

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

ستمبر 2017

عماد علی  
محرران و طبع

# پاک سوسائٹی ڈراماٹک کام

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

منتہی: اس شاعر کا قصہ جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا  
ٹھکرائی ہوئی لڑکی: ایک ایسی سچ بیانی جو قابل تقلید ہے  
لیڈی کلر: لازوال اداکاری کرنے والے ہیر و کار زندگی نامہ





ذکر خاص

نقصہ کہانی

افتخار مجاز

پاکل حسانے سے  
ایک پوسٹ سبق

پہلی سچ بیانی

ٹھکرانی مونی لڑکی

سیما

سرال والوں نے  
اے ٹھکرادیا مہتا

معاشرت

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معصوم نوجوان کی خون  
رنگ لہو گرمائیے والی داستان

تحریر خاص

نظریہ

محمد ایاز راہی

ایک ایسی تحریر جو  
آپ کو چوکھٹا دے گی

دوسری سچ بیانی

سمندر

ذوالفقار

سبق سے بھری ایک  
دلچسپ سچ بیانی

تیسری سچ بیانی

سیلانی

سید محمود حسن

ایک عیاشی ناسور  
کی قربانی کا قصہ

دوسری سچ بیانی

فرشتہ انکل

شرجیل

ایک بچے نے اس  
کی زندگی کا رخ بدل دیا

ساتویں سچ بیانی

سچ جیہے

خورشید شاہ

بدگمانی اس کی زندگی  
شباہ کرنے والی تھی

چھٹی سچ بیانی

گناہ گار

عاطر شاہین

اس نے ایک اجنبی کی  
فیصلہ کر کے کو حیران کر دیا

پانچویں سچ بیانی

جذبہ

افتخار حسین اعوان

متوجہ کشمیر سے  
ایک نکلے بھری کہانی

سوغات

پاپے

قارئین / ادارہ

دنیا بھر سے مختلف موضوعات  
پر معلومات انکشافاتی پاپے

نویں سچ بیانی

گدھ

وسیم بن اشرف

اس نے نہایت حساب  
خود بے باق کر لیا

اٹھویں سچ بیانی

لب بیا

راحت وفا

لب بام پہنچ کر اس  
نے خود کو روک لیا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور  
تہذیب کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر  
آیات

WWW.PAKSOCIETY.COM

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!  
السلام علیکم!

میں سال بھر کے اخبارات کی کاپی بنا کر ایک جگہ رکھ لیتا ہوں۔ آج تعطیل تھی اس لیے میں نے ایک پرایک رکھے بنڈلوں میں سے ایک بنڈل نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ صرف سرخیاں دیکھ کر دوسرے دن کا اخبار نکال لیتا۔ تقریباً دو گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ اس ایک سال کے اخبارات میں لگی خبروں کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ ملک عزیز میں بریلوی غیر محفوظ ہیں، شیعہ غیر محفوظ ہیں، دیوبندی غیر محفوظ ہیں، بلوچ غیر محفوظ ہیں، کشمیری غیر محفوظ ہیں، سندھی غیر محفوظ ہیں، پنجابی غیر محفوظ ہیں، پشمان غیر محفوظ ہیں۔ یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے مجھے دہلا دیا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا کہ ارضی پاک میں محفوظ کون ہے۔ ذہن نے جواب دیا، VIP۔ اور میری نظر دیوار پر آویزاں قائد اعظم کی تصویر پر پڑی۔ ان کی آواز کانوں میں گونج اٹھی۔ ”میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔“ 69 سال قبل کہا گیا جملہ تازہ محسوس ہوا تو میں نے نظر گھائی، کمرے کے کونے میں بے شیلیف پر رکھے قرآن پاک پر نظر ٹھہر گئی۔ جزدان میں لپٹا قرآن فریاد کر رہا تھا کہ ”کبھی مجھے کھول کر مجھے کی کوشش تو کر لیتے۔“

اس افسانے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ کاش ہم احکام قرآن پر عمل کر لیتے تو قائد اعظم کا پاکستان آج جنت نظر ہوتا۔ اداروں سے تصادم ہوتا نہ کسی کے مردہ باد کے نعرے لگ رہے ہوتے۔

معراج رسول

جلد 27 ♦ شماره 08 ♦ ستمبر 2017 م

ماہنامہ  
سکینہ گرامی

مدیرِ اعلیٰ

عذرار رسول



مدیر

پرویز بنگرامی

شعبہ اشتہارات

نمبر اشتہارات: محمد بلال زمان 0333-2256789



قیمت فی پرچہ 60 روپے ♦ زیر سالانہ 800 روپے

پبلشرز پرویز انتر: عذرار رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن

پنفس کشل ایریا مین کورنگ روڈ

کلکتی 75500

نیمل سن

پرینٹر:

مطبوعہ: این جی سن پرنٹنگ پریس

ہالی اسٹیمپ کمپنی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کلکتی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com





## یگانہ شاعر

صوبہ بنگالہ کو تقسیم کر کے ایک نیا صوبہ بہار بنایا جا چکا تھا۔ اسی صوبہ بہار کا صدر مقام عظیم آباد تھا۔ عظیم آباد جواب پڑھ لکھاتا ہے۔ اسی پڑھنے کے محلے منغل پورہ میں ایک معروف منغل خاندان آباد تھا جس کا سلسلہ نسب چنگیز خان سے جاملتا تھا، اس خاندان میں 1301 کے ذی الحجہ (1884ء) میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس بچے کا نام واجد حسین رکھا گیا۔ اس کا نیپالی سلسلہ مرزا آغا جان تک پہنچتا تھا جو لکھنؤ سے عظیم آباد آئے تھے۔ ان کی رشتے داری مرشد آباد سے بھی تھی۔ گویا کہ دونوں جانب سے وہ نواب خاندان تھا۔ اس بچے کو ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی سے ملی پھر اسے محزان اینگلو عربک اسکول میں داخل کرایا گیا۔ پھر ذہین تھا۔ ایک کے بعد ایک کلاس پاس کرتا چلا گیا۔ ہر کلاس میں وظیفے، ترجمے اور انعام حاصل کرتا رہا۔ پھر اسے مزید تعلیم کے لیے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے اس نے 1903ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران اسے ماحول کی وجہ سے شاعری کا شوق ہوا اور اس نے سخن جمی کے لیے سید علی جان پیٹاب عظیم آبادی کا داس تمام لیا۔ پیٹاب عظیم آبادی اچھا کہتے تھے اور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ابتدائی تربیت کے بعد انہوں نے اسے اپنے استاد سید علی محمد شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا۔ شاد عظیم آبادی کا سکہ بہار و بنگال پر بجا ہوا تھا۔ ان کے اشعار لوگوں کی زبان پر رہتے تھے۔ ان کے فیض نے اس کے ذہن رسا کو مزید قوی کیا۔ پھر وہ کلکتہ چلا آیا۔ کچھ دنوں تک کلکتہ میں رہنے کے بعد وہ شیابرج منتقل ہو گیا۔ شیابرج میں مرزا محمد مقیم بہادر (سلطان عالم میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا معلم مقرر کیا گیا۔ شیابرج کی آب و ہوائ صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ بیمار ہو گیا۔ بحالتِ مجبوری اس نے شیابرج چھوڑ دیا اور عظیم آباد منتقل ہو گیا، یہاں بھی صحت صحیح نہ رہی تو لکھنؤ چلا آیا۔ یہ واقعہ 1905ء کا ہے۔ لکھنؤ کی فضا نے جادو اثر دکھایا اور اس کی صحت بحال ہو گئی۔ وقتاً فوقتاً وہ عظیم آباد جاتے اور جائداد کا کچھ حصہ فروخت کرتے اور لکھنؤ لوٹ آتے۔ بے فکری والی زندگی بھی۔ حسن اتفاق کہ نواب بیتا صاحب موج عظیم آبادی اپنے علاج کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی لاابالی زندگی دیکھی تو انہیں فکر ہوئی اور انہوں نے لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے میں حکیم مرزا محمد شفیع کی صاحب زادی سے نسبت ٹھہرا دی۔ یہ واقعہ 1913ء کا ہے۔ اس وقت تک واجد حسین کی شاعری لکھنؤ میں اپنا مقام بنا چکی تھی اور یاس شخص کرنے لگے۔ ان کی شاعری بی بی نے ”بابر“ کا ہوتے ہوئے بھی لکھنویوں پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے ہی عظیم آباد میں واقع ایک بڑی جائداد بیک چکی تھی۔ اب شادی ہوئی تو کمانے کی فکر ہوئی۔ لکھنؤ تو پہلے ہی اڑا ہوا تھا یہاں دال روٹی کا انتظام بھی مشکل تھا۔ اس وقت ہر ایک کی نظر دکن کی سلطنت کی طرف تکی ہوئی تھی کیونکہ اس پر آشوب دور میں دکن ہی ایک ایسی ریاست تھی جو اہل علم کی قدر کر رہی تھی۔ میرزا واجد حسین نے بھی دکن کی طرف کوچ کر جانا اہم سمجھا۔ وہ دکن پہنچے تو انہیں رجسٹرار کا عہدہ مل گیا لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ سکے اور 45-1944ء میں واپس لکھنؤ آ گئے۔ تب تک ان کا پہلا دیوان شتر یاس آچکا تھا۔ عروض و قوافی پر ”چراغِ سخن“ بھی آچکی تھی۔ وہ شعراء میں اہم شمار ہونے لگے تھے۔ اسی سرزمین لکھنؤ میں 2 فروری 1956ء کو انہوں نے دنیا سے منہ موڑا۔ میرزا واجد حسین جیسے یگانہ شاعر کو ہم سب یاس یگانہ چنگیزی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆

## شہر خیال



☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا کورنگی کراچی سے خلوص نامہ۔ ”برصغیر کی ادبی تاریخ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ ہمارے حصے میں آئے اس کے بعد شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کے بعد غالب اور فانی بدایونی کے تذکرے کے بغیر یہ فہرست مکمل نہیں ہوتی لیکن فانی بدایونی کو اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے فوقیت حاصل رہے گی۔ ہمارا ماننا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی اضافی نوازشات کے بغیر کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا۔ چیف صاحب نری، شائستگی، رواداری اور محض کیونکر ہماری قومی زندگی کا حصہ بن سکتا ہے۔ ماضی میں اگر یہ میراث ہماری تھی تو ہماری تربیت کے لیے ہمارے رہبروں میں قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ، راجا محمود آبادیادوب زادہ لیاقت علی خاں اور ان کے رفقاء شامل تھے۔ آج ہماری تقدیروں کے مالک آپ کے سامنے ہیں جو رہنمائی تو بجا و رہنمائی کے بھی قابل نہیں ہیں۔ یہ انہی کی کارگزاریاں ہیں کہ آج ہم بحیثیت قوم زبان و درازی، بدھیز، خود مرضی اور جارحیت کا سہل بن چکے ہیں۔ محترم آپ ہی انصاف کریں جس شخص کو ایسی پاکستان کی خوشخبری دے کر اس کے گمراہوں میں بھی ایک بلب بھی لوڈ شدہ ٹیک کے عوض نہ چلے اور بل ایسا آئے کہ جیسے وہ روشنیوں سے نہایا ہو تو کس کہاں سے لائے گا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم نہ ہو، اسپتالوں میں ڈھنگ کا علاج نہ ہو، دل کے مریضوں کو فوری آپریشن کی بجائے ایک ایک سال کی تاریخیں دی جائیں تو اس کے بچے میں نری شائستگی کیسے باقی رہے گی۔ عام آدمی کی رواداری کس طرح روادارہ نکلتی ہے جب اسے اپنے ہر جائز کام کے لیے جا تا زور دینا پڑے کہ کہا جائے۔ ”شہر خیال“ میں رانا محمد شاہد کا ادبی خلیہ بہت بھایا۔ سید امتیاز حسین بخاری کا دل ہی رکھ لیتے، آپ تو انہیں ڈاکو اور حریت پسند کا فرق سمجھانے لگے۔ شعی محمد عزیز ہم نے تو بچپن میں داستان امیر حمزہؒ، ظہم ہوش ربا، ابن مکی، نیم حجازی کے ساتھ ساتھ شیخ علی اور نازن کو بھی بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ آپ کو بھی بڑا حمزہ آتا اگر آپ بھی پڑھتے، بہادر پور کے حکیم اللہ اللہ دوکٹ کا خطا سب سے شاندار تھا۔ تاریخ کی درستی پر شکریہ۔ ”سر جھانگل“ اور ”نام“ اپنے اندر موسیقیت لیے ہوئے تھیں نور جہاں کا تذکرہ تو کہیں اور بھی بھی آئے بھلا لگتا ہے۔ ایاز راہی بیسوی کی طرح مختصر لیکن جامع انداز میں جھانگل صاحب کی قومی ترانے کی دھن پر دھیان دے رہے تھے۔ جب ہم نے بھی دھیان دیا تو یاد آیا کہ کسی شاعری کے بغیر قومی ترانے کی دھن کا بن جانا اور جانندھری صاحب کی شاعری کا کسی دھن کا مریوں منت ہونا کی مجھ سے کم نہیں ہے۔ خدا کی تخلیق کسی کیسی تخلیقات کو ختم دیتی ہے۔ ندیم اقبال صاحب امریکا کی رنگینوں میں قمار بازی سے خطا اٹھا رہے تھے۔ سفر نامے کی شان ہی یہ ہے کہ داستان کو مسافر اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف بھی کرے اور ندیم صاحب اپنی کئی ہونے پر بات سے انصاف کر رہے ہیں۔ ”دلچسپ دریافت“ میں مذکور ایسے قلم کار کم ہی ہوتے ہیں۔ روز نامہ پیر، ازم، اونڈی ہستی تحقیق حق ادا کر رہی تھیں اور قلم ساز حسن مزاح، زندگی کی جیت، باپ کے بغیر اپنے اپنے کھوجوں کی محنت پر داد طلب تھیں۔ نواب سہا ی انہما کی جاندار اور شاندار ترجمانی۔ قائد اعظم کی محبت اور پاکستان سے عشق نواب بہادر یار جنگ کی محبت میں تھا، میرے ایسے، کتنے ہی انسان دوستوں کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ ”ناسو“ کا علاج بروقت ہو گیا اب بہتری کی طرف کا مزہ ہے۔ ادا کار ندیم کی بے شمار گولڈن جوبلی فلموں کی طرح بحیثیت ادا کار بھی وہ اپنی نصف صدی مکمل کر چکے۔ خدا انہیں مزید صحت و لمبی عمر عطا فرمائے۔ ہم ان سے کئی مریدیل پیچے ہیں۔ ندیم صاحب کی زندگی ان کی اہلیہ فرزانہ کی خالصانہ کوششوں کا ثمر ہیں لیکن ادا کار ندیم بھی پوری زندگی ایک باوقار شوہر رہے۔ کوئی اسکینر ل ان کی زندگی میں نہیں ہے، انہوں نے خلوص کی قیمت اپنی وفا سے چکا دی۔ دل لگی میں ندیم کی ادا کاری ان کے فن کا نقطہ عروج ہے۔ ”لا زوال“ میں ایک ولن کے روپ میں انہوں نے بتا دیا کہ عہد حاضر میں انہیں صف اول سے ٹکالنا ناممکن ہے۔ جناب ساجد امجد نے پچھلے ماہ کی غیر حاضری کی کسر پوری کردی لہذا ان سے ملا کر فریڈ نے فطرت کے اسرار و رموز کی حقیقتات میں اگر اسلام نہیں تو اپنے یہودی مذہب کا مطالعہ ہی کر لیا ہوتا تو اسے اپنے بہت سے نظریات کی صحیح کرنے کا موقع اپنی زندگی میں مل جاتا۔ سچ یانیوں میں نقب، متحول، سماجی، برائیک



نمبر شریک سفر اور نجات زیادہ پسند آئی۔“

☆ فقیر غلام حسین ضیاء کی آمد بمکر سے۔ ”محمد عمران خان ڈیلی نامدار بمکر، محمد عارف بمکر سے، رضا احمد خان اہوان دریا خان بمکر سے، انور عباس شاہ بمکر کے خطوط ”عصیر خیال“ میں پڑھے اور لطف آیا۔ دنیا داری سے فرمت ملے تو یاد کر لیا کرو۔ سید امتیاز حسین بخاری نے طور اور مردو، دو مشہور کردار پر تبصرہ کیا ہے۔ بخاری صاحب نے لکھا ہے کہ طور اور اہوان چارٹ قد کے تھے بلکہ ان کا ساتھی محمد مضبوط جسم کا مالک صرف قد رکھتے تھے۔ امتیاز بخاری صاحب بات الٹ کر گئے ہیں۔ میں نے محمد لونو بار جو طور خان کا ساتھی تھا۔ داؤد خیل ریلوے اسٹیشن پر بمبیک باغیچے دیکھا ہے۔ وہ چارٹ قد اور انتہائی نحیف و زراہم اور کمر کجی ہوئی عینک لگا کر کسیری کی حالت میں دیکھا تھا۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا تھا کہ محمد چاندی والے کتنے روپے تم منہ میں رکھتے تھے تو اس نے کہا کہ میں روپے۔ طور خان پہلے مارا گیا تھا مگر یہ ایس بی نے مارا تھا۔ طور خان ایک عینک کوٹھے میں بندھا تھا۔ ایس بی نے لاکھارا طور ایتھار ڈال دواڑے جاؤ گے۔ وہ مقابلہ کرتا رہا جب کارٹوس ختم ہو گئے تب طور خان نے بندوق باہر جھنجکی ٹیکن کر لیں کیوں کی بوجھاؤ میں گر گیا اور کھیل ختم ہو گیا۔ محمد کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جس کے نام سے لوگ ڈرتے تھے۔ آج کیا حالت ہے۔“ ”نقیات دان“ کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد نے ماہر نقیات ڈاکٹر سکندر فرانیٹز کے حالات زندگی تحریر فرمائی ہے جس کی نقیاتی دریا فائون نے یورپ کے اخلاقی و عملی نظریات میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ فرانیٹز نے سب سے پہلے لاشعور کو دریافت کر کے انسانی افعال و کردار کی نئے انداز سے تعبیر کرتے ہوئے انسانی شخصیت کی بنیاد جس کو فرد یا اوریوں اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے دینی پیار یوں کے علاج میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ”نواب بہادر یار جنگ“ میر سے ہم نام غلام حسین (مین) کی تحریر ہے یہ ایک ایسے محب وطن کا تذکرہ ہے جس نے وطن عزیز کے حصول اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ حیدر آباد دکن کے جاگیردار نواب یار جنگ کے بیٹے تھے۔ ”خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را“ عائشہ انور صاحبہ نے لکھنا کہ نور جہاں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ایک مشہور ادیب نے تو نور جہاں کو سرد جہاں کے نام سے یاد کیا ہے۔ بہر حال اپنے وقت کی مشہور مغربی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب عینی کی سلسلہ دار کہانی ”ناسور“ کی ساتویں قسط جاری ہے۔ یعنی صاحب بلاشبہ داد کے مستحق ہیں۔ ہرموز پر ایک نئی کہانی ہے۔ نعمان کی بہن عاصمہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی۔ سسلس اب بھی قائم ہے۔ ”نقب“ اینیل صاحب کی تحریر ہے۔ کہانی ایک انتہائی گھٹیا ذہن کے انسان کے گرد گھومتی ہے جو شادی شدہ ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کا رسیا تھا۔ انجام سے عزت ہو کر اپنے گھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ”معتول ساتھی“ زرن قمر کی گھر دو سچ کا کس ہے۔ چوری کرنا بھی ایک پیشہ ہے اور اگر واردات سے کچھ حاصل نہ ہو تو پھر اپنی بدھستی کو کوٹے ہیں۔ ”انسان کو مجرم بنانے میں معاشرے کا کردار“ موضوع کے اقتدار سے بہت اچھا عنوان ہے اور جنیل میں قیدیوں سے اپنے جرم کی وضاحت کا کنوینشن لگانا ایک خاتون کے لیے بڑی جرأت اور حوصلہ مندی کی نشانی ہے پھر ایک بے گناہ کو قید سے آزاد کرنا بڑی بات ہے۔ معتول اور اکرم کے ڈائلاگ بہت جاندار ہیں۔ ”راکب نمبر“ ڈاکٹر ظفر احمد خان کی تحریر ہے۔ ظفر صاحب نے بڑی اچھی صیحت کی ہے۔ موبائل فون پر عیبت نہ کریں۔ فون اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا۔ غلط استعمال کا انجام نقصان دہ ہے۔ برے کام کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ والدین تو بچوں کو اسکول یا کالج تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں ان کو خبر کجی چاہے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ ”بدگمان“ درود خان کی تحریر ہے۔ اللہ کے محبوب علی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ شک نہ کرو کہ بعض شک گناہ ہیں۔ اس کہانی کا نتیجہ بھی بدگمانی ہے اسی شک اور بدگمانی پر کتنے گھر روزانہ اجڑ رہے ہیں اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ ”سونا ڈبل“ عاطر شاہین کی ایک فصیح آموز کہانی ہے۔ آج کل اس موضوع کے مطابق عام وارداتیں ہورہی ہیں۔ سونا ڈبل ہونے کے لالچ میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھنا عام سی بات ہے۔ ”ادھوار ششہ“ وسم بن اشرف کی تحریر ہے۔ اس کہانی کا تعلق اس دس سے جوڑ کر دیکھیں جہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ ”شریک سفر“ غلام رضا جعفری کی تحریر نہایت اچھی ہے۔ ایک بچے کے ہیکل انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بالکل بدل گئی اور پھر ٹیک سیرت ساتھی ثابت ہوئی۔ ”نجات“ زویا اعجاز کی کج بیانی ایک حقیقت ہے۔ اندھی عقیدت کا شکار لڑکیوں کو ڈاروہما کا عزت لوٹی جاتی ہے۔ بدعاشوں نے بڑی کا باہر اوڑھ رکھا ہے اور پارسائی کا ڈھونڈ رچا کر شریف زاد یوں کی عزت سے کیلنایہ شیطانی کام ایک آدمی کا نہیں بلکہ یہ عیم درک ہوتا ہے۔ حکومت چاہے تو اس برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے مگر اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری ملیر کراچی سے لکھتی ہیں۔ ”یوم آزادی مبارک کے خوب صورت لفظوں سے جھگڑتے سرورق کے ساتھ سرگزشت اس دفعہ جلد ہی ملے گا۔ ادارہ کی کہانی منفرد اور انگ ہی لگی۔ محترم بزرگ نے اچھی صیحت کی۔ ”عصیر خیال“ پر نظر دوڑائی تو رمانا شاہد صدارت کی کرسی پر دکھائی دیے، مبارک ہو اور ساتھ میں عینی کی سالگرہ کی بھی بہت بہت مبارک باد۔ آفتاب احمد اشرفی صاحب معراج اکل کو دل جلانے سے منع کرتے کرتے اپنا ہی دل جلا رہے تھے۔ مجھی ایسا کیوں؟ دیکھ لیجئے سب کچھ نہ کسی مگر کچھ تو بلا ہے، سننے پاکستان کا خواب دکھانے والے پرانے پاکستان میں بڑی زبردست تہذیبی لائے ہیں۔ بہت سے چہروں کے نقاب سر کے ہیں تو بہت سی چھتیں بھی سامنے آئی ہیں جنہیں دیکھ کر دکھائی ہوئے کہ پاکستان سے محبت کا ڈار مار جانے والوں نے پاکستان کو کن حالات میں پہنچا دیا ہے۔ دل جلانے سے اچھا ہے کہ دعا کیا کریں، وطن کے لیے بھی اور وطن میں بسنے والوں کے لیے بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری ناچ بوہانے میں ہمیشہ کی طرح اپنا کردار بخوبی

ادا کیا۔ ”نفسیات دان“ لکھی اور بہت خوب لکھی باپ کے بغیر اچھی تحریر ہے لیکن ایک الہیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں باپ کوہ خراج نہیں ملتا جس کا وہ مستحق ہے اس کی قربانیاں ہمیشہ بس پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو باپ کی جنتوں کا اعتراف کرتے ہیں ورنہ شاعروں کی شاعری ہو یا ادیبوں کا ادب ہمیشہ ماں ہی کو نمایاں رکھا جاتا ہے۔ فلم ساز پڑھ کر باؤ قدسیہ کے ایک جیلے کی یاد آگئی کہ ”محبت مرد کی زندگی کا محض ایک واقعہ مگر عورت کی پوری زندگی کی داستان ہوتی ہے۔“ ریکا اس جیلے پر پوری اترتی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ سام اگر کرے حالات کا مقابلہ دیدہ دلیری سے کر سکتا ہے تو محبت کا بحر رکھنا اسے بھی آتا ہے۔ ”روز نامہ پیپر“ پڑھ کر حیرت ہوئی اخبار کو تو پیپر کمانے کا ذریعہ جانا جاتا ہے لیکن کسی اخبار کا نام پیپر ہونا واقعی حیرت انگیز ہے۔ ”دششال سے نورنؤ“ میں ندیم اقبال کہاں پھنس گئے۔ اچھا بھلا سفر نامہ جاری تھا ان گوروں نے سارا حرحر کر کر دیا۔ ندیم بھائی آپ گوروں کے چنگل سے توجہ کر کل ہی جایں گے مگر اتنا بتا دیجیے کہ امریکا یا کینیڈا کی شہریت لینے کے لیے جو حلف نامہ لیا جاتا ہے اس حلف نامے میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ یہ سب ذرا تفصیل سے بتا دیے گا۔ ندیم صاحب نے فخر اظہر سڑی میں اپنے کردار کو عموگی سے بھمایا کچھ فلموں کے بارے میں امی سے پوچھا اور کچھ معلومات ہمیں انور فرہادی زبانی ملے۔ انور فرہادی ہو سکے تو اگلی تحریر روٹی باؤ پر لکھیے۔ پلیز۔ ”ناسور“ میں کتنے ہی موڈ کاٹنے کاٹنے لہماں ایسے موڈ پر اکڑا ہوا ہے کہ ایک طرف تو اس کی عزت داؤد لگی ہوئی ہے تو دوسری طرف ان محنت و دشمنوں کی سازشیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ بہرہ کیسے دشمنوں کے عزائم خاک میں ملاتا ہے۔ پہلی جگہ بیانی ”نقب“ پڑھی۔ دوسروں کے گھروں میں نقب لگانے والے کے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔ اگر نقب لگانے والے نقب لگانے سے پہلے یہ سب سوچ لیں تو بہت سے گھر نقب زنی سے بچ جائیں۔ ذویا اعجازی ”نجات“ پڑھ کر روٹھے کھڑے ہو گئے۔ دین اسلام جسطی جیروں فقیروں کے پاس جانے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے لیکن کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ معصیت آتی ہے تو سچے خدا کو بھول کر نام نہاد خداؤں میں خدا کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ غلامت کی دلدل میں دھنسنے یہ یہ فقیر تو خود جتنا ہیں، کوئی سوچتا کیوں نہیں ہے کہ یہ جتنا جوں کی بھتیجی کیسے دور کریں گے۔ زمانہ بدل گیا لیکن نظریے نہ بدلے اور اسی نہ بدلنے کے عمل نے کیا کچھ بیدل ڈالا کہ سکون کی تلاش میں بھٹکنے والے بے سکونی کو ہی اپنا مقدر بنا بیٹھے۔“

☆ مقدس جہاں کراچی کا اختصار یہ۔ ”ہمیں رسالہ 25 تاریخ کو ہی مل گیا۔ اس بار سرگزشت میں ”اوندھی بستی“ سب سے زیادہ پسند آئی کیونکہ اس میں شاہد لطیف نے بالکل نئی معلومات دیں۔ سچ بتائیوں میں ”سونتا ڈبل“ ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ باتوں میں نقب، شریک سفر اور مقتول ساتھی بہترین لگی۔“

☆ محمد ابراہیم درانی نے ڈی جی خان سے لکھا ہے۔ ”میں 1998ء سے آپ کا خاموش قاری ہوں۔ آپ کی تمام تحریریں زبردست ہوتی ہیں۔ آپ نے دلیپ کمار کے متعلق بہت لکھا۔ میرے خیال میں یہ باقی نئے فنکاروں کے ساتھ ایک قسم کی زیادتی اور نا انصافی ہے (دلیپ کمار پر صرف ایک تحریر شائع ہوئی ہے) آپ نشان حیدر پانے والے تمام شہداء کے متعلق تحریر کریں۔ گلوکار کشیش کے متعلق اگر شائع کیا ہے تو بتائیں (کشیش پہلی سفیان آفاقی نے الف لیلہ میں کافی لکھا ہے)۔ پاکستانی اداکارہ آسیہ کے متعلق بھی تحریر ضرور کریں۔ آخر میں میری طرف سے تمام سرگزشت اشاف کو اور قارئین کو دلی عید مبارک۔“

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے آئے ہیں۔ ”یوم آزادی کی مناسبت سے سرورق بہترین رہا۔ تصویر الم کی شاعری کرنے والے فانی بدایونی نے آخر میں اپنی موت کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ ادارے میں حب روایت ہمارے رویوں کے حوالے سے اہم پہلو کی نشاندہی تھی۔ انفرادی ہو یا اجتماعی، وہی لوگ اور قومیں ترقی کرتی ہیں جنہوں نے نری، شائستگی اور جھل سے کام لیا۔ ”عصیر خیال“ میں سب سے پہلے ہمارا ہی خط تھا، شکر ہے۔ سید امتیاز حسین آپ تو خود ادبی و ثقافتی کام کر رہے ہیں۔ آپ میانوالی کے ان حریت پسندوں پر لکھیں تو بہت سے قارئین کو ان کے کارناموں سے آگاہی ہوگی ششی محمد عزیز کا خط بھی اچھا تھا۔ آفتاب احمد نصیر آپ نے سچ لکھا۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ قانون صرف عام اور غریب آدمی کے لیے ہے۔ نزابت و افشال سب سے پہلے تو جاب کی مہارک باذوق کریں۔ دوسرا ایم حجازی کے بڑے ناول نگار ہونے میں کوئی شک نہیں۔ تاہم ان کے ناولوں میں خاصی حد تک مبالغہ آرائی اور دروادی فتنوں پر تحفظات ضرور ہیں۔ سدرہ بانو حاضر تھیں۔ البتہ طاہرہ گلزار اور بشری افضل تو کافی عرصے سے غائب ہیں۔ حکیم الیڈ دو کیٹ نے جماعت اسلامی کے میاں طفیل کے حوالے سے کچھ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ ان سے بھی گزارش ہے کہ اس حوالے سے کوئی تفصیلی آرٹیکل لکھیں تاکہ قارئین بھی ان حقائق کے متعلق جان سکیں۔ محمد عارف اعزاز یہ تو ایک راسخ کا بنیادی حق ہوتا ہے جو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ محض عباس مرزا جیسے بزرگ بھی ذوق و شوق سے سرگزشت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ مختلف ڈائجسٹوں کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ بتاتے چلیں کہ عنایت اللہ صاحب کا حکایت رسالہ قضا یا ڈائجسٹ نہیں۔ وحید ریاست بھی کافی دنوں بعد نظر آئے۔ ان کے سالانہ تجزیے کا بھی کوئی اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو صحت کے ساتھ عمر عطا فرمائے (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد اجاس دفعہ صدی کے ایک بڑے نفسیات دان سگنڈ فر ایڈ



کی زندگی کے مختلف گوشوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ سنگھٹ فراہیڈ کی اپنی زندگی بھی نفسیات کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتی نظر آتی۔ غلام حسین یمن کی ”نواب سپاہی“ اگست کے مہینے کی مناسبت سے بہترین تحریر تھی۔ یمن صاحب نے نواب بہادر یار جنگ کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا جو لوگ بھایا۔ وائے صدیقی کی دلچسپ دریافتیں ایک مختصر مملوئی تحریر تھی۔ انور فواد اس دفعہ پاکستان فلم انڈسٹری کے سپر اسٹار ندیم کا زندگی نامہ لائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے بچپن میں جس پاکستانی ہیرو کی سب سے زیادہ فہمیں دیکھیں وہ ندیم ہی ہے۔ پی ٹی وی کے ایجنے دنوں میں جب ہر ہفتے فلم کرکٹ کرتی تھی تو اس کا بچپنی سے انتظار ہوتا تھا۔ اپنے وقت کے مشہور و معروف اخبارات کے حوالے سے معلوماتی سلسلہ بھی سرگزشت کا ہی خاصا ہے۔ اس دفعہ روز نامہ ”پیپہ“ پر کھیل صدیقی کی معلوماتی و دلچسپ تحریر پڑھنے کو ملی۔ منظر ہام کی ”ازم“ بھی منفرد موضوع پر تھی۔ شاہد لطیف اور شاد تاقب کی تحریریں بھی دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ حب روایت بہترین جا رہا ہے۔ کاشف زبیر کی ہالی ووڈ کے ایک بڑے فلم سازی جدوجہد سے بھرپور کہانی اچھی لگی۔ اللہ سے دعا ہے کہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ کھمالہ حسن کی ”باپ کے بغیر“ مختصر مگر منفرد موضوع پر تھی۔ قوی ترانے کی دھن تخلیق کرنے والے احمد چھاگلہ پر ایاز راہی کی تحقیق قابل ستائش ہے۔ ان کا یہ کام انہیں تاریخ کے صفحات میں زمرہ رکھے گا۔“

☆ قیصر خان کا خطہ بکھرے۔ ”اداریہ میں انکل نے فرض کی طرف توجہ دی ہے جو کہ ہمارے اسلامی معاشرہ کی بنیادی اکانی ہے لیکن پورے ملک میں سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں چڑھائی سے لے کر افسروں تک نرمی سے خالی ہیں جو کہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اس بار سب کے تہرے شاندار تھے۔ نئے دوست بھی حاضر تھے سب کو خوش آمدید۔ سید امتیاز صاحب معلوم نہیں ڈاکوؤں کو کیوں ہیرو بنا گئے۔ کلیم صاحب کا خط تاریخی نقطہ نظر سے بہت اچھا تھا، آپ آتے رہا کریں۔ بہت سے دوست غیر حاضر ہیں۔ ڈاکٹر قرقہ امین، ڈاکٹر روبینہ، محمد عامر ساحل، معظم علی، خالد صاحب، ناصر رند، آغا طاہرہ گھزار، جوانی صاحب وغیرہ لوگ وقفہ وقفہ سے حاضری ضرور دیا کریں۔ ایک صفحہ پر فانی بدایونی صاحب تھے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر ساجد احمد نے بہت اچھے طریقے سے فراہیڈ کی آپ جینی بیان کی۔ قلم کا جاوڈ ڈاکٹر صاحب کا کمال ہے۔ پے پیج میں تمام مضمون بہت اچھے تھے۔ دلچسپ دریا تھیں، نواب سپاہی، گولڈ اسٹار، روزنامہ پیپہ، ازم، اونڈمی ہستی، قلم ساز، نام، باپ کے بغیر، سر جھال، ادا کار ندیم کے بارے میں جاننے کو ملتا اور امریکا کے قلم ساز سے ملے۔ ازم کے بارے میں جاننا تو قوی ترانہ کے مصنف خالق کے بارے میں پڑھا اور افسوس ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس محسن کو بھلا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قدیر خان کو لوگ آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے ہیں۔ ہم پاکستانی محسن کش قوم بننے جا رہے ہیں۔“

☆ عبدالجبار روی انصاری کی خوش چینی تصور ہے۔ ”خدا نہ داشت“ عظیم شاعر فانی بدایونی اپنی سن وفات بتا کر وقت کے مطابق رخصت ہو گئے۔ اللہ کے پیارے بندوں کو کہیں نہ کہیں الہام کرتا ہے اور ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بہر حال گمراہ اور جامع سرگزشت بہت اچھی لگی۔ انکل معراج کے مطابق ہمیں انفرادی اور معاشرتی طور پر نرم بننا ہو گا نہیں تو میں نہ مانو کی طرح ساری انڈیا دھڑکتے ہو جانے گی اور پھر مردہ معاشرے کے چہرے کل اٹھیں گے۔ اس کی شروعات ہو گئی ہیں، بس بنیادی عوام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ”مغیر خیال“ میں رانا محمد شاہد کو صدارت مبارک مصروفیات کا چاک اتنی بڑھ گئی ہیں کہ سبھی سے رابطہ کٹ گیا ہے۔ شعی عزیز، محمد عمران خان، آفتاب احمد نصیراشرنی، نزابت افشار، سعید احمد چاند، کلیم اللہ ایڈووکیٹ، مفتاح عباس مرزا اور وحید ریاست جیسی کے تہرے بہت اچھے تھے۔ نفسیات کے محدود دائروں سے نکل کر انقلاب برپا کرنے والے نفسیات دان، سنگھٹ فراہیڈ کی سرگزشت لا جواب رہی، دلچسپ دریا تھیں، اونڈمی ہستی اور روزنامہ پیپہ معلومات افزا تحریریں تھیں۔ جس حراج نارڈل رہی جب کہ ازم نے سوچے پر لگا دیا۔ ”باپ کے بغیر“ بھی اچھی رہی اور ”ازم“ کی نامور نور جہاں کے شہر میں تو میں اس وقت موجود ہوں۔ مختصر احمد و خیر۔ ”شمال سے ٹورنٹو“ اچھی جا رہی ہے۔ ”ناسور“ میں ناسوروں نے بے چاری حاصم کو اغوا کر لیا جو بایا بایا ہونے کے قریب ہے مگر فہم نہیں سے ہی بے پنا ہو گیا۔ ”مقتول ساتھی“ دلچسپ تھی۔ زریں قمر ربانی کا ذریعہ بن گئیں، زبردست۔ غلط رکھنوں کی ماحول کا ممبر رگ لایا۔ یوں ساجد کو لقب تو لگی مگر شائے کی زندگی بن گئی۔ سووے چکری نے تو مراد خان کو چکرا رکھ دیا آخر اسے بھی اپنی ”نانکن“ بیوی کی سمجھا آئی گئی۔ بھٹی ہوئی خیر کو اچھا چھاپا ملتا تو وہ بھی سدر چھٹی۔ یوں شریک سفر کی کٹھالی بھی مل گئی۔ نفسیات فروش پیرس کار پر کوئی آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا رہا اور ہر کوئی سکون حاصل کرنے کی غرض سے آستانے سے جڑا چلا گیا مگر ایک دن سبھی اس سیاہ کار بد بخت ڈھونڈ بھی پیر کی سمجھت چڑھ گئے۔ معصوم لوگ دنیا سے تو نجات پا گئے لیکن ایسے انسانیت دشمنوں سے نجات کب ملے گی؟ ”بیت بازی“ سے عفت کریم، نیاز ملکھانی اور نانکہ منصور کے شعر عمدہ رہے۔“

☆ ڈاکٹر عبدالغفور کھیل کا تہرہ ملتان سے۔ ”سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ ”خاص نمبر“ کا اشتہار دیکھا۔ آپ اس اشتہار کے ذریعے جو بھنا چاہے ہیں وہ بات سمجھ آ گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں خاص نمبر شائع کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مختصر زندگی میں بہت نمایاں منفرد اور بڑے کام کیے۔ میرے خیال میں اس فہرست میں ایک نمایاں نام ممتاز فلمی اداکار ناٹپ، اشار کاٹلیٹی، بیروہ بلدیہ کی مکر وحید ماہنامہ سرگزشت

مرا دکا ہے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک تحریر افسانے کی شکل میں تیار کی ہے جس میں ان کی تمام قلموں کے نام آجاتے ہیں اگر آپ حکم کریں تو میں وہ تحریر آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں یا ان کے بارے میں مزید بہت کچھ لکھ سکوں وہ لکھ کر بھیج دوں (آپ نے دیر کر دی، لیڈی ظفر کی سوانح پڑھ لیں)۔“

☆ سیف اللہ ملک وال کا اظہار یہ۔ ”سگنڈ فر اینڈ“ ڈاکٹر ساجد کی تحریر نفسیات دان پسند آئی۔ تحریر میں صاحب مضمون کی محنت نظر آرہی ہے۔ ”نواب ساجی“ تحریر سے پتا چلا کہ قائد اعظم کے ساتھیوں میں کیسے کیسے جاں نثارتھے۔ اس لیے تو کزور و جسم والے آدمی نے دنیا کو وہ کر دکھایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ دائیہ صدیقی کی تحریر ”دلچسپ دریافتیں“ واقعی دلچسپ ہے اور ثابت ہوا کہ کچھ بھی ہوتا ہوتا ہے قدرت اس کا سبب بنا دیتی ہے۔ لیجیے انور فراد صاحب نے ”کولڈن اشار“ میں اتنی زیادہ معلومات (ندیم کی قلمیں، ہیر وٹوں کے نام، اعزازات گانے وغیرہ) لکھ کر حیران کر دیا ہے۔ ایک آدمی کے پاس اتنی معلومات!!! اللہ نظر بد سے بچائے۔ روزنامہ ”پیپر“ اخبار میں شکیل صدیقی صاحب نے پیپر اخبار کی تفصیل سے تاریخ تو بتا دی ساتھ ہی کئی محبوب عالم صاحب کے حالات زندگی سے بھی آگاہی ہوئی۔ ازم منظر امام صاحب کا اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ ”اوندمی بستی“ شاہد لطیف صاحب کی اور ”بستی دریافت“ بھلی لکھی۔ لیس جی اب باری ہے ”ششال سے ٹورنٹو“ تک کی۔ ہر قسط پر ندیم اقبال کی تحریف ذمہ لیں لیکن ہر قسط میں قابل تحریف ہے۔ اس دفعہ قسط میں ڈرامائی انداز نظر آیا اور پسند آیا۔ قلم ساز میں سام کی کہانی پڑھی۔ لکھنے والے کاشف زبیر صاحب ہیں تو کیا بیان کی کوئی پرانی تحریر ہے (جی ہاں، بگ نہیں پائی تھی) کیسے جس مزاح بغیر باپ کے زندگی جیت گئی۔ ”سرچھائل“ چھوٹی چھوٹی مگر معلوماتی تحریریں ہیں۔ اچھی ہیں لیکن ”زندگی جیت گئی“ میں لکھا ہے کہ درجہ حرارت منفی 18 ہے لیکن سمندر کی سطح جتنی نہیں بلکہ کشتی رانی کے لیے ٹھیک ہے۔ کوئی کھد ر ہاتھ کر صفر درجہ حرارت پر پانی برف بن جاتا ہے۔ نام والی تحریر میں لکھا ہے کہ آج سے 80 برس پہلے یعنی 1926ء ستمبر میں قصور میں ایک پتی پیدا ہوئی یعنی جب تحریر لکھی گئی اس وقت 2006ء تھا (بالکل صحیح اندازہ ہے۔ یہ 2006ء کی تحریر ہے جو مری ہوئی تھی)۔ سدرہ بانو ناگوری، اختر علی، اختر شاہ کے شعرا جیسے لکے۔ ”پیش گو“ میں فانی بدایونی صاحب کے مختصر مگر جامع حالات زندگی کا پتا چلا۔ سراج رسول صاحب کی دانت، زبان والی مثال گہرے معانی رکھتی ہے۔“

☆ جینا کا گھوہ کراچی سے۔ ”کافی عرصے سے آپ کے رسالے کی قاری ہوں۔ خود بھی شوقیہ لکھتی تھی پھر کچھ حالات کی وجہ سے کافی عرصہ سے لکھنے سے دور ہوں۔ اب بہت دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ لکھ کر ادیبوں کی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑوں سوایک کوشش کی ہے یہ کہانی حرف بہ حرف جچی ہے (کہانی پڑھ کر فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا)۔“

☆ شاہد نقوی کا تبصرہ کراچی سے۔ ”پہلے تو میری طرف سے ہدیہ تہنیت قبول فرمائیے کہ آپ کی زیر ادارت شائع ہونے والے ڈائجسٹ مختلف موضوعات اور دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہیں جو یقیناً اس دور میں کہ جہاں کتب بنی قصہ پارینہ ہوتی جا رہی ہے۔ رفعت کا سامان ہیں۔ توجہ اس امر کی طرف دلاتا مقصود ہے کہ جہاں عمدہ تحریر بہترین اشاعت لیے قاری پر اپنا اعتماد قائم کرتی ہیں وہیں ذرا سی غلطی، ایک آدھ قسم قاری اور ادارے کے درمیان رشتے میں دراڑ ڈال دیتا ہے۔ اس ایک آدھ سال میں کئی مواقع ایسے تھے کہ جی چاہتا تھا احساس دلاتا چلوں لیکن اپنی گونا گوں مصروفیات میں ممکن نہ ہو سکا۔ آج جسارت کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ اسے تنقید نہیں توجہ کے مترادف سمجھیں گے۔ مئی 2017ء کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ مضمون بعنوان ”کیا تیرا بگڑتا“ میں جناب محمد شیراز رقم طراز ہیں۔ ”ایک اور جوان موت شا خان کی ہوئی تھی۔ بابر نام کے ایک نوجوان سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ کراچی سے حیدرآباد جاتے ہوئے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس حادثے میں دونوں ہی کا انتقال ہو گیا۔“ جناب کی توجہ چاہتا ہوں کہ بابر خان ایک اداکار ہے اور وہ اس حادثے میں بیخ گیتا تھا۔ وہ بقیہ حیات ہے (جی ہاں صحیح کہا، ہوا بابر کا نام چلا گیا تھا)۔ اسی طرح عبدالرؤف خالد ایک بیورو کریٹ تھے اور حادثاتی موت کے وقت ان کی عمر تقریباً 50 سال تھی جب کہ مضمون نگار نے نہ صرف ان کی عمر غلط لکھی بلکہ مرحوم کی شہرہ آفاق سیریل ”انگار وادی“ کا ذکر بھول گئے جس نے شیر یوں اور عاصم بھارتیوں کا پول کھول کر دنیا میں پھیل جادی تھی۔ اسی طرح اس اہم مضمون میں چند اہم نام ذکر سے محروم رہے جنہوں نے اگلے جہان میں منتقلی سے قبل بہت تھوڑے عرصے میں دھوم مچائی۔ مثال کے طور پر آئن سٹائن کے جسے جوش صاحب نے ٹیکس کا خطاب دیا تھا۔ آئن سٹائن نے تم عمری میں خود کشی کر لی تھی۔ رزاق راجو کہ جس کی آئن سٹائن نے تعظیم اور لی وی کے بڑے بڑے فنکاروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈائلاگس کی بروقت ادائیگی پھر دیکھنے میں نہ آئی۔ اداکارہ طاہرہ نقوی جس نے شہیدہ اداکاری کو تیار رکھ دیا اداکارہ خالدہ ریاست کہ روحی بانو کے ساتھ اس کی ویڈیو کلیپس پوتا آئن سٹائن کے کورس کا حصہ ہے۔ اداکارہ راسم قاضی تم عمری میں انتقال کر گئے۔ نامور فلمی کامیڈین منور ظریف بھی زیادہ عرصے زندہ نہ رہے اور بھی شخصیات ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس اہم مضمون کے لیے مفصل تحقیق کی ضرورت تھی۔“

☆ شاہد اقبال شاہد کا تجربہ کراچی سے۔ ”ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد ”عقبر خیال“ میں داخل نور ہا ہوں۔ ایک صفحی سرگزشت میں اردو کے عظیم شاعر فانی بدایونی کے بارے میں پڑھا۔ عائشہ ان کی مکمل سرگزشت ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ لہذا محترم



ساجد اصغر سے اس سلسلے میں گزارش ہے کہ فانی بدایونی کے بارے میں مفصل تحریر کریں (جو بھی ہے)۔ ادارے میں آپ نے زبان اور دانت کے تعلق کو بڑے فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور کے سب سے بڑے نفسیات دان کچھنڈ فرانیڈ کی شخصیت پر محترم ڈاکٹر ساجد اصغر نے اپنے دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے جو کہ انہی کا طرہ امتیاز ہے۔ غلام حسین مبین نے تحریک پاکستان کے شطہ بیان مقرر محمد بہادر خان کی سرگزشت تحریر کی جو کہ تاریخ پاکستان میں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے جانے جاتے ہیں اور جن کی تقریریں فرمائش بانی پاکستان قائد اعظم بطور خاص کیا کرتے تھے۔ انور فہاد نے کولڈن انٹارنیم کی داستان لکھ کر ثابت کر دیا کہ ندیم واقعی سنہری ستارہ یعنی کولڈن انٹار کے لقب کے قابل ہیں گو کہ اس سے قبل محترم انور فہاد نے دسمبر 1993ء میں ہنگامہ شادی کے نام سے نذیر بیگ اور فزانی کی خفیہ شادی کا احوال بیان کیا تھا اور جولائی 1992ء میں علی سفیان افغانی مرحوم نے انوکھا اداکار میں نذیر بیگ کی حالات زندگی بیان کی تھی اور اب زیر نظر شمارے میں اس انوکھے اداکار کے بارے میں ایک بار پھر پڑھ کر کافی لطف آگیا۔ ایسی کوشش آئندہ بھی ہوتی رہنا چاہیے۔ ”قلبی الف لیلہ“ کی کمی انور فہاد احسن طریقے سے پوری کر رہے ہیں جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ ٹیلی ویژن کے مقبول مطلوبیاتی پروگرام کیلیم گھر کے میزبان کے بارے میں بھی تفصیلاً لکھیں، جی ہاں میرا اشارہ طارق عزیز کی طرف ہے جو پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے انڈوسٹری میسجی تھے اور میری پسندیدہ ترین شخصیت تھی۔ میں نے ان کے متعدد پروگراموں میں شرکت کی جن کی ریکارڈنگ اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مثنیٰ محبوب عالم کے پیر اخبار کے بارے میں شکیل صدیقی کی خوب صورت تحریر پسند آئی اور بدھیر کے اس منفرد اخبار کے بارے میں معلومات سے بہرہ مند ہوئے۔ دنیا کے مختلف مذاہب کے بارے میں منظر امام نے دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈالی جس سے ہمیں مختلف ازم کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ ”باب کے بغیر“ میں کشمالہ حسن نے ان لوگوں کے متعلق بتایا جن کے سر سے باپ کا سائبیجین ہی میں اٹھ گیا مگر ان کے کارنامے دینی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے جن میں سرفہرست محسن انسانیت حضور اکرمؐ ہیں جن کی عظمت کے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ایاز راہی نے ”سرچمگل“ میں قومی ترانے کی وطن کے خالق کے بارے میں گراں قدر معلومات بہم پہنچائیں۔ ”ناسو“ کو نظر انداز کر کے بیچ پیائوں کی جانب بڑھ گیا کیونکہ قسط وار سلسلے سے مجھے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ میرے خیال میں اس مرتبہ بیچ پیائوں میں پہلے نمبر پر مقبول سماجی، دوسرے نمبر پر نقب اور تیسرے نمبر پر بدگمان رہی۔ ویسے اپنا اپنا خیال ہے میری اس ترتیب سے دوسروں کا حقیقہ وہ ناخودوری نہیں ہے۔ موجودہ شمارے میں آپ نے ”خاص نمبر کا“ شائع کرنے کا بھی عندیہ دیا ہے۔ میں اس شمارے کے لیے جان کھیں گے کہ بارے میں لکھ رہا ہوں۔ جس نے صرف 26 سال کی عمر پائی اور انگریزی ادب میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا (ان پر تحریر موصول ہوگئی ہے)۔ مجھے اُمید ہے کہ سرگزشت کے دیگر خاص نمبروں کی طرح ”یہ نمبر“ بھی ایک یادگار دستاویز ثابت ہوگا۔“

☆ محمد ایاز راہی کی خیال آفرینی ناسمہ ہے۔ ”اک عمر سے بعد دوستوں نے یاد کیا تو حاضر ہوں۔ پہلے سرگزشت کا ذکر ہو جائے۔ ماہ نامہ سرگزشت اُس گھنے سایہ وار پتیل کی مانند ہے جہاں براہ گاہوں (Global, Village) کی چو پال جتنی ہے اور جس کے سائے تلے خاص و عام سبھی ہم کلام ہوتے ہیں۔ سرخ مہر سرگزشت ہی ہوتے ہیں جو سب کو برابر توجہ دیتے ہیں خواہ وہ مرنو گھستانی ہو یا بندہ صحرائی و میدانی۔ یقیناً سرگزشت ایک علمی اور عوامی پرچہ ہے جو ہر خاص و عام کا محبوب ہے، وہ محبوب جس کا باقاعدہ انتظار کیا جاتا ہے جس کی ہر ہر ادا (تحریر) کو سراہا جاتا ہے، دوسرے عوامی سطح پر بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسے مہر پور پذیرائی ملتی ہے اور یہ سب مدیر سرگزشت کی کوہ کنی اور تیشہ آزمائی کا ثبوت ہے کہ سرگزشت جوئے شیریں کی مانند ہر پیاسے کو سیراب کرتا ہے۔ اس علمی، ادبی اور عوامی چو پال میں مجھ جیسا انڈی بھی کچھ نہ کچھ کہہ کے داؤ پاتا اور جوش و جذبے سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس بار شہر خیال کے جن دوستوں نے مجھ تاج کو یاد کیا اللہ انہیں تادیر سلامت اور خوش حال رکھے (آمین)۔“

☆ کوثری (کراچی) کے آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب ایاد آوری کا اذہد شکر ہے۔ میں تو اب بھی شہر خیال کا مستقل باشندہ ہوں۔ عرض کیا تا کہ کبھی تمہارا ہی کوئی بات کر جاتا ہوں وگرنہ تو میرے مضامین مدیر سرگزشت کی کمال توجہ سے لگتے ہی رہتے ہیں۔ میں ایک مزدور آدمی ہوں غم روزگار اور غم جاناں دونوں ہی کندھوں پہ سوار رہتے ہیں۔ ایک سے انکار تو دوسرے سے راہ فرمائیں اُمید ہے آپ سب اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں گے کہ یہی حاصل ہے۔ مہورہ (پنج جنگ) کے نزابت افتخار صاحب آپ کی مثبت تنقید نے دل میں خشک سی ڈال دی۔ یقیناً مضامین کے بہاد میں جملہ غلط بندھ گیا۔ فیض احمد فیض مرحوم یاد آگئے ایک بار شمارے میں انہوں نے اپنا شعر پڑھا کہ اب بہار آئی ہے اس طرح کہ جیسے قاصد کوچہ یار سے بے نیل ورام آتا ہے۔ تو سامعین میں سے کسی نے اٹھ کے کہا کہ حضرت! درست تکیب، بے نیل مرام ہے۔ فیض نے مسکرا کے سر تسلیم خم کر دیا۔ نزابت جی! اُرڈو سے مجھے عشق ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ”آتی ہے اُرڈو زباں آتے آتے“ پچھان ہوں ناں معاف کر دیجئے گا۔ راحت و فارا جیوت صلیبہ ایاز شہر۔ آپ غالباً نامہ، نازنین (کراچی) میں میرا پہلا افسانہ۔ نین سکھ۔ پڑھ کے تبصرہ بھی کر چکی ہیں۔ کراچی کی بہن سدرہ بانو ناگوری بھی یاد رکھتی ہیں۔ پشاور کے انور اعجاز صاحب، پورے والا کے رانا محمد شاہ صاحب، بہاولپور کی بختری افضل صلیبہ اور خصوصاً حیدر یاست بھی صاحب سب

کا شکر گزار اور دعا گو ہوں۔ ہاں البتہ میرے علاقے شہر ہانسمہ کے علی زمان محل، وزیر خان (محل) ذوالفقار احمد دانش اور دیگر ساتھی عرصہ سے مسلسل چپ ہیں شاید دنیا کے ٹیکسٹوں نے جکڑ رکھا ہے انہیں۔ بہر حال کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ سرگزشت کی باتیں سب کے لیے واپس اور ہمیشہ ہیں گی۔“

☆ سعید احمد چاند کرچی سے رقمراز ہیں۔ ”پرچہ ملا۔ سروق پسند آیا۔ شاعر شاہی امیر خسرو کے بارے میں پڑھا۔ معراج رسول صاحب کا ادارہ پڑھا۔ ایک بات میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے دنوں ایکسٹنٹ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میرا سعید چاندھوٹی ہو گیا تھا۔ اس لیے تحریریں مصافحہ نہیں ہے، معذرت خواہ ہوں۔“ ”تھیر خیال“ کے جن دوستوں کے تہرے پسند آئے ان میں اعجاز احمد سٹار، عبدالباروی، ملک شاد تھو، غلام حسین فیاض، رانا محمد شاہد، انور عباس شاہ، محمد عمران خان، عریضہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، منشی عزیز علی، انجم فاروق ساحلی، فیض ادیب شامل ہیں۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے دعا گو ہوں اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، (آمین)۔ (ابھی ابھی سعید احمد چاند کے صاحبزادے محمد انیس اختر نے فون پر اطلاع دی ہے کہ سعید چاند اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ تمام احباب سے درخواست ہے کہ ایک مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر انہیں بخش دیں۔“

☆ اعجاز حسین سٹار نور پور محل سے لکھتے ہیں۔ ”ایک بار پھر حلقہ ڈاک نے روائیتی کارکردگی سے دوستوں کی محفل سے دور کر دیا۔ تمام پابند یوں سے بالاتر ہو کر تفصیل سے تہرہ لکھا تھا۔ اب رونے پینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، دوبارہ کربا عہد کرسفر کی تیاری کرتے ہیں۔ سید امتیاز حسین بخاری مدت بعد تعریف لائے ہیں۔ منشی محمد عزیز علی، عمران ڈبیلی نامدار اور بھکر کے تمام شرکا کو پڑوسی ہونے کے ناطے خوش آمدید کہوں گا۔ بس روینہ نقس انصاری کی کمی رہ گئی ہے۔ ”گولڈن اشار“ میں ندیم کے مرزا نذر بیگ سے شرد کیے گئے سرفراک احوال پڑھا جس میں محنت کے ساتھ ان کی خوش قسمتی کا بڑا احصہ رہا اور وہ سدا بہار ہیر و دین کر پاکستانی عوام کے لیے قابل فخر بن گئے۔ ”اونٹنی ہستی“ کا شکر لطف کا سفر دشار کر گزار اور خطرات سے برقرار لیکن مجھے خاص دلچسپ نہ لگا۔ ”شمشال سے نورنو“ میں ندیم اقبال کپسول کی وجہ سے پھنسے اور پریشانی الگ اٹھانا پڑی لیکن مجھے یہ معاملہ حوصلہ بھانے والا لگا۔ انہوں نے خود اعتمادی سے سامنا کیا ہے۔ اس لیے صاف نکل آئیں گے لیکن کبھی تجربہ میں کتنی مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ”ناسور“ اب مکمل توجہ حاصل کر چکی ہے تمام کردار اپنے پس چروں کے ساتھ سامنے آچکے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ”نقب“ میں ماجد کو اس کی بیوی سے جھگی چوٹ دی ہے امید ہے وہ باقی زندگی سبیل کر اور تھلائے ہوئے گزارے گا لیکن جیسا سبق انیلا دیتا چاہتی تھی یہ راستہ ہی غلط تھا۔ ایسے معاملات پر مرد و اس بچا کر صاف بچ جاتا ہے اور عورت کی ذات شک کی زد میں آ جاتی ہے۔ ”مقتول ساتھی“ میں کئی جھول ہیں واقعات حقیقت اور قانون سے متصادم ہیں۔ مقبول کو چھ سال سزا ہوئی حالانکہ چوری کی دفعات میں انتہائی سزا کم ہے جب وہ عدالت سے سزا یافتہ ہو کر اپنی سزا بھگت رہے تھے تو مقدمات، الزامات اور دفعات کیسے بدل گئیں اور سزا میں کمی بیشی ہوئی ایسے میں تو وکیل کیس کی بنیاد دین ہی ملا دے اور اپنے موکل کو صاف بری کرالے۔ یہاں عدالتی کارروائی کو بچوں کا کھیل بنادیا گیا ہے۔ ”راک نبر“ میں کاشف کا قسمت نے ساتھ نہ زیادہ زندگی بھر کے لیے سزا وار بن گیا۔ ”بیدگان“ میں وردہ خان ذرہ برابر قصور وار نہیں ہیں ایسے پر اسرار حالات میں ہر ذہن میں شک کا کیز اکھلائے لگتے ہیں اور ایسا منظر باپ، بھائی اور شوہر دیکھ لے تو نوبت مار کٹائی بلکہ قتل تک آ جاتی ہے۔ طیش کے وقت محفل ساتھ چھوڑ دیتی ہے لوگ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی پر اعتبار کر کے اپنی اور دوسروں کی زندگی جہنم بنا دیتے ہیں۔ ”ناکھن“ کے واقعات افسوس ناک ہیں لیکن پیش کرنے کا انداز مضحکہ خیز ہے اگر بیانیہ طرز پر لکھی جاتی تو درد ناک حالات اصل حقیقت کے ساتھ سامنے آکر ہمدردی کے جذبات کو جگا دیتے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ عورت ناکھن ہے تو کبھی مرد بھی ایسا کر برا بن جاتا ہے کہ ڈس لے تو دوسرا سانس بھی لینا نصیب میں نہیں ہوتا۔ بس یوں کہیے کہ اپنی اپنی فطرت کی بات ہے پوری صنف کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ ”سونا ڈبل“ میں مڈرا کو لالچ اور بھولپن میں نقصان اٹھانا پڑا حالانکہ کئی سالوں سے ایسے واقعات اخبارات، رسائل اور میڈیا کی زینت بنتے رہے ہیں۔ پھر بھی کوئی ایسے حالات کا شکار ہو گا تو اس کی محفل پر ماتم کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ ”ادھورا رشتہ“ میں شاہین کو میں قصور وار نہیں سمجھتا۔ سارا مکمل ہی قسمت کا ہے اس نے کھر کی جج جج سے تنگ آکر حافیت کا گوشہ تلاش کیا۔ دنیاوی اور شرعی تقاضے نبھائے اگر سکندر نے دھوکا کیا ہے تو اللہ کی عدالت میں وہی جواب دہ ہے۔ شاہین گھربانے والی اور وفا دار عورت ہے۔ سکندر کے بعد کسی دوسرے مرد کی طرف نہ دیکھا لیکن اگر مرد کے دل میں چور ہو تو عورت کیسے کھون لگا سکتی ہے اب اس کا مذہبی رجحان اور سکندر سے پہلو بٹو ٹیک فطرت ہونے کی دلالت کرتی ہے۔ ”شریک سفر“ میں مدح عظیم انسان ہے جس نے تحریک کار در سامنے ہونے کے باوجود شریک سفر بنالیا۔ وہ جوان، قبول صورت اور بارود کا گھما بھلا لڑکیوں کی کیا کی تھی والدین کا بھرم رکھنے اور احسان اتارنے والے اعلیٰ ظرف جوان کم ہی ملیں گے۔ ”نجات“ میں ہمارے اندھے اعتقاد، مکر و ایمان اور بشری کمزوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سب ہمارے ارد گرد کے مناظر ہیں ہم بھی کہیں کم نہیں زیادہ کر دار



رکھتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں زہریکس اور چٹائی کا سامان آپ مہیا کریں تو کسی کی طرف شکوہ بھری نظر سے دیکھنا انصاف کے ذمے میں نہیں آتا۔ ذویا اعجاز نے بھلائی کا حق ادا کر دیا ہے لیکن ہم نے سمجھات سے بچتا ہے تو آج سے غور و فکر کرنی ہوگی۔“

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے۔ ”بڑی خوشی ہوئی کہ میرا خط شائع ہوا۔ شوکت علی قانی بدایونی پیش گو کا یک لمحہ تعارف خوب سے خوب تر تھا۔ ”عصیر خیال“ میں سب خطوط اچھے تھے اور تیرہ خوب تھا۔ نفسیات دان ڈاکٹر ساجد امجد لکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ ان کے قلم میں دریا کی سی روانی ہے اور خوب جادو بیانی ہے۔ ”نواب سہاٹی“ غلام حسین عین کی ایک معلومات افزا اور یادگار تحریر ہے۔ ماہ اگست کے شمارے میں بی بی بیٹھون پدم آزادی کا اصول تھا۔ ”لوچپ دریا نہیں“ دانہ صدیقی کی منفرد پیش کش تھی، پسند آئی۔ قلم بھری میں ”مگلڈن اشار“ اور فرہادی کی تحریر سب سے زیادہ منفرد اور دلکش تھی جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ انور فرہاد نے ادا کار عبدیم کی زندگی کا گوشہ گوشہ بے نقاب کر دیا اور دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اللہ کرے زو قلم اور زیادہ۔ ”روزنامہ پیہ“ اخبار شکیل صدیقی کا ایک تاریخی اور معلوماتی مضمون ہے۔ مثنیٰ محبوب عالم کے نام سے توساری دینا عتارف ہے اور ان کی صحافتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ”ازم“ منظر امام کی حراش سے لبریز عمدہ تحریر ہے اور کافی حد تک معلوماتی ہے۔ ”اودھنی سہتی“ شاہد لطیف کی بھرپور تحریر ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ ندیم اقبال کی ہر قسط لا جواب ہے پڑھنے میں بے حد لطف آتا ہے۔ ”زندگی جیت گئی“ فرزانہ کجکت کی زبردست تحریر تھی، پڑھ کر بہت لطف آیا۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان مقدس ہے ”موت زندگی کی محافظ ہے“ لاکھوں انہم ہم پیش، لاکھوں زلزلے آئیں، لاکھوں گولیاں چلیں، جب تک زندگی ہے کوئی حادثہ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ”نام“ عائشہ انوری کی خوب صورت اور معلوماتی تحریر ہے۔ آغا حشر کاشمیری نے ٹھیک کہا تھا اور نام نور جہاں رکھ دیا جو آج ملکہ ترن نور جہاں کے نام سے عالمی سطح پر معروف ہے۔ ”سر چھاگل“ اباز راہی کی تحریر بھی سب سے منفرد اور بے محسوس اچھی جگہ ایک منفرد و عظیم موسیقار تھے۔ جس طرح خواجہ خورشید اور تھے۔ ”نقب“ اینیل کی واقعی عمدہ تحریر تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دوسروں کو بھی غور و فکر کرنا چاہیے۔ کیا تھوں میں سب سے زیادہ موثر اور بہترین کہانی ”نجات“ ذویا اعجاز کی تھی۔ اس میں جلی بیرون کا پردہ فاش کیا گیا جو تصوف کی آڑ میں اپنا ناپاک دھندا جاری رکھتے ہوئے ہیں۔ ”بیت بازی“ میں اشعار معیاری تھے۔ اقتباسات بھی کافی معلوماتی اور حوصلہ افزا تھے۔ میری طرف سے آپ کو خصوصی دعا و سلام، انشاء اللہ بھر حاضر ہوں گے۔“

☆ بشری افضل کی تحریف آوری بہاد پور سے۔ ”کچھ عرصے کے لیے ہم سرگزشت سے چھڑ گئے تھے۔ مصروفیت نے لکھنے کی فرصت نہ دی گو کہ ہم اس کو پڑھتے ضرور رہے مگر کھنڈ نہ سکے۔ دیر سے حاضری کی معافی کی طلب گار ہوں۔ اٹکل نے بڑی خوب صورت بات کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اب ہم ”عصیر خیال“ میں داخل ہو چکے ہیں۔ السلام علیکم تمام ساتھیوں کو سوائے ایک ساتھی کے جس نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ وہ ساتھی ہیں محمد سلیم فقیر۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ اور محمد شاہد کرسی صدارت پر براجمان تھے، مبارکبادیں، تیرہ واقعی قابل تحسین تھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تیرہ بھی خوب صورت تھا۔ اریشہ محمد عمران خان، سید امتیاز حسین، مثنیٰ محمد عزیز، واہجی واہ ہمارے شہر کے دیکل کلیم اللہ بھی اس محفل میں براجمان ہیں۔ ہمارے شہر کو اللہ تعالیٰ سے بچائے (آمین)۔ پہلی کہانی ”نقب“ پڑھی کہانی خوب صورت انداز لیے ہوئے تھی۔ اینیل نے اپنی دوست کا ساتھ دیا اور خود کو بھی بچائے رکھا۔ خدا نے اس کا نام رکھ لیا۔ نور جہاں کا ”نام“ ہمیں اس مختصر صفحے پر معلوم ہوا۔ ”سونا ڈیل“ اس طرح کے واقعات بہت سے لوگوں کے ساتھ پیش آئے۔“

☆ حنیف ادیب لاہور سے لکھتے ہیں۔ ”سرگزشت لے کر آیا تو سب سے پہلا کام جو کیا وہ رسالے کی ورق گردانی کا تھا اور سب سے پہلی ترجیح وہی پہلا صفحہ تھا جس پر آپ کی نہ کی شخصیت کے تعلق بیان کرتے ہیں اور پھر وہی جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے ٹورنٹو کا سفر نامہ کہ جس نے قارئین کو ایک محسوس بحر میں جکڑ رکھا ہے کہ پڑھ کر بغیر چین نہیں آتا۔ اس بار بھی ماشاء اللہ ندیم صاحب کے قلم سے وہ جوہر دکھائے کر رہے نام اللہ کا۔ ”سرجی“ کا دلچسپ اور دلکش کردار کیا بھلا لگتا تھا کہ اب مطیع اللہ خان نے بھی اپنی جانب قارئین کی آنکھوں کا رخ کر رکھا ہے اور انکھیں ہیں کہ اس چہرے سے بٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ مذکر کو مونث بنا کر پیش کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا مکمل ہے۔ ہمارے اکثر خان بھائیوں کی بول چال ایسی ہوتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اردو زبان کی ایسی سرجری کر دیتے ہیں کہ سننے والے کے کان میں رس گھول دیں اور مسکراہٹ بے اختیار لبوں پر آجائے۔ ”شیبا کا“ ”سیا“ بھی کچھ کم مزید انہیں اور بخاروں سے بھر ہوتا ہے۔ اقبال ندیم کا یہ سفر نامہ ان کے دلکش اور دلچسپ انداز بیان اور الفاظ کی جج دج کے باعث کسی مجھے ہوئے انشاء پر داز کی تحریر لگتی ہے۔ اس کا پڑھنے والا اس وقت دم لیتا ہے جب قسط ختم ہوتی ہے۔“

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

احمد علی، کوثر پروین، اختر اجیری، نشاط خان، کراچی۔ ناہید یا مین، عباس چنیوٹی، لاہور۔ زاہد حسین، فیصل آباد۔ خورشید نیازی، جہلم۔

افشاں علی سید، ملتان۔

مثنوی

ضیاء تسنیم بلگرامی

حضور اکرم نے صاف لفظوں میں احکام خداوندی سنا دیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن اس شاعر نے جو خطہ عرب میں یکتا تھا، جس کے اشعار زبان زد عام تھے جسے امرا و حاکم سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جس کے اشعار کے دلدادہ اک دنیا تھی، بادشاہان بھی اس کے اشعار سے لرزے تھے کہ کہیں وہ اس کی بجو نہ کہہ دے وہی ایک معمولی ڈاکو سے شکست کھا گیا۔ لوگوں نے سنا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ اس کی موت خدا کا عذاب ہے، اس کے گناہوں کی سزا ہے۔

عرب کے ایک بہت بڑے شاعر کے عبرت ناک انجام کی کٹھا

کوفے میں بندہ نامی ایک محلہ تھا۔ یہاں 303ھ (915 عیسوی) میں حسین نامی ایک مثنوی کے گھر میں پڑا پیدا ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام احمد رکھا۔ یہ کوئی خوش حال گھرانہ نہیں تھا لیکن حسین کا تعلق

عرب خاندان سے تھا اور اسے شرقاء میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو اس کو بڑی خوشی ہوئی۔

اسی محلے میں ایک کتبہ تھا اور اس کتبہ میں شرقاء



[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)



[WWW.PAKSOCIETY.COM](http://WWW.PAKSOCIETY.COM)



کوفہ کی اولاد تعلیم پاتی تھیں۔

بچہ محبت و شفقت سے پرورش پاتا رہا اور جیسے ہی اس نے شعور سنبھالا باپ نے اس کو محلے کے اسی کتب میں داخل کروادیا۔ یہ بچہ انتہائی لگن اور محنت سے تعلیم پانے لگا۔

اس زمانے کے مدرسوں میں عموماً ادب شاعری اور لغت کی تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ احمد نامی اس بچے نے بھی مذکورہ موضوعات میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی بعد میں اس بچے نے اپنے اصل نام کے بجائے اپنے تخلص سے شہرت حاصل کی اور آگے چل کر اس بچے نے کینت ابوطیب اور تخلص منتہی اختیار کیا اور اپنے اسی تخلص سے شہرت پائی۔

عربوں میں یہ رسم تھی کہ جب ان کا بیٹا لائق تربیت ہو جاتا تھا تو وہ اسے خانہ بدوشوں میں پہنچا دیتے اور وہ ان کی دلیری، آزادی اور زور و قہر پر جیسی خصوصیات اور اوصاف حاصل کر لیتے۔ زبان دانی بھی انہی بدوی قبائل میں رہنے سے آجاتی تھی۔

منتہی نے چند سال اپنے محلے کے کتب میں تعلیم پائی تھی اور کتب سے اسے بہت کچھ حاصل ہوا تھا مگر منتہی کا باپ کتب کی تعلیم سے زیادہ مطمئن نہیں تھا وہ اپنے بیٹے کو خانہ بدوشوں میں چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن بیٹے کی محبت اسے کچھ عرصہ روکے رہی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے منتہی کے ساتھ خود بھی خانہ بدوشوں میں رہے گا چنانچہ وہ بیٹے کو لے کر خانہ بدوشوں میں پہنچ گیا۔

یہ خانہ بدوش عرب بھی ایسے لوگوں سے بہت خوش ہوتے تھے اور نہایت محبت اور لگن سے ایسے بچوں کی تربیت کرتے تھے چنانچہ منتہی کو ان لوگوں نے نہایت خوشی سے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ یہ لوگ کبھی یہاں ہوتے کبھی وہاں، ان کا زیادہ وقت سفری میں نہزتا تھا۔

منتہی کا باپ اس کو بدوؤں میں آزادی اور دلیری کی تربیت میں مشغول دیکھتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی ایسا لگتا جیسے منتہی کو بدوؤں کی روش اختیار کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ خانہ بدوشوں میں جو بچے پہلے سے زیر تربیت تھے منتہی ان پر آسانی سے حاوی ہو جاتا۔ ہمیں اس نے شاعری بھی شروع کر دی اور خانہ بدوش اس کی شاعری سے بہت لطف اندوز ہوتے۔

آہستہ آہستہ اس کی شاعری کا چرچا خانہ بدوشوں سے نکل کر شہروں تک جا پہنچا۔

منتہی بہت خود پسند اور جاہ طلب واقع ہوا تھا جبکہ اس نے ہوش سنبھالنے ہی اپنے غریب گھر انے کو دیکھا تھا اس کا باپ ستا گیری کرتا تھا حالانکہ ان کے معاشرے میں پیٹھے کی وجہ سے عزت یا ذلت نہیں ملتی تھی بلکہ انہیں اگر خاندانی نجات اور شرافت میسر ہوتی تو وہ شریف گھرانا سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح معمولی حقیر سا پیشان کی شرافت کو داغ دار نہیں کر سکتا تھا۔

منتہی نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کی غربت اور افلاس کو دیکھ کر اسے شرمندگی اور ندامت محسوس ہوئی رہی۔ منتہی کو اپنے باپ کا اس طرح محلے کے گھروں میں جانا پسند نہیں تھا۔ وہ لوگوں پر حکومت کرنے کی خواہش رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔

خانہ بدوشوں میں بھی وہ حکومت کرنے کا قائل رہا اور یہی چاہتا تھا کہ لوگ اس کا حکم مانیں اور وہ اپنے آس پاس کے لوگوں اور اپنے ماحول پر حکومت کرے۔

سادہ کے صحرائیں جو قبیلے آباد تھے۔ منتہی ان میں خاصا مشہور ہو چکا تھا اور لوگ اس کے کلام کو بڑے بڑے شاعروں کے کلام پر ترجیح دیتے تھے اور وہ منتہی سے اس لیے بھی خوش رہتے تھے کہ منتہی ان میں رہتا تھا اور اس کی وجہ سے یہاں کے قبائل کو بڑی عزت اور فضیلت حاصل ہو گئی تھی۔

منتہی اپنی شاعری پر بھرپور توجہ دیتا رہا۔ مضمون آفرینی پر اس کی خاص توجہ رہتی اور وہ دوسرے شاعروں کو کمتر سمجھنے لگتا تھا۔

اس کے دل و دماغ شب و روز اسی غور و فکر میں لگے رہتے کہ ایک نامور انسان بہتوں کو اپنی پیروی کرنے پر کس طرح آمادہ کر لیتا ہے اور ایک بڑا آدمی خود کو کس طرح بڑا قرار دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے خلفا تھے اور نبیوں کے بارے میں بھی وہ غور و فکر میں لگا رہتا اور ان دونوں میں جو خصوصیات اور اوصاف منتہی کو نظر آئے ان میں سے ایک یہ وصف اور خوبی پائی جاتی تھی کہ ان کا تعلق عرب کے مشہور خاندانوں سے تھا۔ خلفائے بنو امیہ بھی اپنی خاندانی سیادت کی وجہ سے دوسروں پر حاوی آگئے تھے اور ان کے نامی گرامی عامل اور بڑے عہدے دار بھی اس لیے کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ بہترین انشا پرداز ہونے کے ساتھ بہت اچھے شاعر یا بہت اچھے مقرر یا خطیب ہوتے تھے۔

منتہی میں شاعرانہ برتری اور عظمت موجود تھی اور وہ اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر سکتا تھا۔  
خلیفہ کے علاوہ نبیوں کے احوال پر غور کیا تو وہاں بھی اسے یہی خوبی نمایاں نظر آئی کہ نبی اپنے دلکش کلام کی وجہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے۔ اسے اپنی شاعری پر ناز تھا اور سادہ کے قائل نے بھی منتہی کی شاعرانہ عظمت اور برتری کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔

منتہی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ خانہ بدوشوں کو جمع کر کے اپنے کلام سے محظوظ کرتا اور سننے والے بھی اس کے کلام کی دل کی گہرائیوں سے داد دیتے۔ اس کے جوارادے تھے۔ ان سے وہ خود تو واقف تھا لیکن سادہ کے قبیلے والے منتہی کے ارادوں سے واقف نہیں تھے۔ ذہین اور چالاک منتہی سادہ لوح قبائلیوں کے مزاج اور دل و دماغ کا اپنی عمیق نظروں سے جائزہ لیتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا جو عظیم تر منصوبہ ہے اگر وہ ان قبیلے والوں پر ظاہر کر دے تو کیا یہ سادہ لوح لوگ اس کے دعوے کو مان لیں گے۔

اس نے کچھ عرصے بعد یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی شاعری نے سادہ کے قبائلیوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا ہے، اب اگر وہ ان سب کے سامنے کوئی غیر معمولی دعویٰ کرے گا تو یہ لوگ اسے دل و جان سے قبول کر لیں گے۔

شام ہوئی اور قبیلے کے ہر عمر کے لوگ اسے گھیر کر بیٹھ جاتے اور اس سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے اور منتہی نہایت جوش و خروش سے اپنا کلام سنانا اور سننے والوں سے داد اور تحسین وصول کرتا۔

اب منتہی کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ اپنے ان عقیدت مندوں میں کوئی غیر معمولی دعویٰ کرے گا تو یہ بھولے بھالے سادہ لوح قبائلی اسے قبول کر لیں گے لیکن اس کے دعوے کو صرف قبول کر لیا اس کے لیے سود مند بات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جاہ طلب اور ثروت پسند شاعر تھا جس نے غربت، حسرت اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی اس کا باپ لوگوں کے گھروں میں پانی پہنچانے کے روزی کھاتا تھا اس لیے اس کے باپ کی کوفے میں عزت نہیں تھی۔ خاندانی نجابت اس کے بھی کام نہیں آئی اب وہ زمانے بھر کے لوگوں میں نمایاں رہ کے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کے دل و دماغ پر اتنا شدید اثر ڈالنا چاہتا تھا کہ اس کے سامنے والے اس کے لیے جائیں قربان کر دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

وہ کچھ عرصہ لوگوں کو اپنی شاعری سے متاثر کرتا رہا اور

آخر کار ایک دن اس نے غیر معمولی حوصلے سے کام لے کر لوگوں کو بتایا۔ ”میری شاعری اتنی غیر معمولی ہے کہ آج میرا اس معاملے میں کوئی مد مقابل نہیں، لوگو کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔“

لوگوں نے یہی جواب دیا کہ وہ عرب ہے اور اس کا باپ بہشتی تھا اور اب منتہی عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

منتہی نے کہا۔ ”مجھے اپنی شاعری کے بارے میں تم سے زیادہ معلوم ہے۔ میں شاعر ہوں اور جو کچھ میں اپنے اشعار میں کہتا ہوں وہ میرا کلام نہیں کلام ربانی ہے۔“  
سننے والوں نے اقرار کیا کہ بے شک منتہی کا کلام، کلام ربانی ہے کیونکہ اسے یہ غیر معمولی شاعرانہ لیاقت، قابلیت اور صلاحیت رب کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اس عہد میں دوسرا کوئی شاعر منتہی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

منتہی اپنے سننے والوں کو جو باور کرانا چاہتا تھا یا ان کے دل و دماغ میں جو بات بٹھادینا چاہتا تھا وہ اس میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کی حصول یابی کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ جانتا تھا کہ یہ خانہ بدوش کی زندگی بسر کرنے والے لوگ بھی غیر معمولی عزت اور آسائش کے خواہش مند ہوں گے، یہ بھی اپنے زمانے میں نمایاں رہنا پسند کریں گے۔

منتہی نے کہا۔ ”تم لوگ سادہ میں خانہ بدوش کی زندگی بسر کرتے ہو جب کہ شہروں میں تمہارے ہی جیسے لوگ انتہائی خوش حالی، آسودگی اور ناموری کی زندگی بسر کر رہے ہیں کیا تمہارے دلوں میں یہ خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی کہ تم بھی اس زمانے میں بلند مرتبہ حاصل کر لو۔“

ان لوگوں نے کہا، ہم یہیں بہت خوش ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ہمیں دربار خلافت سے کوئی نمایاں مقام نہیں مل سکتا۔ ہم خلافت کے ماحول کے پروردہ لوگ بھی نہیں ہیں۔ ہمارا دربار خلافت تک پہنچنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔“

منتہی نے کہا۔ ”آج جنہیں خلافت اور خلیفہ سے اعلیٰ مناصب اور عہدے حاصل ہیں یہ ماضی میں تمہارے ہی جیسے لوگ تھے اور یہ بھی تمہاری طرح خانہ بدوش کی زندگی گزارتے تھے مگر ان میں ان کی خوش مستی سے ایک نئی پیدا ہو گیا اور اس نئی نے اپنے بہت سے سامنے والے پیدا کر لیے اور آہستہ آہستہ نبی کے قریب رہنے والوں نے اور



مت کر کیونکہ جب تک ہم تیرا پورا منصوبہ سن کر سمجھ نہ لیں اور یہ اندازہ نہ لگا لیں کہ اس سے ہم قبائلیوں کو کتنا فائدہ پہنچے گا ہم تیری پیروی کس طرح کریں گے، میں تو اسے جتنی تجھ کو مشورہ دیتا ہوں کہ تو سادہ کے جملہ قبائل کو یہاں کے بڑے میدان میں جمع کر ہم تجھ کو ان سب سے اونچی جگہ پر بٹھادیں گے اور تو ان سب کو بلندی سے مخاطب کرے گا اور ان سب کو بتائے گا کہ تو کیا چاہتا ہے اور اگر ہم تیری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو ہم بھی عباسی خلافت کی طرح ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈال دیں گے۔“

جنتی نے اس بزرگ کا یہ مشورہ قبول کیا اور کہا۔ ”اب یہ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ تم مجھے جس طرح چاہو کسی اونچی جگہ پر بٹھا دو یا کھڑا کر دو، میں وہاں سے تم سب کو بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں، کیا چاہتا ہوں اور تم کس طرح اپنے زمانے میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، لوگو تم یقین نہیں کرو گے کہ میں تمہیں جنتی بلندی تک لے جانا چاہتا ہوں۔“

جنتی کی باتوں نے سننے والوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا وہ اس عظیم شاعر سے بہت کچھ سیکھ چکے تھے اور مزید سیکھنا چاہتے تھے انہیں عباسی خلافت کے دبدبے کا جتنا حال معلوم تھا اس سے انہیں یہ اندازہ ہوا تھا کہ دنیا بھر میں ان سے زیادہ طاقت ور کوئی دوسری حکومت نہیں تھی اب اگر جنتی ان کے مقابلے پر سادہ والوں کے تعاون اور جاں نثاری سے کوئی بڑی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہے تو سادہ والوں کو اس کا ساتھ ضرور دینا چاہیے۔

اس ہجوم میں یہ بات تو طے پا گئی کہ اب اسی میدان میں سادہ کے تمام قبائل جمع ہوں گے اور جنتی کے لیے ایک اونچا تخت بنوایا جائے گا۔ اس پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر جنتی اپنے دل کی باتیں کہے گا اور پھر اس کی باتیں سب کی سمجھ میں آئیں گی جنتی عباسیوں کے مقابلے میں ایک نئی طاقت ور حکومت کی بنیاد ڈال دے گا۔

سامعین نے یہ ساری باتیں سادہ بھر میں پھیلا دیں اور جنتی کی عزت اور توقیر میں بہت اضافہ ہو گیا۔

اب لوگوں نے جنتی کو گھیرنا شروع کر دیا اور وہ اس کی دلچسپ اور خرد افروز باتیں سن کے دل و دماغ میں محفوظ کر لیتے اور انہیں دوسروں تک پہنچا دیتے۔

وقت مقررہ پر سادہ کے قبائلی میدان میں پہنچ گئے۔ انہوں نے جنتی کے لیے ایک اونچا تخت بچھا دیا تھا اور اس

پھر اس کے خاندان نے نبی کی رشتے داری سے فائدہ اٹھائے اور عباسی خلیفہ وجود میں آنے لگے۔ وہ کوئی خاص لوگ نہیں تھے مگر نبی سے ان کی رشتے داری ان کے کام آئی اور ان چالاک لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے خلیفہ نے اپنی برتری بڑھانے اور قائم رکھنے کے لیے دنیا بھر کے لائق لوگوں سے کام لینا شروع کر دیا اور ان کی طاقت اور ضرورت میں اضافہ ہوتا رہا، تو چاہو تو تم بھی اسی طرح ترقی کر سکتے ہو تم بھی ایک نئی حکومت کو وجود میں لا سکتے ہو۔“

جنتی کی یہ عجیب و غریب سمجھ میں نہ آنے والی باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں پھیلان پیدا کرتی رہیں اور انہوں نے جنتی سے پوچھا۔ ”ہماری سمجھ میں تیری صرف اتنی سی بات آئی ہے کہ آج جو لوگ خلیفہ بنے بیٹھے ہیں، ان کا تعلق نبی کے خاندان سے ہے لیکن آج ہمارے زمانے میں تو کوئی نبی بھی نہیں جس کی ہم خدمت کریں اور ہمیں بلند بالا مقام حاصل ہو۔“

جنتی نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ نبی کی 23 سالہ جدوجہد سے واقف ہو؟“

کئی بزرگوں نے جواب دیا۔ ”بہت اچھی طرح۔“ جنتی نے کہا۔ ”میں بھی تمہیں اسی راستے پر ڈال سکتا ہوں اور تم بھی ایک طاقت ور حکومت کے قیام میں میری مدد کر سکتے ہو مگر ابھی میں اپنے ارادے اپنے مقصد اور اپنے مستقبل کے منصوبے کے بارے میں کھل کے تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

سننے والوں نے کہا۔ ”واہ جناب! یہ کیا بات ہوئی ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ تو جو کہے گا ہم وہ کریں گے اور اگر ہم سے طاقت ور حکومت وجود میں آسکتی ہے تو ہم اسے وجود میں لانے کے لیے بے قرار ہیں۔“

جنتی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”دوستو، بھائیو اور بزرگوں میں تم سے جاں فروشی کا مطالبہ کروں گا، تمہیں اپنا عظیم الشان مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دینا ہوں گی۔ تم عصر حاضر کی طاقت ور ترین حکومت سے ٹکرو گے، اگر تم نے میری پیروی کی اور میری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو میں تمہیں یقین دلاؤں کہ اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔“

قبائلی بزرگوں میں سے ایک نے جھجھکائے لہجے میں کہا۔ ”اے جنتی! ہم سے اشاروں اور کنایوں میں باتیں

# صرف نام تجویز کرنے پر جیتیں CC-1300 کار

ان تینوں سے کسی ایک پر ☒ کا نشان لگائیں۔ یا خود تجویز کریں۔

FRUITY JUICE

SKY JUICE

KING JUICE



دوسرا انعام سائیکل

تیسرا انعام LCD سونی

اس جیس کے پکٹ کا نام تجویز کریں

اور جیتیں بے شمار انعامات

نام

شناختی کارڈ نمبر

فون نمبر

ایڈریس

یا نام خود تجویز کریں

اور بھیجیں ایریا BOX 167 P.O گوجرانوالہ

تخت پر قیمتی قالین اور شاہانہ انداز کے گاؤں کیے رکھ دیئے گئے۔

وہ قیمتی تخت پر چڑھنے کے بعد بیٹھنے کے بجائے کھڑا رہا اور درہمیک عباسی خلیفہ کی جاہ و چشم پر نظر برکرتا رہا۔ اس نے اب قابلیوں کو بتایا کہ یہ عباسی بھی تمہارے ہی جیسے خانہ بدوش ہوا کرتے تھے مگر نبی کی قرابت داری نے ان کو اس مقام تک پہنچا دیا۔ اب اگر تم لوگ عباسی خلافت جیسی حکومت قائم کرنے کے متحشی ہو اور چاہتے ہو کہ تم بھی دنیا بھر میں نمایاں رہ کر زندگی گزار دو تو تمہیری پیروی کرو میں تم سب کو خلیفہ بننے کے بعد اعلیٰ عہدے اور مناصب دوں گا تم بھی عباسی خلفاء کی طرح عیش کرو گے۔“

سامعین نے قیمتی کی یہ تقریر بہت پسند کی مگر انہیں قیمتی کا منصوبہ کوئی خاص اس لیے نہیں لگا کہ اگر سادہ والے اس کی خلافت کے لیے بیعت کر لیں گے تو ایک نئی خلافت فوراً وجود میں آجائے گی مگر قیمتی کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ عباسی خلافت اس نئی خلافت کو کس طرح کو مار دے گی۔

خانہ بدوش قبائلی ان انجمنوں اور مصیبتوں کا خیال اپنے دلوں میں نہیں لاسکے جو آگے چل کے انہیں پیش آنے والی تھیں۔

اس میدان میں جو کچھ طے پایا اس کی جزئیات پر عمل کرنے کی منصوبہ بندی قیمتی کو کرنا تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے خلافت سے ٹکرانے کے لیے ایک زبردست عسکری قوت درکار ہوگی۔ اس کے علاوہ اس عسکری قوت کے لیے ایک اعلیٰ پائے کا ذہن، ہوشیار رہنما بھی ہونا چاہیے مگر اب اسے یہ سوچ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ رہنمائی کے فرائض قیمتی خود انجام دے گا اور وہ اپنی نوجوانی ہی میں سادہ کے قابلیوں پر حکومت کرے گا۔

جلے کے خاتمے کے بعد قیمتی نے بھی سے اپنی خلافت کے لیے بیعت لی اور ان سب کو یہ یقین دلایا کہ اگر سادہ کے لوگوں نے اس کی جاں نثاری کے ساتھ پیروی کی اور اس کے احکامات ماننے رہے تو وہ ان سب کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دے گا۔

سبکی دن تک قیمتی ان سب سے بیعت لیتا رہا اور یہاں کی خبریں اس علاقے کے عامل تک پہنچتی رہیں اور خلیفہ کو بھی اس نئے فتنے سے خبردار کیا گیا اور اوپر سے اس علاقے کے عامل کو حکم دیا گیا کہ اس فتنے کو عسکری قوت سے کچل دیا جائے اور قیمتی کو قید خانے میں ڈال دیا جائے۔

سادہ والوں کو اس وقت بڑی پریشانی پیش آئی جب سادہ کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا اور جنگ و جدل کی نوبت تک نہیں آئی۔ قیمتی کو کسی مزاحمت کے بغیر گرفتار کر لیا گیا جب اسے پکڑا گیا تو وہ سادہ والوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے ان سے مدد کا طالب ہوا لیکن سادہ کا ایک شخص بھی قیمتی کی مدد نہیں کر سکا۔ ان کی سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ ان لوگوں نے خلیفہ کی عسکری قوت سے ٹکرانے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

قیمتی کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور سادہ کے لوگ معمول کی زندگی بسر کرنے لگے۔

قید خانے میں قیمتی کی دن تک صرف یہی سوچنا رہا کہ سادہ کے لوگ تو اس پر جان قربان کر دینے کا وعدہ کر چکے تھے اور اس کے ہاتھ پر نئی خلافت کی بیعت بھی کی گئی تھی پھر عین وقت پر لوگ اس کا ساتھ کیوں چھوڑ گئے اور وہ خود تنہا اور بے سہارا کیوں رہ گیا۔

عباسی عامل نے قیمتی پر کوئی سختی نہیں کی اور صرف قید تنہائی کی سزا پر قائم رہا۔ قیمتی جو کل تک سادہ کی کھلی فضا میں لوگوں کو اپنا کلام سنا کے داد و تحسین وصول کیا کرتا تھا۔ اب وہ قید خانے کی دیواروں کے درمیان سننے والوں سے محروم خاموشی کے شب و روز گزار رہا تھا وہ دیواروں کو اپنا کلام سناتا اور ان سے داد و نہ پا کے بے چین ہو جاتا۔

اسے اس قید خانے میں قید تنہائی میں پہلا تجربہ یہ ہوا کہ اسے بیعت لینے سے پہلے سادہ کے قابلیوں کو فوجی تربیت دلوانی چاہیے تھی اور ان کے لیے اعلیٰ ہتھیار بھی فراہم کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور اسے اپنا منصوبہ ابھی راز میں رکھنا چاہیے تھا۔

مگر اب قید خانے میں اسے یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ یہاں سے اسے نجات کس طرح ملے گی اسے یہاں سے نکالنے کے لیے باہر کوئی طاقت بھی موجود نہیں تھی۔ سادہ کے لوگ بھی اسے اس لیے بھول جائیں گے کہ وہ خلافت کے طاقت ور نظام سے ٹکرانے کی ذہنی، فکری اور عسکری قوت سے محروم تھے۔ اب وہ اس دنیا میں تنہا رہ گیا تھا اسے غیر معمولی شعری قوت جو خدا کی طرف سے ملی ہوئی تھی میں اسی سے وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

یہاں تو اسے بالکل بھلا دیا گیا تھا قید خانے کے لوگ بھی اسے دو وقت کا کھانا اور پانی پہنچا دیتے تھے ان سے لیکن وہ اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا تھا۔



پہنچانا چاہیے یا نہیں۔

اس نے پوچھا۔ ”اے جنتی! پہلے میں اس قصیدے کو خود پڑھوں گا اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھ کو تیرا یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔“

جنتی نے اس کو اپنے سامنے بٹھالیا اور قصیدہ اس کو پڑھنے کے لیے دینے کی بجائے خود پڑھ کے سنانے لگا۔

یہ قصیدہ عامل کی شان میں لکھا گیا تھا اور اگر اسے عامل تک پہنچا دیا جائے تو اس کے خدمت گار کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

خدمت گار نے وعدہ کر لیا کہ وہ جنتی کا یہ کام کر دے گا۔

جنتی نے اپنا قصیدہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”رات جب عامل بالکل تنہا ہو تو میرا نام لیے بغیر میرا یہ قصیدہ اس کے حوالے کر دینا اور خود سامنے سے ہٹ جانا، امید ہے کہ اس قصیدے کا خوشگوار اثر پڑے گا اور عامل تجھ کو ضرور بلوائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔“

خدمت گار قصیدہ لے کر چلا گیا اور اس بار جنتی کو قبل از وقت یہ بھی سوچنا پڑا کہ قبضہ خانے سے نکلنے کے بعد وہ کہاں جانے گا اور کیا کرے گا۔

قصیدہ عشاء کی نماز کے بعد عامل کے حوالے کر دیا گیا اور عامل نے اسے پڑھا اور بہت متاثر ہوا پھر خدمت گار سے پوچھا۔ ”جنتی نے اس قصیدے کے علاوہ تجھے کوئی پیغام بھی دیا ہے؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”نہیں جناب! وہ اسی سے خوش ہو جائے گا کہ آپ نے اس کا قصیدہ پڑھا، پسند کیا اور اسے احتیاط سے محفوظ کر لیا۔“

اس قصیدے میں جنتی نے خوشامداندہ روش اختیار کی تھی۔ ”اے میرے آقا! آپ کا کام ہی دولت بخشا اور غلاموں کو آزاد کرتا ہے۔ میں آپ سے امید منتقل ہونے کے بعد اور اپنا گلاموت کے ہاتھ میں پہنچ جانے کے وقت آپ سے مدد کی درخواست کرتا ہوں میری حالت خستہ ہو چکی ہے اور میری ٹانگوں کو پیز یوں کے بوجھ نے کمزور کر دیا ہے۔ انجی سے مجھ پر حدود قائم کی جا رہی ہیں حالانکہ انجی مجھ پر نماز بھی فرض نہیں ہوئی ہے۔“

عامل کے لیے یہ بڑی عزت افزائی کی بات تھی کہ جنتی نے اس کی شان میں کئی اشعار لکھے تھے اور اس سے رحم کی

آخر کار اس نے رہائی کا ایک طریقہ سوچا مگر اسے اپنے اس طریقے کے سودمند ہونے کا یقین نہیں تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا بس وہ کافی غور و خوض کے بعد بھی سمجھ نہ سکا تھا کہ اس کی شاعری کا چرچا یہاں کے عامل تک ضرور پہنچا ہوگا اور اب اس کی شاعری ہی اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

قید خانے میں جو مختلف خدمات پر مامور لوگ تھے ان سے کام لینے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے ان آئے جانے والوں کو اپنا کلام سنایا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اس کی شاعرانہ عظمت سے واقف تھے مگر وہ جنتی سے اس لیے نا آشنا اور بے گانہ رہتے تھے کہ انہیں خوف تھا کہ اگر وہ جنتی میں دلچسپی لیں گے تو عامل ان پر عتاب نازل کرے گا مگر جب جنتی نے ان کو اپنا کلام سنا کے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ جنتی کے پاس ڈرتے ڈرتے بیٹھنے لگے اور اس کے کلام سے محفوظ ہونے لگے۔

جنتی نے کچھ دنوں بعد جب یہ سمجھ لیا کہ اب ان خدمت گاروں سے کام لیا جاسکتا ہے تو اس نے ایک خدمت گار سے رازداری سے پوچھا۔ ”دوست! تم دیکھ رہے ہو کہ وقت اور زمانہ مجھ جیسے یگانہ شاعر پر کیسے تم توڑ رہا ہے اور لوگ مجھ سے کس طرح بے مروتی سے پیش آ رہے ہیں۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”اے جنتی! ہم تو تجھے اپنے سر پر بٹھالیں مگر تو خلیفہ کا مستوب ہے اب اگر ہم تجھ سے اچھی طرح پیش آئیں گے تو خلیفہ ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ خلیفہ کی ملازمت نے ہمیں مجبور کر رکھا ہے۔“

جنتی نے پوچھا۔ ”میں تجھ سے ایک انتہائی معمولی کام لینا چاہتا ہوں وہ اگر کر دو گے تو مجھے اس قید خانے سے رہائی مل سکتی ہے اور اگر رہائی نہ ملی تو میں اپنی قسمت پر صبر کر کے تمہارا شکر گزار رہوں گا۔“

خدمت گار کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں یہ شاعر قید خانے سے فرار ہونے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہا ہے اور اسے اس منصوبے میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔

خدمت گار نے صاف صاف بات کر لی اور کہا۔ ”میں تیرا ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے میں خود معصیت میں پڑ جاؤں۔“

جنتی نے کہا۔ ”میں نے یہاں کے عامل کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے تو اس قصیدے کو عامل تک پہنچا دے اگر میرا کام بن گیا تو تجھ کو کچھ فائدہ ضرور پہنچیں گے۔“

خدمت گار کچھ دیر سوچتا رہا کہ شاعر کا قصیدہ عامل کو

حاصل کرے۔

سیف الدولہ نے پوچھا۔ ”یہ وہی جتنی ہے جس نے نجف کے جنوب میں سادہ والوں میں رہ کے ایک نئی خلافت کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر اپنے ارادوں کی تکمیل سے پہلے ہی وہ گرفتار ہوا اور قتل قید خانے میں پڑا رہا۔“

لوگوں نے اقرار کیا کہ ہاں یہ وہی جتنی ہے۔

سیف الدولہ نے خطرہ ظاہر کیا۔ ”یہ شخص یہاں بھی کوئی خرابی نہ پیدا کر دے۔“

لوگوں نے سیف الدولہ کے اثر و اقتدار کے حوالے سے بتایا۔ ”جتنی اس دربار سے وابستہ ہونے کے بعد سرکشی اور بغاوت کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ اس کے علاوہ قید خانے میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اسے سبق مل گیا کہ وہ بھی بھی اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

سیف الدولہ نے اظہار کیہ کے عامل ابوالعشار کو لکھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ جتنی تیرے دربار سے وابستہ ہو گیا ہے میں نے اس کا کلام دیکھا اسے میرے دربار میں ہونا چاہیے اس سے بات کر اور اس کو بتا کہ میں اسے اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہتا ہوں مگر وہ یہاں آنے کے بعد من مانی کرنے کے ارادے سے باز رہے۔“

ابوالعشار نے جتنی کو خوش خبری سنائی۔ ”اے جتنی! تیری خوش قسمتی تجھے بہت بلندی کی طرف لے جا رہی ہے خوش ہو جا کہ سیف الدولہ کو تیری ضرورت محسوس ہوئی اور تجھے حبل طلب کیا گیا ہے۔“

جتنی نے خود پسندی اور اپنی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر ابوالعشار سے کہا۔ ”تو نے مجھے میری خوش قسمتی کہا ہے میں اس وقت تک اسے اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھوں گا جب تک سیف الدولہ سے میری بات نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ مجھے اپنے دربار سے وابستہ کرے۔“

ابوالعشار نے پوچھا۔ ”تو سیف الدولہ سے کیا بات کرے گا تیرے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تجھے سیف الدولہ تیری خواہش اور درخواست کے بغیر اپنے دربار سے وابستہ کر رہا ہے۔“

جتنی نے جواب دیا۔ ”میں ایک خاص شرط سیف الدولہ کے سامنے رکھوں گا، اگر وہ اسے مان لے گا تو میں اس کے دربار سے وابستہ ہو جاؤں گا نہیں مانے گا تو میں تیرے ہی دربار سے وابستہ رہوں گا۔“

درخواست کی تھی چنانچہ عامل نے اسے معاف کر دیا اور اسے رہا کر دینے کے بعد اپنے ساتھ رکھا۔

قید خانے سے نکلنے کے بعد جتنی کی حالت بہت زیادہ خراب ہوئی کیونکہ جس جرم میں اسے قید کیا گیا تھا اس کی وجہ سے لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے اور احتیاط کرتے تھے کہ جتنی سے دور رہو کہیں سادہ والوں کی طرح جتنی انہیں بھی کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔

جتنی کی معاشی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ عامل نے بھی اس پر زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی کہ کہیں جتنی کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائے۔

جتنی دولت مندوں کی شان میں قصائد لکھتا اور ان سے انعام حاصل کر کے گزر بسر کرتا رہا۔ یہ انعام و اکرام بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ اغنیاء بہت زیادہ سختی اور فضول خرچ نہیں ہوتے۔

اسی دوران جتنی کی شہرت ہوتی چلی گئی اور قسمت نے یاوری کی، شام کا فرمانروا سیف الدولہ، جتنی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ عربی النسل حکمران تھا۔

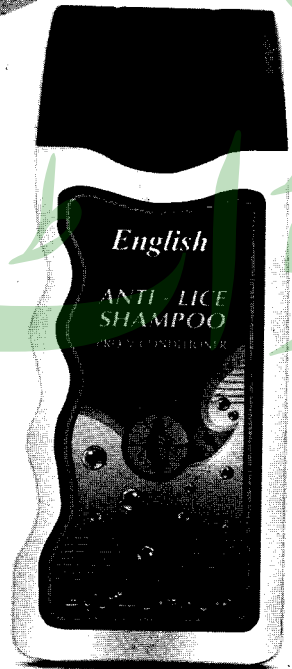
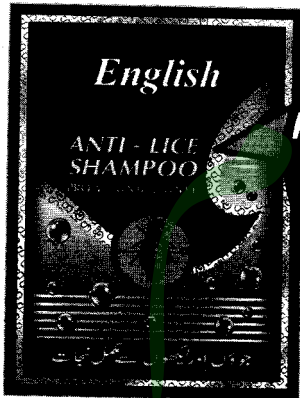
ان دنوں ایشیائے کوچک میں قیصر روم کی حکومت تھی اور سیف الدولہ اس پر حملہ آور ہوتا رہتا تھا اور اسے ان حملوں میں مسلسل کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔

سیف الدولہ علم و فضل کا بھی بڑا قدردان تھا۔ خود بھی نکتہ رخ تھا اس کے بارے میں مؤرخین کا متفقہ فیصلہ یہ رہا ہے کہ اس عہد کے شعراء اور مصنفین اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے سوا کسی اور کے دربار میں اتنا مجمع نظر نہیں آئے گا ابونصر فارابی اور حکایات آغاںی کا مصنف اسی کے دربار سے فیض یاب ہوئے۔ سیف الدولہ کے امراء میں ابوالعشار نامی ایک قدردان امیر تھا۔ جتنی نے اس کی مدح میں چند قصیدے لکھے اور اس کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

ابوالعشار سیف الدولہ کی طرف سے اظہار کیہ میں عامل کے فرائض انجام دے رہا تھا اور خود سیف الدولہ حلب میں رہتا تھا۔ لوگوں نے سیف الدولہ کو جتنی کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے اور پریشان حالی کی وجہ سے وہ ادھر ادھر بھٹک رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی حکمران اس کی سرپرستی کرے اور اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لے تاکہ یہ حکمران بھی جتنی کے قصیدوں میں موجود رہے اور اسی کی طرح شہرت دوام

English

سر نہ کُھجائیں ..  
Healthy ہو جائیں !



اصل کی پہچان  
HOLOGRAPHIC PRINT

5  
پانچ روپے اور لکھنوں سے کم قیمت

جتی نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں امیر سیف الدولہ سے ملوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا کلام امیر کو میری شرط ماننے پر مجبور کر دے گا۔“

ابوالعشائر نے حلب جانے کی تیاریاں کیں اور جتبی کو لے کر حلب چلا گیا۔

امیر سیف الدولہ کو خبر کر دی مئی کہ ابوالعشائر جتبی کو لے کر پہنچ چکا ہے اور بار پانی کا امیدوار ہے۔

اس وقت امیر کے دربار میں کئی لائق لوگ موجود تھے۔ ان سب کو جتبی سے ملے، دیکھے، باتیں کرنے اور اس سے اس کا کلام سننے کی آرزو تھی۔

ان دونوں کو امیر کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ درباریوں کی نظریں جتبی کی طرف تھیں۔ امیر نے بھی نیچے سے اوپر تک جتبی کو دیکھا اور اس کے بعد کسی تمہید کے بغیر جتبی کو حکم دیا۔ ”اپنا کلام سنا کہ میں فوراً فیصلہ کروں تجھے دربار میں بیٹھ کر اشعار سنانے کی اجازت دی جائے یا فوراً رخصت کر دیا جائے۔“

جتبی نے اس دربار کے لیے جو اشعار کہہ رکھے تھے انہیں امیر کے سامنے کھڑے ہو کر سنا دیا۔

اس کے کلام نے امیر کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کچھ دیر دم مسم رہا درباری بھی محروم معلوم ہوتے تھے۔

ابوالعشائر نے اس کیفیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ جتبی کا کام ہو گیا۔

جبھی کو امیر سیف الدولہ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کا انتظار تھا۔

امیر سیف الدولہ نے ہوش میں آتے ہی جتبی کی تعریفیں کیں اور ابوالعشائر کو بطور خاص مخاطب کیا۔ ”اے امیر ابوالعشائر! جتبی کا کلام اتنا پُر فضیلت ہے کہ اسے شرائط پیش کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا اور اسے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنا کلام سنانے کی اجازت دی گئی۔“

ابوالعشائر نے اطمینان کی سانس لی اور جتبی اپنی جگہ بے حد خوش تھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔

امیر سیف الدولہ نے سادہ اور وہاں کے قبیلے بنی کلب کا بطور خاص ذکر کیا اور پوچھا۔ ”اے جتبی! سادہ کا قبیلہ بنو کلب تو اپنی جرأت، شجاعت اور بہادری میں ثانی نہیں رکھتا تو نے ان سب کو جو عجیب و غریب دعوت دی گئی تو اس میں تجھے ناکامی کی وجہ کیا نظر آتی؟“

ابوالعشائر فکر مند ہو گیا کہ یہ عجیب و غریب شاعر معلوم نہیں کیوں ناز و خروش دکھا رہا ہے حالانکہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی کو ہی اپنی عزت افزائی سمجھتا۔

ابوالعشائر نے پوچھا۔ ”تو اپنی شرائط بتا میں سیف الدولہ کو وہ شرائط لکھ کر بھیج دوں گا اگر سیف الدولہ نے انہیں مان لیا تو میں تجھ کو خود اپنے ساتھ حلب لے جاؤں گا اور اگر امیر نے تیری شرائط درخور اعتنا نہ سمجھیں تو تو میرے پاس ہی پڑا رہے گا۔“

جتبی نے کئی شرطیں لکھ کر دے دیں ان میں ایک شرط ایسی تھی جو ابوالعشائر کے خیال میں سیف الدولہ کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ درباری شعراء اپنے قصائد اور اشعار دربار میں کھڑے ہو کر سنا تے تھے اور جتبی اسے اپنے لیے بے عزتی کی بات سمجھتا تھا وہ اپنی جگہ بیٹھ کے ہی قصیدہ یا اشعار سنانے کا خواہش مند تھا۔

ابوالعشائر نے جملہ شرائط سرسری نظر سے دیکھیں مگر بیٹھے بیٹھے قصیدے اور اشعار سنانے کی شرط پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”اے جتبی! تیری تمام شرائط قابل قبول ہو سکتی ہیں لیکن بیٹھ کے اشعار سنانے والی شرط امیر سیف الدولہ نہیں مانے گا۔“

جتبی نے کہا۔ ”مگر میں اس شرط کو مانے بغیر امیر کے دربار سے وابستگی کو قبول نہیں کروں گا۔“

ابوالعشائر نے ناپوی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے! میں تیری شرائط لکھ کر بھیج دوں گا اور وہاں سے جو جواب آئے گا اس سے تجھ کو آگاہ کر دوں گا۔“

ابوالعشائر نے جتبی کی شرائط لکھ کر امیر سیف الدولہ کو بھیج دیں اور یہ بھی لکھا کہ جتبی کو اپنی شاعرانہ عظمت اور فضیلت کا اتنا زیادہ احساس ہے کہ اگر اسے بیٹھ کر اشعار سنانے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ آپ کے دربار سے وابستگی کو گوارا نہیں کرے گا۔“

کچھ عرصہ بعد امیر سیف الدولہ کی طرف سے جواب آ گیا۔ اس نے ابوالعشائر کو لکھا تھا۔ ”تو جتبی کو اپنے ساتھ میرے پاس لے آجیے میں اس کا کلام سنوں گا اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ مجھے جتبی کی یہ شرط ماننا چاہیے یا نہیں۔“

ابوالعشائر نے امیر کا جواب جتبی کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ ”اب تو کیا کہتا ہے کیا تو میرے ساتھ حلب جانا پسند کرے گا۔“



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of  
your Favourite Paksociety's  
Update !**

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

**All Done**

Like Message

✓ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First  
See new posts at the top of  
News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow

مجتبیٰ اتنا ذہین تھا کہ اس نے ان فنون میں بھی کمال حاصل کر لیا۔ امیر سیف الدولہ، مجتبیٰ کے استادوں سے اس کے بارے میں پوچھتا رہتا اور وہ لوگ کہی بتاتے تھے کہ مجتبیٰ میں کیسے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔

مجتبیٰ دربار میں بیٹھے بیٹھے اپنے اشعار اور قصائد سناتا رہا اس وقت بھی امیر کا ذہن نہیں اور ہوتا۔ وہ دیکھنے میں یوں لگتا جیسے شاعری میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور کچھڑی پک رہی ہوئی، مجتبیٰ امیر سیف الدولہ کے دل و دماغ پر بری طرح چھا گیا تھا۔

امیر نے ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا اور مجتبیٰ سے پوچھا۔ ”اب تو تو مجی میرے ساتھ جہادوں میں حصہ لے سکتا ہے۔“

مجتبیٰ نے کہا۔ ”ہاں! امیر محترم اب میں بھی جہاد میں حصہ لینے کے لائق ہو چکا ہوں۔“

امیر سیف الدولہ نے ایشیائے کوچک پر حملہ آوری کی تیاریاں کیں تو مجتبیٰ کو پیش پیش رکھا۔ اس سے مشورے بھی کیے تو مجتبیٰ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے اشعار سے سپاہیوں میں گرمی اور جوش و خروش پیدا کر دوں گا۔“

امیر سیف الدولہ، مجتبیٰ کی مالی مدد کرتا رہا اور اسے اب اتنی آسودگی میسر آئی تھی کہ وہ اس کا اپنے شعروں میں ذکر کرنے لگا تھا۔ اس کے کئی اشعار خاصے مقبول ہوئے اور ان شعروں کو دوسروں کی زبانوں سے بھی سنایا گیا تو امیر سیف الدولہ کو بڑی خوشی ہوئی کہ مجتبیٰ اس کے دربار سے وابستگی کے بعد خوش حال زندگی بسر کر رہا ہے۔

کسی درباری نے بھی یہ شعر امیر سیف الدولہ کو سنائے۔ ”میں نے راتوں کا سفر اپنے پیچھے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جن کے پاس مال کی کمی ہے اور میں نے تیرے (امیر سیف الدولہ) کے احسانات کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو سونے کی نالیں لگوا دیں اور میں نے تیرے لطف و کرم کی وجہ سے اپنے آپ کو تیری محبت میں محصور اور مقید کر دیا اور جو بھی خود کو احسان کی بیزی میں پاتا ہے وہ قید ہو جاتا ہے۔“

دربار میں مجتبیٰ کے پہنچنے سے پہلے ابوالعباس نامی شاعر بڑا رسوخ رکھتا لیکن مجتبیٰ کی شاعرانہ محرکاریوں نے اس کا رنگ پیکا کر دیا۔

ابوالعباس کو جب بھی موقع ملتا مجتبیٰ کی عدم موجودگی میں امیر سے اس کی شکایت کرتا۔ ابوالعباس کو سب سے

مجتبیٰ نے سادہ کے ذکر سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”امیر اس خوشی کے موقع پر میرے تکلیف دہ ماضی کا ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”اگر تم نا تجربے کا رنہ ہوتے اور بنو کلب میں لائق اور دور میں چند افراد بھی ہوتے تو تم خلافت عباسیہ کے لیے مصیبت بن جاتے تم لوگوں نے اتنا بڑا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبے کے پیچھے تجربے اور فکر و تدبیر کی کمی تھی جس سے تم ناکام رہے اور مجھے حصص کے حامل امیروں نے قید خانے میں ڈال دیا۔“

مجتبیٰ نے دوبارہ درخواست کی۔ ”امیر محترم! مجھے اپنی اس حماقت پر آج بھی عداوت محسوس ہو رہی ہے۔“

امیر سیف الدولہ نے مجتبیٰ کی رنگ آمیز محبت نمایاں قدر و قامت اور شاندار ذلیل ڈول کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔ ”تجھے تو بہت اچھا سپاہی بھی ہونا چاہیے تھا، کیا تجھے فنون سپاہ گری بھی آتے ہیں۔“

مجتبیٰ نے جواب دیا۔ ”نہیں! خانہ بدوشوں میں رہ کر مار دھاڑ کی عادت تو پڑی مگر فنون سپاہ گری باقاعدہ سیکھنے کا نہ تو موقع ملا اور نہ وہاں کوئی ایسا ماہر فن تھا جس سے میں فنون سپاہ گری سیکھتا۔“

امیر سیف الدولہ نے پوچھا۔ ”اگر تجھے نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی کے ماہرین کے حوالے کر دیا جائے کہ تو ان سے سپاہ گری سیکھ لے تو تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

مجتبیٰ نے جواب دیا۔ ”یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں فنون سپاہ گری سیکھ کر مرد میدان بن جاؤں لیکن اسے امیر! مجھے تو اس دربار میں بحیثیت ایک شاعر جگہ دی گئی ہے پھر یہ آپ کے دل میں مجھے فنون سپاہ گری سکھانے کا خیال کیوں آیا۔“

امیر سیف الدولہ نے جواب دیا۔ ”تجھے نہیں معلوم کہ میں کبھی کبھی بھی جہاد کے لیے ایشیائے کوچک بھیجتا جاتا ہوں اور وہاں مجھے کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ میں تجھے سفرو و حضر میں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔“

مجتبیٰ کے لیے یہ اور زیادہ خوشی کی بات تھی کہ امیر اس سے اتنا خوش اور متاثر ہوا تھا کہ اسے سفرو و حضر میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

امیر نے مجتبیٰ کو فنون سپاہ گری کے ماہرین کے سپرد کر دیا کہ وہ اسے فنون سپاہ گری سکھائیں۔

شعر میں لفظوں کی جو مناسب بندش کی گئی ہے اس سے شعر دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور سننے والے کو عجیب سی کیفیت محسوس ہوتی ہے، تو بھی اقرار کرے گا کہ میں اس شعر کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کتنی صداقت موجود ہے۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”اے امیر! میں اس سے بہتر شعر کہوں گا اور آپ اس شعر کی بھی اسی طرح تعریفیں کریں گے۔“

لیکن امیر کے پاس سے اٹھنے کے بعد ابوالعباس کو یہ یقین ہو گیا کہ جتنی نے امیر کے دل و دماغ پر ایسا قبضہ جما رکھا ہے کہ اگر وہ جتنی کے اس شعر سے بہتر شعر کہے گا تب بھی امیر اس کے شعر کی تعریف نہیں کرے گا۔

کچھ دنوں بعد امیر سیف الدولہ بھی جتنی کے طور طریقوں سے آشنا گیا، اس کے دربار میں بدلتی بدلتی پیدا ہوئی اور اکثریت رشک و حسد میں مبتلا ہوئی، کچھ تو جتنی کی باتیں گوارہ کر رہے تھے اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے مگر اکثریت نے جتنی کے خلاف باتیں شروع کر دیں اور ان سب نے امیر سیف الدولہ کو مجبور کیا کہ وہ جتنی کی زبان کو لگام دے۔

امیر سیف الدولہ نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ بھی جتنی پر جوابی حملے کریں اور سب مل جل کے جتنی کو عاجز کر دیں۔

امیر کی اس اجازت کے بعد دربار میں بڑی بد مزگی پیدا ہو گئی ایک طرف جتنی تھا اور دوسری طرف جتنی کے حریف تھے اور ان سب نے اپنی مجموعی قوت سے جتنی کو عاجز کر دیا۔ وہ ان سب کا کب تک مقابلہ کرتا آخر جتنی نے سب کی امیر سے شکایت کی۔ ”اے امیر! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے درباری احمقوں اور زبان درازوں کی میری شان میں گستاخیاں برداشت کر لیں میں ذلیل و خوار ہوتا رہا اور آپ خاموشی سے میری ذلت گوارہ کرتے رہے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی عزت کروانے کا سلیقہ نہیں آتا تو نے بھی اپنی ان حرکتوں کا جائزہ لیا۔ تیرے رویوں سے دوسروں کو شکایتیں پیدا ہوتی رہیں اور میرے درباری معزز لوگ تیری زیادتیوں برداشت کرتے رہے۔ میں نے جس طرح تجھے آزادی سے بولنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی تیرے خلاف بولنے کی اجازت دے دی گئی اگر وہ تیرے حملے برداشت کرتے ہیں

بڑی شکایت یہ تھی کہ جتنی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتا اور اس کو مخاطب کیے بغور مڑ کر تا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ ابوالعباس یہ اذیت کچھ عرصہ جھیلتا رہا اسے جب بھی موقع ملتا وہ جتنی کی امیر سے شکایتیں کرتا اور کہتا۔ ”جتنی خود کو معلوم نہیں کیا سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کی بالکل عزت نہیں کرتا۔ آپ اس کو سمجھائیں کہ جب ہم اس کی عزت کرتے ہیں تو اسے بھی ہماری عزت کرنا چاہیے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”میں جتنی کو کیا سمجھاؤں جب کہ مجھے خود بھی یہ احساس ہے کہ وہ اپنے عہد کا بے مثال شاعر ہے لیکن افسوس کہ اس کی خود ستائی اور اس کے بے جا غرور نے مجھے کیا سبھی کو شکوہ شکایت پر مجبور کر دیا ہے، میں اسے سمجھا بھی دوں گا تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”ہم اسے اتنا بڑا شاعر نہیں مانتے جتنا وہ خود کو سمجھتا ہے ہم اس سے بہتر شعر کہہ سکتے ہیں۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”اے ابوالعباس! اس قسم کی باتیں مت کرو وہ واقعی اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے اور تم میں سے کوئی بھی شعر و شاعری میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

ابوالعباس نے زیادہ ہمت اور جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے اس کے کچھ اشعار سنائیں، ہم اسی موضوع پر اس سے بہتر اشعار کہہ دیں گے۔“

امیر سیف الدولہ مسکرایا۔ ”نہیں ابوالعباس! ایسا دعویٰ نہ کریں کہ اس کے جو اشعار میں تجھے سناؤں گا تو اس سے بہتر شعر نہیں کہہ سکے گا اور جب یہ تفصیل جتنی سنے گا تو تیرا بہت زیادہ مذاق اڑائے گا۔“

ابوالعباس کا اصرار جاری رہا۔ ”آپ اس کے کچھ اشعار سنائیں تو سبھی میں ان سے بہتر شعر کہہ دوں گا۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”میں صرف ایک شعر سناتا ہوں اگر تو اس کے جواب میں اس سے بہتر شعر کہہ سکا تو میں تجھے اس سے بہتر شاعر سمجھوں گا۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”آپ مجھے وہ شعر سنائیں تو سبھی۔“

امیر نے اس کو شعر سنایا۔ ”وہ فتح پر فتح حاصل کرتا ہے لیکن اس میں غرور نہیں پیدا ہوتا حالانکہ جب وہ لڑائی کے لیے چلا تھا تو کچھ تیاری بھی نہیں کی تھی۔“

سیف الدولہ نے یہ شعر سنانے کے بعد کہا۔ ”اس

بھائی کا مد مقابل سمجھے۔ امیر کا بھائی ہونے کے علاوہ وہ خود کو بہت بڑا شاعر بھی سمجھتا تھا۔

امیر سیف الدولہ نے خود تو اپنے بھائی سے کچھ نہیں کہا مگر ابو العباس کو مشورہ دیا کہ وہ ابو فراس کے ساتھ اس کی سرپرستی میں منتقلی پر حملے کرے گا تو اس کا اثر ہوگا۔

جب ابو فراس کو منتقلی کی مخالفت پر آمادہ کیا گیا تو اسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ منتقلی انتہائی خود پسند اور مغرور شاعر ہے اسی لیے وہ ابو فراس کے مقابل آنے پر اس کی بھی بے عزتی کر دے گا تو ابو العباس نے اسے بتایا کہ اس کا بھائی امیر سیف الدولہ بھی منتقلی سے عاجز آچکا ہے اور اس کی خواہش پر ابو فراس کو منتقلی کے مقابل لایا جا رہا ہے۔

منتقلی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کچھ شعر سنا لیے تو ابو فراس اپنے بھائی امیر سیف الدولہ کے پاس جا بیٹھا اور وہیں سے شعر سنانے شروع کر دیے۔ پورا دربار منتقلی کے شعروں پر خاموش رہا تھا مگر ابو فراس کے شعروں پر مدح ستائش کے ڈونگرے برسے۔ منتقلی کو اپنی بڑی بے عزت محسوس ہوئی۔ وہ دربار میں تو بالکل خاموش رہا مگر باہر نکل کے وہ ابو فراس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ امیر کے بھائی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

دربار سے رخصت ہونے والے شاعروں نے منتقلی کو راستے میں ٹھوڑے پر کسی کے انتظار میں دیکھا تو مسکراتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔

کچھ دیر بعد ابو فراس بھی اس کے پاس سے گزرا۔ منتقلی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا۔ ابو فراس کا ٹھوڑا اس کے برابر رک گیا۔

منتقلی نے پوچھا۔ ”اے ابو فراس! پہلے تو کبھی دربار میں تو نے آج کی طرح اپنے اشعار نہیں سنائے تھے۔ مجھے سچ سچ بتا کہ ایسا کس کی سازش سے ہوا۔“

ابو فراس نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو دوسرے شاعروں سے کر سکتا تھا۔ میں امیر سیف الدولہ کا بھائی ہوں۔ تجھے ہم دونوں کے اس رشتے کا احترام کرنا چاہیے۔“

منتقلی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”اے ابو فراس! دربار میں اگر تجھے امیر کے بھائی کی حیثیت سے آنا تھا تو تجھے اس کے پاس بیٹھ کے اپنے شعر نہیں سنانا چاہیے تھے تو کیا ہے اس عہد کے جملہ شاعروں کے بھی میرا مقابلہ کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ آج میں نے امیر کے خیال سے

تو تجھے بھی ان کی باتیں سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔“

منتقلی نے امیر کے ساتھ بھی گستاخانہ رویہ رکھا اور کہا۔ ”اے امیر! جب میں اس دربار میں بلایا گیا تھا تو میں نے آنے سے پہلے کچھ شرطیں رکھی تھیں اور آپ نے میری وہ شرطیں قبول کر لی تھیں، کیا اس دربار کا کوئی دوسرا شاعر میری جیسی آن بان سے اس دربار میں آیا تھا۔“

امیر سیف الدولہ نے منتقلی کو منع کیا کہ وہ ایسی گستاخانہ باتیں مت کرے، دربار میں دوسرے شاعروں کی بھی عزت کی جاتی ہے اور منتقلی کو آئندہ ان شاعروں کے خلاف گستاخی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

منتقلی نے کہا۔ ”اے امیر! یہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ نے مجھے دوسرے درباری شاعروں کے مساوی قرار دے دیا اب مجھے اس دربار سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔“

امیر سیف الدولہ کو منتقلی کی یہ باتیں گراں گزرتی رہیں اور اس نے منتقلی کے جانے کے بعد تمام دوسرے شاعروں کو اجازت دے دی کہ وہ بھی منتقلی کے ساتھ رو رعایت سے کام نہ لیں اور اس کے اشعار کا جی بھر کے مذاق اڑائیں۔

اب امیر کے دربار میں منتقلی کی وہ عزت نہیں رہی تھی جو کچھ دنوں پہلے پائی جاتی تھی۔

منتقلی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اشعار سنانا تو دوسرے شاعر بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے شعر سنانے لگے گویا اب اس کے دربار میں بھی شاعر مساویانہ دوچہر رکھتے تھے۔

یہ صورت حال منتقلی کے لیے کچھ دنوں تک گوارہ رہی مگر پھر وہ اتنا بے زار ہوا کہ دربار میں آنا جانا کم کر دیا۔ امیر نے دفتر مالیات کو ہدایت کی کہ اب تک منتقلی کو انعام و اکرام میں جو کچھ دیا جا چکا ہے اس کی تفصیل سے امیر کو آگاہ کیا جائے۔

دفتر مالیات نے حساب کتاب کر کے بتایا۔ ”دفتری حساب کتاب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ منتقلی کو چار برس کی مدت میں 35 ہزار اشرفیاں دی جا چکی ہیں۔“

امیر سیف الدولہ نے دفتر مالیات کو خفیہ حکم بھیجا کہ منتقلی کو آئندہ کچھ بھی نہ دیا جائے۔

امیر سیف الدولہ کا بھائی امیر ابو فراس بھی منتقلی کو ابھی تک اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ وہ خود امیر سیف الدولہ کے



علم ابوفراس کو کیونکر ہو گیا۔  
دفتر مالیات میں جتنی کے قدر دان موجود تھے اور  
وہیں سے اس کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ امیر سیف الدولہ نے  
کچھ دن پہلے اس شخص سے پوچھا تھا کہ چار سالوں میں جتنی کو  
کتنی رقم دی جا چکی ہے۔  
جتنی نے اپنے قدر دان سے اتنی تفصیل جاننے کے  
بعد فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔

سیف الدولہ کے دربار سے رخصت ہونے سے  
پہلے اس نے سیف الدولہ کی ناقدر دانی، نا انصافی اور اپنی  
خودداری کا اپنے قصیدے میں نہایت آزادی اور دلیری  
سے نظم کر دیا۔

اے سب سے زیادہ عادل بجز میرے معاملے کے  
تیرے ہی بارے میں نزاع ہے اور تو ہی دشمن تو ہی  
حالت ہے  
انسان کو آنکھ سے کیا حاصل اگر آنکھ تاریکی اور روشنی  
میں فرق نہ معلوم کر سکے (یعنی سیف الدولہ کو نیک و بد کی تمیز  
نہیں)  
مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحرا، تلوار، نیزے، کاغذ اور قلم  
سب پہچانتے تھے۔

کاش یہ بادل (سیف الدولہ) جہاں برستا ہے وہیں  
جا کر گر جتا بھی۔  
جب یہ قصیدہ دربار میں پڑھا گیا تو تمام درباری  
براہم ہو کر کھڑے ہو گئے۔

سیف الدولہ نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی لیکن  
اظہار کیے کے امیر ابوالعشار کو جتنی کی شکایت لکھ بھیجی کہ جتنی  
گستاخوں پر اتر آیا ہے۔  
ابوالعشار نے اظہار کیے سے دس آدمی جتنی کو سزا دینے  
کے لیے بھیج دیئے۔

سیف الدولہ کے محل کے باہران کی جتنی سے ٹڈ بھڑ  
ہو گئی۔ ایک نے جتنی کی باگ پر ہاتھ ڈالا۔ جتنی نے تلوار کا  
بھر پور وار کیا جو کان کو کاٹ کر ہاتھ تک جا پہنچا اور وہ زخمی ہو  
کر مر گیا بقیہ نے جتنی پر تیر برسائے لیکن جتنی صاف بخ کر  
نکل گیا۔

اب اس نے دمشق کا رخ کیا۔  
دمشق میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد قاہرہ پہنچا اور  
کا فور خواجہ سرا کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔  
کا فور اپنے مالک ابوبکر کے بعد یہاں کا حکمران ہو

تیرا لحاظ کیا لیکن آئندہ میں اس رشتے کا بھی لحاظ نہیں کروں گا  
اور تجھ سے بھی دوسرے درباری شاعروں کی طرح پیش  
آؤں گا۔“

ابوفراس کو بے حد غصہ آیا اور اس نے جواب دیا۔  
”تجھے دفتر مالیات سے تین ہزار اشرفیاں سالانہ مل رہی  
ہیں۔ میں نے اپنے بھائی کو بتا دیا ہے کہ یہ رقم بہت زیادہ  
ہے اتنی رقم میں بھائی کو بیس شاعر مل سکتے ہیں۔“

جتنی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”تب پھر تیرے  
بھائی نے مجھے کیوں تین ہزار اشرفیاں سالانہ پر رکھا ہوا ہے تو  
میں شاعروں کی بات کر رہا ہوں وہ میں شاعر تیرے جیسے  
ہوں گے بلکہ تیرے جیسے بیستیس شاعر میری جتنی قیمت میں  
مل سکتے ہیں۔“

ابوفراس غصے میں بے قابو ہو گیا اور کہا۔ ”اے جتنی!  
تجھے آسودگی اور عزت افزائی راس نہیں آ رہی ہے، کیا تجھے  
سامہ کے قاتل یاد آ رہے ہیں جہاں لوگ تجھ سے تیرے شعر  
تو سنستے تھے مگر انعام میں کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ وہاں بھی  
تیری انا، غرور اور خود پسندی نے تیرا دماغ خراب کر دیا تھا  
اور تو ایک نئی خلافت وجود میں لانا چاہتا تھا اس کی ناکامی  
میں تجھے قید خانے کی ہوا کھانا پڑی اور تو ایک عرصے بیڑیاں  
پہننے قید خانے میں پڑا رہا۔“

جتنی نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہا۔ ”خدا کے لیے اب کچھ  
نہ کہتا میرے دماغ کی رگیں پھول رہی ہیں اور میں غصے  
سے پاگل ہو جاؤں گا، تم لوگ مجھے سچ بتاؤ کہ کیا میں اس  
دربار کو چھوڑ کر نہیں اور چلا جاؤں؟“

ابوفراس نے کہا۔ ”تو دوسروں کی عزت نہیں کرے گا  
تو دوسرے تیری عزت کیوں کریں گے میں تجھے یہی مشورہ  
دوں گا کہ تجھے اب کسی اور دربار کا رخ کرنا چاہیے تو نے مجھ  
سے جھگڑا کر کے اپنے لیے اچھا نہیں کیا میں تجھ سے کمزور  
شاعر نہیں ہوں اور میں تیری شاعرانہ عظمت کو خاک میں ملا  
دوں گا۔“

جتنی کے لیے اب یہ ماحول ناقابل برداشت ہو گیا  
تھا اس نے ابوفراس سے باتیں کرنے کے بعد یہ اندازہ لگا  
لیا تھا کہ اس کے پیچھے سیف الدولہ کی مرضی اور خواہش کار  
فرمانظر آ رہی ہے آخر ابوفراس کو یہ بات کس نے بتائی کہ جتنی  
کو سالانہ تین ہزار اشرفیاں مل رہی ہیں۔

جتنی نے دفتر مالیات سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی  
کہ وہاں سے اسے جو کچھ ملتا رہا ہے اس کی درست تفصیل کا

### جدید سکھ مت

اگرچہ دنیا کے بیشتر حصوں میں سکھ برادریاں موجود ہیں۔ البتہ جدید سکھ مرکزی طور پر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ جدید سکھ مت کے مرکزی ڈھانچے میں تین فرقے ہیں۔ ہر فرقہ نانک کی مرکزی تعلیمات کو قبول کرتا ہے۔ گرنٹھ کو مقدس مذہبی تحریر مانتا اور دس گروؤں کو الہام یافتہ سمجھتا ہے۔ پہلا فرقہ اداسی کہلاتا ہے اور یہ بنیادی طور پر مقدس افراد کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سکھ بہت سے ایسے اصولوں اور قواعد پر عمل کرتے ہیں جو ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے مرتاضوں کے ہاں بھی نافذ العمل ہیں۔ وہ بیشتر مجرد رہتے اور بدھ بخشوں کی طرح کھردرے پہلے کپڑے پہنتے یا جین جوگیوں کی طرح برہمنہ پھرتے ہیں۔ ان کی زیر ملکیت واحد شے مشکول ہے۔ عموماً وہ سرگرم مبلغین ہوتے ہیں اور دیگر عقائد رکھنے والوں کو اپنے مذہب سے متعارف کرانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اداسیوں کو نانک پتر بھی کہتے ہیں۔ گرو نانک کا سب سے بڑا بیٹا ان کا جد امجد تھا جسے گرو امراداس نے برادری سے خارج کیا تھا۔ وہ گرو گوہند کے گرنٹھ کو مسترد کرتے جب کہ گرو نانک کے ادی گرنٹھ کو مانتے تھے۔ سکھوں کا دوسرا فرقہ سیچ دھاری سکھ (ست رو) ہے۔ بحیثیت سکھ ان کی ترقی گوہند سکھ سے پہلے بعض مواقع پر ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جارحیت پسندی کو مسترد کرتے ہیں جو کہ زیادہ تر سکھ مت کی خصوصیت بن چکی ہے اور داڑھی منڈوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

انقباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا لیس مور  
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

کیا تھا حالانکہ پہلے یہ اس کا غلام تھا۔  
جتنی چاہتا تھا کہ کافور اسے کسی صوبے یا ضلع کی حکومت دے دے تو وہ آزادانہ زندگی بسر کرے اور اسی امید میں اس نے کافور کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا مگر اس قصیدے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

کافور نے صلے میں گراں قدر انعام دے دیا۔  
کچھ دنوں اسی طرح کام چلتا رہا مگر کافور کو انعام و اکرام کے علاوہ کسی قلعے یا صوبے کی حکومت دینے میں اس لیے تامل تھا کہ جتنی کی حوصلہ مندی کے قصے سن چکا تھا۔ اس لیے اب تک وہ اسے اپنے دربار میں صرف شاعر کی حیثیت سے رکھے ہوئے تھے۔

جتنی درباری یکسانیت سے عاجز آگیا اور اس نے اپنی خواہشات کا اظہار ایک قصیدے میں کر دیا۔

”جو خدمت چاہیں میرے سپرد کردیں کیونکہ میں آدمی کی صورت میں شیر ہوں۔ میرا دل بادشاہ کا دل ہے گو میری زبان شاعروں کی ہے۔“

ایک دوسرے قصیدے میں لکھا۔  
”اے کافور! پیالے میں کچھ باقی بھی ہے جو میرے کام آئے۔“

بڑی دیر سے میں گار ہا ہوں اور تو پی رہا ہے۔  
تو نے جو دیا وہ زمانے کے ہاتھوں کے انداز سے دیا۔

لیکن میں تو تیرے ہاتھ کے اندازے سے چاہتا ہوں۔

اگر تو نے مجھ کو کوئی جاگیر یا کہیں کی حکومت نہ دی تو تیری سخاوت مجھ کو کپڑے پہنانے کی اور دربار کی حاضری اس کو مجھ سے چھین لے گی۔“

اس قصیدے نے بھی کافور کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور جتنی کو یقین ہو گیا کہ اسے اس دربار سے کوئی جاگیر نہیں ملے گی۔ اس نے دربار میں جانا چھوڑ دیا اور کافور سے تعلقات منقطع کر لیے۔

کافور کو یہ باتیں گراں گزریں اور اس نے جتنی پر پھرے بٹھا دیئے کہ اسے کہیں جانے نہ دیا جائے۔

دربار میں جتنی کے خلاف کافور جو باتیں کرتا جتنی کے ہمدرد نہیں جتنی تک پہچانا چاہتے مگر کافور کے خوف سے وہ جتنی کے پاس نہیں گئے۔

جتنی نے خود کو پھرے میں گھرا ہوا دیکھا تو اس نے

شیراز جانے کا ارادہ کیا یہ عہد الدولہ کا پایہ تخت تھا اور یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اس کے دربار یوں میں محمد بن الحمید بذات خود صاحب علم و فن تھا اور علم و فن کا نہایت قدردان بھی۔

اسے بتایا گیا کہ متنبی مہملی سے ناراض ہو کر اس کے پاس آ رہا ہے اور متنبی نے مہملی کی بہت بے عزتی کی ہے۔ ابن الحمید گھبرایا کہ کہیں یہ شاعر اس کے ساتھ بھی مہملی کی طرح نہ پیش آئے۔

اس نے متنبی کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کا نام حقارت سے لینا شروع کر دیا۔ وہ متنبی کی برائیاں کرتا رہا لیکن ایک دن ابن الحمید کے دربار یوں میں کسی نے اس کو نہایت مقوم اور اداس سر جھکا ئے بیٹھے ہوئے دیکھا۔

درباری نے پوچھا۔ ”حضور والا! بہت متفکر نظر آ رہے ہیں خیریت تو ہے۔“

ابن الحمید نے جواب دیا۔ ”کئی دن پہلے میری بہن کا انتقال ہوا اور اب تک اس کی تعزیت میں میرے پاس ساتھ خیمہ آچکے ہیں اور ہر خط متنبی کے کسی شعر سے شروع ہوتا ہے ایسے شخص کی شہرت کو میں کس طرح مٹا سکتا ہوں۔“

ان دنوں ابن الحمید فرزدین کے ارجان نامی قلعے میں مقیم تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ متنبی اس کے پاس آ رہا ہے تو وہ قلعے سے نکل کر آبادی سے دور ایک جگہ قیام پزیر ہوا اور متنبی کا انتظار کرنے لگا۔

ابن الحمید کے قریب پہنچنے کے بعد متنبی نے اپنا ایک غلام ابن الحمید کے پاس بھیجا۔

اس وقت ابن الحمید سونے کی تیاری کر رہا تھا اور اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ متنبی آچکا ہے تو وہ کھڑا ہو گیا اور نہایت حیرت سے پوچھا۔ ”کیا واقعی متنبی یہاں تک آ گیا؟“

متنبی کا غلام ابن الحمید کے سامنے پیش کر دیا گیا اور ابن الحمید نے اپنے خاص حاجب کو متنبی کے استقبال کے لیے بھیجا۔

یہ صاحب بھی خوب تھا کہ اسے راستے میں جو بھی ملا اس کو اپنے ساتھ لے لیا اور پھر متنبی اس کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا اسے فوراً ابن الحمید کے سامنے پہنچایا گیا اور ابن الحمید نے اس کی بے حد تعظیم کی اس نے پہلے سے اپنے قریب ہی متنبی کے لیے کرسی بچھوا دی تھی اس کرسی پر کھواب کا گدا پڑا ہوا تھا۔

کافور کی ہجو لکھ دی۔ ”یہاں ایک خواجہ سرافراری غلاموں کا امام ہے۔ آزاد غلام بن گئے اور غلام معبود بن گیا ہے۔ میں یہ نہیں خیال کرتا تھا کہ میں ایسا زمانہ دیکھوں گا۔ جس میں ایک کتا مجھ کو ستائے اور پھر مجھ کو اس کی تعریف کرنی پڑے۔“

اب متنبی کو یقین ہو چکا تھا کہ اس جگو کے بعد وہ مصر میں نہیں رہ سکے گا۔

اس نے یہاں سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے آدمیوں کے ذریعے راستے میں جگہ جگہ ہتھیار دیوا دیئے۔

دس دن کی خوراک اپنے ساتھ لی ادنیوں پر پانی کے مشکیزے رکھوائے اور مسلح غلاموں کے ساتھ عید کے دن مصر سے فرار ہو گیا۔

کافور کو خبر ہوئی تو ہر طرف، ناکا بندیاں کروا دیں راستے میں آباد عرب قبائل کو قاصد دوڑا دیئے گئے کہ متنبی جہاں ملے اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دیا جائے۔

راستے میں غلاموں نے بے وفائی کی اور اس کا ساتھ چھوڑ گئے لیکن متنبی کو فتنے میں کامیاب ہو گیا۔

کچھ دن کو فتنے میں قیام کرنے کے بعد وہ بغداد چلا گیا اس زمانے میں بغدادیوں (ایرانیوں) کے زیر اثر تھا اور مہملی، معز الدولہ کا وزیر تھا۔ متنبی نے اس کے دربار میں حاضری دی اور کئی دن تک مہملی اس انتظار میں رہا کہ متنبی اس کی شان میں کوئی قصیدہ لکھے گا لیکن متنبی نے ایک شعر بھی اس کی مدح میں نہیں کہا۔

مہملی نے دوسرے شاعروں کو متنبی کے پیچھے لگا دیا کہ وہ سب مل کے متنبی کا مذاق اڑائیں۔

متنبی اپنی جھوٹے دوسرے شاعروں کے اشعار سن رہا مگر کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے حامیوں نے کہا۔ ”اے متنبی! یہاں کے بہت سے شاعر تیری جھوٹے اشعار کہہ رہے ہیں تو ان کا جواب کیوں نہیں دیتا۔“

متنبی نے اپنا ایک شعر سنایا۔ ”اسے میں اپنے ایک شعر میں کہہ چکا ہوں۔ اب سب شاعروں کے جھوٹے اشعار کا جواب میرے اس شعر میں موجود ہے۔“

”جب کم درجے کے لوگ میری برائیاں بیان کریں تو یہی دلیل ہے کہ میں کامل ہوں۔“

بغداد میں اپنی ناقدر دوانی دیکھ کر اس نے فارس اور

منتہی نے اجازت دے دی اور ابن الحمید نے منتہی کی مجبوریاں اور شرائط عقد الدولہ کو لکھ کر بھیج دیں۔  
چند دنوں بعد عقد الدولہ کا جواب آ گیا۔ ”منتہی کو ہر بات کا پورا اختیار ہے گا۔“

اب منتہی کو ابن الحمید کی محبت چھوڑ کر عقد الدولہ کے پاس جانا پڑا۔

ابھی شیراز بارہ میل دور تھا کہ عقد الدولہ کا ابو عمر صباغ نامی نمائندہ منتہی کے استقبال کو پہنچ گیا۔

دونوں ایک ساتھ شیراز کے لیے چل پڑے۔ راستے میں صباغ نے فرمائش کی۔ ”اے منتہی! تو نے مصر کے کانور سے متعلق حقیقت پر مبنی کوئی قصیدہ لکھا تھا اگر اس کے چند اشعار راستے میں مجھے سنا دیے جائیں تو میرے لیے یہ بات بڑے فخر کی ہوگی۔“

منتہی نے قصیدہ مصر سنا دیا۔

شیراز میں منتہی کے لیے پہلے سے ایک آراستہ مکان تیار رکھا گیا تھا وہ کئی دن تک سفر کی تکان دور کرتا رہا۔ اس کے بعد عقد الدولہ کے دربار میں حاضری دی۔ یہاں دربار میں پیش ہونے والوں کو سخت شامی کے متصل با انداز کو بوسا دینا پڑتا تھا۔ منتہی نے بھی درباری قاعدے کے مطابق بوسا دیا اور گھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سواری کا ممنون ہوں جو مجھ کو یہاں تک لائی۔“

عقد الدولہ نے گر بخوشی سے سفر کے حالات پوچھے اور دونوں میں کچھ دیر گفتگو ہوئی رہی۔

کچھ دنوں کے بعد منتہی قصیدہ لکھ کر لے گیا اور درباری قاعدے کے مطابق گھڑے ہو کر قصیدہ پڑھنا چاہا لیکن عقد الدولہ نے اس کو پیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا۔ ”تو پیٹھ کے قصیدہ سنا سکتا ہے۔“

منتہی نے طلب ملنے والی عزت افزائی سے بہت خوش ہوا اور قصیدہ سنا تا رہا۔

عقد الدولہ نے انعام میں عنبر، منک، عود، اسپ خاصہ، کتواب کے استری چادر، امامہ جس کی قیمت پانچ ہزار دینار تھی، ہندوستانی مرصع تلوار جس کا قبضہ سونے کا تھا ان سب کے علاوہ اثریوں کے توڑے صلے میں دیئے۔

منتہی کی یہ قدردانی سابقہ قدر دانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن یہاں منتہی کے کلام میں پہلے جیسا زور نہیں پایا جاتا تھا۔ عقد الدولہ نے بھی اسے محسوس کیا اور اس نے کسی سے کہا۔ ”جب تک منتہی عرب میں رہا اس کے

ابن الحمید نے بے ساختہ کہا۔ ”میں تجھ سے ملنے کا بے حد مشتاق تھا۔“  
منتہی نے ابن الحمید کے خلوص کا جواب چند اشعار میں دیا۔

بدوؤں سے میرا یہ پیغام کون جا کر کہے گا  
کہ میں نے ارسطو اور سکندر دونوں کو دیکھا  
میں نے بطلیموس کو درس دیتے سنا  
جو فرماں روا بھی ہے بدوی بھی اور شہری بھی  
دونوں گرم جوشی سے در تک باتیں کرتے رہے۔

ابن الحمید نے منتہی کو خوش رکھنے کے لیے اس کی شامگروئی اختیار کی۔ منتہی نے خاص اپنی تحقیق اور بھان بین سے ایک مجموعہ لغت مرتب کیا تھا۔ ابن الحمید نے منتہی کے اس مجموعہ لغت کو پڑھا اسی دوران ابن الحمید کی طرف سے خدمت اور تحائف کے علاوہ پچاس ہزار اشرفیاں منتہی کی خدمت میں پیش کیں۔

فارس و شیراز کے بادشاہ عقد الدولہ کو یہ خبر پہنچی کہ منتہی نے ابن الحمید کی مصاحبت اختیار کر لی ہے تو اس نے ابن الحمید کو لکھا۔ ”منتہی کو میرے پاس بھیج دیا جائے۔“  
شامی فرمان منتہی کے سامنے رکھ دیا گیا اور منتہی نے اسے پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔ ”مجھی میری کیا قدر کریں گے۔“

ابن الحمید نے جواب دیا۔ ”عقد الدولہ مجھ سے ہر بات میں پڑھا ہوا ہے۔“

منتہی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس شامی فرمان سے خوش نہیں ہے۔

ابن الحمید نے اصرار کیا۔ ”اے منتہی تجھے اس فرمان کی تعمیل میں عقد الدولہ کے پاس جانا پڑے گا۔“

منتہی نے حقارت سے جواب دیا۔ ”میں بادشاہوں کی ملاقات سے تنگ آچکا ہوں۔ میں تو ان کو بتانے دوام کا تاج پہنا دیتا ہوں اور وہ مجھے صلے میں ایسی چیزیں دیتے ہیں جو میرے پاس چار دن بھی نہیں ٹھہریں اس کے علاوہ میں ایک جگہ جم کر قیام نہیں کر سکتا جب کہ سلاطین مجھ کو قیام پر مجبور کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجھے بڑی بے لطفی سے قطع تعلیق کرنا پڑتا ہے۔“

ابن الحمید، منتہی کی باتوں پر کچھ دیر غور کرتا رہا اور اس کے بعد کہا۔ ”میں تیری یہ ساری باتیں اگر تو مجھے اجازت دے تو میں عقد الدولہ کو لکھ کر بھیج دوں۔“



علاوہ وہ بخیل بھی تھا اس نے فائک اسدی کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جب تک یہ میرے ہاتھ میں ہے میں آسمان کے نیچے کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔“

فائک اسدی نے کوئی جواب دیئے بغیر ابھی اختیار کی اور اپنے قبیلے میں پہنچ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”میں نے تو جتنی کڑی بہت عقل مند سمجھا تھا مگر وہ بخیل ہونے کی وجہ سے اسحق بھی ہے۔“

فائک اسدی اپنے ستر آدمیوں کے ساتھ چھپ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہی جتنی سانسے سے گزرا تو یہ سب اس پر حملہ آور ہو گئے۔

جتنی نے دیک لڑتا رہا اور جب اسے اپنی شکست نظر آئی تو جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی۔

لیکن جتنی کے غلام نے اس وقت اس کا یہ شعر سنایا ”مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحرا، جنگ و جدل، کاغذ اور قلم سب پہنچاتے ہیں۔“

یہ شعر سن کر غلام نے کہا۔ ”اب اگر آپ شکست اٹھا کے بھاگ کھڑے ہوئے تو اس سے آپ کی بڑی بے عزتی ہوگی۔“

وہ آخر تک لڑتا رہا اور مارا گیا۔

اس کی دولت پر فائک اسدی کا قبضہ ہو گیا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جتنی نے کبھی اس کے قبیلے کی جوکھی تھی۔

جتنی کے ساتھ اس کا بیٹا اور غلام بھی مارا گیا۔

جتنی کا لغوی معنی نبوت کے دعوے دار کے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ کبھی اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنالیا تھا۔ جب اس سے یہ کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ وآلہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ”لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) پھر تو نبوت کا دعویٰ کیوں کر رہا ہے؟“

”جتنی نے جواب دیا کہ میرا نام آسمان میں لا ہے اور آنحضرت نے فرمایا تھا کہ میرے بعد لانا ہی محض نبی ہوگا۔“

اس دعوے کے بعد اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور جب اس نے توبہ کر لی اور نبوت کے دعوے سے دستبردار ہو گیا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔

لیکن کئی نعمانی اسے یاروں کا لقیہ قرار دیتے ہیں۔

کلام میں بلا کا زور پایا جاتا تھا۔“

جتنی نے جب کسی سے عضد الدولہ کی یہ بات سنی تو کہا۔ ”جیسے مخاطب ہوتے ہیں ویسا ہی شعر بھی کہا جاتا ہے۔“

اب جتنی کا دل یہاں سے بھی اچاٹ ہو گیا۔

عضد الدولہ کو معلوم ہو گیا کہ جتنی اس کی کسی بات سے ناخوش ہے اس نے کسی کے ذریعے جتنی سے معلوم کیا۔

”اے جتنی! سچ بتا کہ تجھے عضد الدولہ سے جو بخشش اور انعام مل رہا ہے وہ گراں قدر ہے یا سیف الدولہ کا عطا کیا ہوا انعام واکرام۔“

جتنی نے جواب دیا۔ ”یہ عضد الدولہ نے ابھی تک جو مجھے دیا ہے وہ نہایت گراں قدر اور عظیم تر ہے لیکن میں نے اس میں کچھ تکلف بھی محسوس کیا ہے جب کہ سیف الدولہ کی بخشش میں اس کا اندرونی جوش و جذبہ محسوس ہوتا تھا۔“

جب جتنی کا یہ جواب عضد الدولہ کے گوش گزار کیا گیا تو اسے بے حد غصہ آیا مگر اس نے اپنے وعدے کے مطابق جتنی کو شیراز میں قیام کیے رہنے پر مجبور نہیں کیا۔

جتنی نے ایک دوا کی قعیدہ لکھا اور عضد الدولہ سے رخصت ہو کر گونے روانہ ہو گیا۔

ابو اوزبک کے قیام کیا راستے میں تیز بارش ہو جانے کی وجہ سے اس کا سامان بھیک گیا تھا اور کپڑے بھی نم ہو گئے تھے۔

یہاں اس نے صندوق کھولا کر کپڑے دھوپ میں پھیلا دیئے میدان میں رنگ برنگے پیش قیمت پھیلے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف چمن زار مائل گیا ہے۔

یہیں کہیں قریب ہی بدوؤں کا سردار فائک اسدی اپنے قبیلے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ جتنی بھی یہاں آرام کر رہا ہے تو وہ جتنی سے ملنے کے لیے آیا۔

جتنی نے فائک اسدی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

فائک اسدی نے نہایت ادب سے درخواست کی۔ ”اے جتنی! آگے راستہ خطر ہے اگر آپ کہیں تو میں اپنے قبیلے کے کچھ آدمی آپ کے ساتھ کچھ دوسرے آپ ان کو ان کی خدمت کے صلے میں کچھ انعام دے دیجیے گا۔“

جتنی کو اپنی بہادری اور سپاہ گری پر ناز تھا اس کے



## آشفہ سیر

زین مہدی

برصغیر میں اردو شاعری کو آج پر پہنچانے میں کوشاں شعراء میں ایسے کئی نام ہیں جنہوں نے آزادی کے بعد انتھک کوشش کی اور اردو ادب کا دامن لبالب بھر دیا۔ انہی میں سے ایک بڑا نام علامہ جمیل مظہری کا بھی ہے جنہوں نے اپنا جہان خود پیدا کیا۔

اردو کے ایک بڑے شاعر کا تذکرہ خاص

انہی میں سے ایک بزرگ سید سالار غازی تھے جن کی سرکردگی میں غازی پور کا علاقہ فتح ہوا جو آج بھی مشرقی یوپی میں ایک مردم خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ انہی سید سالار کی نسل میں ایک بزرگ سید تاج الدین گزرے ہیں جن کے نام سے قصبہ تاج

سادات موسوی مدینے سے نکل کر بغداد اور وہاں سے ایران کے علاقے سبزوار پہنچے۔ سبزہ دار سے ان کی اولادیں دوسرے ممالک میں پھیلیں ان میں سے کچھ ہندوستان آئے اور شاہان دہلی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

آنکھوں سے ادھر ہی دیکھنے لگے کچھ دیر تک گھوڑے کی ٹاپ سنتے رہے پھر پکار کر کہا ”خان صاحب! گھوڑے کا پچھلا پیر غلط پڑ رہا ہے۔“ خان صاحب نے دھیان نہ دیا سمجھے کہ مولوی آدمی پھر اندھے گھوڑے کی چال کیا سمجھیں گے خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ قصداً انہوں نے پاؤں ٹھیک کر کے اگلا پاؤں بگاڑ دیا۔ مولانا نے فوراً ٹوکا، اب اگلا پاؤں بگاڑ رہا ہے۔ خان صاحب گھوڑے سے کودے اور مولانا کے پیر پکڑ کر بولے ”مولوی صاحب! ہم تو آپ کو ناپینا سمجھتے تھے مگر آپ تو روشن ضمیر ہیں۔“

مولانا نے مسکرا کر کہا ”میاں! خدا نے آنکھوں کے ساتھ کان بھی دیے ہیں۔ میں آنکھوں کا کام کان سے لے رہا ہوں!“

مولانا مظہر حسن کے بارے میں نواب علی خان کا کہنا تھا کہ اکبر کے پاس نورتن تھے میرے پاس ایک اور یہ ایک رتن ہی نو کے برابر ہے۔ مولانا کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ فقیہوں سے حساب سننے اور زبانی میزان کر کے حساب کی غلطی پکڑ لیتے، بیٹے کو خود پڑھاتے اور بتاتے جاتے دیکھو فلاں صفحہ کی فلاں سطر کے سامنے حاشیہ پر فلاں نوٹ لکھا ہوا ہے پڑھو۔ حالانکہ کتابوں سے الگ ہوئے چالیس سال گزر گئے تھے۔ وہ حاشیہ کے الفاظ پڑھتے تو بے حد دھیان سے وہی الفاظ ملتے۔

فن تاریخ نگاری میں بھی انہیں ملکہ حاصل تھا کہ مختلف مصنوعات کے ساتھ تاریخ نکالتے، ایک ایک فقرے سے اشارہ اشارہ طریقے سے مادہ ہائے تاریخ نکالتے۔ دیگر اصناف سخن میں قیدے، مثنوی، مرعبے، رباعیاں، قطعے، سلام اور نوے کہتے۔ ان کے بیٹے مولانا خورشید حسین خورشید کو بھی وراثت میں فکر و فن کا شوق ملا اور وہ اپنے بڑے بھائی سید اطہر علی اطہر کی طرح خوش گوشا شاعر ثابت ہوئے۔ مولانا خورشید حسین کی شادی ہادی علی خان ڈپٹی مجسٹریٹ مظہر پٹنہ کی بیٹی سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے یا تیسرے سال کیم جنوری 1905ء ان کے لطن سے منسلوڑہ میں میر کاظم علی پیدا ہوئے۔ کاظم علی کی والدہ سب سے چھوٹی تھیں اس لیے اپنے گھر والوں کو زیادہ پیاری تھیں اور بچے میں ہی زیادہ وقت گزارتی تھیں لیکن جب کاظم علی چار سال کے ہو گئے تو انہیں ان کی دادی نے اپنے پاس بلا لیا۔ اب وہ دادی کے پاس ہی رہنے لگے۔ (کاظم علی کی سن پیدائش میں اختلاف ہے۔ وفادار شدی نے ”شاعر“، ”گرہ شمارہ“ اپریل 1946ء میں 1904ء جب کہ رضا مظہر نے ”سہیل“، ”کیا بھارت کے جیل مظہر“ نمبر

پورا یاد ہوا جو غازی پور سے دو تین انٹیشن کے فاصلے پر آباد ہے۔ سید تاج الدین کی اولاد اس آس پاس کی بستیوں میں منتشر ہوئیں ”نومبرہ پارہ“ کامون پور، ڈکری پور وغیرہ چند ایسی بستیاں ہیں جہاں ان کی نسل کے سادات آباد ہیں۔ انہیں خاندان میں سے ایک خاندان مولانا سید ریاض الحسن کا تھا جو شہر غازی پور کے محلّ قاضی ٹولہ میں آباد ہوا۔ محلّہ گلزار باغ پٹنہ کی مشہور مخیر خاتون امام باندی بیگم نے اپنے شوہر کی تربیت دینی اور مسجد کی امامت کے لیے منتخب کیا اور وہ تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے دو صاحب زادے سید فیاض حسن اور سید مظہر حسن اور ایک صاحب زادی تھیں۔ سید فیاض حسن بھی عرصہ تک عظیم آباد میں ملازم رہے۔ سید مظہر حسن نے اپنے والد مرحوم کا علم اور ذوق شعر و ادب ورش میں پایا جسے زمانہ تعلیم میں لکھنؤ اور شاہراہ (کلکتہ) کے قیام نے اور اس کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کی علم پرور فضا نے جلا بخشی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی جب وہ لکھنؤ میں تھے ان کی قوت بصارت چھین گئی، صرف 32 سال کی عمر میں وہ نابینا ہو گئے۔

انہی مولانا سید مظہر حسن کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ حسین آباد شیخ پورہ ضلع موکیر بھار کے نواب علی خان کی ریاست کے وہ مدار الحام تھے اور ان کی آنکھیں بے نور تھیں مگر فاضلی میں ملکہ حاصل تھا۔ کبھی کبھی ریاضوں کو بھی دیکھ لیتے اور زبانی نغے بتا دیتے یا پھر مصاحبین و احباب سے خوش گپوں میں وقت گزار دیتے۔ اس دن بھی وہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب آئے کچھ دیر باتیں کیں اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایک ہم نشین نے پوچھا ”مولانا! آپ کچھ متفکر ہو گئے تھے۔“

انہوں نے جواب دیا کہ ابھی جو صاحب اٹھ کر گئے ہیں ان کی آواز کی نقابت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہفتہ دو ہفتہ کے مہمان ہیں۔ سوال کرنے والے نے استہزاء کیا کہ مولانا! آپ کی بھی باتیں وہ تو اتنی اچھے خاصے بٹے کئے ہیں۔ اس وقت تو بات آگئی کہ ہو گئی مگر دسویں دن خبر آئی کہ جن صاحب کے متعلق انہوں نے حکم لگایا تھا ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے کہ مولانا سید مظہر حسن قبلہ چھڑی کھیتے چلے جا رہے تھے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ ان کی آنکھوں کا کام حسیں کرتی ہیں اس لیے نابینا کیلئے جاتے دیکھ کر بھی کسی نے ٹوکا نہیں۔ راستے میں ایک میدان تھا اس میدان میں دربار کے شہسوار جگن خان نیا خرید کردہ گھوڑا پھرا رہے تھے۔ مولانا رک کر بے بصیرت

رائیگاں جاتے دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ وہ پنڈہ اینگلو عربک اسکول میں اردو فارسی اور عربی کے معلم مقرر ہو جائیں۔ والد نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اب والدہ کو مستقل پنڈہ رہنے کا موقع ملا تو بھیا کو دادی سے جدا کر کے پنڈہ آئیں۔ مولوی صاحب جو بھیا کے معلم تھے وہ بھی ساتھ آئے تاکہ تعلیم کا حرج نہ ہو۔ وہ اپنی گھر میں پڑھاتے پھر بھیا کو مدرسہ سلیمانہ پنچم دروازہ پنڈہ کی ابتدائی جماعت میں داخل کر دیا گیا مگر وہ زیادہ دن وہاں پڑھ نہ سکے کیونکہ والد صاحب کا تبادلہ موہتاری ضلع اسکول میں ہو گیا۔ اسی دوران میں یعنی 1912ء میں دادی کا انتقال ہو گیا پھر مولوی طالب حسین نے بھی پنڈہ چھوڑ دیا اور اپنی جگہ اپنے ایک عزیز مولوی سید امداد امام عشری کو کھرا گئے۔ مجبوراً 1914ء میں والدہ صاحبہ کو بھی موہتاری منتقل ہونا پڑا۔ وہیں کے ضلع اسکول میں بھیا کو پانچویں جماعت میں داخلہ دلایا گیا مگر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے اور 1915ء میں ان کی والدہ صاحبہ سب کو لے کر پنڈہ لوٹ آئیں۔ یہاں تھا ان کے سیکے کی ایک شادی کا۔ 1916ء میں والد صاحب کا پھر ایک بار تبادلہ ہو گیا۔ اس بار انہیں ضلع مظفر پور اسکول میں مقرر کیا گیا تھا۔ بھیا کو بھی اسی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسی سال انہوں نے سالانہ امتحان میں اردو کے پرچے میں گھوڑے پر مضمون لکھا اس مضمون میں انہوں نے میر انیس کے ایک مرثیے کے وہ اشعار بھی لکھے جو گھوڑے کی تعریف میں تھے۔ کاپی چیک کرتے ہوئے مولانا شعیب عربک پنچر نے اس مضمون کو پڑھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ پورے شہر میں اس کاپی کو فخریہ دکھاتے پھرے کہ یہ ایک بارہ سال کے بچے نے لکھا ہے میری پیش گوئی ہے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر بھینا بہت بڑا ادیب بنے گا۔

1916ء کی ہی بات ہے۔ شہر کے ایک رئیس جناب امام الدین خان نے اپنی امام منزل میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشاعرہ اس لیے منعقد ہوا تھا کہ رام پور کے ایک تاجر عطر جابٹ رام پوری ان دنوں مظفر پور آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فخریہ کہا تھا کہ شاعری تو بونہی والوں کا حصہ ہے بہار والے شاعری کیا جانیں۔ حالانکہ عظیم آباد (پنڈہ) جو دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا تیسرا گہوارہ تربیت تھا شاعر عظیم آبادی مبارک عظیم آبادی، مولانا فضل حق آزاد نواب امداد امام اثر، میر باقر حسن کے متعلق داغ نے مثنوی ”فرا داغ“ میں لکھا ہے۔

میر باقر کے گھر قیام ہوا

جلد دوم میں یکم جنوری 1960ء لکھا ہے۔ میر کاظم علی جوان کا تاریخی نام ہے اس سے تاریخ ولادت 1321ھ ملتی ہے اور اسکول شعلیٹ برٹش سے یکم جنوری 1905ء درج ہو گیا تھا جس کا ذکر ”جیل مظہری“ از مالک رام ”آج کل دہلی“ اگست 84ء اجتماع خدین از رضا مظہری ”آج کل دہلی“ ”نفوس“ لاہور شخصیات نمبر۔ ”میسوس صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء“ از مشتاق احمد ”مسلم شعرائے بہار“ از حکیم سید احمد اللہ ندوی۔ ”سہیل“ گیا جیل مظہری نمبر فروری مارچ 82ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سید محمد رضا کاظمی ”جیل مظہری“ مختصر حالات زندگی میں“ تحریر کرتے ہیں خاندانی روایت کے مطابق ان کی پیدائش ستمبر 1904ء میں ہوئی لیکن اسکول کے بابو نے سہولت کی خاطر یکم جنوری 1905ء کر دیا تھا اور یہی تاریخ ولادت ان کی تعلیمی اسناد میں نقل ہوئی۔

چھوٹے بھائی جناب رضا مظہری ”آج کل“ دہلی اگست 82ء کے جیل مظہری نمبر میں لکھتے ہیں ”بھیا“ (جیل مظہری) جب چار سال کے ہوئے تو دادی نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا اور اتنے لاڈ پیار سے پرورش کرنے لگیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے الگ کھانا پکاتیں اور سب سے چھپا کر کھلاتیں۔ نماز روزے طہارت وغیرہ کی بے حد پابند تھیں۔ ان کے بستر پر ان کے صاحب زادوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر یہ لاڈ لے پوتے ضد میں آ کر آگن میں لوٹ لگاتے اور آ کر بستر پر دراز ہو جاتے۔

جب بھیا نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو ان کا مکتب ہوا۔ موضع عشری کے مولوی سید طالب حسین ان کے معلم مقرر ہوئے۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ بھیا بھی جانے میں کچھ تامل کرتے تو اماں انہیں زبردستی بھیجتا چاہتیں۔ وہ ماں کے ڈر سے جاتے لگتے تو دادی انہیں ”کیسا لڑکا ہے کہ دس برس میں درد ہے جا کے لیٹ رہ۔ اس صورت حال کو دیکھتیں تو اماں جزیہ ہو جاتیں مگر ساس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے تھا جو پنڈہ کا گریجویٹ خاندان کہلاتا تھا اس لیے تعلیم کو قدم بھیجتیں۔ وہ موقع کی تلاش میں تھیں کہ کسی طرح یہ عنوان شائستہ دادی کو پوتے سے الگ کر دیں۔ حسن اتفاق سے یہ موقع انہیں 1910ء میں مل گیا۔ والد مرحوم کو علمی و ادبی ذوق بہت تھا۔ زمیندار خاندان سے تھے۔ اس لیے ملازمت کی ضرورت نہ تھی مگر بچے ماموں خان بہادر سید احمد علی خان عظیم نے ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کو



ہوا اسی میں علامہ جمیل مظہری کی پہلی نظم ”بادل کی بیٹی“ چھپی۔ اسی رسالہ میں انہوں نے غلی ورس ٹریول کا ترجمہ ”خوردک آباد کی سیر“ کے عنوان سے کیا۔

مشہور ادیب مالک رام ”آج کل“ دہلی میں لکھتے ہیں۔ ”اس کے بعد انہوں نے 1925ء میں سان زیویرس کالج کلکتہ سے انٹر اور 1928ء میں اسلامیہ کالج اور بنگ باشی کالج کلکتہ سے بی اے کیا۔ اسی دوران میں ان کی زندگی قوس قزح سے مزین ہو گئی۔ اب تک ان کی شاعری صرف اور صرف خیال کے سہارے رواں دواں تھی مگر اب اس میں رنگ بھر گئے تھے جس نے ان کی شاعری پر گہرے نقوش مرتب کرنے شروع کر دیے۔

بقول ماہِ منیر ”میرے بھیا (جمیل مظہری) بھی سبھی جوان تھے ان کی شاعری بھی جوان تھی ان کے دل کی صدا میں بھی کبھی سہانے گیت بننا کرتی تھیں۔ ان کی تمنا میں چین کے گھر وندوں میں خوب کھیل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے آنسو کی کے آنچل میں موتی بن رہے تھے۔ دھانی سائے اور گلابی دھوپ میں انہوں نے بھی ٹھنٹ کا قندار کیا۔ بازیب کی جھنکار سے انہوں نے ہوا کو جموڑے بنائے تھے۔ شیش دھ بھری آنکھوں میں نیند کو کھیلنے بھی دیکھا۔ میرے بھیا کی زندگی شاید اسی جوانی کا سوگ ہے۔“

لیکن بدقسمتی سے یہ عشق پروان نہ چڑھ سکا اور 1938ء میں اس پر خطِ پنج گنج گیا۔

اسی دوران میں جمیل مظہری کی مشہور نظم ”ذرو خدا سے ڈرو“ سامنے آئی اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ شائقین ادب کے علاوہ عام لوگوں میں بھی اس نے جگہ بنائی اور قلمی کانوں کی کتابوں، ایسی دو ورق کی کتاب کلکتہ کے ایک صاحب نے چھاپ کر ہاتھوں ہاتھ بیچی۔ اس نظم کے چند شعاریہ ہیں۔

سنو جمیل سنو تم سے یہ گزارش ہے  
یہ آرزو نہیں دل سے نظری سازش ہے  
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے  
اسے جنوں نہ بناؤ، ذرو خدا سے ڈرو  
مجھے نہ یاد کرو  
ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو  
بلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو  
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو  
نماز میں نہ ستاؤ، ذرو خدا سے ڈرو  
مجھے نہ یاد کرو

خوب دعوت کا اہتمام ہوا  
مذکور بالا شعرا کے علاوہ یاس یگانہ چنگیزی، صغیر بلکرائی، شہید اعظم آبادی وغیرہ جیسے مشہور شاعر بھی بہار کے تھے  
امام الدین صاحب کو یہ بات کراں گزری اور انہوں نے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ بہار کے اس چھوٹے سے شہر میں اردو کے اچھے شاعر موجود ہیں۔ والد مرحوم نے اپنی غزل طرح میں کہہ کر بھیا کو دے دی کہ وہ مشاعرہ میں پڑھ آئیں۔ اس غزل کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔

رو گئے گئے وہ دراز را میرا مراد دیکھ کر  
بھیا نے اس غزل کو ایک خاص انداز سے لہک لہک کر پڑھی۔ لوگوں نے خوب داد دی۔ اس کے بعد تو بھیا کو ہر مشاعرے میں بلایا جانے لگا۔

مظفر پور میں بھیا کی غزل خوانی کا یہ سلسلہ 1920ء تک چلتا رہا پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ چلے گئے۔ اس کے بعد کا ذکر ضامنظری ”سہیل“، جمیل مظہری نمبر 1960ء میں اس طرح کرتے ہیں ”1920ء میں بھیا نے کلکتہ کا رخ کیا۔ حسن اتفاق سے ہمارے ماموں زاد بھائی مولوی سید زاہد علی خان اس زمانے میں مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں مدرس تھے۔ والد مرحوم نے بھیا کو انہیں کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا۔ 1921ء میں بھیا درجنم سے درجہ دوم میں آئے۔ ان دنوں مدرسہ عالیہ کے ہیڈ ماسٹر خان بہادر مولوی محمد یوسف تھے۔ وہ ”سینٹ اپ“ کرنے کے معاملے میں کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ بھیا ہمیشہ سے ریاضی میں کمزور تھے۔ انہوں نے رعایت نہ ملنے کے خوف سے ٹیسٹ سے دو تین مہینے پہلے ہائی اسکول میں اپنا نام کھسوا لیا۔ اسی اسکول سے انہوں نے 1922ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ (جبکہ وہ کلام حیدری کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ میں نے مدرسہ عالیہ سے میٹرک پاس کیا؟) مدرسہ عالیہ کے دوران تعلیم میں بھیا نے گویا شاعری شروع کی۔ ان کے ہم درس ایک صاحب اطہر قادری تھے جو چشمہ قد میں توختی تھے مگر قندار گیزی میں بلا کا سلیتر رکھتے تھے چنانچہ بھیا نے ان کی جھولکھی۔

چلوئے گا کلاس میں نکوار قادری  
مگر باضابطہ شعر گوئی انہوں نے اس کے دو تین سال بعد شروع کی، ہاں مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے ضرور شریک ہوتے۔“  
1922ء میں دفترِ عصرِ جدید سے ایک رسالہ ”نشر“ شائع

علامہ وحشت کلکتوی لکھتے ہیں

”جمیل مظہری کے کلام کی دلکشی کا راز ان کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ ان کا کہا ہوا پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں جمیل مظہری کی تخلیق ہوں۔ ان کے خیالات ایک خاص انداز کے لفظ طلب کرتے ہیں جو ہمیشہ ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ خیالات کی ندرت اور الفاظ کی مناسبت اعجاز کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔“ پروفیسر بجنوں گورکھ پوری رقم طراز ہیں کہ وہ شاعر تھا اور شاعر کے عام تصور سے بلند تھا؛ وہ مفکر تھا اور مفکر کے عام تصور سے بلند تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تخلیق اور تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اتنا وسیع تاریخی و ادبی علم رکھتے ہوں۔ گویا جمیل مظہری کی شخصیت شعر اور علمی فضیلت دونوں کا خوشگوار جوہر تھی۔“ علامہ نیاز فتح پوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”جمیل مظہری ملک کے ان مخصوص شعراء میں ہیں جو اردو شاعری میں اس وقت استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔“ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اظہار خیال کرتے ہیں ”مقبولیت حاصل کرنے والے شعراء میں کسی کی پرواز جمیل مظہری تک نہیں۔ مگر ذوق کے اعتبار سے ان کا کوئی ہم عصر ان کے حریف ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“ جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں ”دلکھنوں سے خط آیا تو وہاں کے مٹی کوچے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے لیکن جمیل مظہری کے انتقال کی خبر بڑھی تو تصورات کا یہ محل گر کر تباہ ہو گیا۔ ہائے جمیل مظہری! کیا کہوں، کیا لکھوں کیا کروں؟ سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر آسو بہانے والا پرانا دوست شادی کی کوئی باقی ہو۔“

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں  
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں  
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں  
نہ یوں دیوانہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو  
مجھے نہ یاد کرو  
میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں جہیں خدا کی قسم  
فلکے حائی عذرائے بے وفا کی قسم  
جو جل رہی ہو بندرتج اس چتا کی قسم  
ہوس کی آگ بجھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو  
مجھے نہ یاد کرو

54 مصرعوں کی اس نظم کے بارے میں جمیل مظہری خود کہتے ہیں ”لوگوں نے اسے میری آپ بیتی سمجھ لیا جو میرے خیال سے میری کامیابی کی دلیل ہے کیونکہ میرے خیال میں شاعری نام ہے اس شعور کا جو دوسروں کی بیتی ہوئی کو آپ بیتی بنا کر اس طرح پیش کرے کہ ہر سننے والا یہ سمجھے کہ کہنے والا اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ آپ کو سن کر یہ حیرت ہوگی کہ اس نظم کے پیچھے جو واقعہ ہے وہ میرا نہیں ہے میرے ایک عزیز دوست کا ہے جسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہوئی تھی جو سولہ سترہ سال کی عمر میں ایک بوڑھے سے بیاہ دی گئی تھی مگر اپنے دل میں ایک امنگوں بھرنے والے کے ساتھ ایک شدید احساس فرض بھی رہتی تھی۔ عشق و فرض کہ یہ ذاتی کش مکش اس کے ان خطوط میں نمایاں ہوئی رہتی جو اپنے چاہنے والے کو لکھا کرتی۔“

جمیل مظہری کی اس بات کو اکثر نقادوں نے غلط سمجھا لیا ہے اور اس نظم کو انہی کی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ جمیل مظہری نے اس نظم کا جواب بھی لکھا تھا جس میں محبوب جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی محبوبہ کو سمجھا کر کہتا ہے۔

جوانی کی ایک چھاؤں تھی گزرنی نکل گئی

ہمارا انتظار کر کے دوپہر بھی ڈھل گئی

لیکن ”عشق نام تمام“ نامی نظم کو اتنی مقبولیت نہیں ملی جو پہلی نظم کو ملی۔ جمیل مظہری نے 1931ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں ”پہلے میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور پھر بمکرو پاشی کالج میں۔ وہیں سے میں نے بی اے کیا۔ فارسی اور تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔“

ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ذہین ادبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انہیں کسی ایسی نوکری کی تلاش تھی جو روح کو بھی غذا فراہم کر سکے۔ کچھ دوستوں نے مدد دی اور کچھ اپنا شوق، وہ روزنامہ الہند

بن کر کاظم سے جمیل مظہری بنا۔ استاد مرحوم بحیثیت شاعر کے ہندوستان کے ہر عظیم شاعر کے مقبول و محترم ہم عصر تھے۔ ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کے علاوہ آغا شکر کاشمیری اور نواب خیال نے میرے ذہن اور اس کی تعمیر میں مساوی حصہ لیا تھا۔ میں نے ہی ان دونوں (آخر الذکر) بزرگوں کی ملاقات کرائی تھی لیکن اس ملاقات کا سلسلہ بڑی تلخ کلاسی پر ختم ہوا اور آغا شکر کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ کرانے کی جو جو بڑبڑی وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس کی داستان یوں ہے کہ داستان اردو (تاریخ ادب اردو) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد نواب خیال نے ایک مقالہ فردوسی کی ڈرامائی رزمیہ نگاری پر لکھا اور جو بڑیہ ہوئی کہ ایک بڑے جلسے میں وہ اسے پڑھ کر سنائیں۔ چنانچہ جلسہ ہوا۔ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ نواب امام نے اپنے رسوخ سے کلکتہ میوزیم کا ایک بڑا ہال مخصوص کر دیا۔ صدارت کے لیے نواب صاحب نے آغا شکر کو موزوں ترین سمجھا۔ حالانکہ میں نے دہلی زبان سے اس کی مخالفت کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ آغا صاحب فردوسی (فارسی کا شاعر) کے قائل ہی نہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں۔ وہ مجھ سے بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ فردوسی شاعر نہیں بھاڑ تھا جو لوگ میرا نسخ کو فردوسی ہند کہتے ہیں وہ انہی کی توہین کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جلسے میں نواب صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ سامعین نے ان کی تعریف میں بار بار تالیاں بجا لیں اور آغا شکر کی صدارت پر بیٹھے بیچ و تاب کھاتے رہے۔ صدارتی تقریر کے لیے اٹھے آغہ کی طرح چمکھائے اور بادل کی طرح گرجنے برسے لگے۔ خطابت کے ساتھ ایکٹنگ کے کرشمے بھی دکھائے، فردوسی کو بی محول کرکوسا، محمود غزنوی کی شرافت اور فردوسی کی ذلالت کی نئی نئی کہانیاں سنائیں اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ نواب صاحب کے مقالے کا ادبی حیثیت سے تعارف بھی نہیں کرایا جو بحیثیت صدر ان کا فرض منصبی تھا۔ ان کا غضب ناک چہرہ اور نواب خیال کی کج تحمل متغفل صورت وہ تصویریں تھیں جن کی عکاسی کی قوت میری زبان میں ہے اور نہ میرے قلم میں۔ بہر حال جلسہ بڑی ناگواری کے ساتھ ختم ہوا۔ نواب زادہ عبدالحی اور علامہ وحشت بانیان جلسہ میں تھے منہ لٹکائے ہوئے ہال سے باہر نکلے۔ آغا شکر رزاق بیچ آبادی کے کاغذ پر ہاتھ دھرے کچھ مسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ تیسرے دن نواب خیال کا مراسلہ روز نامہ ”ہند“ میں شائع ہوا جس میں شرکائے جلسہ کی

کے مدبرین گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کے لیے وہ علامہ وحشت کلکتہ کی پاس جا چکے تھے۔ طوطی بنگال علامہ وحشت نے دو تین غزلوں پر اصلاح بھی دی مگر بعد میں انہوں نے کہہ دیا۔

”میاں جمیل! تمہاری زبان دانی مستند ہے عروض و قواعد سے بھی واقف ہو تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔“

علامہ وحشت کا حکم تھا اس لیے وہ اپنے اشعار انہیں برائے اصلاح نہیں دیتے لیکن یہ دل سے انہیں اپنا استاد مانتے۔ صرف کتنی کی چند غزلیں اصلاح کروائی تھیں پھر بھی دل میں عقیدت رکھتے تھے۔

جمیل مظہری اس دور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”ایم اے کا امتحان دے کر کلکتہ کی صحافتی زندگی میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ کلکتہ کی ادبی اور علمی مجلسوں تک جا پہنچا۔ میری عمر کا وہی حصہ جس کی یاد آج بھی میرے دل کو ایک روشن کنول بنائے ہوئے ہے۔ ماضی کی تاریکی میں مجھے پہلا روشن چہرہ جو نظر آتا ہے وہ اپنے شفیق ترین استاد مولانا رضا علی وحشت کا سنجیدہ اور صمیم چہرہ ہے لیکن عام مولویوں کے چہرے کی طرح خشک اور سپاٹ نہیں بلکہ مجسم محبت انگیز اور عقیدت آموزان کے نام سے اس وقت سے واقف تھا جبکہ میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میں ”تہذیب“ اور ”مخزن“ کے رسالوں میں ان کی غزلیں پڑھا کرتا تھا بغیر سمجھے۔

چار پانچ سال بعد جب کلکتہ آیا تو میں نے انہیں ”مسلم انشٹی ٹیوٹ“ کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھتے دیکھا۔ پھر ویلسلی اسکول آف میگزینوں پر آتے جاتے دیکھا اور ادب سے سلام کرتا اور وہ شفقت سے جواب دیتے رہے لیکن گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ بہت اس وقت ہوئی جب وہ کلکتہ کے نئے اسلامپور کالج میں بحیثیت پروفیسر اور میں بحیثیت طالب علم کے داخل ہوا۔ ۱۹۶۱ء دوران میں ان کے شاگردان خاص ایوان کینسل اور قمر صدیقی سے میری ملاقات بڑھی اور انہیں کے توسط سے میں کبھی کبھی اتوار کو ان کے دولت کدے پر حاضر ہونے لگا۔ ہر اتوار کو ان کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی نشست ادب اور فن کا ایسا مدرسہ ہوتی تھی جو دس بجے دن سے دو بجے دن تک کھلا رہتا۔ ارباب ذوق اور یاران ادب آتے رہتے اور بہترین زعفرانی چائے، ٹیک اور سمو سے ان کی ضیافت ہوتی رہتی۔

مولانا رحمت اللہ علی اپنی ذات سے بقول نواب امداد امام اثر میخانہ غالب کے تھا سانی تھے اس میں میخانے کا جرحہ نوش

## غزل

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا  
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا  
بس ایک احساس نارمانی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو  
جنوں پہ حالت ربودگی کی خرد پہ عالم غنودگی کا  
ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل  
کہیں سر راہ یہ مسافر پگ نہ دے بوجہ زندگی کا  
خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں یہی ناسفی ہے اس کے واعظ  
وہ ابر کا خطر کھڑا ہو مکان جلا ہو جب کسی کا  
جیل حیرت میں ہے زمانہ مرے بقول کی مٹلی کا  
نہ جذبہ اجبائے رضوی نہ کیف پرویز شادی کا

☆☆☆

کچھ تو گرد راہ گرد کارواں بنے رہے  
کچھ غبار ایسے بھی تھے جو آسمان بنے رہے  
ہم نے یہ عالم بھی دیکھا اے جنوں خود گری  
کہ چمن اجڑا کیا اور آشیاں بنے رہے  
تارے سورج ہو گئے لمحات صدیاں بن گئے  
اور خلا میں آسمان پر آسمان بنے رہے  
کارواں وقت آگے کی طرف بڑھتا رہا  
اور ہم انسان گرد کارواں بنے رہے  
ہم نے اس دنیا میں آکر کیا بتایا کیا بنے  
ہاں مگر کچھ عالم وہم و گماں بنے رہے  
ایک وہ جو بے پنش کرتے رہے اظہار نور  
ایک ہم جو سوز رکھ کر بے زباں بنے رہے  
ہم نہ سمجھے کچھ چمن کا راز اجمالا کی نسیم  
پھول کھل کھل کر مشیت کی زباں بنے رہے  
منظہری جلا رہا یوں ہی میرے دل کا الاؤ  
کوئی پاس آیا نہیں شعلے دھواں بنے رہے  
(جیل منظہری)

شرکت کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے آغا حشر کی گرم گرفتاری کے  
سلسلے میں چبھتا ہوا جملہ لکھا تھا کہ تم شا اچھا تھا اور آپ لوگوں  
کی شام دچکی ہے گزر گئی۔ آغا حشر نے جو اس مراٹے کو بڑھا  
تو آدمی سے سلگتا ہوا تنور بن گئے۔ آغا حشر جائیں تو جائیں  
کہاں۔ سیدہ عمر جدید کے دفتر پہنچے۔ شوخی تقدیر سے  
جناب خیال پہلے ہی سے میری میز کے سامنے ایک کرسی پر  
تشریف فرما تھے۔ آغا صاحب انہیں دیکھتے ہی مچکے تھیرکی  
طرح چونچیں مارنے لگے۔ لیکن نواب صاحب حلم مجسم بنے  
بیٹھے رہے۔ ادھر شعلگی ادھر رخ بنگلی ادھر خاموش اضطراب  
بڑی مشکل سے مولانا شائق احمد عثمانی نے آغا حشر کے ہاتھ  
پاؤں جوڑ کر انہیں رخصت کیا۔ حالات بدترین شکل اختیار  
کر چکے تھے کہ نواب زادہ عبدالعلی نے صلح کرادی۔“

جیل منظہری نے ایم اے کرتے ہی صحافتی زندگی کی  
شروعات کردی تھیں۔ لیج آبادی کے روزنامہ ”الہند“ کی  
ادارت سنبھال لی۔ نیا جوش تھا، دلولہ تھا، جوانی تھی خون میں  
گرمی تھی۔ حکومت برطانیہ کو خوب لانا شروع کر دیا۔  
غلام ملک کا ایک معمولی اخبار اس حکومت پر تنقید کرے جس  
کے راج میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات  
حکومت برطانیہ کو بہت بری لگی اور اس بے باک اخبار کو صرف  
اداریوں کی وجہ سے ایک ماہ کے اندر بند کر دیا گیا۔ اخبار  
بچانے کے لیے لیج آبادی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی  
الہند سے نکلے تو فری لانس کی حیثیت سے مختلف پرچوں میں  
لکھنے لگے۔ قلم میں نیکیاں بن تھا، غصب کی کاٹ تھی۔ ان کے  
مضامین کو شائق احمد عثمانی بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی اسی  
خاصیت پر شائق احمد عثمانی نے انہیں چھٹ لیا تا کہ ان کے  
روزنامے ”عصر جدید“ میں لکھیں حالانکہ شائق احمد عثمانی اور  
جیل منظہری کے درمیان نظریاتی اختلافات کی گہری کھائی تھی  
پھر بھی دونوں میں خوب نیچے گئی۔ اس اختلافات کی بنا پر جیل  
منظہری نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں فکائی حصہ لکھوں گا اور آپ  
سیاسی۔ چنانچہ وہ ”کوچہ گرد“ کے قلمی نام سے مہلات نامی کالم  
لکھنے لگے۔ اسی دوران میں ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکلا مگر وہ  
چل نہ سکا لیکن ان کا کالم بدستور چلتا رہا۔

مختلف اوقات میں زمانہ ہمدرد شفاعت اللہ خان نے  
جاری کیا ان میں بھی وہ بہ حیثیت جوائنٹ ایڈیٹر کے کام کرتے  
رہے جب صدیق انصاری نے ”شیخ“ شروع کیا تو انہوں نے  
اس اخبار کے ذریعے اپنا ایک الگ ”روپ“ قارئین کے  
سامنے پیش کیا۔ مشہور طنز نگار رضائفوی داعی اس دور کا نقشہ

فلمی صحافیوں کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑنے کی ایک وجہ اور تھی۔ 1933ء میں آغا حشر کاشمیری اور دانش کے درمیان مقدمہ بازی چھڑ گئی تھی۔ اس مقدمہ بازی کے نتیجے میں ادبی رسالوں اور فلمی رسالوں کے درمیان بھی ٹھن گئی۔ جیل مظہری نے ادبی رسالوں کے ترجمان بن کر ججوں کے گولے داغنے شروع کر دیے تھے۔

گلکشت کئی محضوں میں اہم مقام رکھتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے اس دور میں بھی سب سے بڑا شہر تھا۔ انگریزوں نے 1875ء کے بعد سے ہی دہلی کو پایہ تخت بنالیا تھا۔ دارالحکومت منتقل ہو جانے کی وجہ سے اس شہر کو اجڑ جانا چاہیے تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وجہ سے اب تک یہ شہر اہمیت کا حامل بنا ہوا تھا۔ ہندوؤں اور کرچوں کی مجموعی آبادی کے برابر مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ”چوبیس پرگنہ“ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے شہر میں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ دیہاتیوں کی زبان بنگالہ تھی اور شہریوں کی اردو اسی وجہ سے 1935ء میں خلافت کمیٹی نے مسکن کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کے ساتھ اردو لٹریچر کانفرنس کی بھی داغ بیل ڈالی اور حسین شہید سہروردی و ملا جان محمد نے اصرار کر کے مجلس استقبالیہ کی صدارت جمیل مظہری کو سونپ دی۔

اس کانفرنس میں انہوں نے ایک ایسا خطبہ پڑھا جو خاصا انقلابی تھا۔ اس خطبے میں انہوں نے صاف اردو واضح الفاظ میں کہا کہ ادب برائے ادب کے نظریے سے انحراف ضروری ہے۔ اردو ادب اگر آزادی کی تحریک کے کام نہیں آسکتا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ اپنا فرض پورا نہیں کر سکتا۔ اسے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا مقدس تاریخی فرض انجام دینا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اس خطبے پر سخت تنقید کی لیکن خواجہ حسن نظامی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وطن عزیز کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص پر کوشش ہو۔ ادب تو ہمارا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔

جس وقت جمیل مظہری اسٹیج سے اترے مولانا شوکت علی نے مجمع کے درمیان سے انہیں کھینچا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ انہیں بار بار چوم رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے۔ ”مظہری تم نے میرے دل کی بات کہہ دی خدا تمہارے قلم اور زبان کو مزید تقویت دے۔“

اس کانفرنس نے انہیں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ

کھینچے ہیں۔ ”یہ وہ زمانہ تھا جب گلکشت کی اردو صحافت پر زیادہ تر فلمی شخصیتوں کی چھاپ رہتی تھی۔ ہفتہ وار اخبارات تو خصوصی طور پر فلمی شخصیتوں ہی کے ذکر و افکار سے معمور رہتے تھے بعض فلمی صحافیوں نے صحافت کو ابتدائی کی اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ فن کی قدردانی کے سلسلے میں فلمی ایکٹریوں کو خاتم اور ہیتم بنا ڈالا۔ کسی نے کسی کو سیدانی ثابت کرنا چاہا تو کسی نے کسی کو جوش محبت میں اپنی بہن لکھ ڈالا۔ عام طور پر فلمی صحافی ایکٹریوں کے مستقبل کو بار بار دار ہو گئے۔ جمیل مظہری نے بعض دوستوں اور بزرگوں کے اشارے پر اس طرف توجہ کی اور ان کی طبیعت میں خود جو انقباض تھا وہ سب سے پہلے ایک قطعہ کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہی قطعہ جمیل مظہری کی طرافت نگاری یا جھوٹکاری کی ابتدا ہے فرماتے ہیں۔

کل ملے آئے مجھ سے مرے ایک عزیز دوست  
مشراب روف و پہ ایمان صابری  
زیر بغل خطوط و تصاویر مہ رخاں  
ورو زباں حدیث سیا و مادھری  
قطعہ کے بعد غزل کی ابتدا اور اس ہزل کے چند شعر  
لیکن خطا معاف مجھے پوچھتا ہے یہ  
کس روگ کی دوا ہے یہ فلمی ایڈیٹری  
آئینہ سامنے ہے ادھر دیکھیے ذرا  
سجدوں کا داغ اور جبین ایڈیٹری  
دس شعر کے سوال کے بعد دس شعر کا ہی جواب  
کہنے لگے بڑے کے کہ حاسد ہیں آپ لوگ  
پوچھا ہے صاف صاف تو سنئے کھری کھری  
عزت ہماری دیکھیے بازار حسن میں  
مس مدجیں بڑھانی ہیں پانوں کی مٹھری

اسی دور میں جمیل مظہری نے مسدس ”شہر آشوب“ لکھا تھا۔ یہ مسدس مسدس جالی کی پیروڈی تھی۔ اس دور میں صحافت کس درجے پر چکی تھی اس کا انہوں نے پورا نقشہ کھینچا تھا۔ مشہور ادیب و صحافی خواجہ حسن نظامی نے ایکٹریوں کے فلمی چہرے لکھے تھے۔

وہ دلی کے مشہور چہرہ نظامی  
تصوف میں رشک سنائی و چای  
ہے خواجہ حسن جن کا اسم گرامی  
قلم ان کا دے ایکٹریوں کو سلامی  
لکھے فلمی چہرے ہوا اپنی کھودی  
صحافت کی خواجہ نے لٹیا ڈودی



لی۔ کلکتہ کے دروازے پر چا پانی دستک دے رہے تھے۔ وہاں ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ کہاں جائیں، وہ بھی اسی الجھن میں تھے کہ ہمیں سے جوش شیخ آبادی کا ملاوا آگیا۔ انہوں نے جمیل مظہری کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کی خود اعتمادی مجروح نہیں ہوگی اور اس یقین دہانی پر وہ ہمیں روانہ ہو گئے۔ جوش پہلے انہیں فضل برادرز کے پاس لے گئے لیکن وہاں کلکتے سے آرزو لکھنوی آ کر ڈے داری سنبھال چکے تھے۔ اس کے بعد وہ انہیں محبوب اور کاردار صاحب کے پاس لے گئے۔ محبوب صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ انہوں نے جمیل مظہری سے اپنی ایک فلم کے لیے معاہدہ بھی کر لیا لیکن ایک سین پر دونوں کا اختلاف ہو گیا اور وہ جوش کے ساتھ پونا چلے گئے۔ ہمیں آ کر جمیل مظہری مشہور نقاد محمد رضا کاظمی کے والد موسیٰ رضا کاظمی کے گھر کو بانی ہاؤس بانی کلمہ میں ٹھہرے تھے۔ پونا میں ان کا قیام جوش کے ساتھ ظاہر بیس میں رہا۔ انہی دنوں جمیل مظہری کی ملاقات یوٹیش فلمز کے منیجر شرمہ کے ساتھ ہو گئی اور وہ انہیں اپنے ساتھ واپس کلکتہ لے آئے۔ یہیں انہوں نے ”کروٹیر“ کے گانے لکھے جسے سہگل نے گایا اور کافی مقبول ہوئے۔ انہوں نے ”کھوتی دنیا“ کی کہانی لکھی مگر فلم مکمل نہ ہو سکی۔ بقول جمیل مظہری ”خاندان“ کا بوجھ تھا۔ بے کار رہ نہیں سکتا تھا۔ کلکتہ میں بھی اس لیے رہا اور ہمیں میں فکر معاش پہنچنے لگی اور میں 43ء سے 47ء تک فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ فلم آرزو کے مکالمے اور کروٹیر کے گانے لکھے۔ وارث شاہ کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما لکھا مگر فلم بننے کے بعد کارکنان کا جھگڑا ہو گیا۔ مقدمہ تک بات پہنچی اور پھر ہمیں اس فلم کا کیا پتا۔ مجموعی طور پر فلمی دنیا مجھے پسند نہیں آئی اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے مگر مہمیت نہیں دے سکتی۔ ظاہر داری‘ نصن کے علاوہ مجھے پورا ماحول بڑا عامیانا معلوم پڑا۔“

فلمی دنیا سے بے زاری کا اظہار وہ اپنی مشہور نظم ”بھاگ شاعر بھاگ“ میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہوئے فلمی دنیا سے بھاگ آئے۔ اسی دور کا ذکر ہے علامہ جمیل مظہری نے اس وقت تک شادی نہیں کی تھی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں اختلاج قلب کا عارضہ تھا۔ اسی اختلاج قلب کی وجہ سے ایم اے کے امتحان میں ایک پرچہ چھوڑ آئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے فرسٹ کے سینکڑو ڈیڑھ مالا حاکمہ جس دوست کو انہوں نے فارسی ادب پڑھایا تھا‘ وہ فرسٹ

قریب کر دیا اور بعد میں یہ قربت اتنی زیادہ مضبوط ہو گئی کہ انہوں نے ہمارے محکمہ نشر و اشاعت میں بطور جلیٹی افسر تقرر کے لیے پروفیسر عبدالباری کو ہدایت کر دی۔ پنڈت میں عبدالباری کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے فوراً جمیل مظہری کو پنڈت بلوالیا۔ مولانا ابوالکلام بھی پنڈت آگئے اور انہوں نے بھی سفارش کر دی۔ اس طرح 2 دسمبر 1937ء سے وہ بطور جلیٹی افسر مقرر ہو گئے لیکن 1939ء میں انگریز حکومت سے اختلاف کے باعث دیگر لوگوں کے ساتھ انہوں نے بھی اپنا استعفیٰ پیش کر دیا لیکن راجندر پرشاد سنگھ جو ہمارے تھے اور سہاش چندر بوس کی مستعفی ہو جانے کی وجہ سے ہمارے صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بن چکے تھے۔ انہوں نے استعفیٰ دینے سے منع کر دیا کہ ابھی تمہارے ایسے نوجوان کی ملک کو ضرورت ہے تم پر نہ جھجھو حکومت برطانیہ کے لیے کام کر رہے ہو بلکہ یہ سمجھ کر نوکری کر کہ یہ ایک اہم محکمہ ہے جس سے آزادی کی تحریک کو سوتا ڈھکی کیا جاسکتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی غیر ذمے دار شخص آ گیا تو تحریک کے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ جمیل مظہری نے ان کی بات مان لی۔

وقت گزرتا رہا اور پھر ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا سب سے اہم سال آگیا۔ دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ اتحادیوں کو ہر محاذ پر ہزیمیت کا سامنا تھا۔ جاپان نے پرل ہاربر پر امریکی اور انگریزی بحری بیڑے کو شدید نقصان پہنچایا تھا اور جرمنی اٹلی کے محور کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کر کے اتحادیوں کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس نے سنگاپور ملایا برما کو برق رفتاری سے روند ڈالا تھا اور اب کلکتہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مسلم لیگ کی کامیابی بہت نزدیک آ چکی تھی کہ کانگریس کی مجلسِ عالمہ نے 8 اگست 1942ء کو اپنے اجلاس میں وہ مشہور قرارداد منظور کی جو اپنے مرکزی خیال کے باعث Quit India یا بھارت چھوڑو قرار داد کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے ورکروں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ ان حالات میں جمیل مظہری کے لیے ملازمت میں رہنا ناممکن ہو گیا اور انہوں نے استعفیٰ داغ دیا۔ اس استعفیٰ پر انہوں نے اپنے خون میں قلم ڈبو کر دستخط کیا تھا۔ یہ استعفیٰ کئی مہینوں میں اٹھکھا تھا۔ اس میں نوکری چھوڑنے کی وجہ جو بتائی گئی تھی اس میں فنی اصطلاحات کی جگہ سخت و درشت الفاظ کا استعمال کیا گیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ماہ تک وہ قید رہے رہا لیکن اس نے ہی انہوں نے ”مظہر آباد“ (پنڈت) سے باہر نکلنے کی شان

کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ منہ پھاڑ کر اور آنکھیں پھیل کر چند منٹوں تک ادھر ادھر غلامیں دیکھتے مگر آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں، بعد ازاں ٹوٹی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے ایک خاص انداز سے اپنی کرسی پر دروازہ بوجاتے پھر جب سے سکرپٹ کا ڈبا نکال کر مرمولہ بناتے، اس دوران میں آنکھیں بند رہتیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک رہتا جب تک کوئی ان کے ہاتھوں میں رجسٹر دے کر چونکا نہ دیتا۔ اگر کسی روز لڑکے پڑھنے کے موڈ میں نہ ہوتے تو ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے، ایسی حالت میں جب یکا یک علامہ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے تو ایک خاص انداز سے کہتے، ہاں بھئی حاضری بخواؤ اور جب ان کو معلوم ہوتا کہ وقت ختم ہو رہا ہے تو پیشانی پر خشک ڈال کر کہتے آپ لوگوں نے مجھے قتل ہی کیوں نہیں کہا اور پھر جلدی جلدی پڑھانا شروع کر دیتے اور اس طرح ڈوب کر پڑھاتے کہ وقت ختم ہونے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ جب ہم میں سے کوئی ڈرتے ڈرتے کہتا کہ سر وقت ختم ہو گیا تو اسے مخصوص انداز میں جواب دیتے کہ آپ لوگوں نے قتل ہی کیوں نہیں کہا۔ علامہ پچاسا کر دوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے، ان کی تعریف کرتے، ہمت افزائی کرتے، ان کے دکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے۔ نہایت بے تکلفی سے اپنے شاگردوں کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر باتیں کرتے اور جب غصہ آتا تو درہم درہم مولوی صاحب کی طرح گوشالی کرتے۔ کلاس میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوتا تو یکا یک ایسا محسوس ہونے لگتا گویا ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ علامہ پچام میں ہر ایک سے فردا فردا باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کر رہے ہوں، الفاظ دھنکی کا ایک سمندر سا امنڈ پڑتا۔ غور و فکر کی نئی شاہراہیں ابھرتی نظر آتیں۔ نیا شعور انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہوا نظر آنے لگتا۔ خرد آگہی کے تھاروں پر چوٹ پڑتی سنائی دینے لگتی۔ لیچر کے دوران میں گرج دار آواز، شاعرانہ الفاظ، انوکھا انداز بیان، شاعرانہ شبیہیں اور فنکارانہ استعارے استعمال کرتے۔ وہ اقوال اور اشعار کا حوالہ اس طرح دیا کرتے جیسے کسی مشہور اخبار میں شائع شدہ مضامین کو پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی ہوتی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لیے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ بھئی، میں چاہتا ہوں کہ تیرے اندر علم کا صحیح ذوق پیدا ہو۔ ڈگریاں تو سبھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن طالب علم بہت کم

ڈیڑھ دن میں پاس ہوا۔ اختلاج کی اس شدت کو بعض اعزائے جنون سمجھا اور اسی غلط فہمی نے 1928ء میں بچپن سے منسوب پھولی زاد کا رشتہ منقطع کر دیا۔ اسی سال پھولی بہن کی شادی ہوئی لیکن وہ کم نصیب ساڑھے تین سال سہاگن رہی۔ ان دو حادثوں کا انہوں نے اتنا اثر لیا کہ شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ بہن کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ 1938ء میں انہیں شادی کا خیال آگیا اور محمود طرزی سے استدعا کی کہ ان کے لیے دلہن دینسی جائے۔ عمر پچیس تیس چھتیس ہونا چاہیے۔ محمود طرزی نے تلاش شروع کر دی۔ کافی تلاش کے بعد انہیں ایسی ہی ایک عورت مل گئی۔ انہوں نے علامہ سے ذکر کیا۔ علامہ نے اب ایک نئی بات کر دی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ اس عورت کو دیکھیں گے۔ 1945ء میں ایسی بات ناممکن تھی پھر بھی محمود طرزی نے اپنے طور پر کوشش کی اور اس عورت کو دکھا دیا۔ اسے دیکھنے کے بعد علامہ نے مسترد کر دیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ تلاش جاری رہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے ڈاکٹروں نے تاکید کی ہے کہ جلد شادی کر لوں ورنہ میری شاعرانہ صلاحیتیں ماند پڑ جائیں گی۔ محمود طرزی نے جھلکار کر کر مڑوب لہجے میں کہا کہ اب کیا میرا بھی کام رہ گیا ہے کہ ہر گھر میں محسوس کر لڑکیاں دیکھوں اور پھر آپ کو دکھاؤں۔ یہ ناممکن ہے اس کا انجام یہ ہوگا کہ محلے والے میری اور آپ کی ایسی مہرمت کریں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

بات معقول تھی، علامہ خاموش ہو گئے۔ اور پھر اپنی تلاش کا رخ میاں براج کی جانب موڑ دیا اور کامیاب بھی ہو گئے۔ محمود طرزی نے جس خاتون کو دکھایا تھا وہ خود کو یوں مسترد کیے جانے کو اپنی ہتک سمجھنے لگیں مجبوراً ان سے محمود طرزی کو شادی کرنا پڑی۔

جینی سے 1947ء میں لوٹنے کے بعد ان کا تقرر بہ حیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر پبلسٹی اینڈ فلم کیشن گورنمنٹ آف بہار ہو گیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر صرف تین سال رہے اور پھر جنوری 1950ء میں پٹنہ کالج میں پروفیسر کی آسائی پر چلے گئے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے مہ نہیں لگتی ہیں۔

”پروفیسروں میں عام طور پر علمی رکھ رکھاؤ ضرورت سے زیادہ متانت، عالمانہ شان اور اپنے کو ہمہ وقت لیے دے رہنے کا انداز اپنایا جاتا ہے۔ علامہ جیسے منظر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ علم کے ایک بحر ذخائر تھے مگر ہمدردی کی شان اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا ناممکن ہے“

### جلیل مظہری کی رباعی

(1973ء میں جب بیٹائی زائل ہوگئی)

زخم اپنے دل و جگر کا سی لیں گے جلیل  
جس طرح جلائے گا جی لیں گے جلیل  
جب آنکھ نہیں پھر قلم سے کیا کام  
خون اپنے دماغ کا بھی پی لیں گے جلیل

☆☆☆

اے عمر رواں غمہر کہ چلتا ہوں میں  
دے مہلت یک نفس کہ بوڑھا ہوں میں  
یہ جسم کی جھریاں نہیں ہیں شاید  
زنجیریں ہیں زنجیروں میں جکڑا ہوں میں

دیا تو جلیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کے تفصیلی اعتراف کے بعد ان کی ”گلگتہ نثر نگاری“ کا بھی ذکر کیا۔ آل احمد سرور نے ”عصری ادب“ میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی تذکرہ چیخڑا۔ اولیں احمد دوراں نے ”سریر“ میں اعتراف کیا کہ اگر جلیل مظہری شعر گوئی کی طرح نثر نگاری کو بھی اپنے فکر و فن کے ابلاغ کا مستقل وسیلہ بنائے ہوئے ہوتے تو آج اردو کے نثری ادب میں بھی وہ بڑے بڑوں کے ہمسر ہوتے۔

جلیل مظہری کے تنقیدی مضامین میں سب سے پہلا مضمون نواب نصیر حسین خیال کی مشہور کتاب ”مغل اور اردو“ کا مقدمہ ہے پھر ”آئینے خانے میں“ اختر شیرانی نے (1934ء میں) ”تصویر“ لاہور میں تبصرہ شائع ہوا۔ حکومت بہار کے تعلقات عامہ کا جریدہ بہار کی خبریں منظر عام پر آیا تو اس میں ان کے تنقیدی مضامین تو اتارے آتے رہے۔ اسی دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد رضاعی وحشت و اکثر مبارک عظیم آبادی انشاء اللہ خان ایک ٹریبیڈی اور مرزا غالب پر لکھے گئے مضامین غالب ایک مصحح و نثار (جنوری 69ء) انیسویں صدی کا ایک اجنبی ذہن (اگست 69ء) کے علاوہ کل کا عظیم آباد (جنوری 1970ء) فرق دارانہ ذہنیت کا تاریخی پس منظر (جنوری 1971ء) قومیت کے وقتی سانچے (اگست 1971ء) اور ہندوستان بین الاقوامیت میں ایک بین الاقوامی زبان کی ضرورت (اگست 1972ء) بہار کی خبریں میں شائع ہوئے میراٹھس کی ناقبولیت کے اسباب میراٹھس اور صفی جذبات کی ترجمانی (جلد یادگار ٹھس

ہوتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں مجھ سے کہا تھا ”بیٹی میں علم کی دولت کو دیت کر رہا ہوں تم اسے اپنے سینے میں دفن مت کر دینا بلکہ اس دولت کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنا پچھروں میں میں نہیں بلکہ ٹیکسٹ بک پڑھاتے میں بھی بار بار اس کا احساس ہوتا کہ طلبہ اور استاد ایک فطری سفر پر ایک ساتھ روانہ ہوئے ہیں کوئی ایک قدم آگے ہی کوئی کچھ پیچھے اس وقت علامہ ایک ایسے گائیڈ کی طرح نظر آتے جو خود بھی ہم سفر کی ٹولی میں گم ہل گیا ہو اور اپنے بیان سے لذت لے رہا ہو۔ یہ احساس اس وقت اور شدید ہو جاتا جب علامہ، غالب پر پچھرو دیتے اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ وہ راہ کسی سخن پوش کنار یوں اور جلوہ بار گستاخوں کو متعارف کراتے ہوئے بڑھے جا رہے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے اور گم گشت کرنے لگتے ہیں۔ ان کے پڑھائے اشعار جمالیاتی تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشکل الفاظ کے ساتھ ساتھ باریک نفسیاتی و جذباتی مسائل بھی حل کرتے جاتے۔ خواہ اس میں کتنا بھی وقت صرف ہو۔ اکثر محض ایک شعر کی تشریح کے لیے پورا ایک گھنٹا سرف کر دیتے۔“

1960ء میں وہ پنڈ کاج سے سکدوش ہو گئے تو انہیں پنڈ یونیورسٹی نے شعبہ اردو کے لیے تقرر کر لیا۔ 1965ء تک علامہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے پھر یونیورسٹی گورنمنٹ کیشن کے ریسرچ اسکالر مقرر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مقالے کے لیے ”اردو مرعے کا تاریخی پس منظر“ کا موضوع انتخاب کیا تھا لیکن برا ہو چرکا۔ وہ پنڈ سے اپنے گھر ٹھیکن پور منظر پور جا رہے تھے کہ دوران سفر ان کا ایک جس میں مواد تھا کسی نے اڑا لیا۔

عام طور پر لوگ جلیل مظہری کو ایک بلند پایہ شاعر ایک شفیق استاد اور ایک خلق انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں کچھ ایسے لوگ جو مظہری کی طرح خود بھی ادب و شاعری کی بزم میں شمع کی مانند جلتے ہیں اور اب اس بزم کے غم فراق میں گم ہیں جلیل مظہری کے طر فنانہ رنگ سخن سے بھی کسی حد تک واقف ہیں لیکن اب تک جلیل مظہری کی تنقیدی صلاحیتوں کے احساس پر بہت کم لکھا گیا۔ ان کی پچاس سالہ ادبی زندگی کے تقریباً ہر دور میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی عمومی طور پر ذکر ہوتا رہا۔ مثلاً ندیم کے بہار نمبر 1935ء میں جلیل مظہری کی کامیاب افسانہ نگاری اور دلکش اسلوب کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے جب 1960ء کے قریب مختصر تاریخ ادب اردو کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ترتیب

کے عناصر بھی مقرر کر دیے مثلاً چہرہ، رخصت، آمد، جنگ، شہادت، بین وغیرہ۔ اس لیے مرثیہ کو مسدس سے الگ چیز مان لیا گیا ہے۔ فن مرثیہ گوئی میں دور حاضر کے جن بڑے مرثیہ گو کا نام لیا جاتا ہے وہ ہیں آل رضارضا، نسیم امرہوہی، جوش ملیح آبادی، وقار گنجپوری، مظہر بیٹا پوری، نجم آفریدی اور جمیل مظہری۔ جمیل مظہری کے مرثیوں میں ادبیت بھی ہے اور فکر کا سمندر بھی۔ محمد رضا کاظمی ”جدید اردو مرثیہ“ میں لکھتے ہیں۔ ”جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کی ابتداء قوی مقاصد ہی کے تحت ہوئی۔ جمیل مظہری خود بیان کرتے ہیں کہ ان کا پہلا مرثیہ ”عرفان عشق“ 1930ء میں ترقی پسند تحریک اور مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہو کر کہا گیا تھا۔ سیاسی اغراض کی موجودگی کے باوجود ان کے مرثیوں میں سیاسی عنصر نمایاں نہیں ہے۔ انہوں نے نادانستہ طور پر ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جدید مرثیہ کے مبادیات کو مرتب کرنے تک محدود رہا جائے۔“

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جوش نے اپنے سیاسی مسلک کی تشکیل میں مولانا محمد علی جوہر سے اثر قبول کیا تو جمیل مظہری مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ محمد علی جوہر کے مزاج کا جوش، ولولہ، بلند آہنگی، جذباتی سیلاب اور عزم سرفروشی کی جھلک جوش کے ابتدائی مرثیوں میں ملتی ہے اس کے برخلاف ابوالکلام آزاد کی علمی متانت، رفتار کی استقامت اور مصلحت کوئی تھی اس کے عناصر کی پرچھائیاں جمیل مظہری کے ہاں ملتی ہیں۔ اسی لیے دونوں کو جدید مرثیہ نگاری کا میر اور امیر کہا گیا ہے۔ جمیل مظہری نے جدید مرثیہ کو ایک نیا رخ دیا تو جوش نے اسے وسعت دی۔ جمیل مظہری نے امام حسین کو بطور نجات دہندہ انسانیت قرار دیا تو جوش نے امام مظلوم کو نجات دہندہ تاج مشرقین کہا لیکن جوش کے مرثیوں اور جمیل مظہری کے مرثیوں کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو جوش کے الفاظ تراشی کو نظر انداز کر کے حاصل یہ ہوگا کہ جمیل مظہری نے مرثیوں کو بطور پیغام زیادہ موثر انداز میں عام کیا ہے۔

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلک  
ایمان کی ہو رہی ہے تجارت ابھی تلک  
جاگیر اہرن کی ہے جنت ابھی تلک  
ابلیس ہے معلم فطرت ابھی تلک  
پامانی حقوق کا تہذیب نام ہے  
انسانیت کی روح کا ایک ٹپل عام ہے

جمیل مظہری کے مرثیوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو بیہ رحمہ نظم کیے ہیں ان میں یہ برابر خیال ملحوظ

کشی پنڈ 74ء) دو اقبال (علامہ اقبال سیمینار منعقدہ لکھنؤ 29 دسمبر 77ء) غالب کے نقش قدم پر (ماہنامہ ”مہنگ وچن“ کانپور اپریل 76ء اور آل انڈیا ریڈیو پنڈ سے نشر شدہ) شاد عظیم آبادی کی استعاراتی شاعری (ماہنامہ زبان و ادب پنڈ شاد عظیم آبادی نمبر مارچ 79ء) صفی لکھنوی کی جغرافیائی شاعری (آج کل نئی دہلی ستمبر 80ء) ایک مثالی کردار (آکاش والی کا ترجمان پندرہ روزہ آواز) مقدمہ طنزیات انجم مانپوری۔ دانش کی شاعری پر ایک نظر (1954ء) مکاشفات کشفی (1958ء) واحد برہم کی کاگل پو (1967ء) مظہر حیدری کا جام جم (1967ء) قاسم شبیر نقوی کی میری غزلوں میں آثار کار بلا (سرفراز لکھنؤ 2 مئی 1970ء)۔

قاسم شبیر کی نقش مرثیہ (سرفراز لکھنؤ 27 دسمبر 1973ء) فضا شکی کا دیوان کھمت و غفلت (1974ء) تقریظ۔ ساز و آواز (1975ء) علاقہ شلی کا حرف و صوت (1975ء) تجزیہ۔ وہ جوش شاعری کا سبب ہوا (مجموعہ کلام کلیم عاجز ”بزم کاف“ 1946ء) صغیر بکھری حیات و کارنامے (1976ء) تعارف و حرف آگہی (1977ء) محمد عسکری جدید کے چھ مرثیے اعجاز ناظم (1978ء) تبصرہ و تقریظ، نقاشی عظیم آبادی کی صہبائے بھا (1979ء) مقالہ۔ کلمات اک رباب (1966ء) تعارف۔ بکھری کرنیں (1980ء) تعارف۔ حکایت ہستی (1980ء) میرا نظریہ شعر اور میری شاعری (خودنوشت)۔ ماہنامہ کائنات مرزا پور، جمیل مظہری نمبر جون 1982ء اور جمیل مظہری نمبر ماہنامہ صبح پنڈ مارچ 1963ء) غبار کاروان، شعر و شاعری اور برکات اسلام (کائنات جمیل مظہری نمبر) ”اسلام اور نازیست کافر“۔ ”اجتماع ضدین“ (روزنامہ عصر جدید سلور جوہلی نمبر) قومیت کے ذہنی سانچے (بہار کی خبریں اگست 71ء) یاد ماضی (خودنوشت) آل انڈیا ریڈیو پنڈ سے نشر اور کائنات مرزا پور اپریل تا جون 82ء میں طبع) اس کے علاوہ بھی بے شمار تنقیدی مضامین و تقابلی مختلف ادبی جریوں میں چھپے یہ سارے مضامین بزبان خود ان کی تنقیدی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں۔

جمیل مظہری نے ایک اور صنف سخن کو معراج دی۔ وہ ہے مرثیہ نگاری۔ بقول کلیم الدین احمد ”اردو شاعری کے دامن میں صرف ایک ”مرثیہ“ ہے جسے مانگے کا نہیں کہا جاسکتا ورنہ تمام صنف سخن عربی و فارسی سے مانگی ہوئی ہیں۔“

میر نمبر نے صنف مرثیہ کو مسدس کا قالب دیا اور اس

رومیوں کے بعد قرون وسطیٰ میں صرف عرب قوم ہی ایسی تھی جس نے علم قانون کو ترقی دی اور دنیا کے سامنے قانون کا ایک جداگانہ نظام پیش کیا۔ یہ نظام بنیادی طور پر قرآن اور سنت پر مبنی اور یونانی و رومی قانون سے متاثر تھا اور تمام احکام الہی جو قرآن میں پیش کئے گئے ہیں اور احادیث نبویؐ میں ان کی تعبیر و تشریح کی گئی ہے، شریعت اسلامیہ کے ذریعے ان کو بعد کی نسلوں تک پہنچایا گیا۔ شریعت کے فرائض مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کو منظم کرتے ہیں۔ چاہے یہ شیعہ دینی ہوں کہ سیاسی یا سماجی۔ یہ احکام مسلمانوں کے ازدواجی اور مدنی تعلقات پر حاوی ہونے کے سوا ان کے غیر مسلموں سے تعلقات پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے تمام احوال و نواہی اسی مقدس قانون سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ قانونی اعتبار سے انسان کے تمام اعمال کو بائع الیواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) فرض: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور جس کا ترک کرنا قانوناً مستوجب عذاب ہے۔ (2) مستحب: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے لیکن نہ کرنے سے کوئی عذاب نہیں ہوتا۔ (3) جائز و مباح: وہ اعمال جن کے کرنے کی اجازت ہے اور قانون ان میں حائل نہیں کرتا۔ (4) مکروہ: ایسا عمل جو ناپسندیدہ تو ہے لیکن اس کے کرنے سے عذاب نہیں ہوتا۔ (5) ایسے اعمال جن کے کرنے سے عذاب ہوتا ہے اور ان کا کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

مسئلہ: قرۃ العین حیدر۔ اقراء شی، کراچی

لحم غور، علم دار کربلا اور مرانی کی دوسری جلد وجدان جمیل کے مرثیے وغیرہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جمیل مظہری کی جگہ اردو کے ان شعرا میں ہے جنہوں نے اردو شاعری کی روایت میں توسیع کی ہے۔ نئے ایجاد اور جہتیں پیدا کی ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے معنوی دائرے کو جس حد تک وسیع کیا ہے وہ یقیناً ان کا ایک اہم اور قابل قدر کارنامہ ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ اس انفرادیت کا ثبوت ان کی لوریوں میں بھی ہیں۔ جس طرح دو بے اور بے گیت کے ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لوری کو کبھی اس کے تحت جانا پہچانا

رکھا ہے کہ گریہ ویکا کی فضا تخلیق کرتے وقت امام حسینؑ یا ان کے اعزاءؑ احباب یا محذرات عصمت و طہارت کا ایسا کردار پیش نہ ہو کہ جس سے ظاہر ہو کہ مصائب و آلام نے ان کے عزائم میں شکست کی دماندگی پیدا کر دی تھی اور آپ کے تین کا یہ ابھی ایک بڑا وصف ہے کہ ان میں رقت و دلہوزی بھی خوب ہے یعنی ایک جانب بشری تقاضے بھی ہیں اور دوسری جانب الہوی تقاضے بھی پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جمیل مظہری کے ایک مرثیے سے جانب زینب کے مطمئن نفس کو دیکھیں۔

بیٹھ کر لاش پہ آنسو نہ بہایا اس نے  
میر منہدم نہ گوئیں دکھایا اس نے  
صحن میں آن کے سجادہ بچھایا اس نے  
سجدہ شکر میں سر اپنا جھکایا اس نے  
ماتا دل کو ملنے جو کئی بات یہ کی  
تھر تھراتے ہوئے ہونٹوں سے مناجات یہ کی  
اے میرے پالنے والے مرا فدیہ ہو قبول  
میری قربانی احقر مرے مولا ہو قبول  
آل احمد کا یہ تاجز ہدیہ ہو قبول  
پیش داغ دل دختر زہرا ہو قبول  
کیا ہے انداز نے میری کوکھ جو دیراں کردی  
تیری بخشش تھی تیری راہ میں قرباں کردی  
جمیل مظہری کا مزاج فلسفیانہ ہے جو کائنات کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی خاص نقطہ نظر کا سہارا لے کر نہیں کرتا بلکہ یہ حقیقت کی ذاتی تلاش و تاویل کا نتیجہ ہے کہ جمیل مظہری نے فطرت کی کھلی کتاب کو اپنے علم و وجدان اور تجربے کی روشنی میں واقعات کر بلا کا جائزہ لے کر مذہب اور خالص فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے بلند کیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ ہم اس سانچہ میں انسانی قدروں کو مکمل طور پر جلوہ گرد دیکھ سکتے ہیں۔ جمیل مظہری کا حکیمانہ شعور اخلاقی و روحانی پیکروں کو سامنے رکھتا ہے جس سے زندگی کے لیے جوش و حرارت کا پیغام مل سکے۔

حیف وہ قوم جو ہو ملت شاہ شہدا  
وہ حکومت کی کینری میں ہو حیرت کی ہے جا  
زندگی میت احساس ہے دل مردہ ہیں  
جتنے جذبات ہیں قومی وہ سب افسردہ ہیں  
جمیل مظہری کے مشہور مرثیوں میں عرفان محقق، مضرب  
شہادت، شام غرباں افسانہ ہستی عزم حکم، حقیقت نور و ناز



میڈیکل سائنس مسلسل ترقی کر رہی ہے۔ نئے نئے آلات اور دوا میں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک طرف انسانوں کو قتل کرنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک اسلحہ ایجاد ہو رہا ہے تو دوسری جانب انسانی زندگی کو بچانے کے لیے طبی آلات و نئی دوا میں بھی لائی جا رہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں طبیب مختلف جانوروں سے بھی علاج کے لیے مدد لیتے تھے۔ جیسے بادی خون کو نکالنے کے ”جوک“ کا استعمال، کرورد کے لیے سنگھی مچھلی سے ریزہ کی بڈی پر مچھلی کو چپکانا اور بھی بہت سے جانوروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر کتوں سے علاج میں پہلی بار کام لیا جا رہا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کتوں میں سوگھ کر شاخت کرنے کی صلاحیت بہت تیز ہے جو کینسر کا پتا چلانے میں بھی استعمال ہو سکتی ہے، جاپانی قصبے کانامیا کے 6000 سے زائد رہائشی ایک انوکھے مطالعے میں حصہ لے رہے ہیں جس کا مقصد یہ جاننا ہے کہ کیا کتے واقعی سوگھ کر کینسر کا پتا چلا سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ مطالعہ بین میڈیکل اسکول کے پروفیسر ماساؤ مایشیتا اور ان کے ساتھیوں کے زیر نگرانی کیا جا رہا ہے جبکہ اس مطالعے کے لیے مذکورہ قصبے کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہاں رہنے والے لوگوں کی بڑی تعداد معدے (پیٹ) کے سرطان میں مبتلا ہے۔ مطالعے میں شریک تمام افراد سے پیشاب کے نمونے لے کر ادارے کو بھجوائے جائیں گے جہاں خصوصی تربیت یافتہ کتوں کو ان کی بدبو سگھائی جائے گی۔ یہ کتے اگر کسی نمونے کی بدبو سوگھ کر شدت سے جھوٹے لگیں گے تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ متعلقہ فرد کو یا تو پیٹ کا کینسر ہو چکا ہے یا پھر وہ اس مرض میں مبتلا ہونے کے قریب ہے۔ البتہ اس بات کی تصدیق دوسرے طریقوں سے بھی کی جائے گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ ان تربیت یافتہ کتوں نے پیٹ کے سرطان کی تشخیص درست طور پر کی ہے یا نہیں۔

اس طول بیاں سے یہ غرض ہے  
نفرت بھی تمہاری ایک مرض ہے  
دشمن سے جو دشمنی کرو گے  
اس قرض کا سودا بھی بھرو گے  
(آب و سرب)

اب آخر میں ان کی غزل پر بھی دو باتیں کر لی جائیں۔  
اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر تھے ان کی شعری  
تحلیقات قاری کو دعوت فکر و نظر دیتی ہیں۔ ایک فکری شاعر اپنا  
ایک نظریہ حیات رکھتا ہے۔ وہ اس عالم کون و فساد کو اپنی مخصوص  
نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری اس کے نظریے کی فن کارانہ  
ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا نظریہ حیات اس کی تخلیقات میں  
ایک ربط پیدا کرتا ہے جس کی بنیاد پر قاری کچھ نیت نیچے اخذ  
کر کے اس کے نظریے کو رد یا قبول کرتا ہے۔

جیل مظہری نے اردو شاعری کی عام اور مروجہ روایت  
کے مطابق محض نظم نماغز لیں یا غزل نماغز لکھنے پر اکتفا نہیں  
کیا بلکہ اردو شاعری کی مختلف اصناف اور فارموں کو استعمال  
کر کے ان کے ذریعہ اظہار و بیان میں دوستیں پیدا کیں اور  
اپنے تجربوں کو نیا گداز اور نکھار عطا کیا۔ ان کے ہاں موضوع

جاتا رہا ہے۔ کافی بعد لوری آزاد صنف کی حیثیت سے تسلیم کی  
گئی۔ اردو ادب کی بد قسمتی ہے کہ شعرانے اس صنف سے بے  
توجہی رہی اور اردو کا دامن لوری سے خالی رہا۔ جیل مظہری  
نے جہاں بڑی تعداد میں بچوں کی نظمیں لکھیں وہیں لوریوں  
سے بھی اردو کی مانگ سمجھائی۔ جیل مظہری کی لوریوں کا کیوس  
کافی وسیع ہے۔ ان کے مخاطب اگرچہ بچے بچیاں ہیں لیکن  
زندگی کے مسائل، رموز و نکات، عصری سیاست، عالمی عصری  
صورت حال، امیر و غریب کے امتیاز و فرق کے زیریں لہریں  
بھی لوریوں میں مدغم ہیں۔ یہ انداز فکر لوریوں کو نئے رنگ اور  
نئی جلوہ سامائیاں عطا کرتا ہے۔

جاگتی سنسار کی پرچمائیاں بھی سو گئیں  
شام سے بجتی ہوئی شہنائیاں بھی سو گئیں  
نندہ پروانے لائی اور جگنو سو گئے  
سو گئیں سارنگیاں محفل کے ہٹکر سو گئے  
چلتے چلتے سو گئی صبح شبتاں سو رہو  
جان جاناں ..... سو رہو ..... سو رہو  
لوریوں کی طرح جیل مظہری نے مثنوی کو بھی حیات نو  
بخشی ان کی مثنویوں میں صرف مربوط داستان ہی نہیں ایک  
پیغام بھی پایا جاتا ہے۔

ماساؤ میاشیتا کا دعویٰ ہے کہ ان کے تربیت یافتہ کتوں میں صرف سوگھ کر سلطان کو درست طور پر شناخت کرنے کی صلاحیت تقریباً 100 فیصد ہے اور یہ مطالعہ اسی بات کی باضابطہ تصدیق کرے گا۔ واضح رہے کہ کتوں کی قوتِ شائستہ (سوگھنے کی طاقت) دوسرے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ بھیجی جاتی ہے اور غشیات سے لے کر دھماکا خیز مواد تک کو سوگھ کر تلاش کرنے کے لیے مختلف ادارے باقاعدہ تربیت یافتہ کتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان ہی باتوں کی بنیاد پر برٹنی ماہرین کا کہنا ہے کہ جس طرح کتوں کو غشیات وغیرہ سوگھ کر شناخت کرنے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح انہیں تربیت دے کر سلطان جیسی خطرناک اور جان لیوا بیماریاں کھوجنے کے قابل بھی بنایا جاسکتا ہے۔

گزشتہ دو عشروں کے دوران امریکا، برطانیہ اور جرمنی میں کتوں کے ذریعے کیفر کی تشخیص کے مختلف تجربات کیے جا چکے ہیں اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ کتوں نے مریضوں کی سانس، جلد اور پیشاب کی بدبو سوگھ کر کئی اقسام کے سرطانوں کی 90 فیصد سے بھی زیادہ درستگی کے ساتھ تشخیص کی جبکہ بیماری کے ظاہری آثار بالکل بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے باوجود ماہرین یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ سلطان زدہ خلیات آخر ایسا کون سا مادہ خارج کرتے ہیں جسے سوگھ کر کتے مبینہ طور پر متعلقہ شخص میں سرطان کی موجودگی کا پتا چلا لیتے ہیں۔ دوسری جانب ناقدین کا کہنا ہے کہ اول تو کتوں کے ذریعے سرطان کی تشخیص ایسی تک سچی طور پر ثابت شدہ نہیں اور دوم یہ کہ اگر کسی طرح کتوں کو صرف سوگھ کر سلطان شناخت کرنے کی تربیت دے دی جائے تو یہ ایک طویل اور مہنگا عمل ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے کسی بھی ایک کتے کی تیاری میں 4 سے 5 سال کا عرصہ لگ جائے گا اور 45000 ڈالر خرچ آئے گا۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف۔ ملتان

کے محسوسات و خیالات کی ایک الگ شخصیت بن گئی ہے لیکن افسوس اس شخصیت کا پرتو آج پورے برصغیر میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاگرد بنانے میں دلچسپی نہ لینا بھی ہے۔ جو بذاتِ خود ان کی شاگردی کے لیے پہنچ جاتے انہیں جلد ہی میدان چھوڑنا پڑتا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اشعار پر اصلاح نہیں، قطع برید کرتے تھے۔ اتنی زیادہ کاٹ پیٹ ہوتی کہ شاگرد کی غزل غائب ہو کر استاد کی غزل رہ جاتی۔ اس بات سے سبھی آگاہ تھے نتیجتاً لوگ اس شخص کی غزل کو مکھڑک نظروں سے دیکھتے جو خود کو جمیل مظہری کا شاگرد کہتا۔ شاید اسی وجہ سے سہیل جلیلی بھی بعد میں سہیل عظیم آبادی بن گئے۔ وہ اپنا کلام ننانے میں بھی جلیلی سے کام لیتے۔ بقول جوش لیج آبادی ”میرے محبوب دوست پروفیسر جمیل مظہری کی جب تک انہیں جسمانی زد و کوب کا اندیشہ نہ ہو، شعر نہیں سناتے۔“

کہتے ہیں ہر بڑا شاعر ناؤ نوش سے دلچسپی لیتا ہے مگر جمیل مظہری اس لعنت سے محفوظ تھے۔ جبکہ انہیں جوش لیج آبادی کی قربت بھی حاصل تھی۔ جوش کا ایک شعر خاص طور پر انہی کے لیے ہے۔

الحمد للہ جوش اس بد مذاقی کے زمانے میں

اور ہیئت دونوں اعتبار سے خاصی جدت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں یکساں اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر آسانی سے فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح ان کی نظموں کے تین واضح مدارج اور اقسام ہیں۔ رومانی، انقلابی اور قومی فکری و فلسفیانہ۔ اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تین نمایاں رنگ رومانی، انقلابی اور فکری و فلسفیانہ دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جمیل مظہری اپنی غزلوں کو افکار منظوم کا نام دیتے ہیں اور انہیں روایتی تغزل کے معیار کو پیش نظر رکھ کر غزل قرار دینے سے بچنا چاہتے بلکہ انکار کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے مجموعے کو ”فکر جمیل“ کے نام سے شائع کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی غزلوں کو فکر و فلسفہ جیسی چیز سمجھتے تھے۔

تھی زندگی خدا کا غضب اور مظہری موت اک خدا کا پیار ہے لے اس کا پیار دوست لیکن نقادوں کی رائے ہے کہ جمیل مظہری نے غزل کوئی کواکب نیاز حراج ایک نیا آہنگ بخشا ہے اور غزل کی روایتوں کو ایک نئی سمت دی ہے۔

ان کی غزلوں میں اپنے خدو خال اتنے واضح ہیں کہ جن

ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تین چار مرتبہ آواز دی۔ جواب نہ پا کر میری گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں اپنا نام لے کر ان کو متوجہ کرتا رہا۔ آخر بہت دھیمی آواز میں بولے ”میں سمجھا پاؤں“ انہیں باہوش پا کر کچھ غذا دینے کی کوشش کی وہ نہ مانے۔ اس گھر کے اخلاق کے مطابق ایسے شخص وقت میں بھی مہمان کی فیاضیت مقدم تھی۔ میرے لیے دسترخوان بچھ گیا اس پریشانی میں کیا کھانا پھر بھی پیٹھ گیا۔ اس دوران امیر رضا ماموں اپنی خالہ اور دیگر رشتے داروں کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور پاکستانی آعرہ کی خیریت بتاتا رہا۔ آخر جب میری بے تابی کم نہ ہوئی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر میں نے کہا ”اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے۔“ یہ جملہ بھی بار بار دہرائتا پڑا کچھ دھیمی آواز میں بولے ”معاف کیا پاؤں“ اور لوگوں سے میری حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ مجھے باتوں میں لگا لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سگریٹ مانگا دو ایک کش یوں لیے کہ امیر رضا ماموں کے ہاتھ میں سگریٹ تھی جو ان کے ہونٹوں پر لگا دیئے۔ دس منٹ بعد انہوں نے کروٹ لی اور نیکے پر کچھ بلند ہوئے۔

میں نے امیر رضا ماموں سے کہا ”ان کو جلدی سے اچھا کر دیجئے“ میں آیا ہی ہوں ان کو کراچی لے جانے کے لیے۔ وہاں ان کے چاہنے والے بہت ہیں۔ ان کے شاگردوں کی وہاں اتنی پذیرائی ہوتی ہے یہ خود بخود جائیں تو دھوم مچ جائے گی۔ ان کو تو سب مانتے ہیں صرف میں ان کے خلاف لکھنے لگا ہوں۔

کاظم ماموں نے یہ جملہ سنا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب کسی قدر قوت کے ساتھ کاظم ماموں (جیل مظہری) بولے ”رات بھر تو ٹھہر جاتے۔“ میں نے عذر پیش کیا کہ صبح آؤں گا۔ آخر جب اٹھا تو صاف اور بلند آواز میں ”بی امان اللہ“ کہہ کر کاظم ماموں نے رخصت کیا۔ یہ ان کی آخری آواز تھی جو میں نے سنی تین دن بعد وہ خود اللہ کی امان میں چلے گئے۔“

23 جولائی 1980ء کو رات کے گیارہ بجے وہ راہی ملک عدم ہوئے۔ جنازہ اگلے دن ساڑھے چار بجے سہ پہر میں اٹھا اور انہیں ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اپنے مرنے کی تاریخ انہوں نے خود ہی ”مظہری مرد“ سے (1399ھ) نکال لی تھی لیکن دس مہینے بعد رضا کاظمی مظہری نے ”از سر آہ“ سے ایک کے چھپنے سے (1400ھ) تاریخ نکالی۔

جیل مظہری سا قدر داں ہنشا گیا مجھ کو آخری ایام میں وہ خود سے اتنے بے پروا ہو گئے تھے کہ سہیل عظیم آبادی آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کا کنٹریکٹ بھیجا کرتے اور وہ اسے کم کر دیتے۔ مجبور ہو کر سہیل عظیم آبادی کنٹریکٹ ڈاک سے بھیجنے کی بجائے خود جا کر دستخط کر دیا کرتے تھے۔ کمرابیش بے ترتیب رہا کرتا۔ ڈھیلی چار پائی پر گندی میلی توٹک وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی۔ بستر کی چادر جیسے برسوں سے بدلی نہ گئی ہو۔ گرمیوں میں بھی سوئزرجم سے چکار پھتا۔ مڑے مڑے کاغذوں کا ایک ڈھیر سا توٹک کے نیچے جمع رہتا جن پر کلام لکھتے، قلم برداشت پوری پوری نظم یا غزل مثنوی میں کہہ ڈالتے۔ اساتذہ قدیم کے سیکڑوں اشعار یاد رکھتے مگر اپنا کلام بھول جاتے۔ ان کی زندگی میں شائع ہونے والے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

کلکتہ و فتح طویل افسانہ (کلکتہ 1950ء) نقش جیل (پٹنہ نظمیں کا مجموعہ 1952ء) فکر جیل (غزلیات و رباعیات پٹنہ 1959ء) آب و مراب (فلسفیانہ مثنوی کلکتہ 1970ء) عرفان جیل (مرابی قصائد لاہور 1970ء۔ الہ آباد 1979ء) وجدان جیل (مرابی دلی نظمیں لاہور 1979ء)

جیل مظہری کی زندگی میں ماہنامہ سہیل (گیا بہار) نے دو حصوں میں جون جولائی 60ء مجلہ جشن جیل مظہری پٹنہ نے 1975ء میں خصوصی شمارے شائع کیے اور اشغال کے بعد ماہنامہ ”کائنات“ (مرزا پور بولی) ماہنامہ ”آج کل“ (دہلی) اور سہیل (گیا) 1982ء میں خصوصی شمارے اور طالع افکار (کراچی) نے گوشہ شائع کیا۔

آخری ایام میں جیل مظہری کو پٹنہ یونیورسٹی نے خصوصی لیکچرر کی حیثیت سے مقرر کر لیا تھا وہ 1969ء سے 1974ء تک کئی کئی درس دینے چلے جایا کرتے تھے لیکن جب پیرانہ سالی نے ہیروں کو جکڑ لیا اور کثرت امراض نے پریشان کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے خود ہی سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنے چھوٹے بھائی رضا کاظمی مظہری کے ساتھ کلکتہ میں رہنے لگے۔

وہ مئی 1980ء میں بھیکن پور (مظفر پور) سفر پر روانہ ہوئے۔ کے بھر جی کہ وہ ہمیشہ کے لیے کلکتہ چھوڑ رہے ہیں۔ بھیکن پور کے قیام کا مشہور نقاد جناب سید محمد کاظمی ”تقیدی ورثا“ میں یوں نقشہ کھینچتے ہیں ”میں کاظم ماموں کی جانب مڑا ان کی آنکھیں بند تھیں اور ان پر غصہ کی طاری تھی۔ میں نے



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



## مشعلِ راہ

زویا اعجاز

علم کی ترسیل عبادت سے کم نہیں، لوگ اس اہم نکتے سے آگاہ ہیں پھر بھی کوشاں نہیں جب کہ مسلمانوں کو علم کی شمع جلانے کا حکم خاص ہے۔ جسے یورپیوں نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ خود بھی سیراب ہو رہے ہیں اور دیگر احباب کو بھی ترغیب دے رہے ہیں۔

ان افراد کی روداد جنہوں نے مشعلِ علم تمام کرا ایک مثال قائم کی

1972ء میں پیدا ہوا۔

اس کی زندگی بہت سی مشکلات اور کٹھنائیوں سے



عبارت رہی۔ روایتی

انماز میں تعلیمی سرگرمی

رہتے ہوئے اس نے

میٹرک پوری ٹیکٹ

یونیورسٹی سے نیلی

کمپیوٹر سسٹم میں

انجینئرنگ کرچکی ہیں کی

ڈگری حاصل کی۔ دوران

تعلیم اپنے اخراجات اور

دیگر ضروریات پوری

کرنے کی غرض سے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی ذمہ

داریاں بھرتے ہوئے اس نے بھی یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ

قدرت نے مستقبلِ بھید میں اس مقدس پیشہ سے وابستگی اس

کے لیے مقوم کر رکھی ہے۔

اس وقت اگر احباب ڈیوڈ سے مستقبل کی منصوبہ بندی

قرآن کا حکم ہے کہ ”پڑھو“، مگر کیا تعلیم حاصل کرنے اور

تعلیم دینے کا کام اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک اچھا عمل ہے۔

جب تک ہم نے علم و فن میں دلچسپی لی تو ہم علم و عرفان میں سب

سے آگے نظر آئے۔ بغداد ہو یا سپانیا، علم کی ترویج و تبلیغ میں

سب سے آگے تھے۔ اس وقت جب یورپ و امریکا میں لوگ

بہتر معاشرے سے قطعی لاعلم تھے۔ ہم میدانِ علم میں ران

کر رہے تھے لیکن آج؟ آج ہم علم سے دور بہت دور نظر آ رہے

ہیں اور یورپ و امریکا علم و فن کا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہی لوگ جو ہم

سے علم کے باب میں استفادہ کرتے تھے۔ اب ہمیں علم حاصل

کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ بہترین عالمی اساتذہ کا

تعیین کر رہے ہیں۔ اس بار ”مکھول ٹیچرز“ کا انعام جن دس

اساتذہ کو دیا گیا ان میں سے ایک سلیہ ہے جس کا تعلق اپنے

پاکستان سے ہے۔ ان کی سوانح آپ .... ”روایتِ صحن“ کے

عنوان سے پڑھیں گے اب باقی کے نو اساتذہ کا تذکرہ بھی ملاحظہ

کریں۔

اٹھین کے تاریخی شہر میڈر سے تعلق رکھنے والا ڈیوڈ



میڈرڈ کے گرد و نواح میں واقع سبکی تعلیمی ادارے روایات کے پابند تھے۔ کمر اجما جت کا محدود مٹھن زدہ ماحول طلبہ کی صلاحیتیں اجاگر کرنے کی بجائے خوابیدگی کی طرف مائل کرتا تھا۔ طلبہ کی اکثریت معاشی دباؤ کا شکار بھی تھی جس کے باعث اضافی کوچنگ کلاسز اور ایڈیڈ میں داخلے کا تصور بھی محال تھا۔ اسے اپنی ایڈیڈ میں ایسے طلبہ سے واسطہ رہتا جو کتابوں کو بوجھ گردانتے۔ ان میں خود اعتمادی کی شدید کمی تھی۔ بیزاری کا یہ سفر اس موڑ پر آن پہنچا تھا کہ وہ ریاضی کیبیا اور طبیعات سے نفرت کرنے لگے۔

ڈیوڈ کی دورانہدیش نظر اس اپنے ملک و قوم کے لیے مستقبل میں ذہانت، اہلیت اور تحقیقی صلاحیتوں سے مہر نسل نو کی ایک بڑی کھپ تیار ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے وسیع تر قومی مفاد کے لیے ذاتی مفاد ترک کر دیا اور ایک ایسی سپاہ کی تیاری میں جت گیا جو سائنسی مضامین کی اہمیت اور اس کی اصل روح سمجھ سکے۔ اس کی ذاتی رائے میں سائنس ہی انسانی زندگی کی بہتری، قومی اقدار کی تعمیر اور پرامن عالمی زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ ضرورت محض اس بات کی تھی کہ ان بے کیف مضامین کے لیے طلبہ کے دلوں میں تحریک، محبت اور تحقیقی جذبہ اجاگر کیا جائے تاکہ وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے ایسی طویل مسافت اختیار کریں جو بالآخر قومی ترن پر پہنچے ہو۔ ڈیوڈ نے اس جنگ کے لیے اپنے تمام تر تھکوار آزمائے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ قدرتی طور پر شیریں ذہن اور نرم مزاج تھا۔ اس کی گفتگو کی تاثیر مخاطب کے دل میں گھر کر لیتی۔ دیگر اساتذہ کی طرح وہ اپنی طلیت جھاڑنے سے گریز کرتا اور طلبہ کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق تعلیم دیتا۔ اس کا تشریحی انداز اور دوزمرہ زندگی سے منسلک مثالوں کے ذریعہ مشکل ترین سائنسی تصورات کا بیان اس قدر سادہ ہوتا کہ طلبہ دگ رہ جاتے۔ یہ ایرانی بتدریج تجسس، کھوج اور جستجو میں ڈھلنے لگی۔ ہم عصر اساتذہ کے برعکس کمرائے جماعت کا ماحول خوشگوار بنائے رکھتا ہی اس کی اولین ترجیح تھی۔

ڈیوڈ کو بخوبی علم تھا کہ ان مضامین میں طلبہ کن مقامات پر تفصیلی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے سادہ انداز بیان نے ان سبھی مسائل کا خاتمہ کر دیا۔ طلبہ کی سوچ اور ترجیحات میں تواضع تبدیلایاں نظر آنے لگیں لیکن ڈیوڈ کی پیشہ وارانہ سوچ اب بھی مضطرب تھی۔

2011 میں یہ اضطراب مزید شدت اختیار کر چکا

وریافت کرتے تو اس کی چمکنی آنکھوں، لبوں پر کھلتی مسکراہٹ اور کھویا ہوا انداز بآنگاہک دل ایک ہی عنند یہ دیتا کہ وہ انجینئرین کی دولت شہرت، کامیابی کی بلندیایاں چھوئے اور ٹیلی کیوٹیکیشن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا خواہشمند ہے۔ ڈگری مکمل ہوتے ہی اسے Florentino Perez, Xfera نامی مقامی کمپنی میں نوکری مل گئی۔ زندگی بہت سہل نہ تھی لیکن مشکل بھی نہیں رہی تھی۔

اپنے خوابوں کی تکمیل کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے ڈیوڈ کو پہلی ٹھوکر اس وقت لگی جب 2005 میں ٹیلی کیوٹیکیشن سکٹر میں مالیاتی بحران کی وجہ سے اسے بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بحران کی زد میں آکر ہزاروں ملازمین در بدر ہو گئے۔

خانمانی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے لیے اس نے چارونچا ر ایک بار پھر زمانہ طالب علمی کے سانھی کا ہاتھ تھام لیا اور عارضی سہارے کی غرض سے اسی ادارہ میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے میڈرڈ کے مضافات میں چھوٹے پیمانہ پر اپنی ایڈیڈ قائم کر لی۔

دو سال بعد ٹیلی کیوٹیکیشن شعبہ میں استحکام سے ڈیوڈ جیسے ہزاروں افراد کے لیے خوشحالی، معقول تنخواہ اور سہولیات کی نوید پیدا ہو گئی۔ یہ وقت اس کے لیے بہت کھن تھا۔ وہ ایک ایسے دورا ہے پر کھڑا تھا جہاں ایک راہنڈارے اپنے خوابوں کی منزل تک لے جانے کے لیے کانپیں دایکے پکار رہی تھی۔ اس منزل تک رسائی کے بعد دولت، تعیشات اور شاندار طرز زندگی پر دسترس یقینی تھی۔ لیکن ایک وجدانی جذبہ کے زیر اثر اس نے دوسری راہ اپنانے کا فیصلہ کیا اور شعبہ تدریس سے وابستہ رہے ہوئے مزید جذبہ، لگن اور خلوص سے نسل نو کی تربیت کا بیڑا اٹھا لیا۔

بحیثیت طالب علم ڈیوڈ نے نصابی دسترس کے لیے بہت کٹھناتوں کا سامنا کیا تھا۔ ریاضیات، طبیعات، کیمیا اور ٹیکنالوجی جیسے مضامین اس سمیت ہزارہا طلبہ کے لیے کوئین جیسے تھے جنہیں گھنا محض ایک مجبور ہی تھی۔ اساتذہ کا روایتی طریقہ تدریس خشک، غیر دلچسپ اور بے کیف ہوتا۔ ان مضامین میں معمولی غلط جنبش پر تمام تر جوابی مواد میں نا کا می طلبہ کو مزید خائف اور بیزار کیے رکھتی۔ یہ اہم ترین سائنسی مضامین محض اچھے نمبر اور گریڈز کے حصول کے لیے طوعاً و کرہاً پڑھے جاتے تو لامحالہ طور پر عملی زندگی میں ان پر دسترس اور اطلاق ایک بعد از قیاس امر تھا۔

### فاروق قیصر

زندگی ایک تماشا ہے۔ ہم سب اس کا حصہ ہیں۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر اور کہیں بڑے پیمانے پر کچھ پتلی تماشا جاری ہے۔ کس مسئلے کا تعلق کس بات سے ہے، کس بات کا کیا مطلب ہے؟ اس طرح کے سوالوں کے ذریعے زندگی کی باریکیوں کو حراح کے انداز میں پیش کرنے والی ایک ہی شخصیت ہے جس کو ہم فاروق قیصر عرف انکل سرگم کے نام سے جانتے ہیں۔ فاروق قیصر بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ بی ٹی وی کی تاریخ میں جب بھی مزاحیہ پروگراموں کی تاریخ لکھی جائے گی، اس میں انکل سرگم کا پروگرام ”کھلیاں“ سرفہرست ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ روزنامہ جنگ میں فکر انگیز کالم لکھتے ہیں، پینٹل کالج آف آرٹس کی وزیٹنگ ٹیچنگی میں بھی ہیں۔ ملائیشیا میں یوسیٹ کی طرف سے انہیں ”ماسٹر پیٹ آف دی ریجن“ کا خطاب بھی ملا۔ ان کے کریڈٹ پر بہت سی بہترین تحریریں اور گفتے چلے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ مزاح کی دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں، ایک شاعری آگے بھی آپ کی شخصیت کا حصہ ہے۔ ان کی گفتگو میں کئی ہے مگر سچ ہے۔ ان کے زندگی کو دیکھنے کے زواوے بہت مختلف مگر اچھے ہیں۔

اقتباس: باتوں کی بیانی میں ٹھنڈی چائے  
از: خرم سہیل

مقبول ہو گیا۔

اس چینل کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دسمبر 2012 میں اس کا شمار یورپ میں گوگل پر تلاش کیے جانے والے 25 سرفہرست چینلوں میں ہونے لگا اور اگلے دو سال میں یوٹیوب کوں سو بہترین عالمی چینلوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ 2014 میں ڈیوڈ نے tunicoos.com فری آن لائن ان کیڈمی کا اجراء کر دیا۔ اس کے لیے طلبہ کا پورے جملہ بہت خوش کن اور مثبت محرک تھا۔ اسے عوامی مقبولیت یا کسی بھی سرکاری انعام و کرام سے غرض نہ تھی۔ اس کے پیش نظر تو صرف ان بھی بچوں کا بہتر مستقبل تھا جنہیں آئندہ زندگی میں اپنے خاندان ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنی تھی اور یہ مقصد واضح تر سائنسی تصورات اور ٹیکنالوجی پر دسترس کے بنا حاصل کرنے کی سوچ دیوانے کا خواب تھی۔ اپنے فکر و جماعت اور ڈیوڈ یوز میں وہ طلبہ کو بارہا ایک

تھا۔ اسکول ان کیڈمی میں گزارے گئے چند گھنٹے ان طلبہ کے لیے ناکافی تھے۔ علاوہ ازیں وہ ان لاکھوں طلبہ کے لیے بھی آزر رہتا جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر اب بھی روایتی طریقہ تدریس سے جنگ آزما تھے۔ ڈیوڈ رنگ، نسل، قوم کے فرق سے قطع نظر سب طلبہ کو یکساں مواقع دینے کا قائل تھا۔ اس کی دانست میں مساوات اور وسائل کی یکساں تقسیم ہی عالمی افق پر یقینی مثبت تبدیلی کا واحد حل ہیں اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے حساس ذہن میں ایک ایسے اچھوتے خیال نے جنم لیا جس نے عالمی تعلیمی تاریخ میں انقلاب برپا کر دیا۔

ڈیوڈ نے اپنی کاوشوں کی ترویج کے لیے اپنے مختصر لیکچرز ویڈیو کی صورت میں ریکارڈ کیے اور پھر انٹرنیٹ کا ڈونٹ کے ذریعہ یوٹیوب پر بھی ویڈیوز اپلوڈ کر دیں۔ مخصوص سادہ، دلنشین اور غیر روایتی انداز میں بنائی گئی یہ ویڈیوز محض دس منٹ کے دورانیہ میں طلبہ کو وہ تصورات سمجھا دیتیں جنہیں وہ دو سے تین ماہ کی روایتی تدریس کے بعد بھی سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ طبیعیات، کیمیا اور ریاضی اب ایک من پسند اور دلچسپ صورت اختیار کرنے لگے۔ ڈیوڈ کی یہ ویڈیوز ان کیڈمی کے بچوں، تیس طلبہ کو مد نظر رکھ کر نہیں بنائی گئیں بلکہ اس کی سوچ آفاقی تھی۔ وہ اپنا وجود ایک ہماری ذمہ داری تلے با محسوس کرنے لگا تھا۔

خلوص اور ملکن کی راہ کبھی بھی متوازی نہیں رہ پاتی۔ مخالفت اور سازشیں ایک آزمائش بن کر لازماً قوت پر واز آزماتی ہیں۔ ڈیوڈ کو بھی روایت پرست اداروں اور اساتذہ کی محاذ آرائی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں اس انقلابی قدم سے اپنے اداروں کی بقاء اور معاشی برتری خطرہ میں نظر آنے لگی تھی اس لیے مختلف الزام تراشیوں اور افواہوں کا ایک بازار گرم ہو گیا۔ اس کے لیے یہ صورت حال نہایت افسردہ اور دل شکن تھی۔ اس کے خلوص نیت پر شبہ بظاہر بے غرض جذبات کی توہین تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مخالفین کو دو ٹوک موقف سے واضح کیا کہ اس کی بنائی گئی ویڈیوز کراٹھے جماعت اور اساتذہ کا متبادل کسی صورت بھی نہیں ہو سکتیں۔ اس کی یہ کاوشیں محض اساتذہ کی مدد کا ذریعہ ہیں تاکہ وہ بھی طلبہ کو بہترین تعلیمی تصورات فراہم کر سکیں۔

ان شخص حالات اور مخالفت کے باوجود اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور Unicoos نامی ایک آن لائن تعلیمی چینل کا آغاز کیا۔ اس چینل تک رسائی ہر لحاظ سے بلا معاوضہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے یوٹیوب کوں آج تک اور لائیو امریکا میں بے حد

ڈیوڈ کی اس کٹھن جدوجہد کا لامتناہی سفر اب بھی جاری ہے۔ وہ طلبہ کا مکمل نبض شناس ہے۔ بحیثیت معلم وہ طلبہ سے جنس چند شخصے کے تعامل کا قائل نہیں۔ طلبہ شب و روز میں کسی بھی وقت واٹس ایپ پر رابطہ کر کے اس سے اپنے تعلیمی مسائل کا حل دریافت کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ پیشانی پر کوئی بھی شکن لائے بغیر انھیں فوری رہنمائی فراہم کر دیتا ہے۔

ڈیوڈ اپنی اکیڈمی کے طلبہ کو اسباق میں مسائل کے حل کی نشاندہی کرنے کے بعد غیر محسوس طریقہ سے ان کی انگلی تھامے ایک ایسے مقام پر لے آتا ہے جہاں وہ خود ان مسائل کو حل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ امتحانات کے دوران ان کے شکوک و شبہات خوف زائل کرنے کے لیے وہ اپنی تدریس کا دورانیہ بھی بڑھانے میں متامل نہیں رہتا اور یہ بھی اقدام بلا معاوضہ ہوتے ہیں۔

ریمنڈ برطانوی نژاد ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے وہ بہت ذہین جدت پسند اور ذمہ دار تھا۔ کمپیوٹر کی جادوئی دنیا تسخیر کرنا اس کا جنون تھا لیکن لوحِ تقدیر میں اس کے لیے کچھ اور ہی مقوم تھا۔ وہ حادثاتی طور پر شعبہ تدریس سے وابستہ ہوا۔ پھر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس میدان میں دریافت اور تسخیر کا ایک وسیع جہان آباد ہے۔ اس وقت برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی کمپیوٹر کی تدریس روایتی اور غیر ترقی یافتہ تھی۔

انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) سے منسلک ریمنڈ کے لیے یہ صورت حال بہت مایوس کن تھی۔ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں جب زندگی کے ہر شعبہ میں کمپیوٹر کی اجارہ داری ہے غیر ترقی یافتہ اور روایتی انداز میں طلبہ کے ذہن میں بھاری بھر کم اصطلاحات زبردستی ٹھونسا انھیں اس مشین کے تابع بنانے کے مترادف تھا۔ ریمنڈ نے شب و روز کی محنت کے بعد Microsoft Kinect استعمال کرتے ہوئے



تدریس میں تنوع پیدا کیا جس کی رو سے آئی سی ٹی ٹیکچرز کم خشک اور بے حد دلچسپ بن گئے۔

اس نے وادیتی طریقہ کار ترک کرتے ہوئے اپنی جماعت میں ہلکا پھلکا انداز رائج کیا۔ طلبہ کو ہمہ وقت مختلف عملی سرگرمیوں میں

بات دہراتا۔ ”امید کا دامن کبھی مت چھوڑو۔ اپنی امید کبھی ترک مت کرنا۔ آج بکل زندگی میں کسی بھی مقام پر نہیں۔“ وہ ان طلبہ کو ناکامی اپنی ذات پر عدم اعتمادی کے آسیب سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا تاکہ زندگی میں کسی بھی موڑ پر وہ معاشی خوراک کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔

یونیٹکس کی کامیابی کے باوجود ممتاز افراد کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنی اکیڈمی کی توسیع کے لیے کوئی شراکت دار میسر نہ آ سکا۔ اس افسوسناک امر کی وجہ یہ تھی کہ یونیٹکس ایک نئی پڑی ایک ایسا تعلیمی چینل تھا جس میں کوئی مالی منفعت شامل نہ تھی۔ ڈیوڈ نے اس رویے پر کبھی حرف شکایت تک ادا نہ کیا۔ ہاں! اس کے دل میں ایک خواہش ضرور تھی کہ اگر وہ معاشی طور پر محکم ہوا تو اپنی رقم اساتذہ کی تربیت پر صرف کرے گا۔

ابتدائی مخالفت کے باوجود یونیٹکس کی مقبولیت نے کئی ریکارڈ قائم کیے۔ اس کی بنیادی رقم تقریباً 700 ویڈیوز استعمال کرنے والے افراد کی تعداد سو ملین تک پہنچ چکی ہے۔ یونیٹکس پر 700,000 افراد اس کے چینل سے مستفید ہوتے ہیں جبکہ فیس بک پر استعمال کنندہ کی تعداد 170,000 ہے۔ فی الوقت یونیٹکس نے اسپین کے تین بہترین مجتلو میں رسائی حاصل کر لی ہے اور کئی اساتذہ اپنی تدریس میں ان ویڈیوز کا استعمال کرتے ہیں۔ قومی سطح پر ڈیوڈ کے اس منفرد سلسلہ کی اہمیت اب مسلمہ ہے۔ چند ماہ قبل اسے بہترین یوٹیوبز کا ایوارڈ دیا گیا۔ گوگل انعامیہ کی جانب سے یونیٹکس کو ہسپانوی معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرنے پر نہ صرف ایک خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا بلکہ ڈیوڈ کو یورپی پارلیمنٹ میں اپنی طویل جدوجہد کی داستان بیان کرنے کے لیے بھی مدعو کیا گیا۔ یونیٹکس واحد ہسپانوی چینل ہے جسے قومی سطح پر کئی بار خصوصی اعزازات ملے ہیں۔ تیس سے زائد ممالک میں پندرہ ہزار افراد اس کے باضابطہ رجسٹری شدہ صارفین ہیں۔

ان گرانقدر کامیابیوں کے باوجود اس کی کئی خواہشات اب بھی تشنہ ہیں۔ وہ بڑے بڑے فنانس حیاتیات، شماریات کے طلبہ کے لیے بھی اس انقلابی مہم کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پُر خلوص کاوشیں مستحق اور نادار طلبہ کے لیے نفع غیر متزقہ ہیں۔ بولیویا سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی نے کسی بھی تعلیمی ادارہ کی مدد کے بغیر شخص ویڈیوز سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے امتحانات میں کامیابی حاصل کر لی۔ اسپین ہی کا ایک نابینا محکم بصارت سے محرومی کے باوجود انہی ویڈیوز کے بل بوتے پر سائنسی تصورات میں کسی بھی نازل طالب علم سے کمتر نہیں۔

اختیار کر گیا ہے۔ اسے اپنے طلبہ سے بھی بہت محبت ہے۔ معلم و معلم میں تا عمر برقرار رہنے والا یہ رشتہ اپنی طرز میں منفرد ترین ہے۔ اس کے لیے تدریس ایک مکمل طرز فکر و طرز زندگی ہے۔ تعلیم کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور معلم بھی ہر روز ایک نئی چیز سیکھتا ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کے لیے مثبت سوچ، کردار اور لگن سے لیس سہا تیار کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

ریمنڈ کی ذاتی زندگی بھی توازن، خوشیوں اور نظم و ضبط سے گندھی ہے۔ بہترین سوچ سے لیس شریک حیات نے اس کے جنون اور ہتجو کے سفر میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی۔ ان دونوں نے باہمی رضامندی سے ایک کیلنڈر مرتب کر رکھا ہے۔ یہ خصوصی کیلنڈر موبائل فون کی یادداشت کے علاوہ گھر کی دیوار پر بھی آویزاں ہیں جس میں معمولی ترین امر کی منصوبہ بندی بھی پہلے سے ہی طے شدہ ہے۔ نظم و ضبط کے سلسلہ میں وہ کسی بھی سمجھوتے کا قائل نہیں اس لیے اکثر وہ پیشتر ایسے لوگوں سے نالاں رہتا ہے جو تدریس جیسے مقدس اور ارفع شعبہ میں درجہ چش مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے شخص ذہانی جمع خرچ کرتے ہیں۔

اس جواں سالہ معلم کو قومی سطح پر کئی ایک ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 2013/14 میں اسے جدید مستعد اور ذہین ترین ماہر تعلیم کا اعزاز دیا گیا جبکہ 2015 میں نیکانولوجی میں جدت اور آسانی پیدا کرنے کے لیے برطانوی قومی تدریسی ایوارڈ کا قریحہ فال بھی ریمنڈ ہی کے نام رہا۔

نیری کرشائن

قوم وطن پرستی ایک جلیب جذبہ ہے جو ہر انسان کی رگوں میں سایا ہوتا ہے۔ تاہم رنگ و نسل و وطن و قوم سے برادرہ کرکل انسانیت کی بھلائی کے لیے سرگرم رہنے والے افراد بہت کم ملتے ہیں۔ ایسے ہی نادر افراد میں جرنل کی 33 سالہ معلمہ نیری کرشائن بھی شامل ہے۔

نیری ایک توانا، غیر متعصب اور مقناطیسی شخصیت کی حامل ہے۔ میونسپل یونیورسٹی سے ریاضی اور کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی زندگی درس و تدریس سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ روایتی تعلیمی نظام بچوں کے نرم و نازک وجود اور لطیف نفسیات پر کتنا بلیں کسی بوجھ کی طرح لا کر انہیں بیزاری اور یقین تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ان روایتی طریقوں سے شعوری بغاوت کرتے ہوئے اس نے اپنے طلبہ کو تعلیم بذریعہ کھیل سے متعارف کروایا۔

شریک کرنے کے بعد خاطر خواہ نتائج میسر آنے لگے۔ اس کے ذاتی موقف کے مطابق معلم روشنی اور توانائی کا منبع ہے۔ روشنی کی رفتار بے حد طاقتور ہوتی ہے۔ اسی طرح جب معلم اپنے طلبہ کی زندگیاں روشنی سے منور کرتا ہے تو ظلمت کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ ریمنڈ جیمبرز بھی ایسی ہی روشنی بننے کا خواہشمند تھا۔

اس کی تخلیقی سرگرمیوں سے تدریس عمل میں تہذیبوں کی لہر آئی تو اس نے اپنے تجربات قومی سطح پر دیگر اساتذہ تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ آئی ٹی کو اپنا ہتھیار بنا کر ایک خصوصی بلاگ قائم کیا۔ اپنا تحقیقی مواد اور وسائل سے متعلق معلومات اس بلاگ پر ایڈ کر کے علاوہ وہ ٹوئٹر پر بھی آئی ٹی اساتذہ سے رابطہ قائم رکھتا۔ اس کے غیر روایتی نظریات ترقیاتی طرز فکر اور جدت پسندی نے بہت جلد تعلیمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

ریمنڈ کی اہلیت کی گونج عالمی سطح پر بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ 2012 میں اسے یورپی اساتذہ کی ایک خصوصی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس کے کچھ ہی عرصہ بعد حکومت برطانیہ نے ثانوی سطح پر آئی ٹی کا نصاب کمپیوٹر سائنس میں تبدیل کر دیا۔ اساتذہ کی اکثریت اس تبدیلی سے بہت خائف اور کسی حد تک عدم تحفظ کا شکار بھی تھی۔ ان معلمین کی معاونت اور پیشروانہ قابلیت میں اضافے کے لیے ریمنڈ کی خدمات حاصل کی گئیں۔

بعد ازاں اس نے اپنے ہم پیشہ افراد کی مزید اعانت کے لیے ایک یوٹیوب چینل کا اجراء کیا۔ اس کی لگن، سنجیدگی اور جدت پسندانہ سوچ نے کمپیوٹر سائنس کے میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس چینل کے 250,000 سے زائد صارف ہیں۔ اس کی روایت تھکنی اور جدید طریقہ تعلیم کی بدولت برطانوی نسل نو نے کمپیوٹر سائنس کے شعبہ میں اکثر یورپی اقوام پر برتری حاصل کر لی ہے۔ طلبہ کی شاندار کامیابی اور طرز فکر میں تبدیلی ریمنڈ کے لیے مزید تحریک کا باعث بننے لگی۔ اس نے اپنی تخلیق اور تحقیق کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب 'بی بی سی' نے قومی سطح پر اساتذہ کے لیے مائیکرو بٹ وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے اسے معاونت کی پیشکش کی۔

ریمنڈ جیمبرز کی بروک ویشن اکیڈمی میں زیر تعلیم طلبہ اسی کی صلاحیتوں کا پرتو ہیں۔ حادثاتی طور پر تدریس سے منسلک ہونے والے ریمنڈ کے لیے اپنا کام عشق اور جنون کی حیثیت

جرمن نژاد بچوں سے آبائی مکمل مل گئے ہیں۔ اپنی بیزاری اور اجنبیت فراموش کیے وہ بہترین زندگی کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔

نیری کرستان کا ذاتی اور پیشہ دارانہ فلسفہ زندگی بہت سادہ ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ تعلیمی ہی واحد ہتھیار ہے جس کے ذریعہ معاشرتی ناہمواریوں کو کنڈ کیا جاسکتا ہے۔ مکمل کود کے ذریعہ بچوں میں قوت برداشت، شکست تسلیم کرنے کی جرأت اور ہارجیت کے جذبہ سے قطع نظر جہد مسلسل کی لگن پروان چڑھائی جاسکتی ہیں۔ سامی رتبہ سے محروم بچوں، مہاجر طلبہ کے علاوہ افریقی ممالک میں سیاست و استحصال کی بینٹ چڑھنے والے محصلین کو زندگی کی رنگینیوں کی طرف واپس لانے کا سہرا صرف نیری ہی کے سر ہے۔

اس کی ساحرانہ شخصیت قوی اور بین الاقوامی سطح پر یکساں مقبول ہے۔ جرمنی، ناہنجیر یا اور دیگر افریقی اسکولوں کے باہمی تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے انتظامیہ کا پہلا انتخاب نیری ہی ہوتی ہے۔ امید خوشی اور مسادات کا درس دینے والی اس خاتون کی کاوشیں انمول ہیں۔ گلوبل نیچر پرائز میں نامزدگی کے علاوہ اسے سرکاری طور پر بہترین رہنما مسئلہ کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

ٹریسی این ہال

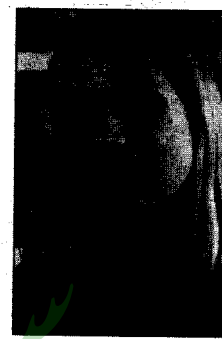
اس روئے ارض میں ہی انسانیت میں مظلوم ترین قوم بلاشبہ سیاہ فام افراد ہیں۔

نامنی بعید سے تادم تحریر ان کی حالت زار میں کبھی کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ نامنی میں سیاہ فام غلاموں کے لیے باقاعدہ منڈی لگائی جاتی اور ان مجبور بے کس افراد کی اس طرح خرید و فروخت کی جاتی گویا وہ انسانیت کے درجہ میں شمار ہی نہیں ہوتے۔ مغربی سامراجی طاقتوں نے افریقی اور دیگر سیاہ فام ممالک میں نوآبادیاں قائم کر کے یہاں استحصال اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا تھا۔ ان ممالک کے وسائل پر مکمل قابض ہونے کے بعد مقامی آبادی کو حقیر کچھڑوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔

مختلف ادوار میں ان گنت درد مند افراد نے ان مظلوموں کی سیاحتی کا بیڑہ اٹھایا۔ بہتری و ترقی کی رفتار سے ہی کسی لیکن ہر خطہ میں اب بھی جاری ہے۔ سیمینٹش ڈاؤن جیسا کہ یہ کامیاب ٹریسی این ہال نے سنبھال رکھا ہے۔

جیسا کہ عسرت زدہ، بنیادی ضروریات سے محروم زندگی کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ ٹریسی کا بچپن اور تعلیمی حالات بھی

اس روایت غنی کے نتائج نیری کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ طلبہ میں گہری دلچسپی اور محسوس پروان چڑھنے



لگا۔ اسکول کو جیل اور قید خانہ تصور کرنے والے محصلین ان غیر روایتی طریقوں کے سحر میں جکڑے کتب سے محبت میں مبتلا ہو گئے۔

نیری کرستان قدرتی طور پر ایک عظیم رہنما کی تمام تر صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ اس

کے نیچر طلبہ پرفسور طاری کر دیتے ہیں۔ طریقہ تعلیم میں جدت کی قائل ہونے کے ساتھ اسے نئے بچوں کی نفسیات پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ اس کے کرانچ جاعت مجھیرے کے جال کی مانند ہیں جس میں ایک بار جکڑ لیے جانے کے بعد رہائی کسی صورت بھی ممکن نہیں ہوتی۔

طلبہ گروہی سرگرمیوں کی صورت میں کام کرتے معاشرتی تعامل سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ نیری کی شخصیت ان کے لیے کسی سیاح سے کم نہیں۔ وہ اسے اپنے گھریلو اور ذاتی مسائل بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اور اس کے فراہم کردہ مشورہ اور تجاویز پر دل و جان سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ نیری کی کرستان کی ذات کا ایک اور خوبصورت پہلو مہاجر بچوں سے دلی لگاؤ اور ہمدردی ہے۔ اپنی شخصی شناخت اسباب زندگی، گھربار اور خوبوں سے منہ موڑے کسی نئی سر زمین میں بسنا بلاشبہ ایک بہت کٹھن امر ہے۔ اس کے بعد مہاجر کی قسمت ایک نئی آواز کا آغاز کر دیتی ہے۔ نئے لوگ ماحول، اقتدار، ثقافت اور سر زمین میں اس کا حراج اور فطرت کی جڑیں پیوست ہونا بھی قطعی سہل نہیں ہوتا۔

ہجرت کے اس دردناک عمل میں بچے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اگر وہ اپنے نئے ماحول میں معاشرتی تعامل حاصل نہ کر پائیں تو شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت ذاتی شکستگی اور خود اعتمادی سے محرومی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ نیری کی خصوصی توجہ بھی انہی بچوں پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ اپنی محبت، شفقت اور خدا داد صلاحیتوں سے انہیں زندگی کی طرف دوبارہ مائل کر کے ذاتی وقار اور کردار کی نئی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ اس کی انہی کوششوں کے نتیجے میں ایران اور دیگر ممالک کے مہاجر بچے



تعلیمی تاریخ میں پہلی بار ٹریسی کی اس جماعت نے 95 فیصد سے زائد نمبر حاصل کیے۔

تعلیمی برتری سے قطع نظر سیاہ فام ٹریسی اپنے طلبہ کے دلوں میں انسانیت کی خدمت اور ترقی بھی پیدا کرتا چاہتی تھی۔ اس نے طلبہ کے باہمی تعاون و تعامل سے بے گھر، سرکوں اور گلیوں میں رہائش پذیر افراد کے لیے طعام کی فراہمی کا آغاز کیا۔ جو پھر خود حرکتی کلب اور اسکول میگزین کمیٹی کے لیے اس کی محنت و کوششیں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔



گذشتہ سالوں میں ٹریسی کے طلبہ اس سے سیکھی گئی تمام تر پیشہ وارانہ اقدار سیٹھ جیک کے مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں۔ پولیس افسران، اسکوبا، ڈائمنڈرز، ہوٹل مینجرز اور شیف کے علاوہ خود حرکتی صنعت میں

موجود یہ طلبہ اپنی اس روایت شکن مکتبہ سے کیے گئے چند وعدوں پر آج بھی کار بند ہیں۔ زندگی میں ہمیشہ ترقی کی جانب گامزن اور مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کا درس وہ بھی فراہم کر رہے ہیں۔

ٹریسی کے لیے کمر لگنے جماعت اپنی ورکشاپ کے مترادف ہے۔ کمرے کی چار دیواری میں جا بجا ایسے چارٹس آویزاں کیے گئے ہیں جن پر سابقہ طلبہ کی شاندار کامیابیاں اور حالیہ محققین کے مقاصد زندگی، خواب اور ارادے جلی حروف میں رقم ہیں۔ ان طلبہ کے باہم دوستانہ مقابلوں میں بہتر گریڈز اور نمایاں بہتری حاصل کرنے والے بچوں کو ٹریسی ذاتی سطح پر تحائف اور انعام و کرام سے نوازتی۔

وہ اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بہت سے اداروں سے منسلک رہی۔ اور ہر ادارہ میں اس کی لگن بہت محنت اور کامیابی کا تناسب یکساں رہا۔ اس نے خود حرکتی مشین صنعت سے وابستہ با اختیار اور اشرور سوخ کے حامل افراد تک ذاتی رسائی کے بعد انہیں ہر ممکن طریقہ سے قائل کیا کہ ذہین اور متقی طلبہ کے لیے وظائف فراہم کیے جائیں۔

وسائل کی شدید کمی کے باوجود اس نے انتہائی خوش سلیستگی سے تدریسی مواد کی فراہمی میں بھی تعطل نہ آنے دیا۔ لگن و خلوص کا یہ عالم ہے کہ تعطیلات گرما میں کٹر معاشی

نہایت دگرگوں تھے۔ وہ ”ڈسلیسیا“ نامی بیماری کا شکار تھی۔ اس بیماری میں طالب علم متوازن ذہانت کے باوجود بہت سے مسائل میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسے الفاظ کے چپے کرنے، ان کی شناخت، تلفظ کی ادائیگی، الفاظ کی لکھائی، ذہن میں ان کے تلفظ کی گونج محسوس کرنے میں پریشانی کے علاوہ پاکواز بلند ادائیگی میں بھی بہت دشواری ہوتی ہے۔ ڈسلیسیا کا قوت ساعت و بصارت میں عدم توازن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایک جینیاتی اور ماحولیاتی مسئلہ ہے۔ عموماً یہ منفرد بیماری اسکول میں ابتدائی طور پر ہی تشخیص کر لی جاتی ہے لیکن ٹریسی کی بد قسمتی دیکھیے کہ اسے کوئی سبب نہ ملا۔ اپنی غیر تشخیص شدہ اس محرومی کے لیے کوئی بھی سہولت و علاج میسر نہ آ سکا۔

پڑھائی لکھائی میں حائل ان ناقابل عبور رکاوٹوں سے جنگ آزمائشی نے اسکول تعلیم مکمل کرنے کے بعد خود حرکتی مشینوں (Automotive) کے ایک کیراج میں فنی تعلیم سیکھنے کا آغاز کیا تو اسے علم ہی نہ تھا کہ مجبوری کے عالم میں لیا گیا یہ فیصلہ مستقبل قریب میں اس سمیت سینکڑوں طلبہ کی زندگیوں کا رخ تبدیل کر دے گا۔

کیراج میں ملنے والی اس فنی تربیت نے ٹریسی کے دل میں تدریس کے لیے محبت اجاگر کر دی۔ اپنی تعلیمی صلاحیت میں اضافہ کے لیے اس نے جیک کے ایک ایسے کالج میں داخلہ لیا جہاں پیشہ وارانہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اگلے تین سال میں وہ اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑتی گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

ٹریسی کے شہر روہیہ اور طرز فکر نے آغاز ہی سے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ اولین طور پر اسے جن طلبہ پر مشتمل جماعت کی تدریس تفویض کی گئی ان کا سابقہ ریکارڈ بے حد خراب تھا۔ اساتذہ کے نقطہ نظر میں وہ ناقابل اصلاح بچے تھے۔ ان 30 لڑکوں پر مبنی جماعت کے لیے ٹریسی نے ان تھک محنت کی۔ ان کی ذہن سازی، کردار کی تعمیر اور پھر شاندار تعلیمی نتائج کا حصول ایک بے مثال کارنامہ تھا۔

اس نے اپنی جماعت میں ایک کتب خانہ قائم کر لیا اور ہر کتاب کی تکمیل کے بعد طلبہ سے تبصرہ و باہمی گفتگو کے لیے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ دسویں گریڈ کے وہ سبھی بچے مثبت تبدیلیوں کی زد میں آ گئے۔ اگلے گریڈ میں منتقلی کے بعد یہ تبدیلی ان پر اس قدر حاوی ہوئی کہ آٹھ لڑکوں نے اسکول طائفہ میں شمولیت اختیار کر لی اور ایک طالب علم اسکول ہیڈ ہوائے کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔ خود حرکتی پیشہ وارانہ امتحانات میں اسکول کی

ماہنامہ سرگزشت

قائل نہ تھا۔ وہ عملی سوچ کا حامل شخص تھا۔ اس نے دیگر اسکولوں کے سربراہان اور اساتذہ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ایک نئے سماجی فلاحی منصوبہ 'Young Scientists: Designing a New Future' کے مندرجات پر کام کرنے کا آغاز کیا۔ اس منصوبہ کا مقصد طلبہ میں یہ احساس اجاگر کرنا تھا کہ اسکول اچھا شہری بننے کی تربیت کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے کردار میں تبدیلیوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس منصوبے سے قطع نظر ویرن نے ذاتی طور پر بھی سائنسی مضامین کی تدريس 'ڈنٹین موثر اور دیرپا بنانے کے لیے نت نئے تجربات کا آغاز کر دیا۔

اپنی تدریسی عمل میں تحریک اور طلبہ میں توانائی و اتحاد پیدا کرنے کے لیے اس نے نصاب میں 'پیروڈی گائے' شامل کر دیئے۔ کمرٹے جماعت میں 'دوری جدول' (Periodic Table) کی پورا ورنگ ترین سرگرمی میں دلچسپی کے لیے وہ طلبہ کو نزدیکی دریا کی علاقہ میں لے گیا تاکہ انھیں آبی آلودگی گدلے کچڑے پیدا ہونے والی ماحولیاتی آلودگی کا براہ راست مشاہدہ کر سکیں۔

بعد ازاں پانی میں موجود کیمیکلز کے تجزیہ کے لیے مطلوبہ نمونے اسکول لیبارٹری میں لے جائے گئے۔ اس پانی سے پیدا ہونے والے طبی و ماحولیاتی مسائل سے واقفیت کے لیے مقامی آبادی کا انٹرویو بھی لیا گیا۔ ان حقائق کی روشنی میں وفاقی یونیورسٹی UFES کی لیبارٹری میں بھی کئی ایک دورے کرنے کے بعد ساحلی علاقوں میں رہائش پذیر آبادی کے مسائل کا منطقی حل تلاش کر لیا گیا۔

ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اگلے چار سال میں تو بے فیصد طلبہ نشیات و جرائم کی دلدل سے آزاد ہو گئے۔ ویرن کا یہ اسکول برازیل کے بہترین اداروں میں شامل ہو چکا ہے اس اسکول ہی کی بدولت ایسے ملحقہ علاقہ کی شہرت میں مثبت تبدیلی پیدا ہوئی ہے جہاں نشیات کی ترسیل، پس ماندگی اور تشدد کے باعث دیگر علاقوں کے رہائشی قدم دھرنے سے بھی سخت خوفزدہ رہتے تھے۔

ویرن نے پیشہ وارانہ زندگی میں اپنے فرسودہ تعلیمی نظام کی روایت شکنی کرتے ہوئے تاریخی اقدام اٹھائے۔ اس نے معاشی دباؤ کے شکار طلبہ کو ہر قسم کی اخلاقی اور مالی مدد فراہم کرنے کے علاوہ ہم پیشہ افراد کی تربیت میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اس کی زندگی شخص حیاتیاتی سائنس پر کامل عبور اور اپنے معاشرتی نظام میں اصلاح کے لیے وقف ہے۔ ویرن نے

خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے وہ خصوصی سرکپ منعقد کرتی ہے۔ ٹریسی کا مقصد زندگی صرف اپنی قوم اور نسل نو کی ذہنی مضبوطی اور تعلیمی برتری ہے۔ اس کی کادشوں کو خاطر خواہ پزیرائی تو نہ مل سکی لیکن محدود وسائل کے مطابق مقامی و قومی سطح پر اس کی خدمات مختلف ایوارڈز کی صورت میں سراہی جاتی رہی ہیں۔

گلوبل نیچرز پرائز کے لیے نامزدگی بلاشبہ اس کے خوش کن خوابوں کی تعبیر تھی تھی لیکن ٹریسی یہ انعامی رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

ویرن ڈسلاوا نوگیرا Wemerson Dasilva Nogueira

ویرن 1990 میں برازیل کے علاقے "نوا وینیشا" میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین کا تعلق کا شکار طبقے سے تھا۔ سات بہن بھائیوں میں ویرن سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی زندگی میں اضافی لاڈ پیار اور ناز غروں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس کے سبھی بہن بھائی سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم رہے۔ ویرن کی دلچسپی کا محور حیاتیاتی سائنس تھا۔ اس نے گریجویٹن کی ڈگری کے فوری بعد ہی تدریس کا آغاز کر دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے مضافاتی علاقہ میں واقع جس اسکول میں پڑھانے کا موقع میسر آیا، وہاں جرائم کی شرح بے حد بھیاں تک پہنچی۔ اسکول میں زیر تعلیم طلبہ کے والدین کا سکہ بند مجرم تھے۔ انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بچے بھی کم عمری ہی سے اسی راہ پر گامزن تھے۔ اسکول اساتذہ انتہائی مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔ تشدد اور نشیات کی ترسیل ایک نامور کی طرح اس معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ عمر گمراہ بچے بھی نشیات کی خرید و فروخت میں ملوث رہتے۔



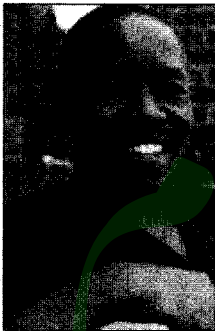
پرائمری جماعت کے بعد اسکول چھوڑنے کی شرح پچاس فیصد سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔ اس صورت حال میں باقی ماندہ طلبہ کو پڑھائی میں دلچسپی رہتی تھی تو کیونکر؟

ویرن ان حالات میں شخص انفرادی اور ہاتھ پر ہاتھ دھرنے بیٹھے رہنے کا

وی ایڈز میں مبتلا لوگوں کی تعداد ناقابل شمار ہے۔ دیگر شہریوں پر جانی اور معنوی حملے تو ایک معمول بن چکے ہیں۔ چنیدہ تعلیمی ادارے طلبہ کی راہ تنگ کرتے رہے ہیں کیونکہ والدین کے لیے بچوں کے تعلیمی اخراجات کا تصور کسی عیاشی سے کم نہیں زندگی کی بنیادی سہولیات نایاب ہیں۔ بجلی صاف پانی اور طبی سہولتیں ان کے لیے ایسے خواب کی مانند ہیں جس کی تعبیر ناممکن ہے۔

ان حالات میں مائیکل کا بچوں کو ”بیلے رقص“ (ایک ایسا رقص جس میں قصبے کا روپ دھار کر بچوں کا ناچ دکھایا جاتا ہے) کی تعلیم دینے کا تصور ہی انتہائی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ لیکن وہ اپنے اس خواب سے دستبرداری کے لیے کسی صورت بھی تیار نہ تھا۔ وہ کبیرا منتھر اور نیروبی کی دیگر مینی آبادیوں میں ٹین کی تختی چھتوں تلے پر بند پائپس رقص سکھانے لگا اور پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب اس کے طلبہ کینیا میں شل تجیز جیسے کی قومی شہرت یافتہ مقامات پر رقص مقابلوں میں فاتح قرار پانے کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لیے وظائف حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔

مائیکل ایک ساحر اتالیق اور رہنما تھا۔ اس نے غربت، جبر، استحصال اور پسماندگی کی دلدل میں گھرے بچوں کو زندگی



میں ایک نیا اور منفرد مقصد عطا کر دیا۔ وہ پیشہ وارانہ رقص کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں سماجی و اخلاقی ضوابط سے بھی آگاہی فراہم کرنے لگا۔ سافت ککھن ہی سہی لیکن ناممکن بہر حال نہ تھی۔ اس کی محنت اور لگن رنگ لانے لگی۔ نفسیاتی، اعصابی

شکستگی اور اخلاق باخشی کا خاتمہ ہونے لگا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب نا بالغ بچیوں میں حمل کی شرح میں واضح کمی کے علاوہ طلبہ میں مایوسی افسردگی اور عدم اعتمادی اپنے وجود پر شرمسار ہونے لگی۔

مائیکل یوایا کی لامتناہی جدوجہد آج بھی اسی جذبہ اور لگن سے جاری ہے۔ Valley View Academy میں تقریباً آٹھ سو طلبہ کو پیشہ وارانہ تعلیم دینے کے ساتھ وہ انہیں ذاتی و قاعدہ خود شای خود اعتمادی اور مقاصد زندگی کے حصول کی راہیں بھی متعین کر رہا ہے۔ زیر تعلیم طلبہ ثقافتی طائفوں کے

اپنے گھر میں بھی ایک سائنس لیب بنا رکھی ہے جہاں نئے نئے تجربات کرتے رہنے سے ہی اس کے اضطراب میں کمی ہوتی ہے۔

ستائیس سالہ یہ معلم محض چوبیس سال کی عمر میں ہی برازیل کے دس بہترین اساتذہ کی فہرست میں شمولیت اور خصوصی ایوارڈ اپنے نام کر چکا ہے اور قرآن مجید بتاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس کی مجلس جدوجہد برازیل میں یقینی انقلاب کا سبب بن جائے گی۔

مائیکل دیا  
افریقی نژاد مائیکل کے لیے زندگی محض تاریکی پریشانیوں اور تکالیف کا دوسرا نام تھی۔ تاریک براعظم سے تعلق رکھنے والے مائیکل کے بھی خواب یکے بعد دیگرے منتشر ہوتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواب تو بچپن ہی سے اس کی آنکھوں میں بسا تھا۔ وہ مشہور افریقی ڈکٹوریہ جمیل کے نزدیک ایک اسکول میں اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے سرگرداں تھا۔

اسکول آمدورفت کے دوران جمیل کے شفاف پانی کا منظر اکثر اس کے قدم ساکت کر دیتا اور وہ تپتی ہی دیر اس میں خوبصورت خوشحال اور مثالی زندگی کے عکس دیکھتا رہتا۔ قسمت کی ستم ظریفی نے اس کی یہ دیرینہ آرزو بھی لمبا میٹ کر دی۔ ہائی اسکول کے بعد مزید تعلیم کے اخراجات اس کی استطاعت میں ہی نہ تھے۔ اس لیے پڑھائی ترک کرنی پڑی۔ وہ بہت دلبرداشتہ ہو گیا۔

انہی دنوں کینیا کا ایک ثقافتی طائفہ افریقی دورہ پر موجود تھا۔ مائیکل اپنے ماحول سے فرار کا خواہشمند تھا۔ اس نے اس طائفہ میں ایک کامیاب آڈیشن دیا اور رقص کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیروبی منتقل ہو گیا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ 2009 میں ایک فلاحی منصوبہ سے منسلک ہو گیا۔

اس خصوصی منصوبہ سے وابستہ برطانوی انتظامیہ پسماندہ افریقی ممالک کے یتیم بچے آسرابچوں کے لیے فنون لطیفہ کی تعلیم عام کرنا چاہتی تھی۔ کینیا کی غربت، پسماندگی اور بدترین معاشی حالات تو ویسے بھی مسلحہ ہیں۔ نیروبی سے پانچ کلو میٹر دور ”ککبیر“ کا علاقہ اس ضمن میں سرفہرست ہے۔ جہاں آبادی پر مشتمل یہ علاقہ انسانیت کی تذلیل اور بے بسی کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ 700,000 نفوس انتہائی غربت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ بے روزگاری کی شرح آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ عوام کی یومیہ اُجرت ایک ڈالر سے بھی کم ہے۔ ایچ آئی

بچوں کا گہرا نفسیاتی مشاہدہ شروع کیا اور پھر اسے علم ہوا کہ سات سال کی عمر میں بچے کے بعد کسی بھی طالب علم کی ذہنی نشوونما میں تین تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ڈائنوساز خلائی علم اور دھماکا خیز مواد میں گہری دلچسپی لینے لگتا ہے۔ ڈائنوساز کی نسل نابود ہوئے تو اب صدیاں بیت چکی تھیں مگر نئے جماعت اور تعلیمی اداروں میں دھماکا خیز مواد کی تیاری اور اطلاق بھی کسی صورت ممکن نہ تھا۔ کین نے خلائی علم کے ذریعہ ان کی ذہنی انجمنیں اور سائنسی مضامین سے متعلقہ نفسیاتی گھٹیاں و خوف زائل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

برسہا برس کین سلبرن اپنے اسباق میں سمی و لیری معادلات کا استعمال کرتا رہا۔ اس کے موضوعات میں تنوع ہوا کرتا۔ ماحولیات اور خلائی سائنس سے متعلقہ مسائل سے آگاہی دینے اس کی ساحرانہ تدبیریں نے آسٹریلیوی نسل نو کو کردار اور پیشہ وارانہ زندگی میں ایک نئے اوج تک پہنچا دیا۔ محنت شعار ی ان کا وتیرہ بن گئی۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب سائنسی شعبہ میں طلبہ کی تعداد 86 سے متجاوز کر گئی۔

اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور ذہانت کے بل بوتے پر ان محنت طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے قومی یونیورسٹیوں کی جانب سے وظائف مہیا کیے جانے لگے۔

کین سلبرن کی تدبیریں میں تعلیم برائے عمل نے ہی طلبہ کو نئے تجربات کی طرف مائل کیا۔ ان کا رجحان آبی میزائل بنانے کی طرف بڑھنے لگا۔ سالہا سال سے وہ Casula High School میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سائنسی پیشہ وارانہ اہلیت میں کامل و یکساں اساتذہ کی ایک ٹیم کا سربراہ ہے۔ اس ٹیم کے ارکان نے باہمی مشاورت اور محنت سے ہائی اسکول طلبہ کے لیے ایک افزودگی منصوبہ iSTEM (invigorating Science, Technology, Engineering and Mathematics) تشکیل دیا۔ لیکن اس منصوبہ کے مندرجات صرف مقامی طلبہ تک محدود نہ تھے بلکہ آسٹریلیا کے طول و عرض میں دیگر اداروں اور جامعات کو بھی شامل کیا گیا۔ یہ سبھی طلبہ جب ایک مخصوص مقام پر اکٹھے ہوتے اور اپنے ہم عمر افراد کے علاوہ دیگر تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے بھی اپنی تحقیق و ایجادات پر بحث و مباحثہ کرتے تو ان کے ذہنی افق میں وسعت اور کئی ایک تبدیلیاں رونما ہونے لگتیں۔

اس اسکول کے طلبہ کو ”مریکی خلائی اکیڈمی“ میں واقع ’خلائی کیمپ‘ میں شمولیت کے مواقع کی فراہمی نے ان کے

ساتھ مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہیں اور کامیابی سیٹھنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے وظائف حاصل کر کے مائیکل کے خواب جی رہے ہیں۔

ڈاکٹر کین سلبرن Ken Silburn

چند روز قبل ایک ہیرا ہے اس کا بچپن معاشی مشکلات اور مسائل کے انبار میں چپکے سے بیت گیا۔ عہد شباب میں خوش قسمتی کے باعث اسے بہت جلد لندن اور ڈین اساتذہ کی قربت میسر آئی۔ وہ اخلاقی طور پر ان معلمین کی محبت، محنت اور شفقت کا مقروض بن چکا تھا اس لیے شعبہ تدریس اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کین نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ’شعبہ امراضیات‘ (pathology) سے کیا۔ کچھ عرصہ فوج کے ساتھ کام کرنے کے بعد اس کا اضطراب شدید ہونے لگا۔ اس قرض کی ادائیگی کے لیے وہ اپنے جیسے سینکڑوں طلبہ کے لیے ایک میچا بننا چاہتا تھا۔ سماجی و معاشی مسائل سے نبرد آزما خاندان اور بچوں کی محرومیوں کا کرب کین سے بہتر بھلا کون سمجھ سکتا تھا؟

آسٹریلیوی نظام تعلیم میں ایک انقلاب در آنے کے لیے پوری قوت سے بڑھ رہا تھا۔

سائنسی مضامین کی تدبیریں میں موجود تنوع، مشکلات، دلچسپیاں اور کھٹنیاں سر کرنے کے لیے اس نے چند سال قبل سڈنی کے جنوب مغربی مضافاتی علاقہ میں

Casula High School میں شمولیت

اختیار کی تو مسائل کا ایک انبار اس کا منتظر تھا۔ اس وقت بارہ سال سے متجاوز اکثر نچے سائنس سے شدید بیزاری اور نفرت کا



شکار تھے۔ اس اسکول میں محض آٹھ عدد بچے سائنسی شعبہ میں موجود تھے۔ طلبہ کا یہ مجموعی رویہ ایک ترقی یافتہ اور بہترین آسٹریلیوی مستقبل کے لیے شدید خطرہ کی علامت تھا۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے کین نے

ماہنامہ مسرگزشت

ہیں لیکن 2015 میں ”پرائم فیسٹر سائنس ایوارڈ“ میں فتح اور رواں برس ”گلوبل ٹیچرز پرائز“ کے لیے نامزدگی کے لحاظ اس کی زندگی میں بے حد افسوس ہے۔

بویا یانگ Boya Yang

تدریس سے محبت اور خلوص چینی خزانہ بویا یانگ کی تین نسلوں پر محیط ہے۔

اس کے دادا دادی اور والدین کے بعد مسیحائی کی تربیت بویا کے لہو اور خمیر میں شامل ہے۔ اسکول اس کے لیے دوسرا گھر تھا۔ کم عمری کے باوجود وہ ذہانت اور چہرہ شناسی کی خوبیوں سے مالا مال تھی۔

اسکول کے کمرلے جماعت میں بیٹھے طلبہ اور پھر اس کے گھر میں رہنمائی کے لیے آنے والے بچوں کے معصوم چہروں اور آنکھوں میں جھٹکنے والی پریشانی، اضطراب اور عدم اعتمادی اس سے کبھی بھی پوشیدہ نہ رہی تھی۔ کم عمر بویا ان کی اس حالت ڈار پر بہت افسردگی و آزدردگی محسوس کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کی ذہانت نے اسی کے ہم عمر ان نئے فرشتوں کی وقتی شہیدگی کا راز دریافت کر لیا۔

وہ کبھی طلبہ امتحانات سے خائف رہتے تھے۔ امتحانات کا آسیب ان کے اعصاب پر اس شدت سے حاوی رہتا تھا کہ اساتذہ کا پڑھایا گیا نصابی مواد ان کے ذہنوں سے کسی حرف

غلط کی طرح مٹ جاتا۔ نتائج میں تنزلی اور ناکامی بسا اوقات انہیں زندگی سے بی کوسوں دور لے جایا کرتی تھی۔

دوسروں کے مشاہدہ اور رہنمائی کے برعکس کسی بھی انسان کا ذاتی مشاہدہ اور غور و فکر سے اخذ کیے گئے نتائج

فطری طور پر بہت چرچا اور گھر سے ہوتے ہیں۔ آگہی کا عذاب اپنی ذات پر بھٹنے والے افراد ہی اکثر دوسروں کے درد کا درماں بننے ہیں۔ طلبہ کی وقتی شکست کی اس آگہی نے بویا کی زندگی کا رخ بھی بدل دیا تھا۔

ان حالات میں پروان چڑھنے والی اس نرم و نازک چینی گزریا نے اپنے مستقبل کا فیصلہ آگہی کے اسی لمحہ میں کر لیا تھا۔ اپنے ہم قوم افراد کی مسیحائی کے لیے وہ نفسیات کی مغلطہ بن گئی۔ اور پھر

سابقہ خوف و خدشات مزید زائل کیے۔ اس کیمپ میں چھ دن کا قیام ایک یادگار تجربہ ہوتا تھا۔ انہیں خلائی علم کی عملی باریکیاں سکھائی جاتیں۔ ایکٹیوی کے مخصوص ماحول میں وہ وقتی طور پر ’خلاء باز‘ کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں اور یہ یادگار تجربہ بتا عمر ان کے ذہن پر ثبت تحریک بن کر حاوی ہو جاتا ہے۔

آسٹریلیوی حکومت اور محکمہ تعلیم لیکن سمرن کی ان صلاحیتوں کے ہمیشہ ہی سے قدر دان رہے ہیں۔ اسے تین رکنی آسٹریلیوی اساتذہ کی اس ٹیم میں بھی شامل کیا گیا جو ناسا خلائی پروگرام اور مریخ میں مہم چوٹی کے لیے تشکیل دی گئی سوسائٹی میں امریکی انتظامیہ کی معاون تھی۔

بین الاقوامی خلائی منصوبوں میں شمولیت کے باوجود کین کا دل اپنی نسل نو کے مسائل سے مضطرب رہتا۔ ثانوی سطح پر طلبہ میں تبدیلی پیدا کرنے کے بعد اس نے پرائمری نظام تعلیم کے بنیادی و حاسنہ میں ’جراثیمی‘ کا آغاز کر دیا۔ پرائمری اسکول کی تعلیم ہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب طلبہ کو باطنی سائنسی مضامین کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ذہن بہت زیادہ تجسس ہوتے ہیں۔ ذاتی تجربات انہیں بے حد بھاتے ہیں۔ اس موقع پر اگر ان کی وقتی تنہائی کا زرخ موڑ دیا جائے تو اس کے ثمرات ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح تک پہنچ کر انقلاب برپا کر دیتے۔

مقامی پرائمری اساتذہ کی مدد کے لیے کین اور اس کی ٹیم نے انہیں مکمل رہنمائی فراہم کی۔ نصاب میں مجوزہ تبدیلیوں کے علاوہ سہل انداز میں تدریس کے لیے ان اساتذہ کو خصوصی تربیت فراہم کی جاتی۔ کین ذاتی طور پر ان اسکولز کے دورے کرتا تھا۔ ان نوعمر بچوں کو پڑھانا، سوالات کے تسلی بخش جواب دے کر انہیں مختلف سرگرمیوں کی طرف مائل کرنا اس کے لیے سستی خیز اور یادگار لحاظ ہوا کرتے تھے۔

ڈاکٹر کین سمرن اپنی انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پر تیس سال قبل آسٹریلیا کی Regional Science Teachers Association کا حصہ بنا اور گذشتہ بارہ سال سے وہ اس تنظیم میں صدارتی عہدہ پر بھی فائز ہے۔ آسٹریلیوی نظام تعلیم میں اس کی حیثیت ریڈر ہک ہڈی سے کسی طور بھی کم نہیں۔ دیگر سائنس اساتذہ کو باقاعدگی سے تربیتی ورکشاپ میں کمرلے جماعت میں اسباق دینے کے طریقہ کار سکھاتا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ وہ منتخب شدہ اساتذہ بھی اس کی تربیت کے بغیر اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کسی صورت نہیں کر سکتے۔

قومی سطح پر کین سمرن نے بے شمار ایوارڈز حاصل کیے





پہلے مرحلہ میں اس نے کمرائے جماعت کے ماحول میں تبدیلی پیدا کی۔ طلبہ کو اعتماد اور محبت کی دولت بخشی تو وہ اس کی مقناطیسی شخصیت کی طرف لوہے کے ذرات کی مانند کھینچے آنے لگے۔ بویا نے اپنی ذات کو ایک 'سینج' کاروپ دے دیا۔ وہ ان طلبہ کے بھی گلے کھوئے شکایات، تنقیدیں اور اذیت ناک سوچیں اپنے وجود میں جذب کر لینے کے بعد اپنے علم کی روشنی اور تعلیم برائے کھیل کے سحر سے ان کے دل و دماغ منور کرنے لگی۔ ان کا ذہنی انتشار نفسیاتی الجھنیں اور گتھیاں اس کی نرم مزاجی کے سامنے بالکل موم ہو گئیں اور دھیرے دھیرے نوجوان نسل اپنے مدار میں لوٹنے لگی۔

دوسرا مرحلہ طلبہ کے والدین سے تعامل تھا۔ منظم منصوبہ بندی کے تحت اس نے اسکول میں والدین سے ملاقات اور محققین کی تعلیمی ترقی، گھریلو مسائل اور برتاؤ کی بابت باہمی گفت و شنید کا آغاز کیا کیونکہ والدین کو بھی ذہنی تربیت کی بے حد ضرورت تھی۔ وہ ان بچوں سے گھریلو مسائل سننے اور پھر ایک نئی لگن سے حل تلاش کرنے میں جت جاتی۔ برف کھیلنے لگی۔ منفی جذبات، تنفر، بیزاری، خود ترسی، خود اذیتی، جنسی کشش میں بے لگام خواہشات سے مغلوب تباہی کی اندھی وادیوں میں گامزن جیسی بچے اپنے گھر اور اسکول میں نا قابل یقین مٹائی کر دار کے مالک بن گئے۔

کمرائے جماعت کے آزادانہ اور دوستانہ ماحول میں ڈراما، ادھر، موسیقی، آرٹ سمیت طلبہ کی ذاتی پسند پر مبنی سرگرمیوں سے انہیں نصاب سے حلقہ اعصابی تناؤ اور امتحانی خوف سے بھی رہائی مل گئی۔ بویا کی جماعت میں حاضری کی شرح میں نا قابل یقین اضافہ ہوا تو اسے بھی محسوس ہوا کہ ان بچوں کے وجود میں ہنر توانائی، تخیل اور ذہانت کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ وہ بہت حیران و خوش تھی اور وہ والدین، ان کی مسرتوں کی تو کوئی انتہائی نہ تھی۔ اکھڑ مزاج اور نا قابل برداشت بچے موم کی ناک بن گئے تھے جو ان کے حکم و خواہش کے مطابق بات آسانی مڑ جاتے۔

اس کامیابی نے بویا کا اعتماد اور حوصلہ پہلے سے کئی گنا بڑھا دیا۔ اس نے دیگر بھی خیال اساتذہ کے ساتھ مل کر ایک خصوصی گروہ تشکیل دیا جس کی مدد سے مقامی اسکولوں میں نفسیاتی تربیت کے کئی ایک پروگرام شروع کیے گئے۔ تعلیمی اداروں کے علاوہ یہ سلسلہ جیل میں مقیدان، بچوں تک دراز کر دیا گیا جو ماضی میں رہنمائی کے فقدان کی بدولت کسی نہ کسی قانونی اور اخلاقی جرم میں سزا بھگت رہے تھے۔

اسے طلبہ کی اس ذہنی اذیت کی اصل وجوہات کا علم ہوا۔ چینی نظام تعلیم میں امتحانات پر بے حد زور دیا جاتا ہے۔ طلبہ اپنے روزمرہ وقت کا تین چوتھائی سے زائد حصہ پڑھائی اور کتب بینی میں صرف کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ نتیجتاً وہ اعصابی دباؤ اور ذہنی تھکاوٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس خارجی دباؤ کے علاوہ انہیں ایک داخلی انتشار کا سامنا بھی رہتا تھا۔ اور بلاشبہ یہ ایک ایسا آفاقی المیہ ہے جو روئے ارض کے ہر خطہ میں یکساں موجود ہے۔

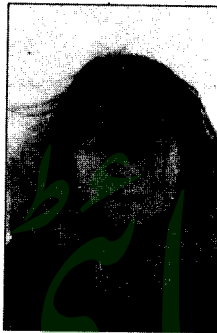
”نہیں ایچ“ (13 تا 19 سالہ عمر) کی تباہ کاریاں جذباتی اور نفسیاتی مسائل کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اس جذباتیت سے زندگی میں کم از کم ایک دفعہ تو ضرور گذرتا ہے۔ ماہرین نفسیات کی دانست میں یہ انسانی زندگی کا مشکل ترین دور ہوتا ہے۔ بچپن کا جتنکشم ختم ہونے کے بعد نوجوانی کی آمد ہوتی ہے تو بچہ اپنی ذات کو بے حد معتبر اور عقل کل تصور کرنے لگتا ہے۔

اصل کشش اور المیہ اس وقت جنم لیتا ہے جب والدین دیگر اقارب اپنے سابقہ جذبات کے پیش نظر ان سے بچوں ہی کی طرح برتاؤ جاری رکھتے ہیں۔ انہیں روک ٹوک اور مختلف پابندیوں کے دائرہ میں مقید رکھ کر اپنے تئیں ان کی بھلائی کرتے ہیں لیکن یہی برتاؤ اور پابندیاں بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ مناسب رہنمائی کی عدم موجودگی انہیں مزید تباہی کی طرف دھکیلے لگتی ہے۔ والدین اور خاندانی اقدار سے تنفر ہوتے ان بچوں کا رجحان دوستوں کی طرف کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی آزاد چمچی کی طرح فضاؤں میں اڑان بھرنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

مخالف جنس کے لیے کشش میں اضافہ بھی اسی مخصوص عمر کی ایک سوغات ہوتی ہے۔ نوجوانی کے شمار میں جلا یہ نادان بچے جنکی تقاضوں سے مغلوب ہو کر مصنف مخالف کی طرف مائل ہوتے ہیں اور تخیر کا جنون انہیں جنسی لذت کی وادیوں کا راہی بنا دیتا ہے۔

بویا کے لیے سب سے کربناک لمحہ یہی تھا کہ چینی کم عمر لڑکیوں میں بغاوت کا تناسب خطرناک حد تک بڑھنے لگا تھا۔ جنسی بے راہ روی کی بدولت اسقاط حمل کی شرح بھی کم پریشان کن نہ تھی۔ مناسب رہنمائی، شفقت، توجہ اور محبت کا فقدان ہزار ہا لڑکوں اور لڑکیوں کو جرائم کی دلدل میں بھی دھکیل رہا تھا۔ اس نے انتہائی تحمل اور حکمت عملی کے تحت ان تمام عناصر سے چمکا کر اپنے آپ کے لیے دوسرے حلقہ وارانہ اقدام طے کیے۔

ہے۔ حالیہ سالوں میں گھوٹیل وارمنگ کی بدولت برف قدرے کم تو ہوتی ہے لیکن اب بھی یہاں موسم سرما ہڈیوں میں گودا جمند کر دینے والی خنڈک لیے نازل ہوتا ہے۔ موسم گرما کے تیز کچھ



دھسے سہی لیکن رہائشیوں کے لیے برف سے رہائی کسی صورت بھی ممکن ہی نہیں۔ بارش بھی فروری ہی کی صورت میں ہوتی ہے اور ہوائیں اس قدر تیز اور نوکیلے برفانی ذرات لیے چلتی ہیں کہ بصارت کو فروری ہی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

درجہ حرارت کموماً منفی چالیس ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے، تاہم موسم سرما میں منفی 68 ڈگری سینٹی گریڈ تک بھی باسانی پہنچ جاتا ہے۔

**Nova Scotia** کینیڈا کے تین ساحلی صوبوں

میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ اس کا شمار ان چار صوبوں میں بھی ہوتا ہے جن سے اٹلانٹک کینیڈا تشکیل پایا ہے۔ اس سرد ترین علاقہ میں زندگی کبھی بھی ہل نہیں ہوتی۔

میکسی نے انہی آزمائشوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گریجویشن مکمل کرنے کے بعد افریقی علاقہ Sub Sahara میں رضا کار کی حیثیت سے کام کا آغاز کر دیا۔ یہ علاقہ غربت، افلاس اور بیماریوں کی آماجگاہ ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2011 میں ایچ۔آئی۔وی ایڈز میں مبتلا 69% افراد کا تعلق اسی خطہ سے تھا۔ یہ لاچار لاعلم اور اپنی بیماری کے اسباب سے ناواقف افراد اس بیماری کے مزید پھیلاؤ کا سبب بن رہے تھے۔ میکسی پانچ سال تک ان افراد کی طبی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ آگہی و شعور کے در بھی داکرتی رہی۔

بعد ازاں وہ شمالی امریکا کی اکیسویں سٹی Salluite منتقل ہو گئی۔ یہ کینیڈا کے نزدیک ہی ایک دیہاتی علاقہ ہے۔ بمشکل تیرہ سو نفوس پر مشتمل اس آبادی میں بھی مسائل کا ایک بہت بڑا طوفان اس کا منتظر تھا۔ اس علاقہ میں زمینی راستے محدود ہوتے ہیں۔ کسی بھی سڑک کے ذریعہ رسائی ناممکن امر ہے۔ یہاں صرف ہوائی رستے سے ہی آمد ممکن ہے۔ اکیسویں آبادی کے انتہائی مشرقی سمت میں واقع اس خطہ ارض کو لاغر

اچھے گرد و نواح میں نظر دوڑائی جائے تو کوئی بھی انسان طویل محنت سا لہا سال کے معمول اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں یکسانیت سے اکثر آتا جاتا ہے لیکن یوایاگ کی لغت میں ممکن اور بیزاری کے الفاظ ناپید ہیں۔ ہر گذرتا لمحہ ہر گذرتا دن اس کی توانائی اس قدر شبت طریقہ سے ہمیز کرتا کہ یہ غیر مرئی شعاعوں کی طرح دیکر اساتذہ پر بھی براہ راست اثر انداز ہوتیں۔

طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہوئے بویا کی مخلصانہ اور روایت شکن کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ صفر سے شروع ہونے والا یہ سفر مستقل مزاجی سے اپنے بڑا ڈپارکرتا ”پچاس ہزار“ ٹین اچ پچوں اور ان کے والدین کی ذاتی تربیت تک آن پہنچا۔

اس کی پیشہ وارانہ اہلیت کا ڈھکا قومی سطح پر بھی پہنچے لگا تھا۔ اسے کئی ایک قومی کانفرنسز میں خطاب کے مواقع دیئے جانے لگے۔ برنی اور پریس میڈیا اس کے انٹرویو اور مستقبل کی حکمت عملی جاننے کے لیے بے تاب رہتے۔ اور خود اس کے خلوص اور نیک نیتی کا عالم یہ تھا کہ 2016 میں Harvard SEED (عوامی جمہوریہ چین کی ایک تنظیم جس میں سماجی خدمت، تعمیر اور جدت کی بنیاد پر ہر سال ایک نمایاں کارکردگی کے حامل نوجوان منتخب کیے جاتے ہیں) کے تحت ”سماجی تعمیر“ کی بھاری بھر کم انعامی رقم بھی اس نے اپنے تربیتی پروگرام کی جین کے طول و عرض میں پھیلاؤ کے لیے سرف کردی۔

میکسی میکڈونل Maggie Macdonnell 2017 میں گوبل نیچرز پرانز کی فاتح ”میکسی میکڈونل“ کی زندگی اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو بلاشبہ وہ لفظ ”سپیا“ ہی ہوگا۔

1980 میں روئے ارض کے سرد ترین خطہ میں پیدائش کے بعد میکسی نے ہمیشہ اپنے ارد گرد وحشت، کھٹانوں اور فطرت سے کشش کی ایک لامتناہی جنگ دیکھی۔ Nova Scotia کے دیہاتی علاقہ میں پرورش نے اس کی فطرت میں چٹائی تختی پیدا کردی۔

میکسی کے حالات زندگی سے آگاہی کے لیے اس کے ماحول اور قلمی علاقہ سے واقفیت ضروری ہے۔

قطب شمالی زمین کے انتہائی شمالی علاقہ میں واقع ہے۔ بحر منجمد شمالی، مگر ملحقہ بحیروں ’الاسکا‘ کینیڈا، ’فن لینڈ‘، ’گرین لینڈ‘، ’آئس لینڈ‘، ’ناروے‘، ’روس‘ اور ’سوئیڈن‘ پر مشتمل زمینی علاقہ ’برفانی جہنم‘ بھی کہلاتا ہے۔ ٹنڈرا کے خطہ میں شمولیت کے باعث یہاں نباتات کی افزائش ممکن ہی نہیں۔ بحیروں کے علاوہ زیر زمین سطح بھی برف سے منجمد رہتی

کی تپش سے ان کے دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکے۔  
بعد ازاں میکی نے شراکتی بنیادوں پر ڈے کیر سینٹر کی بنیاد رکھی جہاں طلبہ کرائے جماعت میں تجربہ کار ڈے کیر کارکنان کے ساتھ کام کر سکیں۔ یہ خیال مفرد لیکن بے حد سودمند بھی تھا۔ طلبہ ابتدائی عمر میں تعلیم دینے کے نئے طریقے سیکھنے لگے۔ اسی دوران میکی نے تقریباً بیس ہزار ڈالرز محفوظ کر لیے جن کی مدد سے اس نے اسکول میں ایک غذائی پروگرام شروع کر دیا۔ اس نئے منصوبہ کے تحت طلبہ اپنے دیگر ساتھیوں کے لیے ہلکے پھلکے اسٹینکس تیار کیا کرتے۔

نسل نو میں مثنی جذبات کے خاتمہ کے لیے اس نے بلا تاخیر "فٹنس سینٹر" قائم کیا جو دھیرے دھیرے تاباں، جوان اور ادیب مزاج افراد کے لیے یکساں طور پر صحت مند طرز زندگی کا حصول کا اہم مرکز بن گیا۔ ان کا اعصابی تناؤ دور کرنے کے بعد ذہنی و جسمانی مضبوطی میکی کی اولین خواہش تھی۔

میکی میکڈول کے مسائل کو اپنے اعصاب پر بالکل بھی حاوی نہ ہونے دیا بلکہ ان مسائل کے حل کی عملی کوششوں میں مختلف سرگرمیوں کا آغاز ہی مناسب سمجھا۔ اس کا مہربان رویہ اور عملی سوچ طلبہ کی ذہنی تربیت میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ اسکول میں حاضری کی شرح بڑھنے لگی۔ کیونٹی پچن میں مصروفیت، خودکشی کے رجحانات میں کمی کے تربیتی مراکز میں آمدورفت، ہائیکلنگ اور فطری مناظر کی دلکشی نے ان کے وجود سے مثنی جذبات کا خاتمہ کر دیا۔

ذاتی مسائل میں گھرے رہنے کے باوجود طلبہ نے میکی کی تحریک پر ڈیابٹس کے مریضوں کے لیے 37,000 ڈالرز کے فنڈز کا حصول یقینی بنایا۔ اپنی ذات کے دائرے سے قطع نظر انسانیت کی خدمت ہی ان کا وسیعہ زندگی بننے لگی ہے۔

محدود ترین وسائل کے باوجود مختصر عرصہ میں اسی گراں قدر جذبہ اور محنت کے لیے "ورکی فاؤنڈیشن انٹنیشنل" نے گلوبل ٹیچرز پرائز کی "ایک ملین ڈالرز کی خطیر رقم کی فاتح" میکی میکڈول کو قرار دیا۔ قطب شمالی کے دیگر سرترین علاقوں میں زندگی سے منہ موڑنے والے افراد کو اس کائنات کی رنگینیوں کی طرف واپس لانے کے لیے یہ انعام اس کے لیے کسی تجویز کی مدد یا سونہو سلوی سے کم ہرگز نہیں۔ اپنے ہم قوم افراد کو ایک نارمل زندگی جیسی تمام بنیادی سہولیات فراہم کرنے کا دیرینہ خواب اپنی تعمیر کے مراحل میں داخل ہو چکا ہے جس کا سہرا میکی کی روایت ممکنہ کوششوں ہی کے سر ہے۔

نفوس بھی کہا جاتا ہے کیونکہ جنگلی حیات کی کمی کے باعث مقامی باشندے اکثر و بیشتر فاقہ کا شکار رہتے ہیں۔

موہی حالات کی سختیاں جھیلنا بھی ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ مثنی 25 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت میں برف کسی نیزے کی انی کی مانند جسمانی اعضا کو تختہ مشق بنائے رکھتی ہے۔ اس علاقہ میں آمد کے بعد میکی میکڈول کے سامنے دو بڑی رکاوٹیں موجود تھیں۔

قطب شمالی کے تعلیمی نظام کا سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے سخت ترین موہی حالات کے باعث اکثر اساتذہ وہاں قیام ہی نہیں کر پاتے۔ کئی ایک معلم تعلیمی سال ادھورا چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں یا پھر محلہ میں اپنے اعصابی تناؤ کی طبی درخواست دائر کرنے کے بعد دیگر پُر سکون علاقوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ فی الوقت میکی میکڈول جس اسکول سے منسلک ہے وہ اپنے سربراہ سے محروم ہو چکا ہے۔ اسکول پرنسپل نے شخص چھ مثنی بعد ہی طبی درخواست دے کر ادارے سے عارضی رخصت اختیار کر لی تھی۔

ان حالات میں ماتحت اساتذہ کا جذبہ برقرار رہے بھی تو کیونکر؟

معاشرتی حالات بھی انتہائی قابلِ انوس ہیں۔ موسم کی شدت و ناہمواری نے مقامی باشندوں میں وحشت، بیزاری، تنہائی یا سیت، خود اذیتی اور زندگی جیسی نعمت سے متفر پیدا کر رکھا ہے۔ چاندی جیسی بریلی چادر اور ڈھمکیوں میں جنس کا دیوانہ بنی تمام تر بربریت سے چنگھاڑتا نظر آتا ہے۔ تنہائی بنیادی ضروریات سے محرومی اور یا سیت کی تپش دور کرنے اور راہ فرار حاصل کرنے کے لیے مردم کش لڑکیوں کو نشانہ بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ مثنی انج لڑکیوں میں حمل کی شرح ناقابل یقین ہے۔

نوجوان نسل میں خود اذیتی کے جذبات بھی اپنی انتہا پر ہیں۔ ذاتی سکون اور وقتی خود فراموشی کے حصول کی خاطر وہ اپنے ہی وجود کو بے طرح رگید ڈالتے ہیں۔ 18 تا 25 سالہ افراد میں زندگی کی خواہش ختم ہونے لگتی ہے۔ انہیں موت کی وادی میں سکون محسوس ہوتا تو خودکشی کا رجحان بھی انہیں ناک حد تک بڑھ گئے۔

ان تمام تر حالات کو نظر رکھتے ہوئے میکی نے Life Skills Programme کی بنیاد رکھی اور آغاز ہی میں بے شمار لڑکیوں نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان سب نے کیونٹی کے افراد کے لیے گرم کھانوں کی تیاری و ترسیل ممکن بنانے کی کوششیں شروع کر دیں تاکہ پیٹ کا جہنم اپنے شعلوں

گل اور میں۔ موضوع کرکٹ تھا۔ اس لیے سب میری طرف متوجہ تھے۔ میں نے جملہ ختم کر کے ان کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ”انڈین کرکٹ ٹیم کے بہترین بلے باز اور پاکستان محمد اظہر الدین اسپاٹ فٹنگ میں ملوث ہو کر تاحیات پابندی کا شکار ہو چکے ہیں۔ سن 2000 میں سی بی آئی نے اظہر الدین پر اسپاٹ فٹنگ کا الزام لگایا۔ اظہر الدین کا کہنا تھا کہ انہیں مسلمان ہونے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا ہے مگر بعد میں انہوں نے خود بھی یہ جرم تسلیم کر لیا۔ 2000 کے سلاٹھ افریقا انڈیا ٹور کے بعد سلاٹھ افریقین کمیشن ایسی کروچے نے بیان دیا کہ اظہر الدین نے انہیں بکیر سے متعارف کروایا ہے جس کے بعد اظہر الدین نے جرم کا اعتراف کر لیا اور ان پر تاحیات پابندی لگا دی

”کرکٹ“ دنیا کا ایک مقبول کھیل ہے لیکن بچے بوڑھے جوان سبھی کے دل پر اس کا راج ہے آصف نے کہا۔ کرکٹ میں جہاں کھلاڑی اپنے ملک کی دنیا بھر میں نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کا نام روشن کرنے کے لیے سر مڑھ کی بازی لگا دیتے ہیں وہیں کچھ کھلاڑی پیسے کے لالچ میں ملک کا نام بدنام بھی کرتے ہیں۔ اسپاٹ فٹنگ نے کرکٹ کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں اسپاٹ فٹنگ کا بہت بول بالا رہا ہے۔ اسپاٹ فٹنگ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پھر بھی ہم ایسے چند کھلاڑیوں کا ذکر کریں گے جو اسپاٹ فٹنگ میں ملوث رہے اور اس کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے۔

اس وقت کمرے میں ہم چار دوست آصف، عمیر، نذر

## اسپاٹ فٹنگ

اعتزاز زریاب وصلی

کرکٹ نے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہر تیسرا شخص کرکٹ کے جنون میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی نے ہی مفاد پرستوں کو شائقین کے جذبات سے کھیلنے کی راہ سجھائی اور بہت سے مقبول کھلاڑیوں نے چند روپیوں کی خاطر یہ ایمانی کا راستہ چن لیا۔

اسپاٹ فٹنگ کے گرداب میں کئی کھلاڑیوں کی شہرت ڈوب گئی



بعد آج تک جنوبی افریقن ٹیم کوئی ٹورنامنٹ نہیں جیت سکی۔ اس طرح اسپاٹ فلکسنگ نے دنیا کے ایک اور بہترین کھلاڑی کو نگل لیا۔

میں نے ایک اور کھلاڑی کا تعارف کرانے کے بعد میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی بھر کر گلاتر کیا پھر سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ”پاکستان کے مشہور سیمین سلیم ملک اسپاٹ فلکسنگ کا نشانہ بننے والے ایک اور کھلاڑی ہیں۔ سلیم ملک پر رشوت خوری کا الزام لگایا گیا جس میں وہ بے قصور پائے گئے لیکن مئی 2000 میں دوبارہ انکوائری پر جسٹس قیوم نے ان پر تاحیات پابندی لگا دی۔ سلیم ملک 16 اپریل 1963 کولامور میں پیدا ہوئے۔ سلیم ملک نے پانچ اپریل 1982 کو اپنا پہلا ٹیسٹ میچ سری لنکا کے خلاف کھلایا اور سچری اسکور کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ٹیسٹ ڈیبیو پر سچری اسکور کرنے والے یہ 1982 میں دنیا کے دوسرے کم عمر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے بارہ ٹیسٹ اور چونتیس ایک روزہ میچوں میں قومی ٹیم کی قیادت بھی کی۔ اس طرح ایک اور بہترین کھلاڑی اسپاٹ فلکسنگ کی بیعت چڑھ گیا۔“

بہی نہیں ان کے علاوہ سلمان بٹ بھی اسپاٹ فلکسنگ کا شکار ہوا۔ ”2010 میں ہونے والی انگلینڈ اور پاکستان کی ٹیسٹ سیریز کے دوران اسپاٹ فلکسنگ اسکینڈل نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی۔ اس فلکسنگ اسکینڈل کا مرکزی کردار سلمان بٹ تھے۔ 27 اگست 2010 کو سلمان بٹ پر بیچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اس کے بعد اکتیس اگست کو ٹیسٹ کرکٹ کی کپتانی سے ہٹا دیا گیا اور ایک روزہ اسکو اڑسے بھی باہر کر دیا گیا۔ آئی سی سی نے سلمان بٹ پر دس سال کا ٹائمن لگایا۔ نومبر 2011 میں سلمان بٹ کو مجرم کی حیثیت سے تین مہینے قید کی سزا سنائی گئی۔ 22 جون 2012 کو وہ جیل سے رہا ہو گئے۔ اگست 2015 میں سلمان بٹ سے پابندی ہٹائی گئی اور 2 ستمبر 2015 سے انہیں انٹرنیشنل کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ سات اکتوبر 1984 کولامور میں پیدا ہونے والے سلمان بٹ نے اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز دسمبر 2003 میں بنگلہ دیش کے خلاف کیا۔ بارہ جولائی 2010 کو شاہد آفریدی کی ٹیسٹ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں قومی ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا اور انہوں نے اپنی قیادت میں پہلے ٹیسٹ میچ میں ہی آسٹریلیا کو شکست دی۔ سلمان بٹ نے 33 ٹیسٹ میچوں میں 33.46 کی اوسط سے 1889 رنز بنائے جس میں تین سچریاں اور دس نصف سچریاں شامل ہیں۔“

کئی۔ 2012 میں اندھرا پردیش ہائی کورٹ نے اس پابندی کو ختم کر دیا۔ آٹھ فروری 1963 کو بھارت کی ریاست حیدرآباد کن میں پیدا ہونے والے اظہر الدین نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز اکتیس دسمبر 1984 کو انگلینڈ کے خلاف ایکس سال کی عمر میں کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے تین ٹیسٹ میچوں میں لگاتار تین سنچریاں اسکور کر کے ریکارڈ قائم کر دیا۔ اظہر الدین تین سو دن ڈے کھیلنے والے دنیا کے پہلے کرکٹر تھے۔ مہندر سنگھ دھونی کے بعد یہ انڈیا کرکٹ ٹیم کو سب سے زیادہ (نوے) دن ڈے جوتانے والے دوسرے کپٹن ہیں۔ اظہر الدین اسپاٹ فلکسنگ کی وجہ سے پابندی کا نشانہ ہونے والے دنیا کے پہلے کھلاڑی ہیں۔ ان کا شاندار کیریئر ایک داغ کے ساتھ ختم ہو گیا۔

میں نے بات ختم کر کے ان کی طرف دیکھا۔  
”بھائی میاں!“ آصف نے میری طرف رخ کر کے کہا۔ ”جب بتائی رہے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ اظہر الدین کے علاوہ اور کون کون اس الزام کی زد میں آیا؟“

میں نے کھار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔ ”جنوبی افریقا اور انڈیا کی 2000 کی متنازع سیریز کے بعد صرف اظہر الدین ہی پابندی کا شکار نہیں ہوئے، سوائے افریقن کپٹن ہنری کروپے اسپاٹ فلکسنگ اسکینڈل کا دوسرا نشانہ تھے۔ سات اپریل 2000 میں ہنری کروپے پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے بچے چاولہ جو کہ ایک مشہور بلی تھا، سے رابطہ کیا ہے۔ اس کے بعد انڈین کپٹن اظہر الدین کی طرح ان پر بھی تاحیات پابندی لگا دی گئی۔ ستمبر 2001 میں انہوں نے اس پابندی کے خلاف کورٹ میں درخواست عاید کی مگر اکتوبر 2001 میں یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ جون 2002 میں ہنری کروپے جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ 25 دسمبر 1969 کو جنوبی افریقا کی ریاست بلوم فونٹین میں پیدا ہونے والے ہنری کروپے نے اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز 1992 میں کیا۔ ہنری کروپے کی قیادت میں جنوبی افریقا نے آسٹریلیا کے علاوہ دنیا کی ٹیم کو شکست دی۔ گرمیہ سمٹھ کے بعد سوائے افریقا کے سب سے زیادہ دن ڈے میچ جیتنے والے کپٹن ہیں۔ ہنری کروپے نے ستمبر 1995 سے مارچ 2000 تک لگاتار ایک سو باسٹھ ایک روزہ میچ کھیلے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ یہ دنیا کے واحد کھلاڑی ہیں جنہوں نے لگاتار سو سے زائد ایک روزہ میچ اپنی کپتانی میں کھیلے۔ 1998 میں ان کی کپتانی میں جنوبی افریقا نے ناک آؤٹ کپ کا ٹائٹل جیتا جس کے



حصہ لیا اور قومی ٹیم کو ٹائٹل جتوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عامر نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز 4 جولائی 2009 کو سری لنکا کے خلاف کیا۔ محمد عامر سائیں ٹیسٹ میچوں میں ایکایک وکٹیں حاصل کر چکے ہیں جبکہ سترہ ایک روزہ میچوں میں انہوں نے تیس وکٹیں حاصل کی ہیں۔ محمد عامر دنیا کے واحد باؤلر ہیں جنہوں نے پانچ وکٹ میڈن اور پچھٹا جس میں دو بولڈ ایک ہیچ آؤٹ اور دوران آؤٹس شامل ہیں۔

اسی دوران چائے آگئی تھی۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک چمکی لی پھر کہا۔ ”اسپاٹ فگنگ میں ملوث ہو کر پابندی کا شکار ہونے والے ایک اور کھلاڑی پاکستان کے لیگ اسپنر دانش کمر یا ہیں۔ انگلش کا ٹوٹی کھیلنے کے دوران دانش کمر یا اور ان کے ایک ساتھی تنیز باؤلر مروان ویٹ فیلڈ پراسپاٹ فگنگ کا الزام لگا۔ الزام ثابت ہونے پر ویٹ فیلڈ پانچ سال اور دانش کمر یا پرتاحیات پابندی عاید کردی تھی۔ یہ پابندی انگلش بورڈ کی طرف سے لگائی گئی۔ سولہ دسمبر 1980 کو راجی میں پیدا ہونے والے دانش کمر یا نے اپنے کیریئر کا آغاز 27 نومبر 2000 میں انگلینڈ کے خلاف کیا۔ دانش کمر یا نے اسٹم ٹیسٹ میچوں میں چوتیس کی اوسط سے 261 وکٹیں حاصل کیں۔ ان کا بہترین باؤلنگ فگر 7177 تھا۔ دانش کمر یا بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی طرف سے کھیلنے والے دوسرے ہندو اور ساتویں غیر مسلم کھلاڑی تھے۔

”ابھی جناب آپ نے تو پاکستانی کھلاڑیوں کو منتخب کر لیا ہے۔ کیا کسی دوسرے ملک کے کھلاڑی اس جرم میں شریک نہیں ہیں؟“ لوگوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”میں فیث شروع ہی ایک ہندوستانی کھلاڑی سے کیا ہے۔ اب ایک اور نام ہیں۔

2013 کی انڈین پریمیر لیگ میں اسپاٹ فگنگ کا بہت چرچا رہا۔ اس فگنگ اسپینڈل کا مرکز کی کرادرا جستان رائٹ کی نمائندگی کرنے والے انڈین فاسٹ باؤلر شانتا کماران سری ساتھ تھے۔ سری ساتھ پرائیڈ پولیس نے ہیچ فکس کرنے کا الزام لگا کر انہیں ان کے دوست کے گھر سے گرفتار کیا۔ گرفتاری کے فوراً بعد راجستان رائٹ نے ان کا کنٹریکٹ منسوخ کر دیا۔ سری ساتھ کے ساتھ ساتھ دو اور کھلاڑیوں اور چودہ بکیر گرفتار کیا گیا۔ ان سب کو دس جون 2013 کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔ 2013 میں بی سی سی آئی نے سری ساتھ پرتاحیات پابندی لگادی۔ چھ فروری 1983 کو انڈیا کی ریاست کیرلا میں پیدا ہونے والے سری ساتھ نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز یکم مارچ 2002 کو انڈیا کے خلاف کیا۔ سری

میں نے رک کر سب کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر بولا۔ ”2010 کے فگنگ اسپینڈل کا دوسرا بڑا کردار محمد آصف تھا۔ محمد آصف جو کہ اپنی شاندار باؤلنگ سے ..... دنیا کو درط حیرت میں ڈال چکا تھا اور جس کے سامنے بڑے بڑے بلے باز پانی بھرتے نظر آتے، اپنے کیریئر کے عروج پر ہی اسپاٹ فگنگ کا نشانہ بن گیا۔ 27 اگست 2010 کو سلمان بٹ کے ساتھ ساتھ ان پر بھی فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ تین نومبر 2011 کو محمد آصف کو ایک سال کے لیے جیل بھجوا دیا گیا۔ ان پر لگائی گئی پانچ سال کی پابندی 14 اگست 2015 کو ہٹائی گئی اور انہیں ہر طرح کی کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ محمد آصف 20 دسمبر 1982 کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا ٹیسٹ ڈیبیو 3 جنوری 2005 کو آسٹریلیا کے خلاف کیا۔ محمد آصف نے 23 ٹیسٹ میچوں میں 23.18 کی اوسط سے 105 وکٹیں حاصل کیں۔ جب ان پر بین لگایا گیا تب یہ آئی سی سی کی ٹیسٹ رینٹنگ میں دوسرے نمبر پر تھے۔ محمد آصف ٹوٹنی ٹوٹنی کرکٹ میں میڈن اور پچھٹنے والے دنیا کے پہلے باؤلر تھے۔ 2007 میں محمد آصف نے ساؤتھ افریقا کے خلاف سیریز میں شاندار باؤلنگ کی اور انہیں وکٹیں حاصل کیں۔ محمد آصف کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے پاؤں پر خود کلبازی ماری گئی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔“

کمرے میں جمع تینوں ساتھی ہمہ تن گوش تھے میں نے سلسلے کو دراز کیا۔ ”2010 کے فگنگ اسپینڈل کا تیسرا نشانہ پاکستان کے نوجوان تنیز باؤلر محمد عامر بنے۔ محمد عامر جس کا کیریئر کے آغاز سے ہی دسم اکرم سے موازنہ کیا جاتا تھا۔ اپنی اسپڈ، لائن لینتھ اور شاندار سوننگ باؤلنگ سے وہ کبھی لمبے باز کو مشکل میں ڈال سکتے تھے۔ محمد عامر پرتیس اگست 2010 کو ہیچ فگنگ کا الزام لگایا گیا جس کی وجہ ان کی بی بی سی کی ناقابل یقین نوبال تھی۔ محمد عامر نے اپنا جرم تسلیم کر لیا اور قوم سے معافی مانگی۔ نومبر 2011 میں عامر کو جیل بھجوا دیا گیا اور ان پر بھی پانچ سال کی پابندی عاید کردی گئی مگر کم عمری کی وجہ سے انہیں کافی رعایت دی گئی۔ 29 جولائی 2015 کو انہیں کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ 2016 میں انہیں پاکستان کی قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور اب محمد عامر فیصل ٹیم کا حصہ ہیں۔ تیرہ اپریل 1992 کو کوہر خان میں پیدا ہونے والے محمد عامر نے اپنا پہلا انٹرنیشنل ہیچ آئی سی سی ٹوٹنی ٹوٹنی ورلڈ کپ 2009 میں صرف سترہ سال کی عمر میں کھلایا۔ محمد عامر نے اس ٹورنامنٹ کے سارے میچوں میں

دوسرے لیے باز ہیں۔ اشرفل 2007 سے 2009 تک تیرہ ٹیسٹ میچ، ایکس ون ڈے اور گیارہ ٹی ٹوئنٹی میچوں میں بنگلہ دیش کی کپتانی بھی کر چکے ہیں۔ کرکٹ کا ایک اور بہترین کھلاڑی اسپاٹ گلنگ کا نشانہ بن گیا۔ اسی طرح اسپاٹ گلنگ کے جرم میں ملوث ہو کر عمر بھر کے لیے بین ہونے والے کھلاڑیوں میں نیوزی لینڈ کے اوپننگ بیٹسمین لوونسنٹ بھی شامل ہیں۔ لوونسنٹ نے 2011 میں سامی کھلاڑی نوید عارف کے ساتھ مل کر انگلش کاؤنٹی کا بیچ فکس کرنے کا اعتراف کیا۔ جس کے بعد 2014 میں انگلینڈ بورڈ نے ان پر تاحیات پابندی لگادی۔ 11 نومبر 1978 کو نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں پیدا ہونے والے لوونسنٹ نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز تیس نومبر 2001 کو آسٹریلیا کے خلاف کیا اور پہلے میچ میں ہی سچری اسکور کی۔ ڈیبیو پہ سچری اسکور کرنے والے یہ نیوزی لینڈ کے چھٹے کھلاڑی تھے۔ لوونسنٹ نے اپنے کیریئر میں 23 ٹیسٹ میچ کھیلے اور تین سچریوں اور نو نصف سچریوں کی مدد سے 1332 رنز اسکور کیے۔ لوونسنٹ نے 102 ایک روزہ میچ کھیل رکھے ہیں جس میں انہوں نے تین سچریاں اور گیارہ نصف سچریاں اسکور کیں۔ یہ نیوزی لینڈ کے واحد کھلاڑی ہیں جو اسپاٹ گلنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے۔

انہی کی طرح ویسٹ انڈیز کے مشہور بلے باز مارلون سیونیلو بھی میچ گلنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے تھے۔ 2007 میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا سیریز کے دوران ان پر ٹی ٹوئنٹی کے ماحولیات دینے کا الزام لگایا گیا۔ 2008 میں آئی سی سی کی طرف سے ان پر دو سال کے لیے بین لگادیا گیا۔ سیونیلو پانچ فروری 1981 کو جیکا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز 14 اکتوبر 2000 کو سری لنکا کے خلاف کیا۔ مارلون سیونیلو اب تک اکہتر ٹیسٹ اور ایک سو ستاسی ایک روزہ میچ کھیل چکے ہیں۔ مارلون سیونیلو کا شمار ویسٹ انڈیز کے بہترین بلے بازوں میں ہوتا ہے۔ سیونیلو 2012 اور 2016 کے ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ جیتنے والی ویسٹ انڈیز ٹیم کا اہم حصہ تھے۔ انہوں نے ان دونوں ٹورنامنٹس کے فائنل میں مین آف دا میچ کا ایوارڈ حاصل کیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ورلڈ کپ 2015 میں کرس گیل اور مارلون سیونیلو نے تین سو بہتر رنز کی پارٹنرشپ قائم کی جو کہ ایک روزہ کرکٹ کی تاریخ کی سب سے بڑی پارٹنرشپ ہے۔ میچ گلنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہونے والے یہ ویسٹ انڈیز کے پہلے کھلاڑی ہیں۔

ساتھ نے ستائیس ٹیسٹ میچ کھیلے اور ستاسی وکٹیں حاصل کیں۔ ان کی بہترین باؤلنگ 2006 میں سلاوا تھ افریقا کے خلاف دیکھنے کو ملی جب انہوں نے اپنی بہترین سوئنگ باؤلنگ سے مخالف ٹیم کے چھکے چھڑا دیے اور میزبان ٹیم کو صرف 84 رنز پہ ڈمیر کر دیا اور انڈیا نے تاریخ میں پہلی بار جنوبی افریقا کو ان کے گھر میں شکست دی۔ سری ساتھ نے اس میچ میں پانچ وکٹیں حاصل کیں اور مرد میدان قرار پائے۔ کرکٹ کا یہ ستارہ بھی اسپاٹ گلنگ کی وجہ سے ڈوب گیا۔

ایک ان پر ہی نہیں، انڈیا کا ایک اور کھلاڑی بھی اس جرم میں ملوث پایا گیا۔

”بھارت کی نمائندگی کرنے والے بیننگ آل راؤنڈر اے جے شرما بھی اسپاٹ گلنگ کا شکار ہو چکے ہیں۔ 2000 میں اے جے شرما پر اسپاٹ گلنگ کا الزام لگایا گیا۔ جرم ثابت ہونے پر ان پر تاحیات پابندی لگادی گئی۔ ستمبر 2014 میں دہلی ڈسٹرکٹ کورٹ نے ان سے پابندی ہٹائی اور بی سی آئی کو حکم دیا کہ انہیں بورڈ کی سرگرمیوں میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ 13 اپریل 1964 کو دہلی میں پیدا ہونے والے اے جے شرما نے اپنے کیریئر کا آغاز دو جنوری 1986 کو ویسٹ انڈیز کے خلاف کیا۔ انہیں ایک روزہ میچوں میں اے جے شرما نے بیس کی اوسط سے 424 رنز بنائے اور پندرہ وکٹیں حاصل کیں۔“

اس جرم میں صرف بڑی ٹیموں کے کھلاڑی ہی نہیں بنگلہ دیش جیسی چھوٹی ٹیم کے کھلاڑی بھی ملوث پائے گئے۔ بنگلہ دیش کے نوجوان بلے باز محمد اشرفل بھی اسپاٹ گلنگ کا نشانہ بن کر آٹھ سال کی پابندی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اپنے خوبصورت اسٹروک کے لیے کی وجہ سے مشہور نوجوان بیٹسمین محمد اشرفل بنگلہ دیش کی بیننگ لائن اپ کے مستقبل کی امید تھے۔ 2013 کی بنگلہ دیش پریمیر لیگ کے دوران محمد اشرفل پر بیچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ 2014 میں بنگلہ دیش کرکٹ بورڈ نے محمد اشرفل پر آٹھ سال کی پابندی عاید کی۔ بعد میں یہ پابندی کم کر کے پانچ سال کر دی گئی۔ سات جولائی 1984 کو ڈھاکہ میں پیدا ہونے والے محمد اشرفل نے اپنے کیریئر کا آغاز چھ ستمبر 2001 میں سری لنکا کے خلاف کیا۔ محمد اشرفل نے آٹھ ٹیسٹ میچوں میں چوبیس کی اوسط سے رنز بنائے اور ایکس وکٹیں بھی حاصل کیں۔ اشرفل بنگلہ دیش کی طرف سے ون ڈے، ٹیسٹ اور ٹوئنٹی ٹوئنٹی میں تیز ترین نصف سچری اسکور کرنے والے بلے باز ہیں۔ محمد اشرفل بنگلہ دیش کی طرف سے ایک روزہ کرکٹ اور ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رنز اسکور کرنے والے



## پرانی کوکھ

کاشف زبیر

اسے دنیا کی پرسہولت میسر تھی، دولت کے ڈھیر پر وہ بیٹھا ہوا تھا لیکن جب اپنے حویلی نما گھر کا جائزہ لیتا تو دکھ سے دل بھر اٹھتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک عجیب راستہ منتخب کیا تھا لیکن اسے حاصل کیا ہوا ہے؟

مغرب سے درآد ایک الگ انداز کا واقعہ

سیلی نے اور اس کا شوہر مارینو نے اس کافی فارم میں کام کرتے تھے یہاں برازیل کی بہترین کافی اگتی تھی اور یہ فارم مسٹر بین جوائے کی ملکیت تھا۔ بین جوائے کا شمار برازیل کے چند دولت مند ترین افراد میں ہوتا تھا۔ یوں تو اس کے بے شمار کاروبار تھے جن میں بینکوں سے لے کر انٹر لائن تک شامل تھیں لیکن وہ کافی کنگ کے نام سے مشہور تھا۔ بین جوائے نسلا اطالوی تھا اور وہ دس سال پہلے برازیل آکر آباد ہوا تھا۔ وہ یہاں مقبول بھی تھا کیونکہ اس

2017  
WWW.PAKSOCIETY.COM

مہینہ نامہ مگشتہ

نوری کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ ماں بننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ اس نے اس شرط کو باقاعدہ تحریر کروایا تھا۔ یہ ان کے شادی کے معاہدے میں شامل تھی لیکن اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔

بین نے اس وقت تو نوری کی یہ شرط مان لی تھی لیکن اب اسے اولاد کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ پچاس برس کا ہو چکا تھا اور اس کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اگر اب اس کا بچہ ہوتا تو وہ کوئی بیس برس بعد جا کر اس قابل ہوتا کہ اس کا وسیع کاروبار اور دولت سنبھال سکے۔ دوسری طرف وہ جانتا تھا کہ نوری کسی صورت ماں بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ جب بھی ان کے درمیان بچے کے موضوع پر بات ہوتی تو نوری اپنا عزم ضرور دہرائی تھی۔ ایک موقع پر جب بین نے بچے کو اپنی خواہش قرار دیا تو نوری نے صاف کوئی سے کہا۔ ”میں اس بات پر تم سے الگ ہونے کو ترجیح دوں گی پھر تم چاہو تو کسی اور سے شادی کر کے اپنی خواہش پوری کر سکتے ہو۔“

لیکن بین، نوری سے محبت کرتا تھا اور اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بات وہیں رہ جاتی تھی۔ وہ نوری سے اس موضوع پر بات نہیں کرتا تھا لیکن اس کے اندر بچے کی خواہش باقی تھی۔

سیلی اور ماریو کا تعلق برازیل کے پڑوسی ملک بولیویا کے ایک پسماندہ سرحدی علاقے ٹریٹیڈاڈ سے تھا یہ جگہ برازیل کی سرحد سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ ماریو ایک مزدور تھا اور جب سیلی نے اس سے شادی کی تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس نہ تو اپنا مکان ہے اور نہ اپنی زمین۔ کیا ان کے بچے بھی اسی طرح غربت اور محروم زندگی گزاریں گے۔ سیلی اور ماریو کا تعلق بہت غریب گھرانوں سے تھا جہاں ایک وقت کھانا بننا تھا تو دوسرے وقت کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی کو اس کے ماں باپ نے بڑی مشکل سے ہائی اسکول تک پڑھایا تھا اور اس کے بعد اسے صاف کہہ دیا کہ اگر اسے آگے پڑھنا ہے تو اپنے سارے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے۔ سیلی جانتی تھی اس کے ماں باپ خود غرض نہیں تھے لیکن وہ کیا کرتے ان کے پانچ بچے اور چھ تھے، ان کو پڑھانا اور پالنا تھا۔ سیلی سب سے بڑی تھی۔

مجبوراً صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے کام شروع کر دیا۔ ان کے علاقے میں کام محدود تھا۔ مرد کان کن بن

نے اپنی دولت سے برازیل میں بے شمار کاروبار شروع کیے تھے اور کئی ہزار افراد کو روزگار مہیا کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتا تھا اس نے عورتوں بچوں اور نشیات کے عادی افراد کی بحالی اور بہتری کے لیے کئی اداروں کو بھاری عطیات دیئے تھے۔

پچاس سالہ بین نے دو سال پہلے ہی برازیل کی مہنگی ترین سپر ماڈل نوری سے شادی کی تھی۔ نوری کے حسن و جمال میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کے بے شمار پرستار تھے۔ لیکن ان میں کوئی بین جوائے جیسا دولت مند نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بین نے اسے پرپوز کیا تو اس نے اقرار کرنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ نوری جانتی تھی کہ اس کی کامیابی کا دور بہت مختصر ہے اور چند سال بعد وہ سابقہ سپر ماڈل بن جائے گی۔ دوسرے وہ اس مشینی زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اس نے کامیابی، شہرت اور دولت سب حاصل کر لی تھی۔ اب وہ سکون سے ایسی پریشانی زندگی گزارنا چاہتی تھی جس کے لیے اسے خود کوئی تک و دو نہ کرنی پڑے۔ بین جوائے اسے یہ زندگی دے سکتا تھا۔ اس کے انتخاب کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا شخص نہیں تھا اس نے نوری کو پسند کیا تھا اور اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس نے نوری پر کام کرنے کی پابندی بھی نہیں لگائی تھی۔ یعنی وہ شادی کے بعد بھی ماڈلنگ کر سکتی تھی۔ گزشتہ دو سال سے ان کے درمیان بہت اچھی گزر رہی تھی۔ نوری کام کرتی تھی لیکن دورانہ یکم کر دیا تھا۔ خاص طور سے جب بین گھر آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ بھی گھر میں ہو۔ اس طرح اس نے کام بھی مخصوص کر لیا تھا اور اب ایسی ماڈلنگ کرنے سے گریز کرتی تھی جس میں اسے مکمل عریاں ہونا پڑے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر کی معاشرے میں عزت ہے اور نوری کی عریاں ماڈلنگ سے اسے شرمندگی ہو سکتی ہے۔ نوری نے بین سے صرف ایک شرط سنوائی تھی کہ بین اسے ماں بننے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اس نے بین سے صاف کہہ دیا ہے۔

”میں ماں نہیں بننا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں بچے پسند نہیں ہیں؟“

”بچے تو پسند ہیں لیکن میں ماں بننے کی تکلیف نہیں برداشت کر سکتی۔“

نوری کا تعلق بہت غریب گھرانے سے تھا اور اس نے اپنے چار بہن بھائیوں کو گھر میں پیدا ہوتے دیکھا تھا اس کی ماں پر اس دوران میں جو گزرتی تھی وہ ہمیشہ کے لیے

تھی۔ ماریٹو نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم بہت خوش نظر آ رہی ہو؟“

سیلی نے آج کا اخبار اس کے سامنے رکھ دیا اور ایک خبر پرائنگی رہی۔ اس کے مطابق برازیل میں بولیویا کی سرحد کے پاس کافی کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جا رہی تھی اور کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس لیے بولیویا کی سرحدی علاقے سے لوگ برازیل جا رہے تھے اور وہاں ان کو ملازمتیں مل رہی تھیں۔ آمدنی تین سے چار گنا زیادہ تھی اس لیے لوگ برازیل جانے کو ترجیح دے رہے تھے اور کیونکہ برازیل کو بھی کارکنوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ آسانی سے بولیویا کے لوگوں کو ورک ویزا دے رہے تھے۔ ماریٹو نے خبر پڑھ کر سوالیہ نظروں سے سیلی کی طرف دیکھا تو اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”ہم بھی برازیل جاسکتے ہیں اور وہاں کام حاصل کر سکتے ہیں۔“

ماریٹو ہنسیا تھا۔ ”لیکن اپنا ملک چھوڑ کر...“

”ہم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔“ سیلی نے اس کی بات کاٹی۔ ”ہم وہاں جا کر رقم جمع کریں گے اور جب ہمارے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ ہم اپنی زمین اور مکان خرید سکیں تو ہم واپس آ جائیں گے۔“

ٹرینیڈاڈ میں زمین زرخیز اور سستی تھی لیکن لوگ اتنے غریب تھے اور آمدنی اتنی محدود تھی کہ وہ یہ سستی زمین بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ آمدنی محدود تھی تو مہنگائی بہت زیادہ تھی لوگ جو کماتے تھے وہ پورا نہیں پڑتا تھا بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی اور ماریٹو یہاں دونوں کمارہے تھے لیکن شادی کے بعد ان کی بچت سو بولیویا ڈالرز تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ ماریٹو ہنسیا رہا تھا لیکن سیلی نے اسے راضی کر لیا۔ ماریٹو کو خوف تھا کہ یہاں روزگار ویسے ہی مشکل سے ملتا ہے اور وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور ان کو برازیل میں بھی کام نہیں ملا تو ان کو واپس آ کر بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے برعکس سیلی کی خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔ اس کا کہنا تھا خطرے کا سامنا کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا ہے وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو خطرہ دل کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

بولیویا کے شہریوں کو ویزا سرحد پر مل رہا تھا۔ برازیلی حکام صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ کام کے لیے آنے والے جوان اور مضبوط ہیں۔ وہ کسی کم عمر یا بوڑھے آدمی کو

جاتے تھے اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ سیلی بھی ایک کھیت میں کام کرنے لگی۔ جہاں جان تو ذمعت کے بعد اسے اتنا ملتا تھا کہ وہ بس اپنے اخراجات پورے کر سکتی تھی۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ اتنی آمدنی میں وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھی اور اگر کالج میں داخلہ لیتی تو اتنا کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں زمین زیادہ تر جاگیرداروں کے قبضے میں تھی اور اکثر لوگ ان ہی کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ بولیویا ویسے بھی ایک پسماندہ ملک تھا اب بھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس وقت تو غربت بہت زیادہ تھی۔

سیلی کی ماریٹو سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی کھیت میں کام کرنے والا مزدور تھا اس کی تعلیم معمولی سی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ عام سانو جوان تھا اس کے مقابلے میں سیلی خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی، اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور جلد انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہسپانوی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہاں کے لوگ عشق و محبت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہسپانوی شریقت کے دلدادہ جو ہوتے، وفا ان کی سرشت میں ہوتی ہے اسی وجہ سے یورپ بھر میں انہیں محبت کی دنیا کے باسی کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور چاہے جانے کے مہینے ہوتے ہیں۔ پیار ان کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اسی لیے ان کی شادی کو دونوں خاندانوں نے سراہا تھا۔ ایک دوسرے کے ہو گئے۔

شادی کے بعد انہیں صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ زندگی کسی قدر دشوار ہے خاص طور سے جب آدمی کے پاس بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی رقم نہ ہو۔ بولیویا میں خراب اقتصادی حالات کی وجہ سے پورے ملک کی ایک جیسی پوزیشن تھی اگر وہ کہیں اور چلے جاتے تب بھی ان کا معیار زندگی بہتر نہ ہوتا۔ ابھی ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز تھا اور وہ جدوجہد کر سکتے تھے جب ان کے بچے ہو جاتے تو وہ جدوجہد کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے اور پھر ان کو جیسے تیسے گزارا کرنا پڑتا جیسے ان کے ماں باپ کرتے آئے تھے۔ سیلی اس معاملے میں بہت حساس تھی اور وہ چاہتی تھی جو مشکلیں انہوں نے برداشت کی ہیں وہ ان کے بچوں کو نہ برداشت کرنی پڑے۔ وہ باقاعدگی سے اخبار دیکھتی تھی کہ شاید کوئی روشنی کی کرن نظر آ جائے۔ پھر اسے یہ کرن نظر آ گئی۔ ایک دن ماریٹو کام سے آیا تو سیلی بہت خوش



تھا جہاں کارکنوں کو تین وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مشروبات بھی دستیاب تھے۔ رہائش اور کھانے کے عوض ان کی تنخواہوں سے معمولی سی رقم کائی جاتی۔ سیلی اور مارینو میاں بیوی تھے اس لیے ان کو ڈبل بیڈ والا ہٹ دیا گیا تھا۔ ہٹ ایک کمرے اور ساتھ میں چھوٹے سے باتھ روم پر مشتمل تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ، ایک الماری اور دو کرسیاں تھیں۔ یہ سیلی اور مارینو کے بولیویا کے اس گھر سے چھوٹا تھا جہاں وہ کرائے پر رہتے تھے لیکن یہاں ساری ضروری سہولتیں تھیں۔ سیلی اور مارینو خوش تھے۔ وہ جتنا سوچ کر آئے تھے ان کو اس سے زیادہ ہی مل گیا تھا۔ بس کام ذرا سخت تھا۔ صبح سات سے دو پہر دو بجے تک کام کرنا ہوتا تھا اس کے بعد وقفہ ملتا تھا۔ پھر پانچ سے سات بجے تک کام ہوتا تھا۔ رات نو بجے تک میں کھانا ملتا تھا اور ان کو صبح چھ بجے اٹھنا پڑتا تھا۔ سات بجے تک ناشا کر کے وہ کام پر پہنچ جاتے تھے۔ ان کی درخواست پر ان کو ایک ہی جگہ لگایا گیا تھا۔

جوائے فارمر کی میلوں پھیلنے زمین کے وسط میں بین جوائے کا عالی شان محل نما مکان تھا۔ اگرچہ وہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریوڑی جیفر و میں رہتا تھا لیکن اس کی اصل رہائش گاہ بھی یہی تھی۔ وہ جب یہاں آتا تو اپنے فارم کا دورہ ضرور کرتا اور اس کے ایک ایک حصے میں آتا تھا۔ سیلی اور مارینو اسے مینے میں ایک بار تو ضرور دیکھتے تھے۔ وہ اپنے کسی کاروبار کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا جتنا جوائے فارمر کو۔ اس کی ذاتی دل چسپی کی وجہ سے فارمر کی انتظامیہ اور پیر وائزر بھی مستعد رہتی تھی اور کارکنوں پر مکمل نظر رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سیلی اور مارینو کو کام کے اوقات میں سکون کے مواقع بہت کم ملتے تھے اور شام کو جب چھٹی ہوتی تو وہ تھک چکے ہوتے تھے۔

اس کے باوجود وہ خوش تھے۔ یہاں کوئی پریشان کرنے والی چیز نہیں تھی وہ محنت کرتے تھے تو ان کو اس کا پورا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ پھر رہائش اور کھانا پینا بھی بہترین تھا اس لیے وہ کام میں پوری دل چسپی لیتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں ان کی صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ ایک سال بعد جب وہ دو مہینے کی چھٹی پروا پس گئے تو ان کے گھر والے ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ انہوں نے ایک سال میں جو کمایا تھا اس سے انہوں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک چھوٹی سی وادی میں کچھ زمین خرید لی۔ اس وادی میں ایک چشمہ بھی تھا اور وہاں کسان بہت اچھی فصل حاصل کرتے

ویریم نہیں دے رہے تھے۔ سیلی اور مارینو ایک خستہ حال بس اور پھر کوئی چار میل کا پیدل سفر کر کے سرحدی چوکی تک پہنچے۔ جہاں ان کو آسانی سے ویریم مل گیا۔ یہ عارضی ویزا تھا ان کو مستقل ویزم اس وقت ملتا جب ان کو تین ملازمت مل جاتی دوسری صورت میں ان کو ایک مہینے کے اندر واپس آنا پڑتا اور وہ نہیں آتے تو برازیلیئن پولیس ان کی تلاش شروع کر دیتی۔ سیلی نے سنا تھا کہ برازیل سے زیادہ مواقع پورٹو ویل ہو میں تھے۔ یہ علاقہ خاص طور سے کائی کے باغات کے لیے مشہور ہو رہا تھا۔ وہ پورٹو ویل ہو کی طرف روانہ ہو گئے۔ بس کا ٹکٹ خریدنے کے بعد ان کے پاس بس اتنی رقم بچی تھی کہ وہ اس سے دو دن گزارا کر سکتے تھے اور اس کے بعد فاقے شروع ہو جاتے۔ دو مہینے بعد وہ پورٹو ویل ہو میں آئے۔

سیلی نے بس سے اترتے ہی ایک ڈسٹ بن میں نظر آنے والا تازہ اخبار اٹھایا اور اس میں ملازمت کے اشتہار دیکھنے لگی۔ سرحد کے دونوں جانب اشتہار زبان بولی اور لکھی جاتی ہے اس لیے زبان کا مسئلہ نہیں تھا۔ سیلی نے ایک بڑا اشتہار دیکھا۔ یہ جوائے فارمر کی طرف سے تھا اور یہاں کائی کے باغات میں کام کرنے کے لیے مزدور درکار تھے۔ کھانے اور رہائش کے ساتھ معقول تنخواہ بھی دی جارہی تھی۔ یہ ان کی سابق آمدنی سے تین گنا زیادہ تھی۔ سیلی نے خوش ہو کر مارینو سے کہا۔ ”اگر یہاں ملازمت مل گئی تو ہم تین چار سال میں بہت ساری رقم جمع کر سکتے ہیں۔“

”اگر ملازمت مل جائے تو۔“ مارینو نے جواب دیا وہ ابھی تک شک میں تھا کہ ان کو یہاں کام مل سکتا ہے حالانکہ اس کے ہزاروں ہم وطن یہاں کام کر رہے تھے۔ وہ جوائے فارمر پہنچے اس وقت وہ بین جوائے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ فارمر کے ایک نائب منیجر نے ان کا انٹرویو لیا اور ان کی عمر، صحت اور کھیتوں میں کام کرنے کا تجربہ جان کر ان کو فوراً ملازمت دے دی۔ جوائے فارمر کے باغات میلوں کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں کام کرنے والے افراد کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ ان مزدوروں کے لیے باغات کے درمیان میں ہی جا بہ جا چھوٹے چھوٹے ہٹ بنائے گئے تھے۔ سستے اور سادہ تعمیراتی میٹرل سے بنے ہوئے ان ہٹس میں سہولتیں موجود تھیں۔ ان کو بجلی اور پانی دیا گیا تھا لیکن وہ یہاں کچھ بیکار نہیں کھا سکتے تھے۔ مچن کی سہولت نہیں تھی۔ ایک بڑا سائیس

بین نے کسی قدر سرد انداز میں اسے دیکھا۔ ”یہ مناسب ہوگا، ورنہ تم بتاؤ اس کے سوا اور کیا راستہ ہے؟“  
 ”میرا مطلب ہے کیا اخلاقی اور قانونی لحاظ سے یہ درست ہوگا؟“

”شاید نہیں۔“ بین کا لہجہ مدہم ہو گیا تھا۔ ”لیکن دوسروں کو اس بارے میں بتانی نہیں چلے گا۔“  
 ”کیسے پتا نہیں چلے گا جب کہ اس کام میں بہت سارے لوگ ملوث ہوں گے۔“ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم رہے گی۔ نوری کی آواز تیز ہو گئی۔  
 ”تم مجھ پر اعتماد رکھو۔“ بین نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ ممکن ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور مجھے تم پر اعتماد ہے۔ لیکن اگر بات کھل گئی تو تم سوچ سکتے ہو ہم کس مشکل میں پڑ جائیں گے؟“

”کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“ بین نے کہا۔ ”میں سب سنبھال لوں گا۔“

اس گفتگو کے بعد وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے تھے۔ گزشتہ چار دن سے تین ڈاکٹروں کی ایک ٹیم جدید ترین آلات کی مدد سے ان کا جسمانی معائنہ کر رہی تھی۔ ان کے متعدد ڈیٹ لے گئے تھے اور آج ہی اس ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر روزانے بین کو بتایا تھا کہ وہ جو چاہتا تھا وہ عملی طور پر مشکل سمجھ لیکن ناممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کی یہ ٹیم اپنے عملے اور آلات سمیت بہت خفیہ عمل آئی تھی۔ وہ جس حصے میں مقیم تھی وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں تک کھانے پینے کا سامان بھی خود کار روٹریٹنگ ٹریلروں کی مدد سے جاتا تھا۔ ڈاکٹر روز کی طرف سے اوکے کا سگنل ملنے کے بعد ہی بین جوئے نے نوری سے بات کی تھی اگرچہ نوری کو پہلے بھی معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن اس وقت ان کے ٹیٹ لے لیے جا رہے تھے۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بین جوئے جو چاہتا ہے وہ ممکن ہے۔ نوری اگرچہ اس خیال سے متفق نہیں تھی کیونکہ ایک تو اسے اخلاقی لحاظ سے درست نہیں سمجھ رہی تھی اور دوسرے اسے اولاد کی خواہش نہیں تھی جب کہ بین جوئے بہر صورت اپنا وارث چاہتا تھا اور اس کے لیے کسی حد تک جانے کے لیے تیار تھا سوائے اسے چھوڑنے کے، کیونکہ وہ نوری سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ نوری سے بات کر کے بین جوئے محل کے اس حصے میں آیا جہاں ڈاکٹر اپنے عملے اور سامان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ بین

تھے۔ یہ زمین تھوڑی تھی لیکن ان کو اُمید تھی وہ چند سال میں مزید زمین حاصل کر سکیں گے اور اس پر گھر بھی بنائیں گے۔  
 بین جوئے عام طور سے مبینے کی آخری تاریخوں میں گھبراتا تھا اور اس کے بعد یہاں ایک ہفتہ یا دس دن ٹھہرتا تھا۔ جب وہ آتا تو اس سے اگلے دن وہ جوئے فارمز کا دورہ شروع کرتا۔ اپنی واپسی تک وہ روزانہ صبح سے شام تک جوئے فارمز کے مختلف حصے دیکھتا تھا۔ اگر اس کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی حصہ معائنے سے رہ جاتا تھا تو وہ اگلی بار اپنے معائنے کا آغاز اسی حصے سے کرتا تھا۔ اس نے جوئے فارمز میں دنیا کی بہترین کافی کاشت کرائی تھی اور یہ کافی ایک معاہدے کے کافی تیار کرنے والی بہترین کمپنیوں کو فراہم کی جاتی تھی بین اپنے فارمز میں کوئی کیسیائی کھاد یا جراثیم کش دوا استعمال نہیں کرتا تھا اس کے بجائے وہ حیاتیاتی کھاد اور کیڑے کوڑے مارنے کے قدرتی دوا استعمال کرتا تھا جو اسے کسی قدر مہنگے پڑتے تھے لیکن اس کے نتیجے میں جو کافی پیدا ہوتی تھی اس کا معیار اور ذائقہ لا جواب ہوتا تھا۔ بین جوئے جتنا اس فارم پر خرچ کرتا تھا اس سے کہیں زیادہ کماتا تھا۔

لیکن اس بار بین جب گھر آیا تو خلاف معمول دوسرے دن اس نے فارم کا معائنہ نہیں کیا۔ نہ اس سے اگلے دن نکلا اور پھر وہ پورا ایک ہفتہ تک اپنے محل مکان سے نہیں نکلا تھا۔ فارمز انتظامیہ اور کارکن حیران تھے کیونکہ برسوں سے بین جوئے کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ تو اسے اگلے دن اپنے درمیان دیکھنے کے عادی تھے۔ جو لوگ بین سے براہ راست تعلق رکھتے تھے وہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیوں فارمز کے معائنے پر نہیں نکلا تھا۔ انہوں نے بین سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پرسنل اسٹاف نے کسی ملاقات کے امکان کو رد کر دیا تھا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔

یہ بین کی آمد کا چمٹا دن تھا۔ وہ اور نوری مکان کے ٹیرس میں موجود تھے جہاں سے دور تک پہلے باغات صاف نظر آتے تھے اور وہ اپنے ہی فارمز کی بنی کافی پی رہے تھے۔ بین جوئے کو کافی زیادہ پسند نہیں تھی لیکن اس کے خیال میں یہ کاروباری اخلاقیات کا تقاضہ تھا کہ وہ جو چیز دوسروں کو چھپ رہا ہے اسے خود بھی استعمال کرے۔ دونوں میاں بیوی خاموش تھے۔ پھر نوری نے ہچکچا کر کہا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

جوائے ڈاکٹر روزا کے پاس آیا۔

”ہم تیار ہیں۔“

”گڈ۔“ ڈاکٹر روزا مسکرایا۔ ”اب ایک ایسی عورت درکار ہے جو شادی شدہ ہو، کنواری نہ ہو اور ابھی ماں بھی نہ بنی ہو۔“

”اسے دیکھنا پڑے گا۔“ بین جوائے نے کہا۔ ”لیکن بندوبست ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم کل سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔“ ڈاکٹر روزا نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے ایک مہینے کے اندر ہمیں کامیابی مل جائے گی۔“

اگلے روز بین جوائے محل سے نکلا اور اس نے فارمزا کا معائنہ شروع کر دیا۔ فارمزا کی انتظامیہ اور کارکنوں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ بین جوائے ٹھیک تھا۔ وہ ٹھیک تھا تو ان کی روزی بھی سلامت تھی۔ اس علاقے میں بین اپنے ملازمین کو سب سے اچھی تحواہیں اور سہولیات دیتا تھا۔ کسی ہنگامی صورت حال میں بھی ان کا خیال رکھتا تھا تو ایسے مالک کی سب کو فکر رہتی تھی۔ جب بین جوائے اس حصے میں داخل ہوا جہاں سیلی اور ماریونے کام کر رہے تھے۔ وہ دونوں ایک درخت کے آس پاس زمین صاف کر رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بین جوائے ٹھک گیا تھا اور اس نے اس حصے کے سپروائزر کو اشارے سے پاس بلایا وہ دوڑا آیا تھا۔

”جناب غالی۔“

”یہ دونوں کون ہیں؟“

”یہ میاں بیوی ہیں۔ سیلی نے اور ماریونے“  
دونوں بلیوین ہیں۔ یہاں ایک سال سے زیادہ عرصے سے کام کر رہے ہیں دونوں سختی اور اچھے کارکن ہیں۔“ سپر وائزر نے مستعدی سے جواب دیا۔

بین جوائے نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ اس نے سپروائزر سے پوچھا۔ ”یہ کہاں مقیم ہیں؟“

”سیکٹر فائیو میں ان کو ایک ہٹ الاٹ کیا گیا ہے۔“  
اس وقت سیلی اور ماریونے جوائے کو سامنے دیکھ کر مڑوب کھڑے ہو گئے تھے۔ جب وہ سپروائزر سے بات کر رہا تھا تو سیلی نے محسوس کیا وہ ان کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ کیونکہ گفتگو کے دوران بین کی نظریں مستقل ان پر مرکوز تھیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سیلی پر مرکوز تھیں لیکن انہیں مردانہ نظریں نہیں کہا جاسکتا تھا۔ سیلی نے موسم کی مناسبت

سے جینز کی چھوٹی سی نیکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا صحت مند جسم اس لباس میں نمایاں ہو رہا تھا اس کے باوجود بین نے اسے مرد کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ سیلی کو ایسی نظروں کا خوب تجربہ تھا۔ بین کچھ دیر سپروائزر کے ساتھ بات کرتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے کچھ کارکنوں سے بات کی لیکن پھر سیلی اور ماریونے کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کام معمول کے مطابق ہونے لگا تو سیلی نے آہستہ سے ماریونے سے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے بین جوائے ہمارے بارے میں بات کر رہا تھا۔“

ماریونے نے بے یقینی سے کہا۔ ”اسے ہمارے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پتا نہیں لیکن مجھے ایسا ہی لگا۔“ سیلی بولی۔  
”نہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی بین جوائے کو ہم جیسے معمولی کارکنوں کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ سیلی نے کہا اور کام میں لگ گئی۔ وہ ایک مہینہ پہلے ہی واپس آئے تھے اور ان کو چھٹیوں کے پندرہ دنوں کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ زمین خریدنے اور آنے جانے کے اخراجات کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا اس لیے وہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کے منتظر تھے۔ ان کو دو دن بعد آنے والی پہلی کو تنخواہ مل جاتی۔ سیلی کو کچھ نئے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ زیادہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کی منتظر تھی۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو سیلی یہی بات کر رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک گئے۔ رات کے اس وقت کوئی نہیں آتا تھا۔ یہاں ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا کچھ کارکنوں سے اچھے تعلقات تھے تو ان سے بھی میس میں ملاقات ہو جاتی تھی۔

”کون ہے؟“ ماریونے نے پوچھا۔

”سپروائزر آتے ہیں۔“ باہر سے آواز آئی۔ آتے زمین ان کا سپروائزر تھا ماریونے نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے؟“

”اس وقت؟“ ماریونے بولا۔ ”کیا کوئی کام ہے؟“  
”نہیں تمہیں جناب بین جوائے نے طلب کیا ہے۔“  
ماریونے کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ”جناب بین

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”ہمارے کس قسم کے ٹیٹ ہوں گے۔“  
 ”یہ تم کل دیکھ لو گے لیکن کیا یہ بات یقینی ہے کہ تم کبھی  
 اُمید سے نہیں ہوئیں؟“

”ایک بار بھی نہیں۔“ سلی نے مضبوط لہجے میں  
 کہا۔ ڈاکٹر روزا نے یہ سوال پہلے بھی کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں  
 نہیں آیا کہ اس کے اُمید سے ہونے یا نہ ہونے سے ان  
 لوگوں کو کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر روزا ان کو ہال میں لے  
 کر آیا جہاں ایک شخص نے ان کو دو دو انجکشن دیے اور پھر  
 کچھ دوائیاں کھانے کو دیں اور پھر ان کو آرام کرنے کے لیے  
 ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ دوائیوں میں شاید کوئی نیند کی  
 دوا بھی تھی کیونکہ ان کو پلٹتے ہی نیند آگئی تھی جب کہ اس سسٹمی  
 میں اتنی آسانی سے نیند نہیں آتی۔ جو اس وقت وہ محسوس کر  
 رہے تھے۔ صبح ان کو بیدار کیا گیا تھا کیونکہ ان کے ٹیٹ صبح  
 سویرے نہار منہ ہونا تھا۔ ان کے خون کا نمونہ لیا گیا اور پھر  
 ان کو کوئی شینون کی مدد سے چیک کیا گیا۔ ڈاکٹر روزا سلی کو  
 الگ حصے میں لے گیا اور اس کا مخصوص معائنہ کیا۔ اس کام  
 میں بھی اس نے شینون استعمال کی تھیں۔ یہ تمام ٹیٹ اور  
 چیک اپ کوئی تین گھنٹے تک جاری رہے تھے۔ اس کے بعد  
 ان کو پھر پور ناشا فراہم کیا گیا۔ جس وقت وہ ناشا کر رہے  
 تھے۔ اس حصے کے ایک کمرے میں ڈاکٹر روزا بین جوائے  
 اور نوری سے بات کر رہا تھا۔

”عورت عمل طور پر فٹ ہے شی ازاے پاورفل  
 وہ مین لیکن اس کے شوہر کے ساتھ مسئلہ ہے۔ بلڈرپورٹ  
 کے مطابق اس میں مخصوص ہارمون کی کمی ہے اور شاید اسی  
 وجہ سے وہ اب تک ماں باپ نہیں بن سکے ہیں۔“  
 نوری کسی قدر بے چین تھی اس نے کہا۔ ”کیا یہ  
 عورت مان جائے گی؟“

”یہ تو آپ پر ہے۔“ ڈاکٹر روزا نے مختاط انداز میں  
 کہا۔ ”معلومات اسی وقت آگے بڑھیں گے جب وہ مان  
 جائے گی۔“

بین جوائے بھی مضطرب تھا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر کیا  
 ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری طرف سے تم ان سے بات کرو؟“  
 ”میں۔“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”میں کیسے بات کر سکتا ہوں  
 جناب؟“

”کر سکتے ہو میری طرف سے تم ان کو کوئی بھی مالی  
 پیش کش کر سکتے ہو اور ان کی وہ تمام شرائط بھی مجھے قبول  
 ہوں گی جو میرے بس میں ہیں۔“

جوائے نے؟“

”تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔“ آئز مین نے ذرا سخت  
 لہجے میں کہا۔ ”فوراُ چلو وہ انتظار کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔“  
 ”ایک منٹ جناب میں اپنی بیوی کو کہتا  
 ہوں۔“ ماریٹو کہہ کر اندر آیا اور اس نے سلی کو بتانا چاہا لیکن  
 وہ پہلے ہی بس چکی تھی۔ ماریٹو نے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ۔“  
 دونوں میاں بیوی اس طلی پر پریشان ہو گئے تھے۔  
 ان کے دل میں خدشہ آیا تھا کہ شاید ان سے کوئی غلطی ہو گئی  
 ہے جس کی یادداشت میں ان کی طلی ہو رہی ہے۔ آئز مین  
 گاڑی میں آیا تھا راستے میں ماریٹو نے ڈرتے ڈرتے  
 پوچھا۔ ”کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جو ہمیں بلایا گیا  
 ہے؟“

آئز مین ہنسا۔ ”یہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن جہاں  
 تک کسی غلطی پر جواب طلی ہے تو یہ جناب بین جوائے کا کام  
 نہیں ہے۔“

یہ بات سلی اور ماریٹو بھی سمجھ رہے تھے اس کے  
 باوجود وہ سب سے ہوئے تھے۔ اگر ان کو ملازمت سے نکال دیا  
 جاتا تو اتنی اچھی ملازمت دوبارہ نہیں ملتی۔ کام تو مل جاتا  
 لیکن اس میں نہ تو اتنی اچھی تنخواہ ہوتی اور نہ ان کو رہائش اور  
 کھانے کی سہولت ملتی۔ آئز مین نے ان کو گلے کے دروازے  
 پر موجود ایک سوٹ پوش جوان آدمی کے سپرد کیا اور وہ ایک  
 ویران اور خاموش راستے سے گزرا کر گلے کے اندر لے آیا اور  
 کئی طویل راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ہال نما جگہ پہنچے  
 جہاں کئی افراد ڈاکٹروں والے لباس میں موجود تھے۔ وہاں  
 ڈاکٹر روزا بھی تھا وہ ان کے پاس آیا۔ ”مسٹر اور مسز نے  
 میرے ساتھ آؤ۔“

وہ ان کو ایک چھوٹے سے کیمین میں لے گیا۔ یہ ڈاکٹر  
 روزا کا دفتر تھا۔ اس نے ان کو بٹھا یا اور نرم لہجے میں سمجھانے  
 لگا کہ ان کے کچھ ٹیٹ ہوں گے اس کے بعد ان کو بین  
 جوائے کی طرف سے ایک پیش کش ہوگی اور اگر انہوں نے  
 یہ پیش کش قبول کر لی تو ان کے سارے دلدرد دور ہو جائیں  
 گے۔ ڈاکٹر روزا کی اس پیش کش اچھی تھی۔ لیکن بعض الفاظ پر وہ  
 لڑکھڑا جاتا تھا۔ بہر حال سلی اور ماریٹو اتنا سمجھ گئے تھے کہ  
 بین جوائے ان سے کوئی کام لیتا چاہتا تھا اور اس کے بدلے  
 ان کو بہت بڑی دولت مل جانی۔ وہ دولت کے لیے تو یہاں  
 آئے تھے اور ڈاکٹر روزا کے الفاظ پر یقین نہ کرنے کی کوئی  
 وجہ نہیں تھی۔ وہ خوش ہو گئے۔ سلی نے بے تابی سے پوچھا۔



”ایک منٹ....“ ڈاکٹر روزا نے جلدی سے کہا اور ان کو کسی نہ کسی طرح پھر سے بیٹھنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ”ابھی اصل بات تو ہوئی نہیں ہے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو اس کے عوض تم کیا حاصل کر سکتے ہو۔ تم جو دم مانگو گے میں جو اے تم کو دے گا تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔“

”ہمیں نہیں چاہیے۔“ ماریونے نفی میں سر ہلایا۔  
”اس میں سلی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آئے گا۔ اس کی عزت محفوظ ہوگی۔“

”یہ عزت محفوظ ہوگی۔“ سلی زہرے انداز میں بولی۔ ”کسی عورت کی بے عزتی صرف اس طرح تو نہیں ہوتی ہے جس طرح عام طور سے سمجھا جاتا ہے تمہاری تجویز بھی بے عزتی کے برابر ہے۔“

”ہمیں دولت نہیں چاہیے۔“ ماریونے کہا۔ ”ہم جو کما رہے ہیں اس سے مطمئن ہیں۔“

”جناب بین جو اے سے کہا جائے کہ وہ کسی اور کو تلاش کریں۔“ سلی نے کہا اور پھر کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر روزا سمجھ گیا تھا کہ کوئی ترغیب ان کو راضی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان کے لباس اور گفتگو سے جان گیا تھا کہ ان کا تعلق معاشرے کے نہایت غریب طبقے سے تھا اور اسی وجہ سے اسے اُمید بھی کہ وہ مان جائیں گے لیکن انہوں نے اس کی پیش کش سننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ ایک آخری حربہ دھمکی کا باقی رہ گیا تھا۔ اس نے سر دلچہ بناتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو اس انکار کی تمہیں کیا قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے؟“

☆☆☆

سلی بستر پر لیٹی سسکیاں لے رہی تھی اور ماریوناس کے برابر میں سر ہلانے سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سلی دینے کے انداز میں سلی کے شانے پر تھا۔ کچھ دیر بعد سلی نے بھی آواز میں کہا۔ ”مجھے مت چھو میں اس قابل نہیں ہوں۔“

ماریونے سر دھمکی بھری۔ ”ہم دونوں ہی اس قابل نہیں رہے ہیں بلکہ قصور تو میرا ہے۔“  
سلی اٹھ بیٹھی۔ ”نہیں اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔“  
”تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں اس ذمہ داری کو نہیں نبھاسکا۔“

”یہ بھی تو میری وجہ سے ہوا ہے۔“ سلی کے لہجے میں اصرار تھا۔ ”مجھے بچانے کے لیے تم نے اپنی غیرت کی قربانی

ڈاکٹر روزا ہچکچایا لیکن پھر مان گیا کیونکہ اگر یہ کام انجام پذیر ہوتا تو اسے بھی انعام میں بہت بڑی رقم ملتی جو اس کے معاوضے کے علاوہ ہوتی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”صرف بات مت کرو بلکہ ان کو راضی کرو۔“ بین جو اے کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔ ”تم جانتے ہو یہ تمہارے لیے بھی بہت ضروری ہے۔“

ڈاکٹر روزا اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ وہ ہال میں واپس آیا جہاں سلی اور ماریونکریوں پر پاس پاس بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی سلی نے کہا۔ ”ڈاکٹر تم نے بتایا نہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”صبر.... صبر۔“ اس نے جواب دیا اور ان کو اپنے دفتر والے کیمین میں لے آیا یہاں ان کی بات کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ ان کو بٹھا کر ڈاکٹر روزا نے پہلے تنہید باندھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ممکن ہے میں تم سے جو کام لینا چاہتا ہوں وہ تمہارے لیے پسندیدہ نہ ہو لیکن اس دنیا میں سب کچھ تو انسان کی پسند سے نہیں ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے بدلے مل کیا رہا ہے؟“

”ڈاکٹر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ ماریونے بولا۔ ”ہم اب تک کچھ نہیں سمجھ سکے ہیں۔“

”میں سمجھا رہا ہوں لیکن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں جو کہوں اس پر غور ضرور کرنا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر روزا آہستہ آہستہ ان کو بتانے لگا کہ بین جو اے سے کیا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی حیرت بھرے انداز میں سن رہے تھے خاص طور سے سلی کی تو آنکھیں ہی پھیل گئی تھیں کیونکہ اصل مطالبہ اسی سے تھا البتہ یہ ان دونوں میاں بیوی کی اجازت سے مشروط تھا۔ ان کا پہلا رد عمل نہایت مخالفانہ تھا۔ ماریونے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”اگر تمہارا مطلب ہے کہ سائنسی لحاظ سے تو یہ بالکل....“

”سائنس گئی بھاڑ میں۔“ ماریونے بھری سے بولا۔ ”یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔“  
”دیکھو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ صرف ایک سال کی بات ہے۔“

”صرف ایک سال۔“ سلی نے زہرے لہجے میں کہا۔ ”صرف ایک سال جو ہماری باقی ساری زندگی کو برباد کر دے گا۔“ وہ کھڑی ہوئی۔ ”چلو ماریونہ یہاں سے۔“

دی۔“

مارینو آہستہ سے بولا۔ ”شاید ہم دونوں ہی کمزور ہو گئے تھے۔ جان بچانے کے لیے ان کی بات مان لی۔“

اس بات کو ایک مہینہ گزر چکا تھا جب ان کو بین جوئے کے محل میں لے جایا گیا تھا اور آج ڈاکٹر روزانے تصدیق کر دی تھی کہ سیلی امید سے ہو گئی تھی۔ وہ بدستور گل میں شمیم تھے اور ان کو یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مجبوراً اس کام پر تیار ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بین جوئے نے ڈاکٹر روزانے کے توسط سے ان کو پیغام بھیجا تھا کہ ان کو اتنا دیا جائے گا کہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔ سیلی اور مارینو نے اس بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ محض مجبور تھے۔ جب سیلی ڈاکٹر روزانے کے حجرہات سے گزر رہی تھی تو اس نے مارینو کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ اب سیلی کے پاس نہیں جائے گا۔ اسے پندرہ دن تک سیلی سے بالکل الگ رکھا گیا تھا اور جب حمل کی تصدیق ہو گئی تو اسے سیلی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ اس پر بھی وارننگ برقرار تھی کہ وہ سیلی کے پاس نہیں جائے گا۔ کمرے میں کیسے لگے تھے اور اگر وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کرتا تو ان کو پتا چل جاتا اس صورت میں مارینو کو اس اور جگہ منتقل کر دیا جاتا جہاں وہ قید ہوتا۔ آج وہ کتنے دن بعد ایک ساتھ تھے۔ سیلی نے سرگوشی میں کہا۔

”میں اس بچے کو پیدا کرنا نہیں چاہتی۔“

مارینو نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”یہ ہماری خواہش نہیں ہے اور نہ ہمارا بچہ ہے لیکن ہم اس معاملے میں بے بس ہیں۔“

”میں اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔“ سیلی نے پھر کہا۔

”اس کی ایک ہی صورت ہے ہم مر جائیں۔“

لیکن سیلی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے اور مارینو کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی اپنے ان بچوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی جنہیں پیدا کرنے کا اس نے خواب دیکھا تھا اس کے اور مارینو کے بچے۔ یہ بچہ نہیں جو اس کے پیٹ میں تھا اور اسے ابھی سے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں کوئی عفریت کھس آیا ہو۔ اس نے اس کے اور مارینو کے بچوں کا حق غضب کر لیا ہو۔ ڈاکٹر روزانے مارینو کو بتایا تھا کہ اس میں مخصوص ہارمون کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی

## ماہنامہ جاسوسی دلچسپ



ماہنامہ کے

شارے کی دل

فریب کہانیاں

### اولین صفحات

جیکا کے ساحلوں میں سیاحت  
کے شوقین اور حیرم کے متوالوں کا سنگین  
ملاپ۔ تجسس سے بھرپور ایڈ ونچر

### انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپین  
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا  
ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

### آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت  
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت.....  
عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

### سردق کے رنگ

روبینہ رشید اور سید شکیل کاظمی  
کی سردق پر سنسنی خیز کہانیاں

### ان کے علاوہ

مظفر امام، تنویر ریاض، سلیم انور،  
امرشد بیگ، جمال دوستی، تمکین مرزا  
اور عکس فاطمہ کی طبع زاد ترجمہ کہانیاں

### جینی نکتہ جینی

آپ کے تبصرے... مشورے... بحثیں...  
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

رہ سکتی۔ میں مرجاؤں گی۔“  
 ”اب ہم باہر نکلنے لگے ہیں تو میں موقع دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی راستہ سمجھ میں آجائے۔“  
 سلی نے نگرانوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہم پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔“

”کیونکہ ہم نے اب تک رویہ بھی ایسا ہی رکھا ہے۔“  
 ماریونے سوچ کر کہا۔ ”اگر ہمیں یہاں سے نجات حاصل کرنی ہے تو ہمیں اپنے رویے میں بھی تبدیلی لانی ہوگی۔“

اگرچہ یہ کام مشکل تھا کیونکہ سلی اور ماریون دونوں ہی سادہ فطرت انسان تھے جن کو زیادہ اداکاری نہیں آتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے خود پر جبر کر کے ایسا ظاہر کرنا شروع کر دیا جیسے وہ اب خوش ہیں اور ان کو اس تجربے پر پہلے جیسا اعتراض نہیں رہا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ انہیں ملنے والی رقم نے نرم کیا ہے ماریونے ڈاکٹر روزا سے پوچھا۔  
 ”بین جوائے ہمیں کیا دے گا؟“

”جو تم چاہو۔“ ڈاکٹر روزا خوش ہو کر بولا کیونکہ اب تک وہ ان پر اور خود پر جبر کرتا رہا تھا وہ ایک ڈاکٹر تھا جو انسانوں کی خدمت کرنے کا حلف اٹھا کر اس مقام تک آیا۔ یہ کام کرتے ہوئے اسے کوفت ہو رہی تھی اس لیے جب اس نے ماریون اور سلی کے رویے میں تبدیلی دیکھی تو خوش ہو گیا تھا۔

”یہ ہمیں کس طرح ملے گا؟“  
 ”بچے کی پیدائش کے فوراً بعد.... دنیا میں جہاں کہو اور جس کرنسی میں قبول جائے گا۔“  
 چند دن بعد سلی نے ڈاکٹر روزا سے کہا۔ ”کیا ہم اس محل کے علاوہ کہیں اور نہیں رہ سکتے۔“

”یہاں کیا مسئلہ ہے؟“  
 ”یہاں مجھے تنہا ہوتی ہے جبر کا احساس ہوتا ہے۔“  
 ”میں بین جوائے سے بات کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے بین جوائے سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کہا۔ ”اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے اگر ایسا ہو جائے تو یہ میاں بیوی دینی دباؤ سے نکل جائیں گے اور بعد میں بھی آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

مستقبل کا خیال بین جوائے کو بھی پریشان کر رہا تھا بچے کی پیدائش کے بعد تو اسے ان دونوں کو چھوڑنا پڑے گا اور اس وقت نہ جانے ان کا کیا رد عمل ہو۔ اس لیے اس نے

اولاد پیدا ہونے کا امکان بہت کم تھا۔ لیکن ماریون اور سلی کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ ان کے خیال میں ڈاکٹر روزا اپنے مفاد کی خاطر ان سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے ماریون سے کہا کہ وہ چاہے تو وہ اس کا علاج کر سکتا ہے۔ وہ اس چیز کا ماہر ہے لیکن ماریون نے انکار کر دیا تھا۔ انہیں ڈاکٹر روزا پر اعتماد نہیں تھا۔ حمل کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے سلی کو احتیاطیں بتائی تھیں،  
 ”اب تم دونوں کو بچے کی پیدائش تک یہیں رہنا ہو گا۔“

”اس سمجھنے ہوئے ہال اور کمرے میں؟“ سلی نے کہا۔

”نہیں تم لوگ چاہو تو باہر کھلی فضا میں بھی جا سکتے ہو اور چاہو تو محل میں کسی اور جگہ بھی منتقل کیا جاسکتا ہے۔“  
 انہوں نے کسی اور جگہ جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن باہر کھلی فضا میں گھومنے والی پیش کش قبول کر لی تھی۔ یہاں کئی نچربات کے بعد ان کو پتا چل گیا تھا کہ وہ مستقل نہ صرف کیمروں کی زد میں رہتے ہیں بلکہ ان کی باتیں بھی سنی جاتی ہیں گویا وہ محل طور پر ان کی نظر اور ساعت میں تھے۔ باہر جانے کی صورت میں وہ ایک تو تازہ ہوا اور صوب حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے وہ آپس میں محل کر بات کر سکتے تھے۔ ان کو باہر جانے کی اجازت مزید دو دن بعد ملتی تھی جب ڈاکٹر روزا نے سلی کے مزید مثبت عمل کر لیے تھے۔ اس دوران میں اس کے لیے ایک عورت فریو آئی تھی جس کا کام دن بھر میں سلی کو مختلف ایکس سائزز اور حرکات کرانا تھا کہ وہ جسمانی طور پر فٹ رہے اور اس کے وجود میں ملنے والا بچہ بھی صحت مندر رہے۔ جس دن وہ باہر نکلے تو ان سے ساتھ دو نگران بھی تھے لیکن وہ ان سے دور رہے تھے۔ محل کا سبزہ زار ناقابل بیان حد تک خوب صورت تھا۔ نگران دونوں کے نزدیک اس جگہ کی حیثیت ایک خوب صورت قید خانے سے زیادہ نہیں تھی۔ اور قید خانہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو آدمی وہاں سے رہائی کے خواب دیکھتا ہے۔ سلی نے بھی موقع ملتے ہی یہ بات کی تھی۔

”ماریون کیا ہم یہاں سے چاہیں سکتے ہیں؟“  
 ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں ہم کوشش کر سکتے ہیں۔“  
 اس نے سوچ کر کہا۔ ”لیکن ناکام رہے تو یہ شاید ہمیں الگ الگ کر دیں۔“

”نہیں۔“ سلی کا نپ گئی تھی۔ ”میں تم سے الگ نہیں

خود سیلی کا خیال رکھتا تھا۔ ان تین افراد کے علاوہ ایک باورچی تھا اور ایک دوسرے کاموں کے لیے مخصوص شخص تھا۔ سر ہاؤس کے گیٹ پر دو مسلح گارڈز کی ڈیوٹی ہوتی تھی لیکن ان کا سر ہاؤس سے تعلق نہیں تھا وہ باہر سے آتے تھے اور دوسرے گارڈز کے آنے پر ڈیوٹی ان کے حوالے کر کے چلے جاتے تھے ان کا کھانا پینا بھی باہر سے آتا۔

سر ہاؤس سے نکلنے کے لیے صرف یہی ایک گیٹ تھا اس کے علاوہ چاروں طرف دس فٹ بلند دیوار تھی جس پر ڈیڑ اینچ والی خاردار باڑھ بھی لگی تھی۔ گویا تین جوائے نے یہاں بھی خیال رکھا تھا کہ سیلی اور ماریو کہیں فرار نہ ہو جائیں۔ عقب میں تقریباً دیوار جیسی سیدھی دھلان بھی جس پر اتارنا خود کشی کے مترادف تھا۔ لیکن تین جوائے ایک بات بھول گیا تھا کہ انسان کو قید کیا جاسکتا ہے اس کی فطرت کو قید نہیں کیا جاسکتا ہے یہ فطرت ہے جو آگ کا دریا بھی پار کر جاتی ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

وقت گزرتا رہا جیسے مہینے میں سیلی کا پیٹ نمایاں ہونے لگا تھا اور اسے چلتے بھرنے میں کسی قدر وقت ہوتی تھی اس کے باوجود وہ ہر شام کو سر ہاؤس کے اوپری ٹیرس میں ضرور جاتی تھی کیونکہ ایک بار ڈاکٹر روزا نے اسے بتایا تھا کہ سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں کے پاس اس کا ملک بولیویا تھا۔ یعنی وہ بولیویا کے سرحد کے پاس نہیں تھے۔ تب سے سیلی ہر روز اوپر ٹیرس پر آکر ان پہاڑیوں کی طرف حسرت سے دیکھتی تھی۔ اسے لگتا جیسے وہ ایک بہت بڑے قید خانے میں آگئی ہو اور اس کی آزادی ان پہاڑیوں کے پابھی لیکن وہاں تک جانا ناممکن تھا۔ کم سے کم اس حالت میں۔ شروع میں ان کو فرار کا خیال آتا تھا لیکن جب وقت گزرتا گیا اور بچے نے اس کے وجود میں اپنی جڑ مضبوط کر لی تو ان کے لیے فرار بھی ممکن نہیں رہا تھا اب اسے اس بچے کو جنم دینا ہی تھا۔ اس کے بعد ہی اسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ اس لیے فرار کا خیال رفتہ رفتہ ان کے ذہن سے محو ہوتا چلا گیا تھا۔

چھ مہینے بعد سیلی اکثر سوچ میں گم نظر آتی تھی۔ ماریو پوچھتا تو وہ ٹال جاتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں میں ماریو کو اس کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ ہو لیکن جیسے ہی ماریو حرکت کرتا یا اسے آواز دیتا تو وہ ساکت ہو جاتی اور سوتی بن جاتی تھی۔ ماریو نہیں جان سکا تھا کہ وہ کیوں روتی تھی۔ ایک رات ماریو کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہیں تھی۔ ماریو نے اسے سر ہاؤس کے اندر تلاش کیا وہ

اجازت دے دی۔ یہاں سے کچھ دور ایک بلند پہاڑی مقام پر اس کا ایک چھوٹا سلاوا تھا۔ جب یہاں گرمی زیادہ ہوتی تھی تو وہ نوری کے ساتھ وہاں بھی چلا جاتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان دونوں کو ڈاکٹر روزا اور اس کے عملے کے ساتھ وہاں منتقل کر دے گا۔ اس طرح سیلی اور ماریو بھی خوش ہو جائیں گے۔ ابھی تک اس کا ان سے سامنا نہیں ہوا تھا اس کے باوجود ایک ہی جگہ رہنے کا احساس دونوں طرف سے حاوی رہتا تھا۔ الگ جگہ چلے جانا دونوں کے حق میں بہتر تھا۔ نوری تو مستقل ریوڈی جنیز و چلی گئی تھی تین جوائے کا بھی زیادہ وقت جوائے فارمز سے دور گزرتا تھا۔ لیکن یہ بات سیلی اور ماریو کو نہیں معلوم ہوتی تھی۔

”ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ تین مہینے ہونے میں کتنا وقت ہے اور یہ میاں بیوی کوئی گڑبڑ تو نہیں کریں گے؟“

”ابھی ایک مہینا باقی ہے۔“ ڈاکٹر روزا نے جواب دیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے انہوں نے صورت حال کو کوئی طور پر قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ دولت کی کشش بھی ان کو مجبور کر رہی ہے میرا خیال ہے بچے کی پیدائش تک وہ بالکل راضی ہو جائیں گے اور جب آپ ان کو بہت بڑی رقم دیں گے تو ان کی رہی تھی تکلیف بھی ختم ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے تین مہینے مکمل ہونے پر ان کو ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے اس دوران میں تم وہاں بھی دیکھ بھال کے تمام انتظامات کر لو۔“

ایک مہینے کے دوران میں ڈاکٹر روزا نے تین جوائے کے سر ہاؤس میں تمام انتظامات کر لیے تھے اس نے سیلی اور ماریو کو بھی بتا دیا تھا کہ ان کو ایک مہینے کے اندر ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ ایک مہینے بعد ان کو سر ہاؤس منتقل کر دیا گیا تھا یہ دو منزلہ لکڑی کا بنا ہوا سر ہاؤس تھا۔ جو پہاڑی پر سب سے بلند جگہ تھا۔ یہاں موسم گرمیوں میں بھی خوشگوار ہوتا تھا اور رات کو کسی قدر سردی ہو جاتی تھی۔ سیلی اور ماریو کو ماسٹر بیڈ روم دیا گیا تھا۔ یہاں آکر سیلی اور ماریو کو بچ آج آزادی کا احساس ہوا تھا۔ یہاں وہ ٹھنک نہیں تھی جو وہ جوائے فارمز والے محل میں محسوس کرتے تھے۔ یہاں ڈاکٹر روزا اور اس کے دو معاونین تھے باقی افراد کی چھٹی کردی گئی تھی۔ اتنے افراد میں صرف ڈاکٹر روزا ہی تین جوائے کے راز سے واقف تھا باقی افراد کو اس تجربے کے بارے میں کچھ۔۔۔ معلوم نہیں تھا۔ اب سیلی کو فریو تھر اپسٹ کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ڈاکٹر روزا

کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔

”وہ کیسے نکلے؟“ بین جوئے نے ڈاکٹر روزا سے پوچھا۔

”اس بارے میں آپ کا سیکورٹی انچارج بتا سکے گا اسی نے پتا کیا ہے۔“ ڈاکٹر روزا نے جواب دیا۔ بین جوئے نے سیکورٹی انچارج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا۔

”وہ دونوں بیس منٹ میں موجود سیورج کے بائپ کی مدد سے نکلے ہیں۔ بائپ چار سو فٹ نیچے نکلا ہے انہوں نے کہیں سے رسی حاصل کر لی تھی اور اس کی مدد سے نیچے اترے ہیں۔“

”ایک سات مہینے کی حاملہ عورت دو فٹ قطر کے بائپ سے نکل گئی وہ بھی چار سو فٹ نیچے۔“ بین جوئے کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آزادی کے لیے انسان سب کر سکتا ہے جناب۔“ ڈاکٹر روزا نے کہا نہ جانے کیوں اسے اندر سے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی۔

”ڈاکٹر یہ تمہاری ذمہ داری تھی۔“ بین جوئے بولا۔

”نہیں جناب ان کی نگرانی اور سیکورٹی میری ذمہ داری نہیں تھی میری جو ذمہ داری تھی وہ میں نے پوری کی ہے۔“

بین جوئے اس دن وہیں رہا اور تلاش کے کام کی نگرانی کرتا رہا۔ اس نے پولیس کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ مقامی پولیس ایک طرح سے اس کی ذاتی ملازم تھی۔ انہوں نے بین جوئے کے آدمیوں کے ساتھ مل کر پہاڑوں کا ایک ایک حصہ چھان مارا تھا اور سرحد تک دیکھا تھا لیکن سبلی اور ماریو کا کہیں سراغ نہیں ملا تھا۔ دو دن بعد بین جوئے نے تسلیم کر لیا کہ وہ دونوں سرحد عبور کر کے بولیویا جا چکے تھے۔ بین جوئے کا اثر برازیل تک ہی نہیں تھا بلکہ اس کے رابطے بولیویا میں بھی تھے اس نے اپنے جاننے والوں سے رابطہ کر کے ان سے کہا کہ وہ بولیویا میں اس علاقے میں سبلی اور ماریو کو تلاش کریں جہاں وہ آبائی رہتے آئے تھے۔

بین جوئے کے رابطہ کاروں نے سبلی اور ماریو کے علاقے میں دیکھا دونوں کے خاندانوں سے بھی تفتیش کی اور مقامی پولیس کی مدد بھی حاصل کی لیکن سبلی اور ماریو وہاں بھی نہیں آئے تھے۔ ایک مہینے بعد بین جوئے ناکام اور

اندیشہ نہیں تھی پھر اسے اوپر ٹیرس کا خیال آیا۔ سبلی وہاں موجود تھی۔ وہ ساکت کھڑی دور مغرب میں تاریک پہاڑوں کو گھور رہی تھی۔ ماریو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”سبلی کیا بات ہے تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو۔“ سبلی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم میری بات سنو اور مانو گے؟“

”ہاں کیونکہ تم میری بیوی ہو۔“ ماریو نے ٹھوس انداز میں کہا۔

”میں یہ بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں دوں گی۔ کیا تم مجھے اور میرے بچے کو یہاں سے نکال کر لے جا سکتے ہو؟“

ماریو ساکت ہو گیا پھر اس نے کہا۔ ”ہاں میں تمہیں لے جا سکتا ہوں یہاں سے۔“

☆☆☆

بین جوئے برازیل کے دارالحکومت برازیلیہ میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا وہاں اسے اطلاع ملی تھی تو اس نے فوری طور پر اپنی مصروفیت منسوخ کی اور ذاتی جیٹ طیارے سے پورٹو ویل ہو کی طرف روانہ ہو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد وہ سرہاؤس میں تھا جہاں ڈاکٹر روزا اور گیٹ گارڈز بدحواس موجود تھے۔ اس دوران میں بین جوئے کی ہدایت پر محل سے اس کے درجنوں آدمی یہاں پہنچ گئے تھے اور وہ پیدل، گاڑیوں اور پہلی کا پٹری کی مدد سے سبلی اور ماریو کو تلاش کر رہے تھے جو سرہاؤس سے رات کسی وقت نکل گئے تھے۔ یہاں کیمرے اور مائیک نہیں تھے اس لیے ڈاکٹر روزا یا کسی کو بھی صبح سے پہلے معلوم نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر روزا اور خود بین جوئے مطمئن تھا کہ معاملات ان کی مرضی کے مطابق جا رہے ہیں اور وہ اپنے حفاظتی انتظامات سے بھی مطمئن تھا۔ اس کے باوجود جب ڈاکٹر روزا صبح سات بجے سبلی کو جگانے آیا۔ وہ ناشتے سے پہلے اسے کچھ مخصوص ورڈس کراتا تھا تو وہ اور ماریو اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ اس نے فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود گارڈز کو چیک کیا لیکن وہ ڈیوٹی پر تھے اور انہوں نے انکار کیا کہ سبلی اور ماریو گیٹ سے نکل کر گئے ہیں۔ دیواریں پھلانگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بین جوئے کو کال کر کے اطلاع دی اور ایک گھنٹے میں محل سے اس کے آدمی آگئے تھے اور اب وہ باریک بینی سے سرہاؤس کا جائزہ لے رہے تھے کہ سبلی اور ماریو کیسے نکلے۔ اس کے ساتھ پہاڑوں پر ان



مگے تھے اس نے بیچ کی پیدائش کے متوقع دنوں میں بولیو یا  
کے تمام اسپتالوں کو بھی چیک کرایا تھا کہ شاید سیلی کہیں داخل  
ہو لیکن اس کی یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ دونوں میاں  
بیوی کسی ایسی جگہ چلے گئے تھے جو اس کی سوچ سے بھی باہر  
تھی۔ نورمی نے اس سے طلاق لی تھی۔ اپنا وارث  
حاصل کرنے کے چکر میں وہ اپنی بیوی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا  
تھا۔

نوری کے بعد اس نے ایک عام عورت سے شادی کی جسے بچے پیدا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اس بار قدرت کی طرف سے اولاد اس کے تعیب میں نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر روزا کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے بھی اپنی سی مہکرن کوشش کر لی۔ مارشادو بار اُمید سے ہوئی لیکن ہر بار بچہ ضائع ہو گیا۔ تیسری بار وہ ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد تین جوئے نے ہار مان لی تھی۔ اُس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اولاد اس کے مقدر میں ہے اور جو اولاد اس کی تھی وہ اس کے مقدر میں نہیں ہے۔

وقت گزرتا رہا مین جوائے دنیاوی لحاظ سے ترقی کر رہا تھا اس کی دولت دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ مگر اولاد اور وارث سے محرومی اس کی زندگی کا سب سے بڑا آزار بن گئی تھی۔ چند سال بعد مارشا نے بھی اس سے طلاق لے لی تھی اور اس نے طلاق اس وجہ سے لی تھی کہ مین جوائے اسے بچہ نہیں دے سکا تھا جب کہ اسے بچے کی خواہش تھی۔ مارشا نے دوسری شادی کی اور اس کے کئی بچے ہوئے تھے۔ اس سے الگ ہونے کے بعد مین جوائے نے پھر شادی نہیں کی تھی۔ اس کی عمر بھی ساٹھ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اور اب اس کی عمر ستر سے زیادہ ہو چکی تھی۔

سلی اور ماریو کا خیال اس کے ذہن سے نکلا نہیں تھا اس نے ایک جاسوس ایجنسی کی خدمات مستقل بنیادوں پر حاصل کر رکھی تھی۔ وہ سلی اور ماریو کو تلاش کر رہی تھی۔ ایجنسی کی جانب سے ہر مہینے ایک لفافہ آتا تھا اور اس میں صرف ناکامی کی اطلاع ہوتی تھی۔ بین جوائے لفافے کو برقی ڈسٹ بن میں ڈال کر جلا دیتا تھا۔ یہ اس کا راز تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ غلطی سے بھی فاش ہو جائے۔ ایجنسی کے مالک کارلوس بیانے کئی بار اس کیس سے دست بردار ہونے کا ارادہ کیا لیکن بین جوائے نے ہر بار اسے دھوکہ دیا۔ ”تم اپنا کام کرتے رہو۔“

ایک مہینہ پہلے کارلوس لفافے کے بجائے خود اس

نامراد واپس ریوڈی جینر لوٹ گیا تھا جہاں نورمی اس کی منظر کشی اس نے بین جو ائے سے پہلا سوال بچے کے بارے میں کیا تھا۔

”وہ نہیں مل سکے۔“ بین جو اے نے تھکے انداز میں کہا تو نورمی نے اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

”ذیل شخص میں اسی وجہ سے اس کردہ تجربے کا حصہ بننے پر تیار ہوئی تھی کہ تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور مجھے بچل جائے گا اور اب تم کہہ رہے ہو وہ بچہ لے کر غائب ہے۔“

بین جوئے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”کیا اس مت کرو..... جہیں بچہ جا ہے ہی نہیں تھا یہ تو بس میری خواہش تھی اور میں نے اسے حاصل کرنا چاہا تھا۔“

”لیکن اب تم نے اسے گنوا دیا ہے۔“ نور می متخ انداز میں بولی۔

”میں مایوس نہیں ہوں میں ان کو تلاش کروا رہا ہوں  
اور اگر وہ نہ ملے تو میں دوبارہ...“

اس بار نورمی نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ ”تم میرے اندازے سے بھی زیادہ گھٹیا شخص نکلتے۔ تمہیں اس بچے کی کوئی پرواہ نہیں ہے جو ہمارا ہے تمہیں صرف اپنے کاروبار کے لیے ایک وارث چاہیے۔“

”ہاں مجھے ایک وارث چاہیے۔“ بین جواب دے کر بولا۔ ”اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔“

”لیکن اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی اور نہ ہی تم مجھے استعمال کر سکتے ہو۔“

”ایک منٹ نورمی میری بات سنو....“ بین جوئے نے اسے روکنا چاہا لیکن نورمی اس کی بات سننے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ پھر وہ اس کے گھر اور زندگی سے بھی نکل گئی تھی۔ اس نے بین جوئے سے کہا۔

”اگر تم چاہتے ہو کہ میری زبان بند رہے تو شرافت سے علیحدگی کا معاملہ طے کر لو میں اب تم سے بات نہیں کرتا چاہتی میرا وکیل رابطہ کرے گا اور یاد رکھنا اگر بات کو رٹ تک لگائی تو میری زبان بند نہیں رہے گی۔“

سب کچھ اس کے ماتھے سے نکل رہا تھا وہ مجبور تھا اگر انکار کرتا تو فوری اس کا راز فاش کر دیتی۔ چھ مہینے کی تلاش کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ سیلی اور مارینوس کی پہنچ سے دور نکل

ایک سفید بالوں والا بوڑھا آدمی اترا تو وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اس نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی وہ بین جوائے تھا۔ وہ ہر روز ہی کہیں نہ کہیں اسے ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ شروع میں وہ ان کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا جو راتوں میں آکر ان کو چکا دیتا تھا اس کے خوف سے وہ سالوں سے رہے تھے۔ گھر سے نکلے ہوئے ڈرتے تھے کہ ان کو تلاش نہ کر لیا جائے۔ پھر رفتہ رفتہ خوف کم ہوتا گیا۔ ان کے پہلے بچے نے جنم لیا جو اصل میں ان کا نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی ان کا بچہ تھا دونوں نے اس سے اسی طرح ٹوٹ کر محبت کی تھی جیسے وہ اپنے بچے سے کرتے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ اسی طرح پاگل ہو جاتے تھے جیسے انسان اپنے بچے کے لیے ہوتا ہے۔

جب جوزینو تین سال کا ہوا تو سیلی پھر اُمید سے ہو گئی۔ وہ اور ماریونو خوشی سے پاگل ہو گئے تھے کیونکہ ڈاکٹر روزا کی بات ان کے ذہن میں تھی اور ان کو لگتا تھا کہ وہ کبھی ماں باپ نہیں بنیں گے۔ اس لیے اس کی پیش گوئی غلط ثابت ہونے پر وہ خوش تھے۔ اس بار بھی بیٹا ہوا تھا۔ وہ پہلے بچے کے برعکس ان پر گیا تھا۔ پھر دو بیٹیاں ہوئیں اور یہ بھی ان کی طرح سیاہ بالی اور سانولا رنگ لیے ہوئے تھیں۔ مگر یہ تعجب کی بات نہیں تھی ہر گھر میں ایک آدھ بچہ اپنے ماں باپ سے مختلف ہوتا ہے۔

جب وہ سر ہاؤس سے نکل کر یہاں آئے تو شروع میں ان کو بہت دشواری اور تنگ دہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سیلی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی کام کر سکتی اور سارا بوجھ ماریونو پر تھا پھر وہ غیر قانونی تاریک وطن تھے ان کے پاس کاغذات بھی نہیں تھے۔ اس لیے ماریونو کو ملازمت ملنے میں بہت دشواری ہوئی تھی بھی کام ملتا اور بھی نہیں۔ ان کو اکثر قاتے بھی کرنا پڑتے تھے۔ پھر جوزینو کی پیدائش پر سیلی کو اسپتال لے جانا پڑا اور ان کا راز کھل گیا۔ بہر حال بچے کی وجہ سے ان کو برازیل کی شہریت بھی مل گئی اور ماریونو کو کام بھی ملنے لگا۔ اس کے بعد حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔ ماریونو نے سخت محنت کر کے کچھ رقم جمع کر کے اپنی زمین لے لی اور اب وہ اس پر کام کرتا تھا۔ وہ بہت خوشحال تو نہیں تھے لیکن اب ایک مناسب زندگی بسر کر رہے تھے۔ بین جوائے کا بھوت بھی ذہن کے نہاں خانوں میں جا چھا تھا اور اب اس کا خیال بھی آتا تھا تو وہ خوف محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن اتنے سالوں بعد بین جوائے کو سامنے دیکھ کر سیلی

سے ملنے آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب اس کیس کا باب بند کر دیا جائے لیکن بین جوائے نے پھر انکار کر دیا۔ ”جب تک میں زندہ ہوں تم یہ کام جاری رکھو گے۔“

”ایک سوال ہے جناب۔“ کارلوس نے کہا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لوگ بولیویا میں ہوں گے؟“

”ہاں تو اور کہاں جا سکتے ہیں؟“

”بعض اوقات جب انسان نے کسی سے چھپنا ہو تو وہ اس سے دور جانے کے بجائے پاس چھپنے کو بھی ترجیح دیتا ہے جب کہ چھپنا آسان ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”بولیویا ایک پسماندہ اور چھوٹا ملک ہے اس کے مقابلے میں برازیل ایک بڑا اور ترقی یافتہ ملک ہے یہاں کسی کے چھپنے کے مواقع زیادہ ہیں بشرط کہ تلاش کرنے والے کا ذہن اس طرف نہ جائے۔“

بین جوائے نے تعجب سے کہا۔ ”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے۔“

”بعض اوقات دور کی سوچتا ہے اور پاس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔“ کارلوس جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ”ایک مہینے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔“

لیکن ایک مہینے کے بجائے اس کی طرف سے دو ہفتے بعد ہی لفافہ آگیا اور بین جوائے اس خلاف معمول لفافے کو دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ لفافے میں ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر مثالی برازیل کے ایک چھوٹے سے قصبے کا پتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی بین جوائے کا جیٹ طیارہ اسے لے کر مثالی برازیل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سیلی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں دھلے کپڑے سوکھنے کے لیے ٹانگ رہی تھی۔ سڑک کے پار کھیل کے میدان میں کچھ لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک سنہری بالوں اور گوری رنگت والا نوجوان بھی تھا۔ وہ بڑی مہارت سے فٹ بال کو دونوں پیروں سے باری باری اچھال رہا تھا اور اسے زمین پر کرنے سے روک رہا تھا۔ جب تک سیلی کپڑے لٹکانی رہی نوجوان نے فٹ بال کو گرنے نہیں دیا تھا۔ وہ مسکراتی اور خالی ٹوکرا لے کر اندر جانے کے لیے مڑی تھی کہ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹی کار آ کر رکی۔ سیلی نے توجہ نہیں دی تھی لیکن جب اس سے

## چلغوزے

چلغوزے گردے، مٹانے اور جگر کو قوت بخشنے ہیں۔ موسم سرما میں ان کا کھانا پیشاب کی زیادتی کو روکتا ہے۔ چلغوزہ موسم سرما کے اثرات کو کم کرتا ہے اور جسم کو حرارت عطا کرتا ہے۔ چلغوزے کھانے سے پہلے نہ کھائیں، کیونکہ اس طرح ہجوک ختم ہو جاتی ہے اور کھانا نہیں کھایا جاتا۔ اس لیے انہیں ہمیشہ کھانے کے بعد کھائیں۔

## تل

تل موسم سرما کی سوغات ہے۔ اسے کھانے سے سردی اثر نہیں کرتی۔ موسم سرما میں کمزور اور بوڑھے افراد کو پیشاب بار بار آتا ہے۔ اس طرح بعض بچے بھی رات کو سوتے ہوئے بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تل کے لٹو کھانا بہت مفید ہے۔ روزانہ تل کا ایک چمچ کھالینا صحت کے لیے مفید ہے۔

پیدا کرنے کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔  
”تم بلا وجہ اپنی توانائی ضائع کر رہے ہو۔“ سلی بولی۔  
”مجھے ڈاکٹر روز اپیلے ہی یہ سب بتا چکا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جو بیرونی اولاد ہے۔“  
”ایک معمولی سائنٹس ثابت کر دے گا کہ وہ میری اولاد ہے۔“ بین جوائے لڑکے کا سر خوش نظر آنے لگا تھا۔  
”ہاں لیکن کیا تم اس بات کا اعلان کر سکتے ہو؟“ سلی نے اسے چیلنج دیا۔ ”کیا تم سب کو بتا سکتے ہو کہ تم نے اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا کیا تھا۔“

بین جوائے جب ہو گیا تھا لیکن پھر اس کے تاثرات دوبارہ رخت ہو گئے۔ ”تھمک ہے اس میں میری بدنامی ہوگی اور ممکن ہے مجھے مجرم بھی قرار دیا جائے لیکن اپنی اولاد کو حاصل کرنے کے لیے میں سب برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“  
”تم نے مجھے جانور کی طرح استعمال کیا۔“ سلی جذباتی ہو گئی۔ ”ایسا تو مجرم بھی نہیں کرتے ہیں۔“

”جو ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں۔“ بین جوائے نے کہا۔ ”تم جس طرح چاہو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے سلی کا معمولی سا گھر دیکھا پھر اس نے کپڑے اور ان کا ساز دیکھا۔ اسے پتا چل گیا کہ سلی کے اور بچے بھی تھے۔ ”جس طرح سے بھی تم چاہو۔“

کے اندر موجود خوف باہر آ گیا تھا۔ بین جوائے نے کار سے اترتے ہی اسے دیکھا اور اس کی نظریں کچھ دیر سلی پر جمی رہی تھیں۔ بیس سالوں نے اس پر زیادہ اثر نہیں چھوڑا تھا وہ پہلے کی طرح مضبوط اور خوب صورت جسم کی مالک تھی۔ اس کا چہرہ جوانی جیسا تر تازہ نہیں رہا تھا لیکن اس پر جھریاں بھی نمودار نہیں ہوئی تھیں۔

بین جوائے نے لکڑی سے بنی دیوار میں لکڑی کا بنا ہوا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ ”ہیلو... کیسی ہوتی سلی؟“  
”تو تم نے ہمیں تلاش کر لیا؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”ہاں اور اس کام میں صرف دو ہفتے لگے۔“  
”میرا تو خیال ہے بیس سال گزر چکے ہیں۔“  
”بیس سال تک میں تم دونوں کو غلط مقام پر تلاش کر رہا تھا یہ خیال تو صرف دو ہفتے پہلے آیا کہ تم دونوں برازیل میں بھی ہو سکتے ہو۔“

سلی اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ ماریونو کام پر گیا ہوا تھا اور بچے اسکول گئے تھے۔ اب سلی کو نئی حالات اور بین جوائے کا سامنا کرنا تھا اس نے ابتدائی خوف پر قابو پایا تھا اور تین کر بین جوائے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ ”تھمک ہے تم نے ہمیں تلاش کر لیا ہے لیکن تم کیا چاہتے ہو؟“  
”تم جانتی ہو میں کیا چاہتا ہوں۔“ بین جوائے بولا۔ ”میں اپنا وہ بچہ لینے آیا ہوں جو تمہارے پیٹ میں تھا جب تم اور ماریونو فرار ہوئے تھے۔“  
”وہ بچہ تمہارا نہیں ہے اسے میں نے جنم دیا ہے وہ میرا بیٹا ہے۔“

”تم صرف ایک کیریئر تھیں اصل میں وہ میری اور نوری کی اولاد ہے۔“ بین جوائے نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”اولاد اس کی ہوتی ہے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے میں اس کی ماں ہوں۔“

”ایک بات سے شاید تم بے خبر ہو۔“ بین جوائے نے دھیمے انداز میں کہا۔ ”تمہارے جسم میں ایک مکمل جینن رکھا گیا تھا۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ وہ جینن میرے اور نوری کے تولیدی خلیوں سے تیار کیا گیا تھا اور یہ کام ڈاکٹر روزانے ٹیسٹ ڈش میں انجام دیا تھا۔ پھر اسے تمہارے جسم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ایسا صرف اس وجہ سے کیا گیا کیونکہ نوری بچہ

معلوم تھا بین جوئے طاقت ور آدمی تھا اس نے پہلے بھی انہیں مجبور کیا تھا اور اب کر سکتا تھا۔ وہ ان سے جزیو نوکھین کر لے جا سکتا تھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ ”جزیو نو بہت اچھا فٹ بالر ہے۔ ابھی اس نے مقامی لیگ سے معاہدہ کیا ہے اس کا کھیل دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں برازیل کی ٹیم میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ وہ اچھا طالب علم ہے وہ ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ گھر اور خاندان اس کا فخر ہے۔“ سلی نے کہتے ہوئے سر اٹھایا۔ ”کیا تم صرف اس لیے اس سے اس کا فخر اور اس کا سب کچھ چھین لو گے کہ تمہیں اپنے کاروبار کے لیے ایک چیف ایگزیکٹو درکار ہے۔ شاید تمہیں چیف ایگزیکٹو مل جائے لیکن جزیو نو سے اس کا سب چھین جائے گا۔ ٹھیک ہے میں مانتی ہوں، وہ تمہاری اولاد ہے لیکن کیا تم صرف اس لیے اسے تباہ کر دو گے کہ وہ تمہاری اولاد ہے؟“

بین جوئے کا چہرہ کسی پتھر کی طرح خستہ ہو رہا تھا۔ مگر کچھ دیر گزرنے کے بعد اس پتھر میں دراڑیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ پتھر کے نیچے سے نرمی نمودار ہو رہی تھی۔ بین جوئے نے ایک گہری اور ٹھک خورہ سانس لی۔

”سلی تم ٹھیک کہہ رہی ہو جزیو نو کو صرف اس لیے تباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ میری اولاد ہے۔ لیکن میری تم سے ایک اٹھا ہے۔ کیا میں بھی بھی اسے دیکھنے آ سکتا ہوں۔ تم لوگوں سے میرا تعلق بھی تو ہے۔ بس دس پندرہ منٹ کے لیے؟“

سلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہتر ہو گا تم اس باب کو یہیں بند کر جاؤ کیونکہ تم بار بار آؤ گے تو اس سے کوئی خرابی ہو سکتی ہے۔“

بین جوئے نے ایک اور گہری سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ میری دولت کا وارث ہو گا۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ سلی نے بات ختم کر دی اور بین جوئے کے پاس وہاں سے رخصت ہونے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا اس کے جانے کے بعد جزیو نو اندر سے نکل آیا اس نے نہا کر لباس بدل لیا تھا۔

”نام وہ بوڑھا کیوں آیا تھا؟“  
”وہ کسی کا پتا پوچھتا آیا تھا لیکن اس کا بتایا ہوا شخص یہاں نہیں رہتا ہے وہ غلطی سے آیا تھا اور اب بھی نہیں آئے گا۔“ سلی نے یقین سے کہا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”اگر تمہارا اشارہ دولت کی طرف ہے تو وہ تم پہلے بھی دے رہے تھے اور ہم نے پہلے بھی اسے ٹھکرا دیا تھا ورنہ فرار ہی نہ ہوتے۔“

”اس وقت تم صرف دو تھے لیکن اب تم ایک فیملی ہو اور تم کو اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضرورت ہوگی۔“ بین جوئے کا لہجہ ترغیب دینے والا تھا۔

”ہم اپنی بساط کے مطابق ان کو بہتر زندگی دے رہے ہیں۔ میرا شوہر اس کے لیے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔“

بین جوئے نے محسوس کیا کہ سلی کسی صورت نہیں مانے گی اور اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نہیں نکلے گا جو دونوں فریقوں کے حق میں ہو۔ لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔

سنہری بالوں اور کئی سفید رنگت والا نوجوان اندر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بہترین اور فٹ بال اٹھا رکھی تھی اور اس کا لباس بھی بہترین تھا۔ اس نے اندر آ کر سلی کا گال چوما

اور بین جوئے کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہے مام؟“ اس کی نظروں میں اجنبیت تھی اس نے فی پر بین جوئے کو دیکھا لیکن یہ اس کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ مشہور زورمانہ

بین جوئے ان کے گھر آ سکتا ہے۔ بین جوئے کو لگا جیسے اس کے سامنے اس کی جوانی کی تصویر سامنے آ گئی ہو۔ وہ یقیناً اس کا اور نوری کا بیٹا جزیو نو تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ

جزیو نو سے تعارف کراتا سلی نے اس کا ہاتھ چوما اور بولی۔  
”ایک پرانا واقف کار ہے۔ تم اندر جا کر نہا لو آج میں نے تمہارا پسندیدہ اسٹو بنایا ہے۔“

”دنیا کی سب سے گریٹ مام۔“ جزیو نو خوش ہو گیا تھا اس نے پھر سلی کو پیار کیا اور فٹ بال اچھالتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

”یہ.... میرا....“  
”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ سلی پھر تن کر

کھڑی ہو گئی۔ ”جزیو نو.... صرف میرا بیٹا ہے اگر تم نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو یقین کرو ہم آخر تک لڑیں گے اور عدالت میں جائیں گے۔ مجھے یقین ہے دنیا کی کوئی

اولاد ایک ماں سے اس کا وہ بچہ نہیں چھین سکتی جسے اس نے جنم دیا ہو۔ میں تمہارے سارے کرتوت دنیا والوں کے سامنے لے آؤں گی۔“

بین جوئے سلی کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر زیادہ اثر نہیں ہوا ہے اور وہ بہر صورت اپنی سی کر کے رہے گا۔ یک دم سلی کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا اسے

دن کے نوبت تھے، جیسن اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک  
میں داخل ہوا اور اپنی کلاس میں لیچرار کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ  
یونانی تاریخ کا مضمون پڑھایا کرتا تھا۔ اس کی عمر انیس برس تھی  
اور قد چھ فٹ دو انچ۔ وہ اپنے طالب علموں میں مقبول تھا۔  
34 طالب علموں کی اس کلاس میں دروازے تو تھے مگر  
کھڑکیاں نہیں تھیں۔ اسے دیکھ کر طلبا خاموش ہو گئے۔ جیسن  
نے براہر کی سیٹ پر بیٹھنے ہوئے انیس سالہ ٹام الیگزینڈر کو دیکھ  
کر سر کو خفیف سی چپکس دی، جو سینڈری اسکول میں انگریزی کا

## ہلاکت خیز

شکیل صدیقی

ترقی یافتہ ممالک میں دہشت گردی کی وباء اس طرح پھیل رہی ہے  
کہ ہر کوئی حیران و پریشان ہے۔ یہ دہشت گردی دولت کے حصول  
کی خاطر نہیں ہوتی ہے بلکہ نفسیاتی دباؤ، قتل و خونریزی پر  
اکساتا ہے۔ زیر نظر خونی واقعات اب وہاں عام ہیں۔

ایک خونی واقعے کی روداد جو امریکا میں عام ہے





کی پیداوار ہوں۔“ اس نے اپنی بندوق اٹھالی اور موڈ میں بولا۔ ”مگر میں اس کے بارے میں کسی اور کو بتانا نہیں چاہتا۔“

مانک کونز نے سوچا یہ شخص غالباً دیوانہ ہے۔ وقت گزر رہا تھا اور بندوق برادر خانی نشتوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ راتقل اس کے ہاتھ میں تھی۔ میک ایشی جو قانون کا طالب علم تھا اسے بندوق برادر کی جیب میں پڑی ہوئی گولیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ”کیا تم اس دیوانے پر چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے اپنے قریب کھڑے ساتھی سے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ چاہتا کیا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔

”ان دروازوں کو کھولو۔“ بندوق برادر نے بندوق کی نال سے اشارہ کیا۔ وہ دروازہ ایک سرنگ سے جا کر مل جاتا تھا۔

وہ دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر کوئی بھی اندر آ سکتا تھا اور خوریزی ہو سکتی تھی۔ ”اے ٹمہرو۔ اے نہ کھولو۔“ مانک کونز نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

بندوق برادر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک ہی عمر کے تھے۔ بندوق برادر چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سرکوشانی جنبش دی جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔ پھر اس نے کہا کہ وہ کمرے کے ابتدائی حصے کی طرف جائیں جہاں بارہ فٹ کی ایک پروجنٹس اسکرین لگی تھی۔

مانک نے محسوس کیا کہ انجینی کارویہ بھی بکھار دوتا نہ ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس سے شناسائی پیدا کروں تو کام بن سکتا ہے۔ برہمی میں جو اس کی ناک تنخی سے کھڑی ہے ممکن ہے کہ میں اسے موڑنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

اس نے جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ اس کے قریب بیٹھا ہے۔ اس نے ملائمت اور رسانی سے کہا۔ ”ہیلو ہنڈ! ایک سگریٹ مل جائے گی؟“

انجینی کی آنکھیں سڑک گئیں۔ پھر اس نے مانک سے کہا۔ ”ہاں۔“ اس نے ڈیبا سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”لیکن کسی اور کو نہیں ملے گی۔“

مانک نے دیکھا کہ ان کے درمیان صرف چھ فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس نے سگریٹ اچھال دی تو مانک نے اسے کچج کر لیا۔ ”ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“

”جب میں نو عمر تھا تو انہوں نے میرا دماغ کھول کر اس میں ایک کمپیوٹر چپ رکھ دی تھی۔ تاکہ میں جو کچھ سوچوں اس

استاد بننا چاہتا تھا۔ جب کہ سامنے کی قطار میں چھبیس سالہ مانک کونز بیٹھا جو تاریخ کا پروفیسر بننا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے فولسنڈر کا پچھڑا تھا۔ وہ اپنے لکچر کی ابتدا کرنا چاہتا تھا کہ اس نے دروازے پر کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا تم اس کلاس کے طالب علم ہو؟“

وہ بھاری جسم کا تھا اور اس کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ وہ برساتی جیکٹ پہنے تھا اور اس کے چہرے سے سختی جھلکتی تھی۔ اس نے اپنے شانے سے لٹکنے والے بیک سے ایک بندوق نکال لی۔ ”آج کا سب سے اہم اعلان یہ ہے کہ تم سب لوگ پر غماں ہو۔“

نام جو انگریزی کا استاد بننے والا تھا، اس صورت حال سے خوفزدہ ہو گیا اور اس کی گردی کی ایک رگ پھڑکنے لگی۔ اسے ہرن کا شکار کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ جانتا تھا کہ انجینی کے اعشاریہ 270 کی رینج تک سب آٹومیٹک جس سے پانچ گولیاں فائر کی ہیں۔ اگر کسی شخص کے قریب جا کر کیا جاتا تو اس کے ٹکڑے اڑ سکتے تھے۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھے رہو۔ کوئی حرکت نہ کرے۔“ اس نے راتقل لہراتے ہوئے کہا۔ اس نے طائرانہ نگاہ سے ہال کا جائزہ لیا پھر دائیں جانب پڑی ہوئی میز کی طرف بڑھ گیا اور اس نے اپنی برساتی جیکٹ اتار دی۔ نیچے ایک اور جیکٹ تھی۔ سیاہ رنگ کی چمکدار جیکٹ جس سے نیچنگ کرتی ہوئی پتلون اس نے پھن رکی تھی۔

”چلو اٹھو۔“ وہ چنچا۔

سارے طالب علم اپنی جگہوں سے اٹھے اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ بندوق برادر نے پروفیسر کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اب تم میڈیا سے رابطہ قائم کرو اور ہو سکے تو کانگریس اور جناب صدر کو بھی اطلاع دو۔“

فولسنڈر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدمی سے ملحقہ آفس میں چلا گیا۔ پھر اس نے یونیورسٹی پولیس کو فون کیا اور انہیں بندوق برادر کے بارے میں بتایا۔

☆☆☆

بندوق برادر اب دائیں جانب کی دیوار سے ٹیک لگائے طالب علموں سے 35 فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی بندوق میز کے سہارے سے کھڑی کی پھر اس نے جیب سے ڈیبا نکال کر ایک سگریٹ سلگائی۔ اس نے پہلا کش کھینچ کر لالہالی انداز سے کہا۔ ”میں ایک غلط تجربے کی پیدائش

امریکن ہرٹ ایسوسی ایشن کی رپورٹ میں ڈاکٹر فریک سیک نے ناریل کے تیل کو کھانوں میں استعمال کرنے کے نقصانات نہیں بتائے، البتہ اسے خطرناک چربی کا تیل قرار دیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ناریل کے تیل میں جانوروں کے گوشت میں موجود چربی، مگھن اور دیگر چربی والی اشیاء کے مقابلے زیادہ چربی ہے، مگر لوگ اسے صحت کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں امریکا کی 7 کلینکس کی جانب سے ناریل کے تیل سمیت دیگر چربی والے تیلوں پر کی جانے والی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کوکونٹ آئل میں موجود چربی کی خراب مقدار (ایل ڈی ایل) دل کی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

سے وہ باخبر ہو جائیں۔ وہ مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور مجھ پر مکمل کنٹرول چاہتے ہیں۔“

مانک نے سوچا کہ کون سا کونسا تو نہیں ہے؟

پرو جیکشن اسکرین کے پیچھے سے اچانک کسی نے اس اجنبی کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو! کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟“

طالب علموں کے چہروں پر قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ اجنبی کو وہاں آئے ہوئے پچاس منٹ ہو چکے تھے۔ آواز پرو جیکشن اسکرین کے پیچھے سے آرہی تھی، جب کہ اسکرین دھندلے شیشے کا تھا۔ چنانچہ دوسری طرف کون تھا اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔

طلبہ نے اس کے سامنے ایک مانک رکھ دیا تاکہ وہ بات کر سکے۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ پوچھا گیا۔

”مہی کی یوٹیورٹی کے صدر، گورنر، سپریم کورٹ کے جج

اور صدر امریکا کو یہاں بلا دیا جائے۔“

”مظہر و دیکھتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“ جواب دیا گیا۔ ”میرا نام کیوں ہے اور تمہارا؟“

”اپنے ذرائع سے میرا نام معلوم کرو۔“ اس نے غرا کر

کہا۔ پھر مانک پچھک کر دوبارہ راتقل اٹھالی پھر اس کی انگلی

فریگر پر پختی سے جم گئی۔ اس نے نال کا رخ چھت کی طرف کر

کے طلبہ سے پوچھا۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں فائر کروں؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ ہال میں بہت سی خوفزدہ آوازیں

اُبھریں۔

مانک کونز نے ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے

کہا۔ ”چھت میں لوہا اور ٹنگریٹ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ

تمہاری چلائی ہوئی گولی چھت توڑ کر دوسری طرف نکل

جائے۔ اگر وہ پلٹ گئی تو تمہارے دماغ میں بھی سوراخ کر سکتی

ہے۔“

”تم درست کہتے ہو۔“ وہ بولا۔ پھر اس نے راتقل کی

نال کا رخ پرو جیکشن اسکرین کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ ایک

دھماکا ہوا اور طلبہ کی چیخیں گونجیں۔ پھر پرو جیکشن اسکرین سے

ملیا کر نے لگا۔

اس اسکرین کے پیچھے ایک کمر تھا جہاں پولیس کے دو

افسران کیوں اور جیمز ہورٹن بیٹھے تھے۔ انہوں نے فائر کا

دھماکا سن کر پھر اسکرین میں ایک سوراخ ہوتے دیکھا۔ وہ گولی کا

سوراخ تھا۔ انہوں نے جلدی سے خود کا ڈم میں کر لیا۔

”یہ بڑی راتقل کا دھماکا ہے۔ گولی جسم میں داخل

ہو جائے تو یقینی موت ہے۔“ ہورٹن نے کہا۔ پھر اس نے ریڈیو پر ہڈ کوارٹر کو رپورٹ دیتے ہوئے بتایا کہ حملہ آور کا صحیح طور پر پتا نہیں ہے، اس لیے اسے طلبہ کی موجودگی میں ایکشن نہیں لیا جاسکتا۔

☆☆☆

راتقل کے کارٹوس کا کوکھاس نے جیمز سے نکال کر

طلبہ کے سامنے پھینک دیا اور مسکرا کر بولا۔ ”میرے پاس ایسے

بہت سے کارٹوس ہیں۔“ اس نے جیب سے کارٹوس نکال

کر میز پر رکھ دیے پھر انہیں گنتے لگا۔ اس کے بعد اس نے کمر

میں لگا ہوا خنجر نکالا اور اس کی دھار پر انگلی پھیرتا ہوا بولا۔ ”اس

کی دھار بہت تیز ہے۔“ اس نے ٹھوڑی دیر بعد خنجر کو دوبارہ

اس کے غلاف میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ہال میں ٹپٹنے

لگا۔ جب وہ راتقل سے دس فٹ دور چلا گیا تو ایٹمی نے سوچا

کہ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر اس طرف آئے چھلانگ لگا کر

راتقل تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات اس نے سرگوشی میں اپنے

ساتھی سے بھی کہہ دی۔ اس نے سرگوشی میں جنس دی تو ایٹمی

نے اپنی ٹانگوں کی پوزیشن تبدیل کر لی اور سرگوشی میں

بولا۔ ”مگر یہ نہیں معلوم ہے کہ اس کی جیب میں کوئی ریوا لور تو

نہیں ہے، جس سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دے۔“

اجنبی نے جیسے اندازہ لگا لیا۔ اس نے پلٹ کر اپنی

راتقل اٹھالی اور نال کا رخ ایٹمی کی طرف کر کے

بولا۔ ”سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ اگر مجھ پر چھلانگ لگانے کا

”یہ میری بہتیجی نے دی ہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ جب آپ مٹی میں ان کنکریوں کو دبا کر ملیں گے تو سکون محسوس کریں گے۔“

پھر اس نے ماکرو فون اٹھا کر کہا۔ ”میرے لیے ایک ٹیلی وژن سیٹ لاؤ، پورٹبل ٹوائلٹ، غذا اور سگریٹ وغیرہ بھی۔“

”اس کے بعد کیا تم طلبہ کو جانے دو گے؟“ دوسری طرف سے ہوش نے پوچھا۔

”فضول باتیں نہ کرو۔“ وہ دھاڑا۔ ”ٹیلی وژن لا کر رکھو۔“ اس نے طلبہ کی طرف مڑ کر کہا۔ ”تم سب ہال کے وسط میں آ جاؤ۔“

جب سب بیٹھ گئے تو نام الیگزینڈر سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ انجینی پر جھپٹ پڑا۔ انجینی ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی بددوق اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔ پھر وہ گھومنا اور بچنے کی طرف دوڑا۔ الیگزینڈر نے اس کی کمرہ تھام لی اور اسے اپنی طرف گھما دیا۔ اچانک الیگزینڈر نمودار ہوا۔ وہ دونوں مل کر اسے گھسنے ہوئے آخری زینے تک لے گئے۔

انجینی کو سوخ گیا تھا۔ اس نے مختصر نکال لیا۔ الیگزینڈر اور نامک کوڑنے اسے دروازے سے نکل دیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس دوران میں تین مضبوط قسم کے لڑکوں نے انجینی پر ہلے بولے دیے۔ وہ فرش پر گر پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ان میں سے ایک نے پریچکن ہال کا دروازہ کھولا تو آٹھ مسلح پولیس والے دوسری طرف سے آ گئے۔ انہوں نے انجینی کو پھانسی لگا دی۔

ایٹنسی اور دوسرے لڑکے جو دھاچہ بازی میں زخمی ہو گئے تھے انہیں ایٹنسی میڈیکل سینٹر لے جا کر طبی امداد دی گئی۔ وہ سب ایک دوسرے کے شکر گزار تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کی جانیں بچالیں۔

☆☆☆

ستائیس سالہ رالف ٹوروی امریکی تھا اور شکاگو میں رہتا تھا۔ زیادہ پڑھنے لکھنے کی بنا پر وہ ذہنی مریض ہو گیا تھا اور وار داتیں کرنے لگا تھا۔ ہر وقت غلامی سے آزاد ہونے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ جس کمپیوٹر پرپ کا وہ تذکرہ کرتا رہتا تھا وہ اس کے دماغ میں کہیں بھی نہیں ملی۔ معلوم نہیں کیوں اس کے دماغ میں یہ وہم پرورش پار ہا تھا اور کب سے؟ اسے ایٹنسی جیل میں بند کر دیا گیا۔ جلد ہی اس پر مقدمہ چلنے والا تھا۔

ارادہ ہے تو اس ارادے کو جیب ہی میں رکھو۔ اس لیے کہ میں فائر کرنے میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔ خبردار ہیر و بننے کی کوشش نہ کرنا۔“

ایٹنسی کو گھبراہٹ میں پسینا آنے لگا۔ اسے اپنے والدین اور بھائی یاد آنے لگے۔ اسے رات کو دادی کے ساتھ ڈھیر کرنا تھا، جواب ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

رائفل بردار سپین کی طرف مڑا جو کلاس میں واحد نیکر تھا۔ وہ چھوٹ تین انچ کا تھا اور اس کا وزن 260 پاؤنڈ تھا۔ وہ خپل فیم کا کینٹین تھا۔ ایٹنسی نے کہا۔ ”اور تمہارا نمبر دوسرا ہوگا۔“

ان دونوں کا ساتھ بیٹھنا اسے پسند نہیں آیا۔ اس نے ایٹنسی سے کہا۔ ”تم ہال کی دوسری طرف جاؤ اور ہیر و بننے کی کوشش نہ کرنا، میرا غصہ بہت خراب ہے۔“

اس نے ماکرو فون اٹھا کر کہا۔ ”ہاں، تو تم لوگ اب کیا کر رہے ہو؟“

”دوبارہ فائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے میڈیا کے لوگوں کو بلا لیا ہے۔“ کیون نے کہا۔

”میرے ساتھ نفسیاتی کھیل نہ کیلو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ میں طلبہ کو گولیاں مارنا شروع کر دوں گا۔“ اس نے گونجدار لہجے میں کہا تو دونوں لڑکیاں رونے لگیں۔

”جینو چلاؤ نہیں۔ میں تم لوگوں کو گولی نہیں ماروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”دروازہ کھول دو اور انہیں جانے دو۔ ان کے ساتھ کوئی اور دروازے کی طرف نہیں بڑھے گا ورنہ میں اس کی پیٹھ پر گولی مار کر اسے جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

نامک کوڑا اور ایٹنسی نے دروازہ کھولا تو دوسری طرف سے سر دھوا کا ایک جھونکا اندر آیا اور وہ کچپکا کر رہ گئے۔ دونوں لڑکیاں اس سرنگ سے باہر چلی گئیں۔ نامک نے دیکھا کہ وہ جہاں کھڑا تھا، آزادی وہاں سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھی، لیکن اس کوشش میں کسی اور کی بھی جان جاسکتی تھی۔ وہ جنوبی، جنون میں دوسرے طلبہ کو نشانہ بنا دیتا تو اس کی ذستے داری نامک پر ہی عائد ہوتی۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر ایٹنسی بھی اپنی جگہ پر چلا گیا۔

ایٹنسی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند چھوٹی کنکریاں نکالیں اور طلبہ کو دکھانے لگا۔ ”میں دیوانہ نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”انہیں رکھنے کی بھی ایک وجہ ہے۔“

”یہ کنکریاں تمہیں کہاں سے ملیں؟“ نامک کوڑنے پوچھا۔



فلم نگری

## لیڈی کلر

انور فرہان

پاکستانی فلم نگری میں ایک سے ایک اداکار آئے، فن کا جوہر دکھایا، کامیابی کے جھنڈے گاڑے لیکن وہ شہرت وہ پسندیدگی جو اس اداکار کے حصے میں آئی کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کا کمال یہ تھا کہ پردے سمیٹیں پر آتے ہی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی۔ انتقال کے بعد بھی اس کے شائقین اسے پوجنے کی حد تک پیار کرتے ہیں۔

اس نامور اداکار کی سرگزشت جس کا نام کامیابی کی ضمانت تھا

جانے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنے بے شمار چاہنے والوں اور پرستاروں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک وحید مراد بھی تھے۔ پاکستانی لیڈ فٹکار 23 نومبر 1983ء کو اپنے چاہنے والوں

اللہ کے بے شمار بندے ایسے ہیں جو جیتے جی بھی زندہ رہنے کے حقدار نہیں کہلا سکتے جب کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی، عالم جاودانی پہنچ جانے کے بعد بھی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو

مراد کو خصوصی طور پر ٹریبونٹ پیش کرنے کے لیے خاص پروگرام نشر کرنا شروع کر دیئے۔ اس حوالے سے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وحید مراد کل بھی زندہ تھا۔ آج بھی زندہ ہے۔ اور کل بھی زندہ رہے گا۔

وحید مراد نے جب نیا نیا فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا اس وقت سنٹوش کمار، سدھیر، درپن، کمال، حبیب، یوسف خان اور انجاز درانی وغیرہ بڑے اور سپر ہیرو کے طور پر موجود تھے۔ یہ تمام اداکار اپنی شخصیت اور اداکاری میں لا جواب تھے۔ سب کا اپنا اپنا انداز تھا اپنا اپنا فن تھا۔ ان سب میں کی صرف یہ تھی کہ وہ نوجوان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس دور میں وحید مراد ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کردار کیا کرتے تھے۔ فلم ”اولاد“ میں وحید مراد نے حبیب کے ساتھ پر فارم کیا۔ فلم ”داسن“ میں سنٹوش کمار کے ساتھ اداکاری کی۔ ”عید مبارک“ میں ایک بار پھر حبیب کے ساتھ جڑی کردار ادا کیا۔ یہ ساری بڑی اور کامیاب فلمیں تھیں مگر ان میں وحید مراد کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔ عوام میں محل کران کی پہچان نہیں ہوئی۔ موٹری توجہ انہوں نے ”داسن“ میں حاصل کی جب نیلو کے ساتھ انہوں نے مغربی تہذیب اپنانے والے کردار میں ایک ڈانس اسٹم کلب کے ماحول میں پکچر انز کرایا۔ پہلی بار لوگوں کو ان کا انداز ذرا ہٹ کر اور مختلف لگا۔

ایک اداکار جو کچھ خود چاہتا ہے کہ ایسا کردار ہو تو وہ اس میں اپنی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر طور پر راجا کر سکتا ہے مگر دوسروں کی فلموں میں ایسے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے انہیں خود اپنی فلمیں بنانی پڑتی ہیں۔ وحید مراد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کا ذاتی پروڈکشن ہاؤس تھا جس کے بنر تلے وہ دو فلمیں بنا چکے تھے مگر ان میں وہ بطور اداکار شامل نہیں تھے۔ اب جب انہیں اپنی اداکاری کو اپنی خواہش کے مطابق نکھارنے اور سنوارنے کا خیال آیا تو انہوں نے پہلے ”ہیر اور پتھر“ اور پھر ”ارمان“ جیسی فلمیں پروڈیوس کیں۔ جن میں خود ہیرو کا رول لے کے۔ ”ہیر اور پتھر“ میں وہ پہلی بار مکمل ہیرو کے طور پر منتظر عام پر آئے اور اس حیثیت سے انہیں فلم دیکھنے والوں نے پسند کیا۔ ان کے لیے اتنی پذیرائی ہی کافی تھی۔ اس کے بعد اپنی اگلی فلم ”ارمان“ میں اپنے سارے ارمان پورے کر لیے۔ ”ارمان“ میں وہ ایک ایسے نوجوان کے رول میں آئے جو شرارتی بھی ہے، عاشق بھی اور جدائی میں ترپنے والا بھی ہے۔ ایسے نوجوان کا کردار اپنی ساری فنی خوبیوں کے

کے درمیان سے اٹھ کر افق کے اس پار چلے گئے مگر آج بھی اتنے دنوں کے بعد بھی وہ ہمارے درمیان ہی موجود ہیں۔ اپنے سینکڑوں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں پیار کرنے والوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر زندہ ہیں۔

کروڑوں دلوں پر راج کرنے والے یہ خوب صورت اور مہم سوزی صورت کے فنکار دلیپ کمار کے بعد وہ واحد اداکار تھے جن کا ہمیشہ اسٹائل ضرب المثل بنا۔ حتیٰ کہ اس زمانے کی اکثر لڑکیاں تک وحید مراد کے اسٹائل کے بال بنایا کرتی تھیں۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کی پاپولرٹی خواتین کے حلقوں میں حد درجہ زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ”شہنشاہ رومانس“ اور ”لیڈی لکڑ“ جیسے القاب سے بھی یاد کیا گیا۔ ان کے چاہنے والوں نے انہیں چاکلیٹی ہیرو کا بھی خطاب دیا اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن بھی کہا۔ بے محل، منفرد، لا جواب اور باکمال وحید مراد کہہ کر بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ نعمات کی پکچر انزیشن کے حوالے سے بھی وہ برصغیر کے لاٹانی ہیرو تھے اس لیے انہیں ماسٹر آف سوئگ پکچر انزیشن کا خطاب بھی دیا گیا۔

سلور اسکرین پر جلوہ گر ہونے والے فنکاروں کو ہر دور میں اور ہر جگہ فلم بینوں کا بڑا طبقہ چاہتا ہے، پیار کرتا ہے، یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں مگر ان کے جیسے جی ہی اس پیار کا بندھن بندھا رہتا ہے بلکہ اکثر تو اس وقت تک عوامی مقبولیت کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ جب تک وہ خود مقبول ہوتے ہیں۔ اور وہ اسکرین سے آؤٹ ہوئے، اُدھر چاہنے والوں کے دلوں میں بھی ان کی چاہت کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ نئی اور انوکھی بات یہ ہے کہ دنیا سے گزرنے کے برسہا برس بعد بھی چاہنے والوں کی چاہت کم نہ ہو۔ پیار کرنے والے بھلا نہ سکیں۔ یہ حیران کن بات ہے۔ وحید مراد کو ہم سے چھڑے 34 سال بیت چکے ہیں مگر وحید مراد آج بھی اپنے بے شمار چاہنے والوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر دھڑک رہے ہیں۔ اس دور میں بھی جب عام لوگ اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ کو بھی ان کے گزرنے کے سال دو سال بعد یاد نہیں رکھتے۔ وحید مراد کے پرستاروں کی اس والہانہ محبت کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ خصوصی طور پر میڈیا نے ان کی اس عقیدت بھری محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے وحید مراد کی برسی پر خاص اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ شو بے کے اخباروں اور پرچوں نے خصوصی ایڈیشن شائع کرنا شروع کر دیئے اور ٹی وی چینلوں نے وحید



## زندگی نامہ

نام: وحید مراد (خاندانی بھی اور فلمی بھی)  
پیدائش: بروز بدھ 12 اکتوبر 1938ء

مقام پیدائش: کراچی

والد: ثمار مراد

والدہ: شیریں مراد

تعلیم: انگریزی ادب میں ایم اے

شادی: بروز جمعرات 17 ستمبر 1964ء کو سلی

بنت ابراہیم سے طارق روڈ کراچی میں شادی ہوئی۔

سلی مراد 31 مارچ 1941ء کو بھارت کے شہر سورت

میں پیدا ہوئی تھیں۔ اولاد: ایک بیٹی عالیہ مراد، ایک بیٹا

عادل مراد۔ عالیہ 23 دسمبر 1969ء کو فلم ”عندلیب“

کی شائندہ گولڈن جوبلی کے موقع پر پیدا ہوئیں جب کہ

عادل مراد 13 نومبر 1976ء کو ڈائنڈ جوبلی فلم

”شبائے“ کی ریلیز کے موقع پر پیدا ہوئے۔

فلمی کیریئر: فلم ساز، اداکار، ہدایت کار، مصنف

اور گلوکار۔ فلم ساز کے طور پر گیارہ فلمیں پروڈیوس کیں۔

ادا کار کے طور پر 125 فلموں میں اداکاری کی۔ ان میں

115 اردو، 9 پنجابی اور ایک پشتو فلم تھیں۔ بطور ہدایت کار

اور گلوکار ان کی ذاتی فلم اشارہ تھی۔ بطور مصنف ان کی تین

فلمیں ارمان، احسان اور اشارہ ہیں۔

اعزازات: 44 فلموں نے سلور جوبلی، 28

فلموں نے گولڈن جوبلی، 4 فلموں نے پلانٹیم جوبلی

اور ایک فلم نے ڈائنڈ جوبلی منائی۔

ایوارڈز: مختلف اداروں کی جانب سے 32

ایوارڈز حاصل کیے۔ 2011ء میں بعد از مرگ

حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز دیا گیا۔

فہمائیں: پہلی فلم بطور اداکار فلم ساز در پن اور

ہدایت کار الحامدی فلم ”ساجی“ جس میں وہ ایک مل مزدور

کے مختصر کردار میں نمودار ہوئے۔ بطور مکمل ہیرو، پہلی فلم

”ہیر اور پتھر“ آخری فلم ”ززلہ“ جو ان کی موت کے بعد

ریلیز ہوئی۔ بطور فلم ساز پہلی فلم ”انسان بدلتا ہے“ آخری

فلم ”ہیر“ جو ان کے انتقال کے بعد نمائش پذیر ہوئی۔

انتقال: 23 نومبر 1983ء بروز بدھ 10 بجے

کراچی میں انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر 45 برس تھی۔

تدفین: بروز جمعرات صبح ساڑھے دس بجے

لاہور میں ہوئی۔

ساتھ ادا کر کے انہوں نے فلم بینوں کو چونکا دیا۔ لوگوں نے  
بار بار ”ارمان“ دیکھی اور وحید مراد کی محبت میں گرفتار ہوتے  
چلے گئے۔ یہ ایسی فلم تھی جس کے ذریعے رب العزت نے  
انہیں ایسی شہرت بخشی جو انہیں تمام ہیروز سے الگ ثابت کر  
گئی۔ ان کی اپنی الگ پہچان بن گئی۔ ”ارمان“ وحید مراد کی نئی  
زندگی کی ایک خوشگوار ٹریجک پوائنٹ تھی۔ ایک ایسی فلم جس  
نے ان کو شہرت اور مقبولیت کے فرش سے اٹھا کر عرش تک  
پہنچا دیا۔

یہ درست ہے کہ اس فلم کے ذریعے وحید مراد کو جو  
عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں خود وحید  
مراد کا کلیدی کردار تھا۔ ان کی فنی صلاحیتوں کا بڑا عمل دخل تھا  
مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک پوری ٹیم  
تھی جس نے وحید مراد کی صلاحیتوں کو ابھارنے اور نکھارنے  
میں زبردست کردار ادا کیا۔ ان میں پرویز ملک کا خصوصی  
کردار تھا۔ ملک صاحب امریکا سے فلم سازی کی تعلیم و  
ترتیب حاصل کر کے تازہ بہ تازہ پاکستان واپس آئے تھے۔  
وحید مراد کے دیرینہ دوست تھے۔ جب کہ وحید مراد نے ”ہیرا  
اور پتھر“ شروع کی تو اقبال رضوی اسے ڈائریکٹ کر رہے  
تھے۔ جب وحید مراد نے پرویز ملک کو اس کی ڈائریکشن کے  
لیے کہا تو وہ بولے۔ ”اب تک اس فلم کو کون ڈائریکٹ کر رہا  
تھا؟“

”اقبال رضوی۔“

”کیا وہ برائیاں نہیں مائیں گے اگر میں نے.....“

”ارے نہیں یار! میں انہیں رضا مند کر لوں گا۔ وہ  
بڑے اچھے آدمی ہیں۔“ اور جب ملک کو اطمینان ہو گیا کہ  
اقبال رضوی نے بخوشی انہیں ”ہیرا اور پتھر“ کی ہدایات کی  
اجازت دے دی ہے تو انہوں نے ”ہیر اور پتھر“ سے اپنی  
ہدایت کاری کی ابتدا کی۔ سب سے پہلے فلم کے اسکرپٹ کو  
بخور پڑھا اور جہاں جہاں انہیں ترمیم و اضافے کی ضرورت  
محسوس ہوئی ترمیم و اضافہ کیا۔ پھر شوٹ کیے ہوئے حصے میں  
بھی جس کو مناسب سمجھا اسے رکھا باقی کو ریجیکٹ کر دیا۔  
اسکرین پلے میں بھی اپنی مرضی سے تبدیلی کی۔ اس کے بعد  
اپنے انداز میں فلم مکمل کی۔ ”ہیر اور پتھر“ پسند کی گئی مگر پرویز  
ملک اس سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے لیکن وحید مراد نے  
جب اگلی فلم شروع کی تو ملک صاحب نے اپنی بھرپور  
صلاحیتوں اور امریکا سے حاصل کی ہوئی تعلیم و تربیت کا  
مظاہرہ کیا۔ ”ارمان“ مکمل ہو کر سلور اسکرین کی زینت بنی تو

اس کی یہ عوامی مقبولیت دیکھ کر قلم ساز اسے ایسی ہی فلموں میں کاسٹ کرتے تھے جو اس کے پرستاروں کو اچھی لگیں، پسند آئیں اور ایسی فلمیں عام طور پر لو اسٹوری ہوتی تھیں۔

وحید مراد کو رومانوی کرداروں کی ادائیگی میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے وہ روٹینک فلموں کی اہم ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ رومانوی کرداروں کی ادائیگی کی طرح رومانوی گیتوں کی پکچر انزیشن میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے ہی انہیں ماسٹر آف سوگ پکچر انزیشن کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

وحید مراد نے اپنی فلمی زندگی میں 292 نعمات فلمبند کروائے جن میں بڑی تعداد روٹینک گیتوں کی تھی۔ کچھ اداکار اپنی پہلی ہی فلم میں ہی ہو جاتے ہیں۔ جیسے ندیم۔ مگر وحید مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انہیں منزل مقصود کے حصول کے لیے بہت باؤنڈیلینے پڑے اگرچہ وہ ایک معروف فلم تقسیم کار فائمراد کے فرزند ارجمند تھے۔ اس کے باوجود وحید مراد کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے زینہ زدہ قدم بڑھانا پڑا۔

وحید مراد وہایت کار الفائد کی فلم ”ساتھی“ میں پہلی بار اداکار درپن کے ہمراہ جلوہ گر ہوئے۔ یہ فلم 1959ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ ایک مختصر سا جودی سا کردار تھا۔ ہدایت کار ایس سلیمان کی دوسری فلم ”باجی“ بھی وحید مراد کی دوسری فلم تھی جو 1963ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں وحید مراد اور محمد علی مہمان اداکار کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ ایک تقریب کا سین تھا جس میں ایک مقبول گیت فلمبند کیا گیا تھا جس کے بول تھے

جبن لاگی تو ری گن

یہ گیت اداکارہ راقصہ پنا پر عکس بند کیا گیا تھا۔ گانے کی اس تقریب میں حاضرین کی صف میں وحید مراد بھی شامل تھے۔

اسی طرح 1966ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”میں وہ نہیں“ میں بھی وحید مراد اور محمد علی مہمان اداکار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک تقریب کا منظر تھا۔

ہاں 1962ء میں فلم ساز وہایت کار ایس ایم یوسف کی معاشرتی، سماجی، گھریلو اور نفسانی فلم ”اولاد“ میں وحید مراد کو ایک مختصر کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے حبیب اور نیر سلطانہ کے صاحبزادے کا کردار ادا کیا تھا اور

اس نے دھوم مچادی۔

اس فلم سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ قلم میک اور غیر تربیت یافتہ اور نا اہل قلم بتانے والوں میں یہ فرق ہوتا ہے۔

اس فلم کے دوسرے نمایاں تخلیق کاروں میں مسرور انور اور سبیل رعنا تھے۔ موسیقی فلموں کی کامیابی میں بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ اچھی موسیقی اچھے گانے ہوں تو کمزور کہانی کی فلمیں بھی پسند کر لی جاتی ہیں۔ ”ارمان“ کی کہانی، ہدایت کاری، اداکاری تو سہرا کلاس کی تھیں۔ اس پر سبیل رعنا کی دلوں میں اتر جانے والی موسیقی کی دھنیں اور مسرور انور کے مدحہرے گیتوں نے سونے پر سہاگا کا کام کیا جب کہ احمد رشدی کی جادوئی آواز نے بھی ایسی جادوگری دکھائی کہ فلم کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اگر ارمان کو لوگوں نے بار بار دیکھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پوری ٹیم کی فنی کارکردگی عروج پر ہے۔ اس فلم کی سپر ڈپر کامیابی نے وحید مراد کی پسندیدگی، مقبولیت اور شہرت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس فلم کی نمائش کو آٹھ دن ہو گئے مگر آج بھی اس کی تروتازگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

وحید مراد بلاشبہ ایک ذہین اور اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال فنکار تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والے سامنے آئے تو منہ بند کلیوں کی طرح ان کی فنی صلاحیتیں کھلی چلی گئیں۔ ان کی فلمیں دیکھنے والے ان کے گرویدہ اور شیدائی ہوتے چلے گئے۔

ہر دور میں فنکاروں کے چاہنے والے موجود ہوتے ہیں۔ آج بھی شان، جادیدہ، عجب گل اور شاہد خان کو ان کے پرستاروں کا طبقہ انہیں چاہتا ہے ان سے پیار کرتا ہے مگر جس تناسب سے وحید مراد کو اس کے چاہنے والوں نے چاہا، پیار کیا اس تناسب سے کسی اداکار کو بھی چاہا نہیں گیا۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ جواب تک نہیں ٹوٹا اور شاید آنے والے دنوں میں بھی نہیں ٹوٹے گا۔

رومانی ہیر و کے طور پر سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے وحید مراد کی پسندیدگی کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ نوجوان لڑکوں اور کالج کی طالبات ہی اس کی گرویدہ نہیں تھیں بلکہ پردہ دار گھریلو خواتین بھی سب سے چمپ کے اس کے نام کی مالا جاکر لگتی تھیں۔ شہر کے سینماؤں میں اس کی فلمیں لگتی تھیں تو انہیں دیکھنے ضرور جاتیں واپس آ کر اس کی ایک ایک ادا کو یاد کر کے سو سو جان سے اس پر فدا ہوتیں۔

### وحید مراد کے بچے

عالیہ مراد کی شادی 12 فروری 1987ء کو سید سجاد حسین شاہ سے ہوئی جن سے ان کے دو بیٹے سید مقبول شاہ اور سید محلی ہیں۔

عادل مراد کی شادی مریم رحیم سے 27 دسمبر 2005ء کو ہوئی ان کا بیٹا عیان عادل 16 نومبر 2006ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔

### عادل مراد بحیثیت اداکار

وحید مراد کے صاحبزادے عادل مراد جو وحید مراد کے انتقال کے وقت سات سال کے تھے۔ اب ماشاء اللہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اب بچوں کے باپ ہیں اور اب اپنے والد وحید مراد کے بیٹے پر فارمنگ آرٹ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان کی پہلی فلم ”بچن آئے نہ“ 11 اگست 2017ء کو ریلیز ہو رہی ہے (شاید یہ سٹریٹس پر رچتے وقت آپ عادل مراد کی فلم دیکھ چکے ہوں) ”بچن آئے نہ“ سید نور کی فلم ہے۔ ان کی اس سے پہلے 55 فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں۔ عادل مراد جوئی وی انڈسٹری سے بطور پروڈیوسر ڈائریکٹر وابستہ تھے اور متعدد ڈراما سیریز اور سوپ کرتے رہے تھے۔ ایک دن سید نور کی طرف سے انہیں ان کی فلم میں کام کرنے کی دعوت ملی جسے غور و فکر کے بعد عادل نے قبول کر لی۔ اگرچہ یہ ایک ٹینگیٹو کردار تھا۔ ایک ڈیڑے کے بھڑے ہوئے بیٹے کا کردار تھا جو یو کے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتا ہے اور دولت کے نشے میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ اس منہ کی کردار کو قبول کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے عادل مراد کہتا ہے۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ وحید مراد کو ”شیشے کے گھر“ میں ان چاہنے والوں نے قبول نہیں کیا تھا اگر یہ سوچ کر میں وحید مراد بننے کی کوشش کرتا رہوں گا تو یہ میرے اور وحید مراد کے چاہنے والوں کے لیے اچھی بات نہیں ہوگی کیونکہ وحید مراد دنیا میں ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ یہ عوام کا کام ہے کہ میرا کام دیکھ کر فیصلہ کریں کہ میں بحیثیت اداکار کتنا کامیاب رہا ہوں۔“

اس فلم کو ان کی اولین فلم کہا جاتا ہے۔

ہدایت کار قدیر غوری نے انہیں اپنی گھریلو اور نغماتی فلم ”دامن“ میں پہلی بار نیلو کے ساتھ رومانی ہنر بنا کر پیش کیا تھا مگر سنوٹس کمزور اور صبیحہ خانم اس فلم کے ہیرو ہیروئن تھیں۔ وحید مراد اور نیلو کے جڑی رومانوی کردار تھے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض تو ایک شرا کے طور پر فلمی میدان میں قدم رکھتے ہیں جن کی بہترین مثال سلطان راہی اور ریکیلا کی ہے۔ وحید مراد کے ساتھ یہ نوبت تو نہیں آئی مگر چھوٹے موٹے کرداروں کے بعد جب انہیں قدرے بڑے رول بھی ملنے لگے تو وہ بھی جالوی ہوتے تھے۔ بڑے فنکاروں کے ساتھ بغل بچ کے طور پر پیش کیے جاتے تھے۔ وحید مراد بڑھے لکھے اور باشعور اداکار تھے ان کے لیے یہ صورت حال تو لگ رہی تھی۔ کبھی جب وہ اکیلے بیٹھے ہوتے تو خود ہی خیال آرائی کرتے۔ ”اس طرح تو میں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے پہنچے پوڑھا ہوا جاؤں گا۔“

ان کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ لہذا اس کے سدباب کے لیے انہیں اپنی طبیعت کے مطابق کرداروں پر پر فارم کرنے ہی میں اپنی بہتری نظر آئی۔

”کیوں نہ میں اپنے لیے اپنی فلم بناؤں؟“ انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ چند روز تک اس پر غٹھنے دل و دماغ سے غور و فکر کیا اور پھر ”ہمیرا اور پتھر“ بنا کر اس میں فرسٹ رومانی ہنر کے طور پر کام کیا اور تماشا بینوں نے انہیں سولو ہیرو کے طور پر دیکھ کر اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ لوگوں میں جہاں بہت سی اچھائیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں وہاں ان میں کچھ خرابی اور برائی بھی ہوتی ہے۔ انسان ہونے کے ناطے وحید مراد بھی اس انسانی جبلت سے پاک نہیں تھے جہاں ان میں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک خرابی یہ تھی کہ وہ بڑے جذباتی تھے۔ فوراً روٹھ جاتے تھے۔ ناراض ہو جاتے تھے اور اپنے بہترین ساتھیوں اور دوستوں سے بھی بدظن ہو جاتے تھے۔ ان کے بہت قریبی اور بہت اچھے دوست ہدایت کار پرویز ملک کی زبانی ان کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ پرویز ملک کہتے ہیں۔ ”وحید مراد میرے محسن تھے۔ انہوں نے مجھے بطور ہدایت کار متعارف کرایا۔ وہ ایک مکمل رومانوی ایکٹر تھا مگر اس کی ذاتی زندگی میں کافی ہنچل سی تھی جس کی وجہ سے وہ سفارش پسند نہیں کرتے تھے۔“ آخری دنوں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے

ہیر وئن پر گرتا ہے۔ وحید مراد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ فلم میکرز نے ناکام فلموں کا ذمہ دار وحید مراد کو ٹھہرا کر انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور ان کی جگہ ندیم اور دوسرے ہیر وئن کو کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ وحید مراد پڑھے لکھے تھے۔ باشعور انسان تھے۔ انہیں تو یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی بجائے ندیم کو فلموں میں کاسٹ کرنے کے ذمہ دار پرویز ملک ہیں۔ پرویز ملک تو بس اسی بات کے گناہ گار تھے کہ پرویز سرنے جس ہیر وئن کا انتخاب کیا اسی کو لے کر فلم بنائی۔

وحید مراد کی منفی سوچ نے انہیں ڈپریشن کا شکار کر دیا۔ اگرچہ اس حوالے سے ندیم صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اس صورت حال کا مقابلہ خود وحید مراد کو کرنا چاہیے تھا جس طرح انہوں نے اپنی ذاتی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو منوایا تھا اسی طرح اس موقع پر بھی اپنی فلموں کے ذریعے فلم سازوں کے اس نظریے کو مسترد کرنا چاہیے تھا۔ ان کا ذاتی پروڈیوسر ہاؤس تھا۔ ان کے پاس سرمایہ بھی تھا۔ وہ یہ کام بخوبی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔“

وحید مراد کے بارے میں ان کے دور کے ایک اور ہدایت کار شوکت ہاشمی نے بھی اپنے محسوسات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ نئی نسل کو شاید شوکت ہاشمی کے بارے میں زیادہ علم نہ ہو۔ اس لیے ان کے بارے میں مختصر عرض ہے کہ وہ ایک پرانے ہدایت کار اور مصنف تھے۔ بہت ہی فلم انڈسٹری میں بہت دنوں تک اپنی فنی زندگی جاری رکھی۔ انہوں نے اس دور میں ایک عشق بھی کیا۔ اس میں ناکام بھی ہوئے اور پھر اس عشق کو شہرت ان کے لکھے ناول ”نیا جوک مگنی“ سے حاصل ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے نئی فلمیں بنائیں۔ آخری عمر بحیثیت صحافی گزاری۔

پاکستان میں انہوں نے ”ڈاکٹر“ کے نام سے جو فلم بنائی تھی اس میں انہوں نے وحید مراد کو بطور ہیر وئن کیا تھا۔ یہ وحید مراد کی چوتھی فلم تھی۔ اس کے بعد بھی وحید مراد کو لے کر کچھ فلمیں بنائیں۔ شوکت ہاشمی فلم میکر کے علاوہ ادیب اور صحافی بھی تھے اس لیے ان کی سوچ، فکر اور وٹن قابل غور و فکر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

”وحید مراد، سنوٹش، درپن اور سدھیر سے زیادہ فریش اور ٹیلنٹڈ تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اپنے کرداروں کی روح میں اثر کر پر قائم کرتا تھا۔ وقت پر اسٹوڈیو آتا، جلدی سے میک اپ کر کے سیٹ پر پہنچ جاتا۔ اپنا سین پڑھتا، مکالمے یاد کرتا، کوئی اچھا ٹیچسن ہوتا تو ہدایت کار

کہا۔ ”پرویز! میں نے تمہاری باتوں پر کبھی عمل نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے آج یہ وقت کافی برا لگ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔ جب میں ندیم کے ساتھ فلموں میں مصروف تھا اس کے باوجود میں تمہیں ایک دوست اور بھائی سمجھتے ہوئے مشورے دیتا رہتا تھا۔ کیونکہ تم پاکستان کے ایک عظیم ہیر وئن آج میں جو کچھ ہوں صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ہوں۔“

پرویز ملک کہتے ہیں۔ ”اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ میں نے وحید مراد سے جو کچھ کہا وہ حرف بہ حرف درست ہے مگر میرے لیے یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے کہ میں نے وحید مراد کے ساتھ بے وفائی کی۔ یہ سراسر جھوٹ اور منفی پروپیگنڈہ ہے۔ میں نے ہم دونوں، قریبا، بچل، انتخاب، بچان، مہربانی پروڈیوسر کی خواہش اور ندیم کاروں کی دھمکائی کے مطابق بنائی تھی۔“

پرویز ملک اس حوالے سے مزید کہتے ہیں۔ ”وحید مراد اور ہمارے چند مخالفین نے ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر میں آج بھی وحید مراد کو ایک بہت بڑا اداکار مانتا ہوں۔ وحید مراد کا مقابلہ ہم بھارت کے بڑے بڑے ہیر وئن کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ گانوں کی پکچر انڈسٹری میں بھی وحید مراد کو کمال مہارت تھی۔ آج یہ بات میں فخر کے ساتھ کہوں گا کہ میری فلموں میں وحید مراد نے جو پر فارم کیا تھا ان فلموں میں گانوں کی پکچر انڈسٹری میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ وحید مراد کو جاتا ہے۔“

وحید مراد کی کامیابی و ناکامی سے قطع نظر میں یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ وہ دنیا سے فلم کے واحد ہیر وئن جو درود ہائی گزرنے کے بعد بھی اپنے پرستاروں کے درمیان موجود ہیں۔

پرویز ملک کے اس اظہار پر سے آپ بخوبی اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ وحید مراد اپنے اتنے اچھے دوست کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایک ایسا وقت آیا تھا جب وحید مراد کی کچھ فلمیں تابز توڑنا کام ہو گئی تھیں۔ ہمارے ہاں ایک بری روایت ہے کہ اگر کسی اداکار یا اداکارہ کی کچھ فلمیں باکس آفس پر ناکام ثابت ہوں تو وہ ان کی نگاہوں سے ایک دم گر جاتا ہے۔ اسے ناکام ہیر وئن یا ہیر وئن سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگرچہ فلم ایک نیم ورک ہے۔ متعدد لوگوں کی کارکردگی سے فلم منفی اور کامیاب یا ناکام ہوتی ہے مگر ناکامی کی صورت میں سارا ملہا ہیر وئن

### گیتوں کی پچھرائزیشن

وحید مراد گانوں کی پچھرائزیشن میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس لیے ان پر ہر فلم میں زیادہ سے زیادہ گیت فلمبند کرائے جاتے تھے مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان کے کریڈٹ میں کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں ان پر کوئی گیت عکس بند نہیں کرایا گیا۔ ایسی فلموں میں اولاد، دامن، میرے اپنے، آہٹ، پرواہ نہیں۔ انوکھا راج اور جوگی قابل ذکر ہیں جب کہ کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں صرف ایک گانا پچھرائز کرایا گیا۔ ان فلموں میں ممتا، بھونیک، ماں باپ، انسانیت، چاند سورج، بہار و پھول برساؤ، وقت، خریدار، جو اور جینے دو، گونج اٹھی شہنائی، آدمی، شیشے کا گھر، نذرانہ، وعدے کی زنجیر، یہاں سے وہاں تک، چھوٹے نواب، بندھن، پیاری، گن مین، کرن اور کل، دو پٹی جی، مانگ میری بھر دو، ہیرا اور زلزلہ شامل ہیں۔

### وحید مراد کی ذاتی فلمیں

وحید مراد نے بطور فلم ساز گیارہ فلمیں پروڈیوس کیں۔ جو یہ ہیں۔ انسان بدلتا ہے، جب سے دیکھا ہے تمہیں، ہیرا اور پتھر، ارمان، احسان، سمندر، اشارہ، نصیب اپنا اپنا، ممتا نہ ہاسی (پنجابی) جال اور ہیرو۔

### چاکلیٹی ہیرو۔ لیڈی کلر

وحید مراد کو اس کی زندگی میں بھی اور آج بھی چاکلیٹی ہیرو اور لیڈی کلر جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ وحید مراد کے حسب حال نام دینے والا کون شخص تھا؟ یہ دیکھی پریم نگری تھے جو معروف صحافی، معصف اور نقد نگار تھے۔ جن کا ایک بہرہ گیت آپ نے بھی شاہ ہوگا۔ ”دنیا کی کے پیار میں جنت سے کم نہیں“ یہ فلم ”جاگ اٹھا انسان“ کا گیت ہے۔

وحید کے ہدایت کار، اداکارائیں، موسیقار اور گلوکار وحید مراد نے 53 ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ ان کے ساتھ 27 اداکارائیں ان کی ہیروئن بنیں۔ ان پر 292 نغمات عکسند ہوئے جنہیں 22 گلوکاروں نے گایا۔ 23 موسیقاروں نے ان گیتوں کی دھنیں کمپوز کیں۔

کو بڑے ادب سے بتاتا۔ شوٹنگ کے دوران محنت سے کام کرتا۔ ان ڈور آؤٹ ڈور، گرمی سردی جہاں بھی شوٹنگ ہوتی وہ خوشی خوشی کام کرتا۔ نس کچھ اور خوش اخلاق تھا۔ فلمی حلقوں میں روز بروز پاپولر ہوتا گیا اور دوسرے ہیروز کو پیچھے چھوڑتا ہوا بہت آگے بڑھ گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے لاکھوں روپے کمائے اور بڑی عزت اور مقبولیت حاصل کی۔ یہ تو وحید مراد کی وہ خوبیاں تھیں جنہیں شوکت ہاشمی نے محسوس کیا۔ اب ان کی زبانی وحید مراد کی ایک اور خوبی کے بارے میں بھی اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے۔ شاید کسی اور نے اس جانب نشاندہی نہیں کی۔ وحید مراد کو اس بات کی قدرت بھی حاصل تھی کہ وہ آنے والے دنوں کے بارے میں کچھ فلموں اور فلمی لوگوں کے متعلق پیش گوئیاں بھی کرتے تھے جو صحیح ثابت ہوتی تھیں۔

شوکت ہاشمی کہتے ہیں۔ ”میری فلم ”ڈاکٹر“ جس کے وہ ہیرو تھے۔ اس کی تکمیل کے دوران انہوں نے دونوں اعزاز میں کہہ دیا تھا۔ ”آپ جتنے بھی جتن کر لیجیے۔ میری یہ فلم کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ پڑھے لکھے ناظرین اور ناقدین بمصرین کی تحریف و توصیف کے باوجود ”ڈاکٹر“ بارہ ہفتوں سے زیادہ نہ چل سکی۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا۔ ”تم نے فلم کی تکمیل اور اس کی نمائش سے پہلے کیسے یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کامیاب نہیں ہوگی؟“

میں نے وجہ پوچھی تو دو کہنے لگا۔ ”اس کی وجہ ہیروئن ہے۔ اس فلم میں تمام اداکار اور ٹیکنیشنز پلس ہیں صرف ایک ہائٹس ہے اور یہ ہائٹس تمام ہی پلس پر بھاری ہے یعنی اس فلم کی ہیروئن۔“

میں نے اسے بتایا۔ ”اس فلم کی ہیروئن ہی اس فلم کی پروڈیوسر ہے اور اس کا فلم بنانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ بطور ہیروئن کی طرح اسٹیلش ہو جائے۔“

وحید کلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ میں اسے بخوبی جانتا ہوں۔ وہ کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی۔ وہ اور اور اتج ہے۔ بد صورت ہے۔ بھدی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں اداکاری کا کوئی اسپارک نہیں ہے۔ بہر حال میں صرف آپ کی خاطر اس فلم میں کام کر لوں گا۔ میرا کیا ہے، میرے پاس دس فلمیں ہیں میرا کچھ نہیں بگڑے گا



کے پروڈیوسر نے انتقاماً فلم کے ٹائٹل اور پلٹنی وغیرہ میں میرا نام بطور ہدایت کار تحریر کیا تھا۔ حالانکہ اس فلم میں سوائے جھ آؤٹ ڈور اور ان ڈور گانوں کی پچھرازیٹن کے میرا کوئی کنٹری بیوشن نہیں تھا۔ پروڈیوسر کی اس انتقامی کارروائی سے میرے فلمی کیریئر کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ میں نے اس صورت حال سے پہلے ہی اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بدل دیا۔ میں نے بہت مناسب وقت میں صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کل بھی زندہ تھا آج بھی زندہ ہے۔ اس کے بہت سے پرستار ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے اسے اس کی زندگی میں نہیں دیکھا ایسے چاہنے والے اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں نہیں جانتے۔ نئی سسل کے ایسے پرستاروں کی معلومات میں اضافے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سپر اشار کی ابتدائی زندگی کے متعلق بھی بتایا جائے۔

وحید مراد کے والد محترم ثار مراد کا تعلق سیالکوٹ شہر سے تھا۔ ثار مراد بعد ازاں کراچی آ گئے جس کے بعد انہوں نے پاکستان فلمز کے نام سے فلموں کی تقسیم کاری کا ادارہ قائم کیا اور اس ڈسٹری بیوشن دفتر سے متعدد فلمیں ریلیز ہوئیں۔ وحید مراد کا بطور طالب علم پہلا اسکول میری کلاسکو سینڈری اسکول تھا۔ اسی اسکول سے انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اس کے بعد ایم ایس کالج سے ایف ایس سی اور آرٹس کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے انکس لٹریچر میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک سے ماسٹری ڈگری تک ان کا تعلیمی کیریئر شاندار رہا۔

دورانِ تعلیم وہ فراغت کے اوقات میں اپنے والد ثار مراد کے دفتر میں بھی وقت گزارتے تھے۔ جہاں فلمی دنیا کے مختلف شعبوں کی مختلف شخصیات کی آمد بھی رہتی تھی۔ اس طرح انہیں فلموں اور فلم والوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ انہی دنوں انہوں نے دو فلمیں بھی پروڈیوس کیں۔ ان کی پہلی ذاتی فلم کا نام ”انسان بدلتا ہے“ جب کہ دوسری فلم ”جب سے دیکھا ہے تمہیں“ تھی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ان کے دوست پرویز ملک فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے امریکا جا رہے تھے تو وحید مراد نے بھی ان کے ساتھ ہی امریکا جانے اور فلم ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر جب انہوں

مگر اس فلم میں آپ کا کیریئر ختم ہو جائے گا۔ آپ سوچ لیجیے۔“

وحید مراد نے سچ کہا تھا۔ فلم ابھی نصف کے لگ بھگ مکمل ہوئی تھی کہ یہ آثار نظر آنے لگے کہ آگے خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ ہیروئن صاحبہ کے شوہر نامدار کی ہر بات، ہر مجالے پر مدخلت سے مجھے فلم مکمل کرنا ناممکن نظر آنے لگا۔ وہ چاہتے تھے کہ فلم کا کوئی منظر کوئی سین ایسا نہ ہو جس میں ہیروئن نظر نہ آئے۔ فلم کی کہانی میرے ایک دوست نے لکھی تھی اور کہانی کے تقاضے کے مطابق جہاں جہاں ہیروئن کی انٹری ضروری تھی وہاں وہاں اس کا کردار تھا۔ ہیروئن کے شوہر (فلم کے قلمساز) کا کہنا تھا کہ آپ کہانی میں ایسی تبدیلی کریں کہ ہیروئن ہر سین میں موجود ہو۔ ایسا کرنا میرے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ہیروئن صاحبہ کا اردو تلفظ بھی بہت ناقص تھا۔ میں بار بار ٹوٹا اور سچ ادا نیگی کے لیے کہتا تو ہیروئن سے زیادہ ان کے شوہر کو ناگوار گزرتا۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں ہیروئن کو لٹ ڈاؤن کر رہا ہوں۔ پونٹ میں بڑا احتجاج پیدا ہو گیا۔ دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ میرا حامی تھا دوسرا گروپ ہیروئن اور ان کے شوہر کی ہر نا جائز بات کو بھی درست تصور کرتا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس فلم سے علیحدگی اختیار کر لوں۔

میری علیحدگی کے بعد میرے ایک نالائق شاگرد نے جو پروڈیوسر کا خوشامد تھا، فلم کو مکمل کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی اور ہیروئن اور ان کے شوہر کی خواہش کے مطابق اسکرپٹ میں تبدیلی کر کے فلم مکمل کر لی۔ ”بندھن“ ریلیز ہوئی تو اس سے عوامی رشتے کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ایسی فلم کا جو حشر ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ پہلے ہی ہفتے میں اس کا دھڑن ختم ہو گیا۔

”بندھن“ کی نمائش کے دوسرے دن ایور نیوا سٹوڈیو میں میری وحید مراد سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ان دنوں میں روزنامہ ”مشرق“ میں سینئر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کر رہا تھا۔ وحید مراد میرے قریب آیا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔ ”آپ نے بہت اچھا کیا جو ملازمت کر لی۔ اب آپ کا فلمی کیریئر ختم ہو چکا ہے۔ دل لگا کر اخبار میں کام کیجیے یہ پیشہ فلم ڈائریکشن سے زیادہ ریسپیکٹ پہنچاتا ہے۔“

اگرچہ آدمی فلم (بندھن) چھوڑ کر میں آ گیا تھا مگر اس

مشورہ دیا کہ اب تم مکمل ہیرو کے روپ میں خود کو پیش کرو۔ ان لوگوں میں ان کے والد محترم ٹارمراد بھی شامل تھے۔ وحید مراد خود بھی چاہتے تھے کہ وہ ثانوی کرداروں کے حصار سے نکلیں اور مرکزی رومانوی کرداروں میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں۔ اس وقت تک پرویز ملک امریکا سے واپس آ چکے تھے۔ وحید مراد نے پڑھے لکھے اور روشن خیال ہونے کی وجہ سے اپنے فنی سفر کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے اپنی ایک ٹیم بنائی۔ اس میں ہدایت کار پرویز ملک، موسیقار سہیل رحمان اور مصنف ذفرہ نگار مسرور انور کے اہم کردار تھے۔ اس اشتراک کے نتیجے میں وحید مراد کی ”ارمان“ جیسی ہلاک بسمل و ظلم وجود میں آئی جس نے نہ صرف باکس آفس پر پلانٹیم جوبی (75 ہفتے) کا پرچم لہرایا بلکہ وحید مراد کو فلم انڈسٹری کا کامیاب ترین ہیرو متوالیا۔ ”ارمان“ 18 مارچ 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس ٹیم کی فلم ”احسان“ اور کچھ اور فلموں نے بھی کامیابی کا سلسلہ جاری رکھا۔

”ارمان“ کی نمائش سے پہلے یعنی 17 ستمبر 1964ء میں ٹارمراد نے بڑے ارمانوں کے ساتھ بیٹے کے سر پر سہرا سچایا۔ ان کی دہن سلمیٰ تھیں جو ایک بڑے اور نامور صنعت کار کی صاحبزادی ہیں۔

وحید مراد کے فلمی کیریئر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بطور فلم ساز اپنے ادارے فلم آرٹس کے سینئر تلے انہوں نے گیارہ فلمیں بنائیں۔ جن میں پنجابی فلم ”مستانہ مائی“ اور آخری فلم ”ہیرو“ بھی شامل ہیں۔ بطور مصنف وحید مراد کی چار فلمیں ہیں۔ ارمان، احسان، اشارہ اور ہیرو جو ان کی وفات کے بعد ریلیز ہوئی۔ بطور ہدایت کار ان کے فلمی کیریئر میں صرف ایک فلم ہے اور یہ فلم ہی اشارہ۔ اس فلم کی ہیروئن شبنم تھیں۔

انہوں نے بطور ہیرو مختلف ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا۔ وحید مراد کی پہلی جوڑی زیبا کے ساتھ تھی۔ زیبا کے ساتھ انہوں نے 9 فلموں میں کام کیا۔ جب کہ رانی کے ساتھ 18 فلموں میں اور شبنم کے ساتھ 16 فلموں میں کام کیا۔ نیلو، نفیسہ، روزینہ، روجی بانو، بہار، بارہ شریف، شگیتا، کویتا، ممتاز، نجمہ، انجمن، دردانہ رحمن، شائستہ قیصر، نشو، شیم آراء اور چترانہا (بنگالی اداکارہ) کے ساتھ بھی وہ بطور ہیرو جلوہ گر ہوئے۔

کبھی کبھی کچھ فلم ساز و ہدایت کار کچھ تجربے بھی کرتے ہیں جو کبھی کامیاب اور کبھی ناکام ہو جاتے ہیں۔ جیسے اسلم

نے اس بات کی خواہش اپنے پاپا سے کی تو انہوں نے انہیں امریکا جانے نہیں دیا۔ وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھے اور ان کے پاپا ٹارمراد ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ چند برسوں کے لیے جیے وہ ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو سمجھایا۔ ”تمہیں فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”کیوں؟ کیوں ضرورت نہیں؟ میرا بھی ارادہ اسی لائن کو پیشہ بنانے کا ہے۔“

”اسی لیے تو تمہیں ضرورت نہیں۔“ ٹارمراد بولے۔

”تم فلم سازی کی حیثیت سے فلمیں پروڈیوس کرو۔ اپنا پروڈکشن ہاؤس بنا لو۔ سرمایہ کاری کے لیے تمہیں کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاپا کے پاس جو روپیا پیسا ہے وہ سب تمہارا ہی ہے۔“

نوجوان وحید مراد نے چند لمحے سوچا۔ پھر کہا۔ ”ہاں آئیڈیا تو اچھا ہے۔“

”آئیڈیا اچھا نہیں بہت اچھا ہے۔ یہیں کراچی میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس دوران یا اس کے بعد فلم سازی شروع کرو۔ مجھے تو کچھ فلم والے کہتے ہیں تمہارا بیٹا بالکل ہیرو ٹائپ ہے۔ اسے فلموں کا ہیرو بناؤ۔“

وحید مراد ہنسنے لگے۔ ”ارے نہیں پاپا! میں کیا اداکاری کروں گا۔“

ٹارمراد نے بیٹے کی محبت میں اسے امریکا جانے نہیں دیا مگر اس کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اسے فلم پروڈکشن میں لگا دیا۔ اپنی ابتدائی ذاتی فلموں میں وحید مراد نے اداکاری نہیں کی مگر ٹارمراد کے دوستوں نے ان کے بیٹے کو اداکار بنادیا۔ ہدایت کار ایس ایم یوسف نے وحید مراد کو اپنی فلم ”اولاد“ میں ایک نمایاں کردار میں پیش کر دیا۔ یہ ہیرو کا کردار نہیں تھا اس کے باوجود اہم رول تھا۔ جس میں وحید مراد نے توقعات سے بڑھ کر اچھی اداکاری کر کے سب کو حیران کر دیا۔ یہ فلم 1962ء میں ریلیز ہوئی اور کولڈن جوبی کے اعزاز سے ہمکنار ہوئی۔ اس کے بعد سنٹوش کمار اور مہدیہ خانم نے اپنی ذاتی فلم ”دامن“ میں سینئر فلمی ہیئر کے طور پر نیلو کے ساتھ پیش کیا۔ اس فلم میں بھی وحید مراد کی اداکاری کو فلم بینوں کی بڑی تعداد نے پذیرائی کی سند عطا کی اور وحید مراد بطور اداکار فلم والوں کی نگاہوں میں آ گئے۔

اس کے بعد وحید مراد کو ان کے بیبی خواہوں نے یہ

کی۔ اس کی فلموں کی کامیابی اور ناکامی کو ترازو میں تول کر اس کی بے قدری کی۔ جب تک اس کی فلمیں ان کے بینک بیلنس میں اضافہ کرتی رہیں، اس وقت تک اسے سرائیکھوں پر بٹھایا۔ جب اس کی کچھ فلمیں کامیابی کے معیار پر پوری نہ اتریں تو اسے نظر انداز کر دیا۔ اگرچہ ان فلموں کی ناکامی میں ان کا اپنا حصہ بھی تھا۔

بہر حال وہ عظیم تھا اور ہمیشہ فنی عظمت کے میناروں میں اس کا نام اور کام روشن رہے گا۔ اس کی بہت سی باتیں ہیں جو گزشتہ 33 برسوں سے لکھی جا رہی ہیں پڑھی جا رہی ہیں لیکن اب تک ختم نہیں ہوئی ہیں۔ ہم بھی آپ کے لیے اپنے قارئین کے لیے اس کی مزید باتیں کرتے ہیں جو اب تک نہیں کر سکے۔

یہ ناٹیفکاز گزشتہ 2 اکتوبر 1938ء کو بروز بدھ کراچی میں پیدا ہوا۔ اس کا نام وحید مراد رکھا گیا۔ کیونکہ اس کے والد محترم کا نام شام مراد تھا۔ اس لیے اس کے نام وحید کے ساتھ مراد بھی جوڑا گیا۔

وحید مراد، شام مراد کی واحد اولاد تھے۔ اس لیے بڑے چاؤ اور لاڈ پیار سے ان کی پرورش ہوئی۔ ماں باپ کے حد سے زیادہ لاڈ پیار کے باوجود وہ بگڑے نہیں۔ ان کے بڑوں نے انہیں اچھی تعلیم اور اچھی تربیت دی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے جتنے جتنے بات تو کچھ ایسی ہی بات وحید مراد کے ساتھ تھی۔ وہ بچپن اور لڑکپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم تک ان کا تعلیمی کیریئر بہت شاندار رہا۔ انہوں نے میٹرک میری کلاسک اسکول سے 1952ء میں پاکستان ایس ایم سائنس کالج سے بی اے کیا اور 1968ء میں کراچی یونیورسٹی سے انگلش ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ایم اے کی ڈگری سلیٹو پیپم سے شادی کے بعد حاصل کی۔

یہ بات سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہے کہ وحید مراد طالب علمی کے زمانے سے ہی فلموں کے دھندے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ دو فلمیں بنائی تھیں مگر اس مگر میں آکر بھی بیٹھے نہیں۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر فلموں میں اداکاری بھی کرنے لگے مگر عام فلمی اداکاروں کی طرح بے راہ روی کے راستے پر گامزن نہیں ہوئے۔ اس کی خاص وجہ ان کے والدین کی اچھی تربیت تھی۔ بیٹے کے سلسلے میں اچھی منصوبہ بندی تھی۔ انہوں نے مناسب موقع دیکھتے ہی بیٹے کی شادی کر دی۔ جس سال شہر کے مینے میں بیٹے کی شادی کی

پرویز جب ہیرو کی حیثیت سے ناکام ہونے لگا اور یکے بعد دیگرے اس کی بہت سی فلمیں فلاب ہونے لگیں تو اس نے از خود فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کئی برسوں کے بعد ہدایت کار حسن طارق نے اسے اپنی ایک فلم میں بطور ولن کاسٹ کیا۔ غالباً یہ فلم ”شکوہ“ تھی۔ فلم ریلیز ہوئی تو فلم کے ساتھ اسلم پرویز بھی بطور ولن ہٹ ہو گیا۔ اسی طرح اپنے وقت کے بہت بڑے ہدایت کار نذر اللہ اسلام نے بھی اپنی ایک فلم ”شیشے کا گھر“ میں ایک تجربہ کیا تھا۔ وحید مراد کو ولن کے روپ میں پیش کیا تھا۔ اس فلم کا ہیرو شاہد تھا مگر ان کا یہ تجربہ بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ وحید مراد کے پرستاروں نے وحید مراد کو ولن کے روپ میں قبول نہیں کیا۔ انہوں نے یہ فلم یکسر مسترد کر دی۔ اس طرح نذر اللہ اسلام جو کامیاب فلموں کے ہدایت کار تسلیم کیے جاتے تھے ان کی یہ فلم ناکام ترین فلم ثابت ہوئی۔ ”شیشے کا گھر“ 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی جو تھی کردار میں وحید مراد کی پہلی اور آخری فلم تھی۔

وحید مراد کو اس بات کا اعتراف بھی حاصل ہوا کہ ان کی فلم ”رشتہ ہے پیار کا“ کی فلم بندی پہلی بار کسی یورپی ملک میں کی گئی۔ وہ فلمی دنیا کے کرکٹ کلب کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے اس کلب کے کھلاڑی کی حیثیت سے 29 میچ کھیلے۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے 43 انٹرویوز نشر ہوئے۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں وہ پانچ بار جلوہ گر ہوئے۔ طارق عزیز کے ”فیلام گھر“ میں دو بار اور پروگرام ”گیت والا“ میں بھی دو بار۔ اور ایک بار ”سلور جوبلی“ پروگرام میں۔ وحید مراد کے اسٹائل اپنانے کا رجحان پاکستان میں ہی نہیں ہالی ووڈ میں بھی ان کی نقالی کرتے ہوئے کچھ اداکار نظر آتے تھے۔

وحید مراد جس نے 20 سال تک اپنے چاہنے والوں کے دلوں پر راج کیا۔ ان کا فانی کیریئر ایکس بائس برسوں پر محیط ہے۔ جن میں بیس سال تک فلم انڈسٹری میں اپنا سکہ رائج رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہی نہیں اس جہان فانی سے گزر جانے کے بعد بھی لاکھوں دلوں میں دھڑکن بن کر زندہ رہتا اور وہ بھی سال دو سال تک نہیں 34 سال گزرنے کے بعد بھی دلوں پر راج کرنا وحید مراد کا ہی اعزاز ہے۔ اس مرتبے پر ابھی تک کوئی دوسرا فنکار نہیں پہنچا۔ ناقدین اور معاصرین اسے ”مجسم فن“ اور ”مکتبہ فن“ کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہماری فلم انڈسٹری اور اس کے کرتا وھرتاؤں نے اس کی اور اس کے فن کی قدر نہیں

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of  
your Favourite Paksociety's  
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**

Like Message

✓ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First  
See new posts at the top of  
News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow

سمندر

کبھی کبھی قلم ساز و ہدایت کار اپنی عام روش اور شیڈول سے ہٹ کر کچھ تجربہ کرتے ہیں جس میں کبھی کامیاب اور کبھی ناکام ہوتے ہیں۔ وحید مراد نے بھی اپنی ایک فلم ”سمندر“ میں اپنے شیڈول سے ہٹ کر کچھ فیصلے کیے۔ جیسے اس فلم کے لیے پرویز ملک کی جگہ رفیق رضوی کو بطور ہدایت کار لیا۔ سہیل رعنا کی بجائے دیو بھٹہ چار یہ کوسائن کیا اور سرور انور کی جگہ صہبا اختر کو بطور شاعر آزمایا۔ شبنم کو اس فلم میں پہلی بار مغربی پاکستان کی فلم میں بطور ہیروئن پیش کیا گیا۔ فلم 10 مارچ 1968ء کو عید الاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی۔ اس نے 37 ہفتے چل کر محض سلور جوبلی حاصل کی۔ اس فلم کے کیتوں نے کامیابی حاصل کی جن میں ”تیرا میرا ساٹھی ہے لہراتا سمندر“ آج بھی مقبول ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تجربہ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

وحید مراد روڈ

کراچی شہر کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اس کی ایک سڑک وحید مراد روڈ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ سابق مارشین روڈ تھا جو قیام پاکستان سے قبل برٹش افسر کے نام سے منسوب ہے۔ 1989ء میں اسی مارشین روڈ کو وحید مراد کا نام دے دیا گیا۔ وحید مراد روڈ ریونیو سیمیا کی طرف سے شروع ہوتا ہے اور گاؤں روڈ سے نکل کر گوڈین سیمیا کی سائٹ پر آ جاتا ہے اور یہاں سے ایم اے جناح روڈ سے جاملتا ہے۔ ایم اے جناح روڈ سے آنے والے کئی راستے وحید مراد روڈ کو ایم اے جناح روڈ سے ملاتے ہیں۔ وحید مراد روڈ پر یو ایس سیمیا تھا۔ اس کے برابر سے جو راستہ جاتا ہے کچھ ہی فاصلے پر سیدھے ہاتھ پر گوڈین سیمیا تھا۔ اس کے بالکل سامنے جو بلی سیمیا تھا۔ وحید مراد روڈ پر، گوڈین سیمیا، افشال سیمیا اور نقیسن سیمیا ہوا کرتے تھے۔ ان چھ سیمیاؤں میں اب صرف دو سیمیا گھر باقی رہ گئے ہیں۔ وحید مراد کے نام سے سڑک متعین کرنے کا مطالبہ وحید مراد کے پرستاروں کا تھا۔ کوئی چھ سال بعد اس پر عمل درآمد ہوا۔ اس سلسلے میں الیاس رشیدی مرحوم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ پاکستان میں پہلا واقعہ تھا کہ کسی اداکار کے نام پر شہر کی کوئی سڑک منسوب کی گئی۔

اسی سال دسمبر کے مہینے میں ”ہیرا اور پتھر“ ریلیز ہوئی۔ جو وحید مراد کی چوتھی یا پانچویں فلم تھی۔ شاعر مراد صاحب نے بیٹے قلمی کیرئیر کے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ اس طرح اس کی عوامی مقبولیت اثر انداز ہوگی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بیٹے کو اخلاقی طور پر ثابت قدم رکھنے کے لیے ایسا کیا۔ یہ کسی اداکار کے لیے بڑا رکی اقدام ہوتا ہے مگر اللہ نے ان کے نیک اقدام کا انہیں زبردست انعام دیا۔ ”ارمان“ 18 مارچ 1966ء میں نمائش پذیر ہوئی۔

ندیم جو اپنی پہلی فلم ہی سے ہٹ ہو گئے تھے۔ وہ بھی ”چکوری“ کی کامیابی کے بعد اپنی شادی پر رضامند نہیں تھے مگر انہیں ان کے سرکاریوں کے مجبور کرنے پر شادی کرنی پڑی مگر وہ بہت خائف تھے کہ کہیں ان کی شادی کی خبر ان کی مقبولیت کو متاثر نہ کر لے مگر وحید مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ وہ خوفزدہ تھے نہ ان کے والدین۔ شادی کے بعد وہ فلموں میں پہلے کی طرح کام بھی کرتے رہے اور ان کی عوامی مقبولیت میں روز بروز اضافہ بھی ہوتا رہا۔ ”ہیرا اور پتھر“ نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی اور ”ارمان“ نے پلانٹیم جوبلی کی۔

شادی کے بعد ان کے بچے بھی ہوئے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام انہوں نے عالیہ مراد رکھا اور بیٹے کا نام عادل مراد۔ دونوں کا نام عین (ع) سے شروع ہوتا ہے دونوں دادا دادی کے بھی لاڈ لے تھے۔

وحید مراد کے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ انہیں بچپن سے اداکاری کا شوق تھا مگر یہ حقیقت نہیں۔ انہیں فلموں میں کام کرنے کا قطعی کوئی شوق نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی دونوں ذاتی فلموں ”انسان بدلتا ہے“ اور ”جب سے دیکھا ہے تمہیں“ میں اداکاری ضرور کرتے مگر انہوں نے ان میں کوئی ثانوی کردار بھی ادا نہیں کیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ کچھ فلم والوں نے انہیں زور زور بدلتی اداکاری کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی ساری دلچسپی تو صرف فلم سازی سے تھی۔ ان کے اداکار بننے میں ان کے علاوہ مگر کسی فرد کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خود کرکٹر بننا چاہتے تھے ان کی والدہ کی خواہش کچھ اور تھی جب کہ ان کے والد شاعر مراد انہیں سی ایس لی آفیسر بنانا چاہتے تھے مگر ہوا وہی جو منظور خدا تھا۔ ان سمیت مگر کے تمام افراد کے نہ چاہنے کے باوجود وحید مراد اداکار بن گئے۔ فلموں کے ہیرو بن گئے اور ایسے بنے کہ آخری دم تک ہیرو ہی بنے رہے۔



”ارے بھئی! لڑکا تو غضب کی اداکاری کرتا ہے یہ تو جلد ہی ہماری فلموں کی ضرورت بن جائے گا۔“  
وہ جو کہتے ہیں جسے پچا چاہے وہی سہاگن۔ تو کچھ ایسی ہی بات اس نے اداکاری کی تھی۔ اس کی اداکاری پسند کرنے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ فلم بنانے والے تمام شائقین کا رجحان دیکھتے ہیں۔ عوامی پسندیدگی کو پیش نظر رکھ کر فلموں کی کاسٹ ترتیب دیتے ہیں۔ فلم میکرز بڑی سنجیدگی سے اس نئے اداکار کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگے۔

وحید مراد کے والد ثار مراد ایک جہاندیدہ فلم تنظیم کار تھے۔ فلم والوں سے ان کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ انہوں نے فلم سازوں کے اس ارادے کو بھانپ لیا کہ فلم میکرز ان کے ابھرتے ہوئے اداکار بیٹے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انہوں نے سوچا یہ فائدہ وہ اور ان کا بیٹا خود کیوں نہ اٹھائیں۔ انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ”دیدو! تم خود فلم بناؤ اور اس میں مکمل ہیرو کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرو۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم خود اپنی فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“

وحید مراد اپنے باپ سے بے پناہ پیار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں اپنا بہترین بی بی خواہ اور رہنما بھی سمجھتے تھے۔ ”ٹھیک ہے بابا! میں ایسی فلم بناتا ہوں۔“ اور انہوں نے ”ہیر اور پھر“ کے پروڈیکٹ پر کام شروع کر دیا۔  
وحید مراد نے اس وقت کے کراچی فلم انڈسٹری کے معروف مصنف اور ہدایت کار اقبال رضوی سے ایک ہلکی پھلکی رومانوی کہانی لکھنے کو کہا۔

وہ جب کہانی لکھ کر لائے تو اس کی پسندیدگی کے بعد بولے۔ ”رضوی صاحب! آپ اس کے مکالمے بھی لکھیں گے۔“

جب وہ مکالمے لکھ چکے تو فلم ساز وحید مراد نے کہا۔ ”اس فلم کو ڈائریکٹ بھی آپ ہی کریں گے۔“  
”جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

اور پھر دونوں نے مل کر کہانی کی ضرورت کے مطابق آرٹسٹوں کا انتخاب کیا اور موسیقی کے لیے سہیل رعنا اور نغمات کے لیے سرور انور اور موج لکھنوی کو منتخب کیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو شوٹنگ شروع کر دی گئی۔ اس دوران کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وحید مراد کے دیرینہ دوست پرویز ملک امریکا سے فلم ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے واپس

اداکاری میں وہ کیسے آئے یہ کہانی بھی عجیب ہے۔ ایک دن ثار مراد صاحب نے درپن سے کہا۔ ”میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ہیرو لینے کا ارادہ ہے۔“  
درپن نے وحید مراد کی طرف اشارہ کر کے کہا، جو اس وقت ان کے قریب ہی تھے۔ ”اب آپ کو کسی بھی ہیرو کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہیرو تو آپ کے اپنے ہی کمر میں موجود ہے۔“

درپن کی رائے سن کر ثار مراد صاحب کو فلم بنانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کیونکہ درپن نے اپنی ذاتی فلم ”ساستی“ میں وحید مراد کو کاسٹ کر لیا۔ وحید مراد کی یہ پہلی فلم جمعہ 23 اکتوبر 1959ء کو ریلیز ہوئی۔ الحامد اس فلم کے ہدایت کار، بے اسے چشتی موسیقار اور درپن فلم ساز تھے۔ اس فلم کی کہانی اقبال رضوی نے تحریر کی تھی۔ مکالمے بھی انہی کے تھے جب کہ گیت فضل ہوشیار پوری نے لکھے تھے۔ عکاسی کے فرانسس نسیم حسین نے انجام دیے تھے۔ درپن، بمبیر خانم، سنتوش کمار، نذر اور طالش نے اہم کردار ادا کیے تھے۔ وحید مراد کو ایک اہم مگر ثانوی کردار میں پیش کیا گیا تھا۔

”ساستی“ سے شروع ہونے والا وحید مراد کا یہ فلمی سفر 125 فلموں پر محیط ہے۔ ”زولزلہ“ اس ”ساستی“ کی آخری مدوری ثابت ہوئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ اچھائی خود خوشبو کی طرح پھیلی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ وحید مراد کی ”ساستی“ میں مختصر مگر بااثر اداکاری نے یہ اثر دکھایا کہ دوسرے فلم میکرز بھی اس نئے نئے اداکار کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہدایت کار ایس ایم سیف صاحب نے اپنی فلم ”اولاد“ میں بھی اس نئے اداکار کو ایک چھوٹا سا کردار دیا۔ اس فلم میں وہ نیر سلطانہ اور درپن کے بیٹے کے رول میں نمودار ہوئے تھے۔ اس مختصر کردار میں بھی وحید مراد فلم دیکھنے والوں کو اچھے لگے۔ ان کی اداکاری پسند آئی۔

وحید مراد کی اداکاری اور عوام کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے سنتوش کمار نے اپنی ذاتی فلم ”داسن“ میں اس ابھرتے ہوئے اداکار کو زیادہ بہتر کردار میں پیش کیا۔ بطور سائیڈ ہیرو کے اس سے کام لیا۔ اس فلم میں ان کی سائیڈ ہیروئن نیلو تھیں۔ وحید مراد کو اس فلم میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا زیادہ بہتر موقع ملا۔ فلم بیٹوں نے اس نئے جوڑے کو نہ صرف پسند کیا بلکہ فلم میکرز کو بھی اس نئے اداکار میں پوشیدہ فنی خوبیوں کا اندازہ ہوا۔

وہاں وحید مراد بطور ہیر و شہرت اور مقبولیت کے آسان پرچاند سورج بن کر جگمگانے لگے۔ اس وقت ٹاپ کے جو ہیر و ز تھے۔ ان کو اس نئے ابھرتے ہوئے ہیر و سے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی چمک دمک سے ان کی شہرت اور مقبولیت کو گہن نہ لگ جائے۔

دوسرے ہیر و ز کا ایسا سوچنا غلط نہیں تھا۔ فن اداکاری سے جس کو بھی آگاہی حاصل تھی اس نے ارمان میں وحید مراد کی اداکاری دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اس اداکار نے اداکاری کو حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔ گویا وحید مراد نے اداکاری کا جدید اسلوب رائج کیا۔ ان میں بے جان الفاظ میں چادو بھرنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ گیتوں کو اپنی شوخ اور چٹیل اداکاری سے تماشا بینوں کو فریفتہ کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری میں ہوا کا ایک تازہ بھونکا بن کر نمودار ہوئے اور فلموں کو عطر پیڑ کر دیا۔ پاکستان میں جننے والی رو بانوی فلموں کو ایک نیا اور خوشگوار موڑ دیا۔ اس نے فلم کے گلوں سے محبت کے جذبات کا ایک طوفان اٹھا دیا۔ اس کی ان خداداد خوبیوں کی وجہ سے وہ فلم انڈسٹری کے لیے ایک گواہر بنایا۔ قرار دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی فنی جگہ گاہٹ سے دوسرے فلمی ستاروں کو مان کر دیا۔

اس کے والد محترم نے اسے یاد دلایا۔ ”جہیں یاد ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا، اس سے پہلے کہ دوسرے تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ تم خود اپنی پسند کی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو فائدہ پہنچاؤ۔“

”جی ہاں مجھے یاد ہے وہ ذرا۔ میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ آپ جتنے اچھے ہیں آپ کی باتیں، آپ کے مشورے بھی اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ کے کہے پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا فائدہ پہنچایا۔ میرا تو ایمان ہے کہ جو لوگ اپنے ماں باپ کا کہا ماننے ہیں ان کے کہے پر عمل کرتے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ کامیاب و کامران کرتا ہے۔“

ایک محتاط جائزے کے مطابق وحید مراد کی تقریباً 125 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جن میں کچھ ناکام فلمیں بھی شامل ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مزید فلموں میں بھی اداکاری کی تھی مگر مختلف وجوہات کی بناء پر وہ ریلیز نہ ہو سکیں۔ جن میں بہت سی فلمیں مکمل ہو چکی تھیں اور کچھ غیر مکمل تھیں۔ یہ سب اگر مکمل ہو کر اسکرین کی زینت بنتیں تو وحید مراد کے کریڈٹ میں نہ صرف مزید کامیاب فلموں کا اضافہ ہوتا بلکہ ان کی

وطن آگئے۔ کئی برسوں کے بعد دونوں بچھڑے ہوئے دوست ملے تو بہت خوش ہوئے اور وحید مراد نے اسی وقت ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ فلم ”ہیر اور پتھر“ اب پرویز ملک ہی ڈائریکٹ کرے گا۔ اقبال رضوی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ فلم بن گئی اور کامیاب ٹھہری۔

”ہیر اور پتھر“ کی کامیابی سے جہاں وحید مراد مکمل ہیر و کے طور پر کامیاب ثابت ہوئے۔ وہاں پرویز ملک کو بھی بطور ہدایت کار شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

”ہیر اور پتھر“ کے بعد وحید مراد نے پرویز ملک سے کہا۔ ”اب میری اگلی فلم تم شروع سے آخر تک اپنی پسند اور اپنے تجربے اور تعلیم و تربیت کی روشنی میں بنانا۔“ ”ہیر اور پتھر“ میں تو صرف تمہاری ڈائریکشن تھی۔ اس فلم میں سب کچھ تمہاری مرضی کا ہو۔“

”جو حکم سرکار کا۔“ پرویز ملک نے خوشگوار لہجہ میں کہا۔ ”جیسا آپ چاہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔“

”ارمان“ ان دونوں کی دوسری فنی کاوش تھی۔ جس کے لیے پرویز ملک نے اس کے ہر شعبہ کو اپنی پسند اور معیار کے مطابق ترتیب دیا۔ جو کچھ فلم سازی کے بارے میں امریکا سے سیکھ کر آئے تھے اس کی روشنی میں اس فلم کو بنایا۔ سنوارا اور ایک اچھی فلم بنانے میں اپنی ساری فنی صلاحیتوں سے کام لیا۔

اللہ رب العزت اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ پرویز ملک کی محنت، لگن، جدوجہد اور فنی صلاحیتوں کا اظہار ایک شاندار اور یادگار فلم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ”ارمان“ ہر پہلو سے ایک بہترین فلم ثابت ہوئی۔ اس دور میں ہی نہیں ہر دور میں اپنی مثال آپ ہے۔ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جس طرح اپنی پہلی نمائش کے زمانے میں تھی۔

”ارمان“ کی کہانی اس کے مکالمے، موسیقی، اس کے گیت، اداکاری اور فلم کی ہدایت کاری، معیار کے لحاظ سے اعلیٰ ترین تسلیم کی گئی۔ تماشا بینوں نے اسے اپنی سپر پسندیدگی سے بلاشبہم جوبلی کا اعزاز عطا کیا۔ ناقدین اور مبصرین نے اسے کامیاب فلموں کے سر کا جوہر قرار دیا۔ اتنا صبر و تحمل کرنے کے بعد بھی اس کے معیار میں، اس کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ کوئی فرق ظاہر نہیں ہوا ہے۔

”ارمان“ کی سپر ڈر کامیابی سے جہاں پرویز ملک فلم انڈسٹری کے صف اول کے ہدایت کار تسلیم کر لیے گئے۔

فلوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی۔

جو فلمیں ریلیز نہ ہوں ان کے بارے میں معلومات جمع کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن میں نے ”دیدو“ کے پرستاروں کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ مشکل مرحلہ بھی طے کیا ہے۔

آئیے! ان بد نصیب فلموں کے بارے میں آگاہی حاصل کیجیے جن کو ریلیز ہو کر وحید مراد کے کریڈٹ میں اضافے کا موقع نہ مل سکا۔

مکمل فلموں کے علاوہ کچھ فلمیں ایسی بھی ہیں جو ساٹھ ستر فیصد تک بنی ہوئی ہیں۔ ان کی مکمل ہو جانے والی فلموں میں پہلی فلم کا نام ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ ہے۔ اس فلم کے فلم ساز صافضی اور ہدایت کار اقبال یوسف تھے۔ موسیقی کی دھنیں ناشاد نے ترتیب دی تھیں۔ تسلیم فاضلی اس کے نغمہ نگار تھے۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، نسیم آراء، صوفیہ بانو اور حنیف شامل تھے۔ وحید مراد نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا۔ ایک رول میں ان کی بہرؤن نسیم آراء تھیں۔ دوسرے میں صوفیہ بانو! اگر یہ فلم ریلیز ہو جاتی تو

وحید مراد کی بہرؤنوں میں صوفیہ بانو کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ یہ رنگین فلم تھی۔ وحید مراد اس فلم سے بہت پرامید تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس فلم میں، میں نے اپنی زندگی کا یادگار ڈبل رول ادا کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وحیدی آرٹ پروڈکشن کی جانب سے اس فلم کا ایک خصوصی پریس شوکر اچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو میں ایک بار منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں اس فلم کے ہدایت کار اقبال یوسف نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت کی تھی۔ دیگر شرکاء میں وحید مراد مرحوم کی اہلیہ محترمہ سلٹی مراد، فلم ساز بشیر دانا والا، اسد قریشی، اداکار گلاب چانڈیو، محمود سلطان، بابر سلطان، انس ایم بروہی اور آل پاکستان وحیدی کلب کے ممبروں نے شرکت کی تھی۔ یہ فلم ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ مار دھاڑ سے بھرپور عام فلموں سے قطعی مختلف ہے۔ خوب صورت گیتوں سے مزین ایک رومانوی فلم ہے جس میں وحید مراد کے ساتھ تمام اداکاروں نے بہترین اداکاری کی ہے۔ اس فلم کو دیکھنے والوں کی اجتماعی رائے یہ ہے کہ مرحوم وحید مراد کی یادگار فلموں میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس فلم کے تمام گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند گیت یہ ہیں۔

☆ ”دہ نظر مہرباں ہو گئی ہے۔ میرے دل کی زباں ہو گئی ہے“ (آواز ملکہ ترنم نور جہاں)

☆ ”میرا بار بار اثر میلا ہے“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

☆ ”میرے چہرے چاہوں تھے دیکھوں“ (آواز احمد رشدی)

ہیں کیونکہ ان کے پاس اتنے وسائل ہیں اور یہ ان کی ذاتی قلم ہے۔

”دیا جلے ساری رات“ کے قلم ساز سجاد گل کے والد محترم آغا جی اسے گل اور ہدایت کار ایس ایم یوسف تھے۔ شمیم آراء نے اس قلم میں وحید مراد کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ التوا کے شکار اس مووی کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین ہیں جب کہ اس کے تمام تر نعمات نامور شاعر قسطنٹین شفا کی تحریر کردہ ہیں۔

کسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے مہناز بیگم کی آواز میں گایا ہوا ایک نغمہ نشر ہو کر بہت مقبول ہوا تھا۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو۔

اس مطلبی دنیا کو کوئی پیار سکھا دے

ہاں پیار سکھا دے

یہ خوب صورت گیت بھی وحید مراد کی ایک مکمل قلم ”نغمات کی رات“ کا ہے اس کے قلم ساز، مصنف اور ہدایت کار نامور شاعر شیون رضوی تھے۔ شاعر بڑی اس قلم کے موسیقار تھے۔ اس کے گانے اس کی ریلیز سے پہلے بہت مقبول ہو گئے تھے۔ اس قلم کی کاسٹ میں وحید مراد، بابہ شریف، شاہد، صاعقہ اور طالش شامل تھے۔ شیون رضوی کو اپنی اس قلم سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس قلم کو ریلیز کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اچانک ان کی موت واقع ہو گئی یوں یہ قلم سلور اسکرین کی زینت نہیں بن سکی۔

”پہلی نظر“ بھی وحید مراد کی ایک مکمل قلم تھی۔ جو بوجہ ریلیز نہ ہو سکی۔ اس کے قلم ساز ظہور قریشی تھے۔ ہدایت کاری کے فرائض الحامد نے انجام دیئے تھے۔ کہانی شور لکھنوی کی تھی جب کہ اسکرین پلے اور مکالمے اقبال رضوی نے لکھے تھے۔

تاج پچرز کے بیئر تلے بننے والی اس قلم میں وحید مراد، زبنا، آزاد، نرالا، شاہینہ، ترنم اور حنف نے نمایاں کردار ادا کیے تھے مگر افسوس کہ یہ مکمل قلم بھی نمائش پذیر نہ ہو سکی۔

وحید مراد کی مکمل فلموں میں ایک پنجابی قلم ”شہری بابو“ بھی ہے۔ ایک فلمی نام سے بہت پہلے پاکستانی فلموں کے ابتدائی دور میں سورن لاکھی جو اس دور کی کامیاب فلم تھی۔ ”شہری بابو“ جس میں وحید مراد نے ٹائٹل رول کیا تھا رنگین قلم تھی۔ ایڈیشن اور رومان کا شاہکار تھی۔ اس کے قلم ساز میاں جاوید قرادر ہدایت کار افتخار خان تھے۔ یہ وہی افتخار خان ہیں جو اس سے پہلے وحید مراد کی ذاتی پنجابی قلم ”مستانہ مانی“ کی بھی ہدایت دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جال،

### لورز کلب اور لورز

☆ پنس وحید مراد فیئر کلب۔ ہیڈ آفس کلشن کراچی۔ ☆ آل پاکستان سینٹر وحیدی کلب۔ لاہور، کورنگی کراچی۔ ☆ آل پاکستان وحید مراد لورز کلب، لاہور۔ ☆ آل پاکستان وحید مراد کنک آف۔ لیجڈز، لاہور۔ ☆ شہنشاہ رو مانس وحیدی کلب، کورنگی کراچی۔ ☆ ایور گرین وحید مراد گرینڈ فیئر الائنس، سیالکوٹ، لاہور، کراچی۔ ☆ ایور گرین وحید مراد فین کلب، کراچی۔ ☆ آل پاکستان وحیدی کلب، سیالکوٹ۔ ☆ آل پاکستان وحیدی کلب، حیدر آباد۔ ☆ پاکستان لائف ٹائم کمپانی فیڈریشن۔

ان لورز کلبوں کو قائم کرنے والے اور ان کے تحت وحید مراد کی عظمت اور بڑائی کا پرچم بلند کرنے والے محض تین ایگزٹ اور نو جوان لڑکے تھیں، بڑی عمر کے اور پختہ کار لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کلبوں کے عہدے داران اور ممبران وحید مراد کے بارے میں نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھ کر اخبارات و جرائد میں شائع کروا تے ہیں بلکہ وحید مراد کی برسی پر فلمی اخباروں سے وحید مراد پر خصوصی ایڈیشن نکلاتے ہیں۔ اس موقع پر وہ ایسے اخباروں کو اپنے کلبوں کی جانب سے بڑے بڑے اشتہارات چھپواتے ہیں اور ان خصوصی اشتاعتوں کو زیادہ قیمتوں کے باوجود ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں۔ ایسے خصوصی شادوں کے لیے ان کلبوں کی جانب سے ہر پور مواد بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

### بدر منیر کی عقیدت

پشتو فلموں کے لیجڈ ہیرو بدر منیر اپنے ابتدائی دور میں کچھ عرصہ تک وحید مراد کے ذاتی ملازم رہے۔ انہوں نے (وحید مراد نے) بدر منیر کی اداکاری کی طرف دلچسپی دیکھتے ہوئے ان کے لیے پشتو فلم میں کام کرانے کی سفارش کی۔ لہذا انہیں (بدر منیر کو) پشتو قلم ”یوسف خان شیر بانو“ میں ہیرو کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ بدر منیر پشتو اردو اور پنجابی فلموں میں کام کرنے لگے۔ پشتو فلموں کے سپر اسٹار بن گئے مگر وحید مراد کی عزت احترام میں کمی نہیں آنے دی۔ تمام عہدہ وحید مراد کو ”آقا“ کہہ کر پکارتے رہے۔

قوی خان کی دوسری قلم ”حنا“ بھی قتل کا شکار ہو کر مکمل نہ ہو سکی۔ ”حنا“ کے ہدایت کا اقبال اختر تھے۔ موسیقی کمال احمد کی تھی۔ کہانی بی ایچ بخاری نے تحریر کی تھی۔ اسے حمید اس کے عکاس تھے۔ وحید مراد، بابہ شریف، نوین تاجک، شاہد، نیر سلطانہ اور قوی خان اس قلم کے نمایاں فنکاروں میں شامل تھے۔ نوین تاجک وحید مراد کی بہترین تھیں۔ اس قلم کو بھی مکمل ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

یاد رہے کہ قوی خان نے بطور قلم ساز کوئی درجن بھر فلمیں بنائیں مگر وہ جتنے اچھے بڑے اور اعلیٰ معیار کے اداکار ہیں۔ ان کی پروڈیوس کی ہوئی فلمیں باکس آفس پر اس کے برعکس ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ قلم کا سبکیٹ تو بہت اچھا تلاش کر کے اس پر کہانی لکھواتے تھے مگر قلم کی کامیابی کے لیے جو گھیر یا مصالحہ الٹا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے گریز کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی چند ایک ہی فلمیں باکس آفس کے معیار پر پوری اتریں جن میں ”چوری چوری“ اور ایک آدھ فلمیں تھیں۔ اپنی فلموں کی مسلسل ناکامی کے بعد انہوں نے قلم سازی سے توبہ کر لی۔

وحید مراد کی مکمل فلموں میں ایک قلم ”ممل مٹی منزل“ بھی تھی۔ جسے رفیق رضوی (پاپو) ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ آغا نذر کاوش اس کے کہانی کار ناٹھاد موسیقار اور تسلیم فاضلی نغمہ نگار تھے جب کہ اس قلم کی عکاسی رفیق رضوی کے صاحبزادے سعید رضوی سرانجام دے رہے تھے۔ 80 فیصد سے زائد قلم بنائی جا چکی تھی کہ اس کے قلم ساز نے اس کا نام تبدیل کر کے ”اپنی منزل اپنی راہیں“ کر دی۔ جانے اس نام کی تبدیلی کا اثر کیا ہوا کوئی اور وجہ کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ نہ راہیں ہموار رہیں نہ منزل مل سکی۔ قلم اچانک روک دی گئی۔ اس نامکمل رہ جانے والی فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، شائستہ قیصر، نشو، منور سعید، شاہ نواز، عرش منیر اور سانی شامل تھے۔ تبدیل شدہ نام ”اپنی منزل اپنی راہیں“ کے نام سے اس کے گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول ہوئے۔ جن میں سے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ چار دینا سے بے نیاز ہوا (آواز۔ نور جہاں)

☆ اپنے ہوئے پرانے (آواز۔ نور جہاں)

☆ سلام آیا بہاروں کا (آواز۔ مالا)

قلم ساز محمد امین اور ہدایت کار رفیق اختر کی قلم ”دیدار“

بھی وحید مراد کی ریلیز نہ ہونے والی فلموں میں ایک تھی۔ اس قلم کی کہانی ذکی، بی اے نے تحریر کی تھی۔ موسیقی ایم اشرف کی

سیونی، میرامانی، پرواہ نہیں اور راجا کی آئے گی بارات بھی ان کی کامیاب فلمیں ہیں۔ اس قلم کی کہانی ختیر کاظمی نے لکھی تھی۔ نغمات خواجہ پرویز کے تھے۔ موسیقی وجاہت عطرے نے ترتیب دی تھی۔ اس قلم میں وحید مراد کے ساتھی فنکاروں میں نیلو، اعجاز، نیر سلطانہ، اقبال حسن، سادون اور سلطان راہی تھے۔ اداکارہ رانی وحید مراد کی بہترین تھیں۔ وحید مراد کو اپنی اس قلم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ”مستانہ مانی“ کی طرح ان کی یہ پختا قلم بھی کامیابی کے شاندار ریکارڈ قائم کرے گی۔ افتخار خان کی مگر پروڈکشن سے بھی وہ بہت پر امید تھے مگر افسوس کہ پوری قلم ہر طرح سے مکمل ہونے کے باوجود نمائش پذیر نہ ہو سکی۔

”جیسا سمندر“ جیسے خوب صورت نام کی قلم وحید مراد کی ایسی قلم ہے جس کی نمائش کی پیاس اب تک نہیں بجھ سکی ہے۔ اگرچہ یہ قلم مکمل ہوئی تھی۔ یہ قلم ہدایت کار اقبال یوسف کی قلم تھی۔ اس کے قلم ساز ایمان مرزا اور نذر احمد تھے۔ اس کی کہانی بشیر نیاز نے لکھی تھی۔ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ وحید مراد، محمد علی، بابہ شریف، نیر سلطانہ، حبیب، خالد سلیم موٹا، سانی، ملک انوکھا نے اس قلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے مگر صمد افسوس کہ اتنی بڑی کاسٹ اور کوئیٹ کی قلم اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔

اب کچھ ان فلموں کا ذکر جو مختلف حالات اور واقعات کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکیں۔ ان میں ایک قلم ”انجانے راستے“ بھی۔ اس کے ہدایت کار رفیق رضوی (پاپو) تھے۔ آئی ایچ جعفری قلم ساز تھے۔ ”انجانے راستے“ کی کہانی صفائی اور مصنف آغا نذر کاوش نے تحریر کی تھی۔ ویجو بمشہ چارہ اس کے موسیقار اور سرور نور نغمہ نگار تھے۔ ستر فیصد بنی ہوئی اس قلم میں وحید مراد کی بہترین شہنشاہ تھیں۔ نازیکہ، ستوش رسل، آزاد، آغا طاہش اور محمد علی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔

اداکارو قلم ساز قوی خان نے وحید مراد کو بطور ہیرو لے کر دو فلمیں بنائی تھیں۔ ان میں ایک قلم ”آنکھوں کے تارے“ اور دوسری ”حنا“ تھی۔

”آنکھوں کے تارے“ کی کہانی اطہر شاہ خان نے تحریر کی تھی۔ اس کی موسیقی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، نشو، دیبا، صاعقہ، لہری، عثمان پیروز، قوی خان اور طاہش شامل تھے۔ یہ قلم 1976ء میں زیریںجیل تھی۔ ساتھ فیصد تک بننے کے بعد نمائش کی کمی کے باعث التواء کا شکار ہو گئی اور اگے نہ بڑھ سکی۔



تیرا نام ہے محبت، پیغام اور وحید مراد کی ذاتی قلم ”مقدّر“ قابل ذکر ہیں۔ وحید مراد یہ قلم ادا کار شاہد کے اشتراک سے بنا رہے تھے جو 40 فیصد تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس قلم کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔ باہر شریف اس قلم میں وحید مراد کی ہیر و دن تھیں کہتے ہیں کہ یہ قلم شاہد کی بے پروائی کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی۔

وحید مراد کی نامکمل فلوں میں مگر کی عزت، عقیدت اور وفا بھی ہیں جو تکمیل کے دوران مختلف وجوہ کی بنا پر رک گئیں اور دوبارہ شروع نہ کی جاسکیں۔

وحید مراد کے پرستاروں کی خواہش ہے کہ وحید مراد کی جو فلمیں مکمل ہیں اور کسی نہ کسی وجہ سے نمائش کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکی ہیں انہیں اسکرین کی زینت بنایا جائے اس سلسلے میں وہ درخواست گزار ہیں کہ ان فلوں کے مالکان یا ان کے وارث اس سلسلے میں اپنے وسائل بروئے کار لا کر ان کی نمائش ممکن بنائیں۔ پرستاروں کا کہنا ہے کہ ان فلوں کی کامیابی یعنی بھیجی جائے اگر وحید مراد کی پیشتر پرانی فلمیں بار بار دکھائی ہوئی فلمیں اب چلتی ہیں اور اچھا خاصہ پرس کر رہی ہیں تو یہ نئی فلمیں بھی اللہ نے چاہا تو باکس آفس پر کامیاب ہوں گی۔

مکمل فلوں میں اقبال یوسف کی قلم ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ دیا بیکیم کی ”میرے جیون ساگھی“ قلم ساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار ایس ایم یوسف کی ”دیا جلع ساری رات“ اور نامور ہدایت کار افتخار خان کی ڈائریکشن میں بنی رنگین پنجابی قلم ”شہری بابو“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ اور رنگین پنجابی قلم ”شہری بابو“ کے پروڈیوسروں یا ان کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ ان فلوں کی نمائش میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کر کے انہیں ریلیز کر دیں تاکہ وہ سرمایہ جوان فلوں کی وجہ سے نچھو ہو گیا ہے، اسے منافع کے ساتھ حاصل کریں۔

آج حسن طارق زندہ ہوتے تو شاید وہ ریاض شاہد (عابدہ ریاض) کی قلم ”بہشت“ اور ایم صادق مرحوم کی رکی ہوئی قلم ”بہار و پھول برساؤ“ کی طرح وحید مراد کی ان فلوں کو بھی مکمل کرا کے ریلیز کرتے۔

اگر متذکرہ بالا فلمیں ریلیز ہو جائیں تو وحید مراد کے کریڈٹ میں کچھ اچھی اور کچھ بہت اچھی فلموں کا اضافہ ہو جاتا مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ بہر حال ان کی کم و بیش

تھی جب کہ وہ نامور شاعروں سرور انور اور فیاض ہاشمی نے اس کے گیت لکھے تھے۔ عکاسی مسعود الرحمان کی تھی۔ یہ قلم کافی حد تک بن چکی تھی۔ بلکہ اس کی پہلی ہی زور و شور سے جاری تھی کہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر ”دیدار“ مکمل نہ کی جاسکی۔ کہتے ہیں کہ بس تھوڑا سا ہی اس کا کام باقی رہ گیا تھا۔ اس قلم میں وحید مراد کی ہیر و دن شیم آراء تھیں جب کہ دیگر کاسٹ میں دیبا، لہری، نیلہ اور جمیل کل شامل تھے۔

وحید مراد کی ایک نامکمل قلم ”من کی آس“ بھی تھی۔ جس کی تکمیل اور نمائش کی آس پوری نہ ہو سکی۔ اس کے قلم ساز سعید ملک اور ہدایت کار مشتاق رضوی تھے۔ کہانی اور مکالمے نذیر ابراہیم اور راقب نوشانی نے تحریر کیے تھے۔ موسیقی رفیق علی اور کمال احمد کی تھی۔ نغمہ نگار سعید گیلانی اور تسلیم فاضلی تھے۔ ”من کی آس“ کے کئی گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول بھی ہوئے۔ اس دور میں جب فلمیں بن رہی ہوتی تھیں تو ان کی تشہیر کے لیے قلم ساز اپنی فلوں کے گانے ریڈیو پر نشر کرنے کے لیے فراہم کر دیا کرتے تھے۔ ”من کی آس“ کے ایسے ہی چند گیت۔

☆ من کی آس ہوئی نہ پوری۔ پیار کا پہنا ٹوٹ گیا (آواز۔ نور جہاں)

☆ مہنگی نفاذوں میں تو ہے صنم۔ اللہ قسم (آواز۔ غلام عباس، شازیہ)

اس قلم کی کاسٹ میں وحید مراد، نجمہ، غلام محی الدین، صبیحہ خانم، طالش، حنیف اور اسلم پرویز شامل تھے۔

”زینو“ بھی وحید مراد کی ایک نامکمل قلم تھی۔ اس کے قلم ساز نصیر ملک اور ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔ روٹی باؤ، وحید مراد کی ہیر و دن تھیں۔ جب کہ اس قلم کا دوسرا درمان خیر باہر شریف اور قوی خان کا تھا۔ صبیحہ خانم، سنتوش کمار اور اسلم پرویز اس قلم کے دیگر اہم کردار ادا کرنے والوں میں تھے۔ یہ ایک سوشل قلم تھی۔ مکمل ہو جاتی تو قوی امکان تھا کہ کامیاب بھی ہوتی۔

متذکرہ بالا فلوں کے علاوہ وحید مراد کی اور بھی فلمیں ہیں جو 30 فیصد، 40 فیصد اور 45 فیصد تک بنی ہوئی ہیں جب کہ چند فلمیں ایسی بھی ہیں جن کا تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا۔ ان کی مزید نامکمل فلوں میں، میں نے کیا جرم کیا؟ اُمید، اب کیا ہوگا، بات اک رات کی (جس میں ریشماں ان کی ہیر و دن تھیں) ”دہن ایک رات کی“ (جس میں شیم آراء ان کی ہیر و دن تھیں) ہدایت کار پرویز اختر کی فلمیں برسات،

واضح ثبوت نہیں کہ انہیں ہم سے پچھڑے 33 سال ہو گئے ہیں پھر بھی ان کے لاکھوں چاہنے والے انہیں اب تک بھلا نہیں پاتے ہیں۔ ان گنت لوگوں کے دلوں میں وہ آج بھی دھڑکن بن کر دھڑکتے ہیں۔

بات وحید مراد کی پسندیدگی اور چاہے جانے کی چل نکلی ہے تو اس سلسلے میں کچھ دلچسپ اور غیر معمولی واقعات و حالات بیان کرنے کو بھی چاہتا ہے۔ یہ باتیں اس دور کی ہیں۔ جب آتش جوان تھا۔ ہمارا خوبرو ہیرو و شہرت اور مقبولیت کے آسمان پر جنگ مار رہا تھا۔

1971ء کی بات ہے (سکو (روس) میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا انعقاد ہوا تو اس فلمی میلے میں پاکستان سے وحید مراد، محمد علی، زبیرا وغیرہ نے شرکت کی۔ پاکستانی فلمی صنعت کی نمائندگی کرنے والے اس وفد کی جہاں بڑی آؤ بھگت کی گئی وہاں ایک روسی اداکارہ آئری شیلیف نے وحید مراد کو دیکھا تو اس کا حال یہ تھا کہ ساغر کبیر سے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ پہلی نظر میں ہی وہ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ فلمی میلے میں وحید مراد کی فلم ”ارمان“ دکھائی گئی تو اس سے متاثر ہو کر کئی روسی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے وحید مراد کو اپنی فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی جب کہ دوسری طرف روسی اداکارہ آئری شیلیف وحید مراد کے گلے پڑ گئی۔

”مگر میڈم! میں آپ کو اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی میں نے گھر بھی جانا ہے۔“

مگر اس نادان خاتون پر وحید مراد کے کلام نرم و نازک کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ وحید کے ساتھ پاکستان آنے پر بضد ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے وحید مراد نے اس سے جان چھڑائی اور روسی فلم سازوں سے بھی معذرت کی کہ میرے لیے پاکستانی فلمیں ہی کافی ہیں۔ وفد کے دیگر ممبران نے جن میں کچھ سرکاری عہدے دار بھی تھے۔ انہوں نے پاکستان واپس آنے کے بعد بتایا۔ ”وحید مراد صاحب یہاں اپنے ملک میں ہی خواتین کی دیوانگی کا سبب بنیں بیٹے ہیں۔ بیرون ملک بھی انہیں دیکھنے والی لڑکیاں اور خواتین دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کی گردیدہ ہو جاتی ہیں۔“

لڑکیوں کی دیوانگی کا ایک واقعہ 1974ء میں بھی منظر عام پر آیا۔ پنجاب یونیورسٹی کیمپس کی چندہ میں خوبرو

جو 125 فلمیں نمائش پذیر ہوئی ہیں ان میں بھی ان کا اداکارانہ فن عروج پر نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ان کی کچھ فلمیں ناکام بھی ہوئیں لیکن ان کا فن ان فلموں کی ناکامیوں سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوا۔ وہ ہر فلم میں فن کا ایک ایسا گل کھلا گئے جس کی خوشبو آج تک لوگوں کی سانسوں اور ذہنوں میں اسی طرح بسی ہوئی ہے جسے کوئی فراموش کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ فن کی اصل معراج یہی ہے کہ وہ ہمیشہ قائم و دائم رہے۔

فن کو جلا بخشنے والا وحید مراد اپنی ذات کی جنگ میں بھلے ہی شکست کھا گیا ہو لیکن فن کے ہاتھوں کبھی مغلوب نہیں ہوا۔ 1982ء تک ہر سال اس کی فلمیں اسی اوسط سے ریلیز ہوتی رہیں جو ان کے ابتدائی سالوں سے چلتا آرہا تھا۔ یہ محض غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈہ تھا کہ وحید مراد اپنے فنی کیریئر کے آخری چند برسوں میں فن کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اگر ہم ان کے آخری پانچ سالوں کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ مفاد پرستوں نے ان کے خلاف کتنی ٹھکانڈنی سازش کی تاکہ یہ عظیم فنکار فن کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کر کے اپنی موت آپ مر جائے۔

1979ء میں وحید مراد کی 7 فلمیں ریلیز ہوئیں جب کہ محمد علی کی 11 اور ندیم کی صرف 2 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ 1980ء میں جو ہماری فلمی صنعت کا بہرانی سال تھا۔ وحید مراد نے 5 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے ان کے برعکس ندیم کی 7 اور محمد علی کی صرف 2 فلمیں ریلیز ہو سکیں۔ 1981ء میں وحید مراد کی 9 فلمیں منظر عام پر آئیں۔ محمد علی کی گیارہ فلمیں جب کہ ندیم کی صرف تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ 1982ء میں وحید مراد کی سب سے کم یعنی صرف تین فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جب کہ محمد علی کی چھ اور ندیم کی آٹھ فلمیں اسکرین کی زینت بنیں۔

اس تخمینے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فلموں کی کسی بیشی کا شکار صرف وحید مراد ہی نہیں رہے۔ ہر بڑے فنکار کو اس نازک مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اپنے آخری برسوں میں وحید مراد فلموں کے حوالے سے سپہری کا شکار ہو گئے تھے۔

ان کی ذات بات کو ان کے فن سے منسوب کرنے والے نہ صرف ان کے فن کی بے قدری کر رہے ہیں بلکہ احقوں کی جنت میں رچے ہیں۔ وہ بھلا فن کے ہاتھوں کیسے شکست کھا سکتا ہے؟ کیا یہ امر وحید مراد کے فن کی عظمت کا

شہنشاہِ رومانس، ڈاکو کے روپ میں

وحید مراد پر میٹر کے واحد ہیرو ہیں جنہوں نے ایک ہی سال میں مسلسل تین فلموں میں ڈبل رول کیے ہیں۔ جن میں بل ایشین، ناگ منی، دولت اور دنیا شامل ہیں۔ دولت اور دنیا میں وحید نے پہلی بار ڈاکو کا رول کیا۔ بل ازیں وہ خالصتاً رومانس کے شہزادے کے طور پر فلموں میں نظر آتے تھے۔ اس مختلف کردار میں بھی وحید نے ناظرین کو متاثر کیا۔ اس کردار میں وہ پینٹ اور شرٹ میں بلیوئس نظر آئے جب کہ ہماری فلموں کے ڈاکو لانا کرتا یا شلواریس میں دکھائے جاتے تھے۔ اس فلم میں ان کا ایک رول ڈاکو تھا تو دوسرا مصور کا۔ ڈاکو کے کردار میں انہوں نے لازوال کردار نگاری کی اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہر رنگ میں اپنی اداکاری کا جوہر دکھا سکتے ہیں۔ اس فلم کی سپر ہٹ کامیابی کو صرف اور صرف وحید مراد کی پرفارمنس قرار دیا گیا کیونکہ اس فلم کے ہدایت کار خلیفہ سعید احمد کی اردو فلموں میں کوئی ویڈیو نہیں تھی جب کہ اس کی دونوں ہیروئیں عالیہ اور روزینہ دوسرے درجہ کی اداکارائیں تھیں۔

### چاہت کا ایک انداز

وحید مراد کے چاہنے والوں میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وحید مراد کے انتقال کے بعد پشاور سے روینہ خان نامی ایک خاتون ایک بڑی سی گاڑی میں اپنے چار گارڈز کے ہمراہ ہر جمعرات کو ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کرتے ہوئے گلبرگ III وحید مراد کی قبر پر حاضری دینے آتی ہے پھولوں کی چادر چڑھاتی ہے فاتحہ پڑھتی ہے اور واپس پشاور لوٹ جاتی ہے۔

### مشاہیر شعراء کا کلام اور وحید کی فلمیں

وحید مراد کی فلموں کو ایک اعزاز یہ بھی حاصل رہا ہے کہ اردو ادب کے نامور شاعروں کا کلام ان میں شامل کیا گیا۔ جن میں اختر شیرانی (فلم جان آرزو)، احسان دانش (تم ہی ہو محبوب میرے)، شان الحق حقی (پھر چاند نکلے گا)، فیض احمد فیض (چاند سورج)، داغ دیلوی (جاگ اٹھا انسان، گونجی شہنائی)، آغا شمس کاشمیری (کنیز)، معین احسن جرنی (چاند سورج) قابل ذکر ہیں۔

لڑکیاں وحید مراد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کلاس روم سے غائب رہنے لگیں۔ جب پرنسپل صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے اس کا سخت نوٹس لیتے ہوئے ان لڑکیوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا۔ یہ پرنسپل صاحب جن کا نام رؤف قریشی تھا صحافت سے بھی انہیں شوق تھا۔ انہی دنوں انہوں نے ”اخبار جہاں“ کراچی کے لیے وحید مراد سے انٹرویو کرتے ہوئے کہا۔ ”وحید صاحب! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی مقبولیت کا جادو آج کی لڑکیوں کا مستقبل تباہ کر رہا ہے۔“

وحید مراد کے استفسار پر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ان لڑکیوں کی حرکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس جرم میں وہ یونیورسٹی سے نکال دی گئی ہیں۔

اس پر وحید مراد نے جواب دیا۔ ”جن میری بہنوں نے ایسا کیا بہت برا کیا۔ یہ حرکت اچھی نہیں۔ کلاس روم سے غائب ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ میں آپ کے توسط سے ایسی لڑکیوں تک اپنا یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا را آئندہ کوئی لڑکی ایسے جرم کی مرتب ہو کر اپنی تعلیم کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے ایسے عمل سے ان کے خاندان کی بدنامی اور ان کے مستقبل پر داغ لگ جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کی اس دیوانگی نے مجھے ایک فلمی ہیرو کے طور پر نہیں ایک برے اور ناکردہ گناہ کا مجرم بنا دیا ہے۔“

اس کے بعد انہوں نے رؤف قریشی صاحب سے کہا۔ ”میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ان نادان لڑکیوں کو معاف کر کے یونیورسٹی میں انہیں پھر سے داخلہ دلوا دیں۔“

”میں آپ کی باتوں اور آپ کے اخلاق و آداب سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔“ قریشی صاحب بولے۔ ”اور اب مجھ پر یہ راز عیاں ہوا کہ آپ کی پرسنالٹی ہی کچھ ایسی ہے کہ جو آپ کو دیکھ لے وہ آپ کا بن جائے۔“

نامور مصنف، ڈائریکٹر اور صحافی علی سفیان آفاقی نے ایک بار وحید مراد کی باتیں کرتے ہوئے لکھا تھا۔

1969ء کی بات ہے۔ میں ناظم آباد کراچی میں اپنے عزیزوں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی فیملی بالخصوص خواتین شام کو تیار ہو کر اپنے شوہروں کے ساتھ باہر چلی جاتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ایک عزیز سے پوچھ بیٹھا۔ ”آپ لوگ اکثر شام کو باہر کیوں چلے جاتے ہیں۔ کیا کسی خاص کام کے لیے جاتے ہیں یا سیر و تفریح کے

لیے؟“

وہ صاحب بولے۔ ”آفاقی صاحب! آپ سے کیا پردہ ہم لوگ شام کو وحید مراد کی قلم ”عندلیب“ دیکھنے چلے جاتے ہیں۔“

”اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ واقعی وحید مراد کو دیوانہ وار چاہتے ہیں۔“ آفاقی صاحب کا کہنا ہے۔ ”وحید مراد جیسا کہ ریز پاکستان بھر میں کسی اور قلمی ہیرو کو نڈل سکا۔“ کوئی کسی کو خواہ مخواہ نہیں چاہتا۔ کوئی خاص بات ہوتی ہے جب ہی اس کے حوالے سے وہ چاہا جاتا ہے۔ وحید مراد کی پاپولینٹری کا ایک واقعہ یہ بھی ہے۔

22 فروری 1974ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں پاکستان میں اسلامی سربراہی کا نفرنس ہوئی تھی جس میں یاسر عرفات، شاہ فیصل، کرنل قذافی، عیدی امین، سلطان قابوس، انور سادات، شیخ مجیب الرحمن اور شاہ ایران جیسے اسلامی ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی تھی۔ لاہور کے اسمبلی ہال میں جب اسلامی سربراہان کو عشاءِ یہ دیا گیا تھا تو ہماری قلم انڈسٹری کی کئی معروف شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن میں وحید مراد، محمد علی، ندیم، زبیر، نور جہاں، مہدی حسن، آفاقی اسے کل، حسن طارق، سیف الدین سیف، سنوٹوش کار، صبیحہ خانم، رانی اور شبنم قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر سیف الدین سیف، محمد علی اور وحید مراد نے تقریریں بھی کیں۔ اس موقع پر وحید مراد نے انگلش اور عربی زبان میں تقریر کی تو حاضرین ششدر رہ گئے۔ وحید مراد انگریزی کی طرح عربی بھی بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ ان کے بہت سے قریبی ساتھیوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ وحید مراد عربی زبان سے بھی اس قدر آشنا ہیں کہ روانی سے عربی میں بھی تقریر کر سکتے ہیں۔ اگلے روز بہت سے اخباروں اور جریڈوں میں خبر کی صورت میں وحید مراد کی اس خاص خوبی کا ذکر کیا گیا تھا۔

وحید مراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں انگریزی اور عربی کے علاوہ بھی کئی غیر ملکی زبانیں آتی تھیں۔ انہوں نے اپنی طالب علمی کے دور اور اس کے بعد بھی فرصت کے اوقات میں کئی غیر ملکی زبانیں سیکھی تھیں۔

وحید مراد کی عوامی مقبولیت کا ایک اور واقعہ بھی آپ سے شیئر کروں گا۔ مئی 1975ء کو قلم کے کچھ تنقید اور پڑھے لکھے لوگوں نے قلموں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی عریانی اور فحاشی کے خلاف احتجاجی ریلی نکالی تھی۔ یہ وہ دور

تھا جب ہماری قلمی صنعت میں کچھ نااہل اور ناکرشن لوگ قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے قلموں کو عریانی اور فحاشی کے زور پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ سرکاری طور پر بھی شاید ان دنوں ان پر ہولا ہاتھ رکھا جا رہا تھا۔ اس لیے سنیما گھروں میں بھی پاکستانی قلموں سے پہلے بعد میں یاد درمیان میں غیر ملکی بلیو قلموں کے ٹوٹے دکھائے جاتے تھے۔ یہ احتجاجی ریلی اسی کے خلاف نکالی گئی تھی۔ اس ریلی میں قلم انڈسٹری کے نامور قلمی لوگ شامل تھے۔ یہ سارے قلمی لوگ مختلف ٹرکوں پر سوار ہو کر لاہور کے اسمبلی ہال سے لکشی چوک تک پکڑ لگا کر اور فحاشی اور عریانی کو روکنے کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس موقع پر دیکھنے والی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ دیگر ٹرکوں کے مقابلے میں اس ٹرک پر لاہوریوں کی خصوصی توجہ مرکوز تھی جس پر وحید مراد سوار تھے۔ اس پر عوام کی جانب سے گل پاشی کی جارہی تھی اور وحید مراد زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اس موقع پر خواہش مند حضرات کی جانب سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا تھا۔

”وحید مراد! ہمیں اتنا پیدار کر دو۔“

مجبور ہو کر وحید مراد کو ٹرک سے نکل کر اپنے چاہنے والوں کے درمیان آنا پڑا۔ ان کے پرستاروں نے انہیں پھولوں سے لا دیا۔ وحید مراد نے ان سے کہا۔ ”اگر آپ لوگ حقیقی معنوں میں مجھ سے پیار کرتے ہیں تو میرے سامنے وعدہ کیجئے کہ سنیما گھر میں گندی، بے ہودہ اور بلیو فلمیں نہیں دیکھیں گے۔“

لاہوریوں نے ان سے وعدہ کیا۔ ”وحید مراد! ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ نہ صرف ہم سنیما گھروں میں ایسی فلمیں نہیں دیکھیں گے بلکہ عریانی اور فحاشی کا پرچار کرنے والے سنیما گھروں کو بھی پس نہیں کر دیں گے۔“

وحید مراد نے کہا۔ ”دیکھو دوستو! پہلے انہیں شرافت سے سمجھانا کہ یہ گندہ کھیل تماشا بند کرو۔ اس پر وہ رضامند ہو جائیں تو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچانا اگر آپ لوگوں کی بات نہ مانیں اور ضد کریں اور اپنی حرکت سے باز نہ آئیں تب ان کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا۔“

وحید مراد کے پرستاروں نے ایسا ہی کیا اور ان کے ڈرانے دھمکانے پر سنیما گھروں میں بلیو قلموں کا تماشا دکھانا بند کر دیا گیا۔

وحید مراد کے چاہنے والوں میں نوجوان ہی پیش پیش نہیں تھے۔ بڑی عمر کے اور بزرگ حضرات بھی انہیں عزت

پناہ۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہی وہ اندر آ سکے اور ان سے میری ملاقات آخر ہو ہی گئی اور یوں میں نے اپنے خوابوں کے شہزادے کو پہلی بار دیکھا۔ ان سے منکلام ہوئی اور آج ایک طویل عرصے کے بعد بھی ان لکھوں کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔“

کیسی عجیب بات ہے کہ وحید مراد کو اگر ایک طرف لاکھوں لوگ پیار محبت سے یاد کرتے ہیں تو دوسری طرف آج بھی ایک طبقہ ایک مخصوص طبقہ ان کی موت کے بعد بھی ان پر تنقید کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ان کی زندگی میں ایسا ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ان پر تنقید کر کے اپنا قد بڑا کرتے تھے اور ان کی موت کے بعد آج بھی ایسے افراد موجود ہیں جو ان کی ذات اور ان کے فن میں کیڑے نکال کر ان کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جسے اللہ رب العزت نے عزت دی ہو اسے کون ماندر سکتا ہے۔ وہ ایک بے ضرر اور اخلاص و محبت کی مٹی سے گوندھے ہوئے پیکر تھے۔ اس لیے اپنی زندگی میں بھی ایسے لوگوں کو کچھ نہیں کہا۔ کبھی منفی جذبات کے شکار نہیں ہوئے اور اب جب وہ اس دنیا میں نہیں، ان کے چاہنے والے لوگ بھی ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگتے۔ قدرت کی طرف سے انہیں یہ بتا اور دکھا دیا جاتا ہے کہ وہ حقیقتاً ایک اچھا اور نیک انسان تھا اس لیے چوتھائی صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد زندہ ہے بے شمار لوگوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر اب بھی دھڑکتا ہے۔

دنیا نے فلم کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو ایسی کوئی دوسری مثال نہیں مل پائے گی کہ کسی اداکار کی برسی اس کے مداح اس قدر شان و شوکت اور عقیدت و احترام سے مناتے ہوں۔

گزرتے وقت کے ساتھ حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ پہلی تاریخ سے چودھ تاریخ تک چاند چڑھتا ہے۔ پھر پندرہ تاریخ سے گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی زندگی میں بھی ایسا اتار چڑھاؤ آتا ہے۔ وحید مراد کی شہرت اور مقبولیت کا سورج نصف النہار میں چمکتا تھا، آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا اور اس کے لیے پریشانی کا سبب بننا چلا گیا۔ مصنف، ہدایت کار اور صحافی شوکت ہاشمی اس دور کی روداد کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

”وحید مراد کی اوپر تلے اتنی فلمیں قلاب ہو گئیں کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ مالی پریشانی تو نہیں تھی لیکن

واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

معروف فلم پروڈیوسر چوہدری محمد سلیم کے فرزند محمد حسین چوہدری بتاتے ہیں کہ میرے والد 1960ء سے فلم پروڈکشن سے وابستہ تھے۔ ان کی مشہور فلموں میں من موچی، آج اور ابھی، سانول، ماجھو، لکھاں وغیرہ شامل ہیں والد مرحوم کے دفتر (ایورینو اسٹوڈیو) میں فلمی لوگوں کا جھکا لگا رہتا تھا۔ ظاہری بات ہے فلمی لوگ تھے فلمی لوگوں ہی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ والد صاحب وحید مراد سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ دفتر میں اگر کسی سے یہ غلطی ہو جاتی کہ غلطی سے بھی وحید مراد صاحب کی شخصیت یا فن پر کوئی تنقید کرتا تو اسے مارنے کے لیے اپنا جوتا اٹھا لیا کرتے تھے اور کہتے۔ ”پہلے خود کو اس قابل تو بنا کہ تو کس عظیم آدمی کا نام لے رہا ہے۔“

والد صاحب ہم سب سے کہتے۔ ”وہ درویش مفت انسان ہے۔ میں نے رات کے پچھلے پہر میں بارگاہی میں اسے تہجد کی نماز پڑھتے اور گزرا کر روتے ہوئے عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ تو کوئی عجیب ہی دنیا کا بندہ ہے۔“

والد صاحب سے اگر کوئی یہ کہتا۔ ”آپ اگر وحید مراد کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں تو انہیں اپنی فلموں میں ہیرو کیوں نہیں لیتے؟“

والد صاحب جواب دیتے۔ ”وہ جس کلاس کا آرٹسٹ ہے اس لیول کا ہمارے ہاں کوئی ڈائریکٹر ہی نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں بھی اوروں کی طرح اسے ضائع کروں۔ کم از کم جو میرے دل میں ان کے لیے احترام اور ان کی شخصیت کا خا کہ ہے وہ تو قائم رہے۔“

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ فلمی فنکاروں کے پرستار عام لوگ اور ناچنے ذہن کے افراد ہوتے ہیں۔ سنجیدہ لوگ پرستاری کے چکر میں نہیں پڑتے مگر مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ معروف ڈراما نگار سیما غزل وحید مراد کی پرستاروں میں تھیں۔ اس بارے میں ان کی ہی زبانی ان کی کہانی سنئے۔

”جب میں ریڈیو سے منسلک تھی تو میری یہ خواہش تھی کہ میں اپنے نمونہ ہیرو وحید مراد کو کبھی دیکھ سکوں۔ ان سے بات کروں۔ ان سے آؤ گراف لوں۔ آخر کار ایک دن میری یہ حسرت پوری ہو گئی۔ جب وہ ریڈیو پاکستان کی دعوت پر ریڈیو کے مہمان بنے۔ ان کا انٹرویو ریکارڈ ہوتا تھا لیکن ریڈیو انجینئرز کے باہر عوام کا اس قدر جم غیر تھا کہ خدا کی



اسٹوڈیو نہیں آنا چاہیے تھا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”اس سے تمہاری ویلیو براثر پڑے گا۔“

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اس کے بعد بولا۔ ”اب بھی نہیں کون لے رہا ہے ہاشمی صاحب۔ اب تو ہم عبرت کا نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ سوچتا ہوں اب اپنی ہی فلم شروع کروں۔“

اس رات گھر آکر میں بہت دیر تک وحید کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے فلمی کیریئر کا آغاز اور انجام دونوں میرے سامنے تھے۔ وقت کا نشتر بھی کتابے رحم ہوتا ہے۔ دلوں پر کیسے کیسے گھاؤ ڈالتا ہے جو کسی مرہم سے مندرل نہیں ہوتے۔

وحید مراد کی خواہش کے مطابق ان کی آخری ذاتی فلم ”ہیرو“ بنی مگر اس کی کامیابی یا ناکامی انہیں خود دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ 11 جنوری 1985ء میں نمائش پذیر ہوئی جب کہ وہ 1983ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے۔

ان کی موت کے بعد ریلیز ہونے والی ان کی آخری فلم ”زلزلہ“ تھی جو 13 مارچ 1987ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ یعنی ان کی موت کے 5 سال بعد۔

وحید مراد کی زندگی میں زہر گھولنے والے گھر کے باہر کے لوگ ہی نہیں تھے گھر میں بھی موجود تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وحید مراد کے گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ محمد علی اور ندیم کے مقابلے میں وحید مراد کی گھریلو زندگی پرسکون اور خوشگوار نہیں تھی۔ ایک عالم جس شخص سے پیار کرتا تھا اس کی بیوی، اس کی شریک حیات اس سے خوش نہیں تھی۔

اب جب وحید مراد کے چاہنے والے انہیں وحید مراد کی شریک حیات ہونے کے حوالے سے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ انہیں ہر محفل اور ہر تقریب میں صدر محفل بتاتے ہیں تو یہنا سلٹی ٹیکم کو احساس ہوتا ہوگا کہ وہ ایک عظیم شخص تھا۔ اب وہ اس کی یاد میں چھپ چھپ کر روتی ہوں گی۔ تڑپتی بھی ہوں گی اور انہیں اس کی فلم ”دوراہا“ کا گیت یاد آتا ہوگا تو ان کی حالت دیدنی ہونی ہوگی۔ وحید مراد نے خود پر قلما ہوا یہ گیت کیا میرے ہی لیے گایا تھا وہ سوچتی ہوں گی اور باہمی بے آب کی طرح تڑپتی ہوں گی۔

مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو  
مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے

کاروباری اعتبار سے وہ ہیرو سے زبرد ہو گیا تھا۔ ہفتوں مہینوں اس کی کوئی شوٹنگ نہیں ہوتی تھی۔ وقت کاٹنے نہیں کٹتا تھا۔“

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وحید مراد بیمار ہے اور ڈیوس روڈ پر ایک کلینک میں داخل ہے۔ میں اس سے ملنے گیا وہ بستر پر لیٹا ہوا کوئی انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ میں نے میز پر پھل رکھے تو کہنے لگا۔ ”مجھے تو کچھ بھی کھانے کی اجازت نہیں۔ آپ ناحق لے آئے۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں بچوں کے کام آجائیں گے۔“

وحید مراد بچوں کے ذکر پر کچھ بولا نہیں، چپ رہا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے اس کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ تو کہنے لگا۔ ”ابھی تو ٹیسٹ ہو رہے ہیں شاید آپریشن ہوگا۔“

میں نے اسے تسلی دی مگر وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ شاید اس کے گھر کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ میاں بیوی کے درمیان جس قسم کی مفاہمت سے گھر بیتے ہیں اور زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ وہ شاید سلٹی اور وحید کے درمیان نہیں تھے۔ اس نے کچھ باتیں کیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شدید قسم کے ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس ڈپریشن کے وجوہات بہت سی تھیں۔ ایک سال قبل اس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے انتقال کی وجہ سے کراچی کا ڈسٹری بیوشن آفس بالکل بند ہو گیا تھا اس کی فلمی ساکھ اور ویلیو بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہر وقت گھر میں رہنے سے اس کی زندگی اجیرن بن گئی تھی اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

ایک ماہ بعد وحید صحت یاب ہو کر کلینک سے چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ آپریشن کے بغیر ٹھیک ہو گیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن دو ماہ بعد ایک روز وحید سے ایور نیو اسٹوڈیو کے باہر ملاقات ہوئی تو میرے قدموں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔ وہ بہت کمزور اور بہت دہلا ہوا چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اور شخص ہے جو وحید مراد سے تھوڑی مشابہت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم تو بالکل بدل گئے ہو وحید! تمہاری صحت تو ٹھیک ہے؟“

اس نے کہا۔ ”اب تو میں بہت بہتر ہوں شوکت صاحب۔ پہلے آپ مجھے دیکھتے تو پہچان نہ پاتے۔“  
”وحید! تمہیں مکمل طور پر صحت یاب ہونے اور اپنا کھویا ہوا رنگ روپ اور وزن حاصل کرنے سے پہلے تمہیں

### نادر معلومات

وحید مراد کے قومی شناختی کارڈ کا نمبر 32-G-39-158328 اور پتا مکان نمبر 32-G گلبرگ III لاہور ہے۔ شناختی علامت پشت پر کٹے کا نشان درج ہے۔ میٹرک سائنس، انتخابی مضامین طبیعیات و کیمیا، لازمی مضامین، انگریزی، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ اور عربی کے ساتھ اپریل 1954ء میں درجہ دوم میں پاس کیا۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی کی 18 مئی 1954ء کو جاری کردہ سند پر وحید مراد کی تاریخ پیدائش 2 اکتوبر 1938ء درج ہے۔ انہوں نے میٹرک کے سالانہ امتحان میں طبیعیات اور کیمیا کے مضامین میں اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔

### ایک خامی

وحید مراد کی جہاں بہت سارے روشن اور باعث فخر پہلو ہیں وہیں ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ وہ اپنے سارے کیریئر میں اولڈ کیریئر کرنے سے گریزاں رہے۔ یہی وہ خامی بھی جس نے انہیں بہت سامیچورا اور ناقابل فراموش کام کرنے سے باز رکھا۔

رشیدی نے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ میں ان کی اس تحریر کے کچھ اقتباسات پیش کر کے اس دغراش وقوع سے آپ کو باخبر کرنے کی کوشش کروں گا۔

”میں نگار کی آخری کاپی کی تکمیل میں مصروف تھا کہ ایک ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ جب فون کی کھنٹی کی بارنج چکی تو میں نے نہایت غصے سے ریسپونڈ اٹھایا۔ دوسری طرف سے سنگیتا کی آواز آئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”الیاس صاحب! میں لاہور سے بول رہی ہوں۔“

”بولو کیا بات ہے؟“

”میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ لاہور میں یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے کہ وحید مراد کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ آپ اس خبر کے بارے میں صحیح بتائیں کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کرے کہ یہ افواہ ہو۔“

میں نے جواب دیا۔ ”یہ سراسر افواہ ہے۔ وحید مراد کے کسی دشمن نے اڑائی ہوئی اگر یہ خبر خبر ہوئی تو مجھ تک ضرور پہنچتی۔“

میری بات سن کر سنگیتا نے خدا کا شکر ادا کیا اور فون

نہ جانے مجھے کیوں یقین ہو چلا ہے  
مرے پیار کو تم مٹا نہ سکو گے  
مری یاد ہو گی جدھر جاؤ گے تم  
کبھی غم نہ بن کر کبھی بن کے آنسو  
ترہتا مجھے ہر طرف پاؤ گے تم  
شع جو چلائی ہے میری وفانے  
بچھانا بھی چاہو بچھانا نہ سکو گے  
تبھی نام باتوں میں آیا جو میرا  
تو بے چین ہو ہو کے دل تھام لو گے  
کسی نے جو پوچھا سبب آنسوؤں کا  
بتانا بھی چاہو بتانا نہ سکو گے

انسان پر جب برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وحید مراد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب اس کی فلمیں یکے بعد دیگرے ناکام ہونے لگیں تو فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس سے کتنا شروع کر دیا۔ وہ سنگی سماجی جن کو لے کر اس نے ایک ٹیم بنائی تھی، انہوں نے بھی اس موقع پر کسی صورت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ پچھلے وہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی ڈیمانڈ پر کام کرتے رہے مگر اس برے وقت میں اس کے پاس آکر یہ نہیں کہا کہ وحید تم اپنی فلم بنادو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ اس کا پایا جو اس کا سب سے بڑا اور مخلص رہنما اور دوست تھا، اب وہ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ ہوتے تو شاید وہی اسے سنبھال لیتے۔ اس بھری دنیا میں اب اگر کوئی اس کے ساتھ تھا تو اس کی والدہ اور اس کا ننھا بیٹا عادل مراد تھا۔

سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام ہے کہ ایسے برے حالات میں جس کا جی جینے کو چاہتا ہے؟ ایسے میں ان کی کار کا حادثہ۔ ان کا چہرہ دشمنوں سے بد نما ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص ایسا اداکار ایسا ہیرو جس کی شکل و صورت کے ہزاروں نہیں لاکھوں فریفتہ ہوں، اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟ وہ اپنے چند بہی خواہوں کے مشورے پر اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانے کے لیے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کراچی چلے آئے۔ کراچی میں اب ان کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ لہذا ان کی منہ بولی بہن ممتاز مسز کرل ایوب اپنے گھر لے گئیں۔ جہاں وہ چند دنوں کے بعد مردہ حالت میں پائے گئے۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کی وفات حسرت آیات کی رودادفت روزہ نگار کے مالک و مدیر الیاس

”سو فیصد درست ہے۔“ اور پھر انہوں نے جلدی

میں فون بند کر دیا۔

اب میں نے اس خبر کی تصدیق کے لیے مختلف تقسیم کاروں کو فون کرنا شروع کر دیا لیکن جسے فون کیا اس کا فون انجیج ملا جس کے بعد میرا شبہ یقین میں بدلتا چلا گیا کہ شاید تقسیم کار اس سلسلے میں آپس میں بات کر رہے ہیں۔ بعد ازاں میں نے منظور صاحب کو دوبارہ فون کیا تو انہوں نے

کہا۔

”حتیش صاحب کو اس خبر کی مکمل طور پر تصدیق ہو گئی ہے۔“

اب اس خبر کی صداقت پر یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ لہذا میں نے نگار کے صفحہ اول کی ساری خبریں نکال کر ان کی جگہ وحید مراد کی موت کی ہیڈ لائن لگا دی اور وحید مراد کی پرانی فلموں کی تصویریں لگا دیں۔ اس شمارے میں وحید مراد کی موت کی پوری تفصیلات درج نہ ہو سکی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی نگار اپوارڈ کی تقریب جو 29 نومبر کو کراچی میں منعقد ہونے والی تھی اور جس کی خبر ہیڈ لائن کے طور پر شائع کی جا رہی تھی، اس تقریب کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد مجھے یہ جتنو ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی موت کی وجہ معلوم کی جائے۔ جس کے لیے سب سے پہلے اس کی قیام گاہ کا پتا چلانا تھا۔ لہذا میں نے اور روزانہ جنگ کراچی کے فلمی رپورٹر سلیم باسط نے وحید مراد کے ایک خاص دوست قادر موسانی، جن کی جیولری کی دکان ”حیرا پنا“ طارق روڈ پر ہے ان کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ ان کی دکان سے وحید مراد کی منہ بولی بہن سمر ممتاز کرنل ایوب کا پتا اور ان کا فون نمبر حاصل کیا۔ پھر کرنل صاحب کی کوٹھی پر بار بار فون کیا لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ کرنل صاحب کی کوٹھی جانا چاہیے۔ چنانچہ سلیم باسط کی کار میں ہم کرنل ایوب کی کوٹھی کی تلاش میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف چل پڑے۔ ہمیں کوٹھی کا نمبر بتایا گیا تھا وہ غلط تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی تک دو دو کے بعد بھی ہمیں وہ کوٹھی نہ ملی۔ کوٹھی کے ٹیلی فون نمبر پر بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ لہذا ہم واپس ہو کر دفتر واپس آ گئے۔

میں نے سلیم باسط سے کہا۔ ”مرحوم کے بچا اور اس کی والدہ اگر لاہور میں میم ہیں تو اس کی میت دھنیا لاہور بھیجی

بند کر دیا۔

چند منٹ بعد ہی یاسین گورپچہ صاحب کا لاہور سے فون آ گیا۔ انہوں نے بھی مجھ سے وہی سوال کیا جو سنگیتا نے پوچھا تھا۔ میں نے یاسین گورپچہ کو بھی وہی جواب دیا جو سنگیتا کو دیا تھا۔ گورپچہ نے میری بات پر یقین کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میں نے نگار کے اسٹاف صلاح الدین پراچہ سے کہا۔ ”لاہور سے دو فون سنگیتا اور یاسین گورپچہ کے آئے ہیں کہ کیا وحید مراد کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ ایک تردیدی نوٹ بنیادیں کہ یہ حیران فواہ ہے۔“

پراچہ صاحب نے فوراً ہی نہ صرف تردیدی خبر لکھ دی بلکہ اس کی کتابت بھی کرادی۔ اس دوران گورپچہ صاحب کا دوبارہ فون آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”الیاس بھائی! کراچی میں جہاں وحید مراد مقیم تھے وہاں سے وحید کے چچا سلیم مراد جولاہور میں فلم تقسیم کار ہیں کو فون پر وحید مراد کی حرکت قلب بند ہونے کی خبر تکرم ہو گئی ہے۔ آپ ہیں کہ اتنی اہم خبر کراچی میں رہتے ہوئے بھی اسے افواہ سے تعبیر کر رہے ہیں۔“

یاسین گورپچہ کی زبان سے یہ خبر سن کر جو اس قدر وثوق سے کہہ رہے تھے مجھے بھی احساس ہوا کہ وحید مراد کی موت کی خبر درست ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے پراچہ صاحب کے ساتھ اپنے صاحبزادے اسلم الیاس کو وحید مراد کے ذاتی قلیٹ جہاں وہ اکثر کراچی میں اقامت پذیر ہوا کرتے تھے بھیجا۔ قلیٹ پر فون بھی کیا لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ جب مجھے بھی فکر لاحق ہوئی کہ کسی کار سیور نہ اٹھانا چہ معنی دارد؟ چنانچہ میں نے نگار کی آخری کاپی چھپنے کے لیے پریس نہیں بھیجی۔

کچھ دیر کے بعد پراچہ اور اسلم الیاس بھی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وحید مراد کے قلیٹ کے چوکیدار نے بتایا ہے کہ وحید صاحب دو روز پہلے قلیٹ چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر چلے گئے تھے چوکیدار سے جب ان کی بہن کا پتا معلوم کیا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

اسی دوران ایور ریڈی پکچرز کراچی کے جنرل میجر منظور صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ ”وحید مراد کی خبر آپ نے سن لی ہوگی؟“

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا اس کی موت کی خبر درست ہے؟“

بتایا۔ ”لاہور جانے کے لیے وحید مراد کا ایک تابوت ضرور بک کرایا گیا ہے مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کون وحید مراد ہے۔“

”ارے صاحب! یہ پاکستانی قلموں کا چاکلیٹی ہیرو وحید مراد ہے۔“

”اوہ!“ اس نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا اور کہا، ہمیں تو بس یہ بتایا گیا کہ تابوت میں وحید مراد کی میت ہے۔“ اس کے بعد ہم لوگ بڑی شدت اور بے چینی سے میت کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ سو اسات بچے ہمیں ایک سوز کی آتی ہوئی نظر آئی۔ ہم نے اس پر کوئی توجہ نہ دی مگر جب وہ ہمارے سامنے سے گزرتی ہوئی کار کو گری طرف جانے لگی تو اچانک میری نظر سوز کی میں رکھے ہوئے تابوت پر پڑی۔ تابوت کا ایک حصہ سوز کی سے نکلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم لوگ سمجھ گئے کہ یہ تابوت وحید مراد ہی کا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ دوڑتے ہوئے سوز کی کے قریب پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ اس سوز کی میں اگلی نشست پر صرف ایک ڈرائیور بیٹھا ہے۔ آگے گئے تو ایک اور آدمی بھی نظر آیا پتا نہیں وہ ڈرائیور کا مہلر تھا یا تابوت کو کھول کر دکھانے والا

جائے گی یا پھر اس کے رشتے دار کراچی آکر اس کی تدفین کریں گے۔ لہذا لاہور سے رابطہ کر کے اصل صورت حال کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔

سلیم باس نے میری بات سے اتفاق کیا۔ میں نے لاہور میں روبین گوٹھ کو فون کر کے اس بارے میں پوچھا۔ روبین نے کہا۔ ”میں ابھی ابھی وحید مراد کی کوٹھی سے واپس آیا ہوں۔ مجھے وہاں پتا چلا کہ رات 8 بجے کی فلائٹ سے وحید کی میت روانہ کی جائے گی اور ساڑھے نو بجے تک یہاں پہنچ جائے گی۔“

اس اطلاع کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ کہیں اور جا کر وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں ایئر پورٹ جانا چاہیے۔ لہذا ہم دونوں صلاح الدین پراچہ، رضوان حیدر برنی، ذیشان صدیقی اور اسلم الیاس کو ساتھ لے کر ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے کے بعد سی این بی ایس کے سربراہ سعید الظفر اور کچھ دیگر ایڈیٹرز ایئر پورٹ تازنگ کے زاپشیر ازبکی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔

سب سے پہلے ہم لوگ پی آئی اے کے کارگوانہ خارج سے ملے۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ انہوں نے

### ذرا سی بات

زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی بات کسی کی بھیئت بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر

ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک پر فکر داستان

سنانجہ تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے ربطات کی تفریق کیے بغیر صرف بڑے اور منفرد کام کرنے والوں کو اپنے اوراق پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی صفحات پر علی اختر کی ایک چونکا دینے والی دلنشین تحریر

باغی مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی.....

خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تھقہ

وقت اکثر لحاظ پر لگا کر اڑ جاتے ہیں مگر..... کچھ سونا تیش بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ حسام بٹ کے قلم کی روانی

ستمبر 2017ء کا تقریباً ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینسٹس



مزید

خلو طرکی جملہ  
مصلح شہر فخر

اور

مرزا امجد علی گاہ جنگ اولاد

اس کے علاوہ

منظر امامہ تنویر ریاض، سلیم انور، محمد الیاس، ثمر عباس اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

اور پھر بند کرنے والا تھا۔

وحید مراد کی لاش کو اس طرح بے یار و مددگار دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ آہ! پاکستان کا ایسا نامور فنکار اور صاحب ثروت شخص اور اس کسمپرسی کی حالت میں اس کی میت لاہور بھیجی جا رہی ہے جیسے اس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ اس وقت سب ہی لوگ دل گرفتہ تھے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈرائیور سے پوچھا۔ ”تمہارے ساتھ کسی اور نے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟“

”صاحب! ہم کو ایک صاحب نے اتنا ہی کہا تھا کہ تم ایئر پورٹ پہنچو، ہم تمہارے پیچھے اپنی کار میں آرہے ہیں۔“ یہ سوچ کر غم و الم سے میرے آنسو چمک پڑے کہ کراچی کا وہ شہزادہ جو کل تک قیمتی کاروں میں کراچی کی سڑکوں پر گھومتا تھا۔ آج اس کی میت ایک کرائے کی سوزوکی پر رکھ کر لائی گئی ہے۔ اس سوزوکی میں نہ وحید مراد کا کوئی دوست تھا، نہ کوئی اور۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی منہ یولی بہن خود بھائی کے تابوت کے ساتھ ہوئی۔

ذرا دیر بعد تابوت کو سوزوکی سے نکال کر سامان تولنے والی مشین پر رکھ دیا گیا۔ وزن کرنے کے بعد تابوت کو کھول کر پی آئی اے کارگو کے عمل کو دکھایا گیا کہ اندر واقعی لاش ہے یا کوئی اور چیز۔ اس کے بعد ڈرائیور کے ساتھ آنے والے نے تابوت میں ٹکیلیں ٹھوک کر تابوت بند کر دیا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا۔ ”وحید مراد کی میت کو غسل بھی دیا گیا۔ اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی گئی یا نہیں؟“ دونوں بیک زبان ہوئے۔ ”ہم نے تو وہاں نہ کسی غسل دینے والے کو دیکھا نہ ہی کسی نے جنازے کی نماز پڑھوائی۔“

میں نے وہاں موجود تمام ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر اس غریب کو کراچی میں کسی نے غسل نہیں کرایا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تو دوستو! ہم ہی کم از کم اس کے لیے فاتحہ خوانی کر دیں۔“

چنانچہ وزن کے کانٹے پر رکھے ہوئے تابوت کے قریب پہنچ کر ہم سب نے فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد پی آئی اے کے عملہ تابوت کو جہاز کی طرف لے گیا۔

چند منٹ بعد دیکھا کہ وحید مراد کی منہ یولی بہن ممتاز کے شوہر ریٹائرڈ کرنل ایوب اور وحید کے دوست قادر موسانی پی آئی اے کارگو آفس تشریف لے آئے اور پوچھنے لگے۔ ”تابوت کو جہاز پر سوار کر دیا گیا یا نہیں؟“

”ابھی ابھی جہاز پر بھیجا گیا ہے۔“

کرنل ایوب سے تو میں واقف نہیں تھا البتہ قادر موسانی سے واقف تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”قادر صاحب! اصل بات تو بتاؤ کہ وحید مراد کی موت اچانک کیسے واقع ہو گئی؟“

قادر موسانی بولے۔ ”میں اپنے کام کی وجہ سے دو ایک روز سے وحید سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ تین چار روز قبل وحید اپنے بیٹے کی سالگرہ کے لیے کافی سامان خرید کر میری دکان پر رکھ گیا تھا۔ میں نے اس سے ازرہ مذاق کیا۔ ”تم پہلے تو جی اتنا سامان نہیں خرید کر تے تھے۔ اس بار بہت مال خرچ کر رہے ہو۔“

”پتا نہیں آجندہ سال تک زندہ بھی رہتا ہوں یا نہیں، اس لیے اس سال دل بھر کر تجھے تحائف لایا ہوں۔ خوب دھوم دھام سے بچے کی سالگرہ مناؤں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

قادر موسانی نے بتایا۔ ”جس روز وحید مراد کا ہارٹ فیل ہوا، صبح ساڑھے 10 بجے کے قریب وحید مراد کی منہ یولی بہن ممتاز میرے پاس آئیں۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”وحید کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ آپ جلدی چلیں۔“

میں ممتاز کے ہمراہ ان کی.... ڈیفنس سوسائٹی پہنچا۔ جب میں اوپر گیا، جہاں وحید کا بیڈروم تھا تو میں نے دیکھا۔ وہ بچلی کے سوچ بوڑھے کے پاس دیوار کے سہارے گرا ہوا ہے۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بالکل زرد تھا۔ نبض دیکھی وہ بالکل بھی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے ممتاز سے کہا۔ ”شاید وحید مراد کا انتقال ہو چکا ہے۔“

ممتاز نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد موت کی تصدیق کر دی۔

میں نے قادر موسانی کی زبانی وحید مراد کی موت کی کہانی سننے کے بعد کہا۔ ”تم تمام ڈسٹری بیوٹرز کو جاننے ہو۔ میرے دفتر کا بھی تمہیں علم ہے۔ اتفاقاً حادثہ ہو گیا اور تم نے اس کی کسی کو اطلاع نہیں دی۔ تم کسی کو فون ہی کر دیتے۔“ قادر موسانی نے جواب دیا۔ ”اس کو بھی کا فون ہی

خراب ہے۔ دوسرے سب ہم پریشان تھے۔“ ”اس کو بھی کا فون خراب تھا تو ڈیفنس کی کسی بھی کوشی سے فون کر دیتے۔ وہاں تو ہر گھر میں فون ہے اور بیچ پٹکھوا دیتے۔ کم از کم کچھ لوگوں کو تو علم ہو جاتا اور وہ وہاں اس کا



## مونگ پھلی

مونگ پھلی ایک لذیذ میوہ ہے۔ یہ موسم سرما میں کھائی جاتی ہے۔ یہ ستامیوہ ہے۔ غریب آدمی بھی آسانی سے خرید سکتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں لحاف میں بیٹھ کر اس کا کھانا بہت لطف دیتا ہے۔ مونگ پھلی آپ جتنی بھی کھالیں، اس کی چکنائی سے کوئٹھنرول نہیں بڑھے گا۔ اسے خالی پیٹ نہ کھائیں کیونکہ یہ بھوک کو ختم کر دیتی ہے اس لیے ہمیشہ کھانے کے بعد کھائیں۔

## جرمنی کی بربادی

گلیڈیو آپریشن 9/11 سے پہلے یورپ اور جنوبی امریکا تک انسداد کیونٹس آپریشن کے نام پر پھیلا دیا گیا۔ پیٹم، ناروے، جرمنی، یونان، پرتگال، اسپین اور دوسری مغربی یورپی جمہوریتوں نے ان برسوں میں گلیڈیو کی دہشت گردی برداشت کی۔ 1970ء کے نصف آخر میں جب میں اسکاٹ لینڈ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اس وقت بدر منہاں گروہ اچانک خبروں پر چھا گیا۔ اس گروہ کو عام طور پر سرخ فوج یا آراء ایف کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ 1977ء میں ہائمرٹن اسکلیئر کا اغوا تھا جو مغربی جرمنی کے سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ تھا۔ اس کا اغوا پانچ ستمبر کو ہوا۔ بالکل اسی تاریخ کو جب اسرائیلی کھلاڑیوں کو 1972ء میں مارا گیا تھا۔ یہ گلیڈیو کے تنظیم کا مشہور طریقہ کار تھا۔ وہ بائیں بازو کی تحریک میں خفیہ طور پر شامل ہو جاتے اور اس سبب میں اس کی قیادت کرتے جو سب گلیڈیو کے تنظیم کے لیے موزوں ہوتی۔

## مصری سائنسدان کا

## منفرد کارنامہ

جاپان میں خدمات انجام دینے والے ایک مسلمان مصری سائنسدان ڈاکٹر شریف المصنعی نے ماحول، پانی اور مٹی سے تابکاری کو علیحدہ اور ختم کرنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کر کے ایٹمی ترقیات کے شعبے میں اہم کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ دنیا کے پہلے سائنسدان ہیں جنہوں نے اس گراں ترین اور مشکل ترین کام کو اپنی ٹیم کے ساتھ صرف چند ہفتوں میں مکمل کر کے ایٹمی ٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

آخری دیدار کر لیتے۔ اس کی میت کو کاندھا بھی دے دیتے۔ آخر تم لوگوں نے وحید کے چچا کو لاہور بھی تو فون پر اطلاع دی تھی۔ ہمیں بھی وحید کی موت کی خبر لاہور ہی سے ملی۔“ میں نے کہا۔ ”کراچی سے جس طرح وحید کی میت کسمپرسی کے عالم میں لاہور بھیجی جا رہی ہے اسے تو میں جراسر طور بری کہوں گا اگر ہم چند لوگ ایئر پورٹ نہ پہنچتے تو ہمیں مرحوم کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کی توفیق بھی نصیب نہ ہوتی۔ آپ لوگوں نے تو حد کر دی۔ وحید کی میت کو بے یار و مددگاری لاہور بھجوا رہے ہیں۔“

”ہمیں یہ بات نہیں۔“ قادر موسانی بولے۔ ”میت کے ہمراہ وحید کی ساس ممتاز اور وحید مراد کا بچہ بھی اسی فلائٹ سے لاہور جا رہے ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ جاتا لیکن وحید کی بیگم سنگلی اور ان کی بیٹی عالیہ امریکا سے کل کراچی پہنچنے والی ہیں میں انہیں اپنے ہمراہ لے کر لاہور جاؤں گا۔“

میں نے وحید مراد کی موت کو اس لیے پراسرار کہا ہے کہ قادر موسانی اور ممتاز کے بیانات میں تضاد نظر آتے ہیں۔ قادر موسانی نے کہا۔ ”جب میں کمرے میں گیا تو وحید بچکی کے سوچے پور ڈکے نیچے دیوار کے سہارے گرا ہوا تھا اور وہ فوت ہو چکا تھا۔“ جب کہ وحید کی منہ بولی بہن نے لاہور پہنچ کر اخبارات کو درد منشا بیان دیے ایک بیان میں وہ کہتی ہیں۔ ”جب میرا نوکر وحید بھائی کو چگانے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا وحید مراد اپنے بستر سے نیچے گرے پڑے ہیں اور فوت ہو چکے ہیں۔“

جب کہ ایک اور بیان میں موصوفہ نے کہا۔ ”جب ہمارا نوکر کمرے کے قریب گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے نہ کسی نے دروازہ کھولا نہ کوئی آواز آئی۔ چنانچہ اس نے آکر مجھے یہ بات بتائی۔ پھر ہم کمرے کا دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وحید بھائی اپنے بستر سے نیچے پڑے ہیں اور وہ فوت ہو چکے تھے۔“

ایسے متضاد قسم کے بیانات پڑھ کر لوگوں کے شکوک و شبہات میں جتلا ہونا بڑا فطری ہے۔ پھر جس خاموشی کے ساتھ وحید کی میت لاہور بھیجی گئی اس سے ان شبہات کو اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

الاس رشیدی صاحب کی تحریر کے اقتباسات سے پاکستانی فلموں کے ایک پراسرار کی ایسی کسمپرسی کی موت اور

وابستہ ہر شعبہ کے افراد وہاں موجود تھے۔ ان میں فلم ساز بھی تھے، ہدایت کار بھی، اداکار بھی اور ٹیکنیشن بھی۔ تمام اداکارا میں بھی صبح ہی وحید کی کوشی پہنچ گئی تھیں۔ اداکار محمد علی اور ہدایت کار لیتھن اختر جنازہ اٹھانے کے انتظامات میں مصروف تھے۔ قبر کے لیے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ دس بجے تک جہوم اتنا بڑھ گیا کہ کوشی کا لان اور باہر کی سڑک مرحوم کے پرستاروں سے بھر چکی تھی۔ سوا دس بجے جنازہ اٹھانے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے پہلے وحید مراد کی میت دیدار کے لیے لان میں رکھ دی گئی تھی۔

چونکہ لان میں اتنے سارے لوگ جمع نہیں ہو سکتے تھے لہذا فیصلہ کیا گیا کہ کوشی کے سامنے وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی جائے۔ جنازہ اٹھا تو پورے علاقے میں کھرام مچ گیا۔ بے شمار خواتین جن میں اداکاراں بھی شامل تھیں بے اختیار چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ الغرض اشتہار آنکھوں اور کانٹے ہاتھوں سے لوگوں نے جنازہ اٹھایا اور کٹلے میدان میں رکھ دیا۔ بے پناہ جہوم کی وجہ سے صفیں درست کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ نماز جنازہ کے بعد ساڑھے دس بجے قبرستان لے جانے کے لیے جنازہ اٹھایا گیا۔ اس موقع پر ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ وہ آگے بڑھ کر وحید کے جنازے کو کندھا دے سکے۔ چند منٹ بعد جنازہ قبرستان پہنچ گیا۔ یہاں بھی بڑی مشکل سے جہوم پر قابو پایا گیا۔ چند بڑوں نے وحید مراد کے پرستاروں سے منت سماجت کی تب کہیں جہوم قبر سے ڈرا دور ہٹا اور آخر کار گیارہ بجے میت کو دفنانے کے بعد بھی بے شمار لوگ کافی دیر تک کوشی کے باہر موجود رہے۔

اگلے روز جمعہ کا تھا۔ سہ پہر تین بجے رسم لے ادا کی جاتی تھی۔ اس موقع پر بھی عوام کی بڑی تعداد پہنچ چکی تھی۔ قلمی صنعت سے وابستہ افراد کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں عزیز رشتے دار اور پرستار تھے جو راولپنڈی، سیالکوٹ، پشاور، گوجرانوالہ اور فیصل آباد سے آئے تھے۔ نماز عصر کے بعد قرآن خوانی شروع ہوئی۔ جس کے اختتام پر مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ اس موقع پر وحید مراد کی بیوہ سلمیٰ بیگم کا بڑی شدت سے انتظار کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا جہاز رات کو پہنچے گا۔

وحید مراد کی بیوہ سلمیٰ مراد کو بذریعہ فون امریکا میں ان کے شوہر کی وفات کی اطلاع دی گئی تھی جسے سن کر انہوں نے پہلے تو اس پر یقین نہیں کیا اور کہا۔ ”یہ سچی خبر نہیں افواہ ہے۔“ لیکن انہیں یقین دلایا گیا کہ یہ خبر صمد فیصلہ جی ہے۔

اس کے بعد ایک یادگار اور صاحب حیثیت شخص کی میت کی ایسی بے پروائی رونگھٹے کھڑے ہو جائیں۔

اللہ وحید مراد کو غریق رحمت کرے۔ اب اس کی میت کی لاہور آمد کی داستان یاسین گورچہ صاحب کی زبانی سنئے۔ ”ملک کے خودیاد اور اپنے دور کے جاہلیٹی ہیرو وحید مراد کو جمہرات کی مچ ساڑھے دس بجے ان کی کوشی سے ملحقہ قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس موقع پر کون سی آنکھ تھی جو اٹھکرا نہ تھی۔ سوگوار غورتوں کا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ بدھ کی رات دس بجے پی آئی اے کے ذریعے وحید مراد کی میت جب کراچی سے لاہور پہنچی تو وحید کے چچا سلیم مراد اور محمد علی کے علاوہ درجنوں قلمی شخصیات ایئر پورٹ پر موجود تھیں۔ ان کی موجودگی میں میت کا تابوت ایک دین کے ذریعے مرحوم کی کوشی گلبرگ پہنچایا گیا۔ کوشی میں میت کی آمد پر بے حد دل خراش مناظر دیکھنے میں آئے۔“

وحید کی پیار والدہ نے اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی میت دیکھی تو چیختے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ وحید کو کس میں بند کر کے کیوں لائے ہو؟“

”اس کی والدہ کی آہ و بکا دیکھ کر اس جگہ موجود ہر شخص بری طرح رورہا تھا۔ وحید کی والدہ نے اپنے سات سالہ پوتے عادل مراد کو سینے سے چٹالایا اس کے بعد ان کی زبان تنگ سی ہو گئی۔ ان پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔“

”وحید مراد کی موت کی اطلاع بدھ کی صبح بارہ بجے کے قریب لاہور پہنچی تو کسی نے بھی اس پر یقین نہیں کیا۔ میں نے جب وحید مراد کے چچا سلیم مراد کی کوشی فون کیا تو ہوتا چلا کہ اطلاع واقعی درست ہے۔ وحید مراد کی موت کی خبر جب دن کے دو بجے کے قریب میں نے دفتر نگار کو بذریعہ فون دی تو مدبر نگار کو اس کا یقین نہ آیا۔ کیونکہ وحید مراد تو اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کے لیے ڈاکٹروں سے مشورہ کر رہے ہیں۔“

یہاں لاہور میں یہ خبر بے حد حیرانگی اور افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ کراچی میں قلم سے واسطہ شخصیات کو کسی نے بھی وحید کی موت کی اطلاع نہیں دی۔

لاہور میں وحید مراد کے جنازہ کو اٹھانے کا وقت دوسری صبح دس بجے دیا گیا تھا۔ جیسے ہی یہ خبر لاہور میں صبح کے اخباروں میں شائع ہوئی وحید مراد کے ہزاروں پرستار مرحوم کی کوشی گلبرگ پہنچ گئے۔ دس بجے تک قلمی صنعت سے

ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو جائیں۔

مرحوم کے دوستوں، بھئی خواہوں اور رشتے داروں نے اس موقع پر سہیلی بیگم کو سنبھالنے اور سہارا دینے کے لیے ان کی دل جوئی شروع کی۔ ساس کی باتوں کو نظر انداز کرنے کو کہا۔

جب سہیلی بیگم کی طبیعت ذرا سنبھلی تو انہوں نے پوچھا۔ ”یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟“

”دو ماہ پہلے لاہور میں ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ چہرے پر خاصا زخم آیا تھا۔ اللہ نے اتنا کرم کیا کہ دونوں آنکھیں سلامت رہیں۔ کچھ دنوں تک اسپتال میں زیر علاج رہے۔ پھر صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ زخم منڈل تو ہو گئے مگر چہرہ داغدار ہو گیا تھا۔ صحت بالکل صاف ہو چکی تھی۔ اس موقع پر وہ بالکل تھکتے۔ کوئی اپنا ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں تھا۔ ان کے کچھ دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرا لو۔

انہوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا۔ ”جی ہاں آپ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالیں مگر اس کے لیے آپ کو بیرون ملک جانا پڑے گا یا کراچی میں یہ کام کروانا پڑے گا۔ یہاں لاہور میں پلاسٹک سرجری نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وحید مراد صاحب کراچی چلے گئے۔“

”جب بہن ممتاز ایوب کو معلوم ہوا کہ ان کے بھائی وحید مراد اکیلے اپنے فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ وہاں پہنچیں اور ضد کر کے اپنے گھر ڈنٹیں لے گئیں۔ وہاں وہ مشکل کی رات تک ٹھیک ٹھاک تھے۔ خوشگوار موڈ میں کپ شپ کرتے رہے تھے۔ بدھ کی صبح جب وہ دس بجے تک نہیں جا گئے تو کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور جب کافی دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو دروازہ توڑ کر اندر دیکھا گیا۔ وہ اس دوار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔

سہیلی مراد چپ رہیں۔ کچھ دیر تک کچھ نہیں بولیں۔ پھر دھیرے سے خود گلہ کی انداز میں بولیں۔ ”ایک شخص جو رات کے وقت بالکل بھلا چنگا تھا۔ صبح ایک دم مردہ حالت میں پایا گیا کیا یہ مس ٹیرس نہیں؟ پراسرار نہیں؟“

اور پھر کئی دنوں کے بعد جب نگار اور دوسرے اخباروں میں وحید مراد کی موت کی روداد شائع ہوئی تو ان کا موڈ بہت جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھیں کہنا

وحید واقعی اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تب انہیں شدید رنج ہوا اور انہوں نے لہجہ کی کہ ان کے آنے تک ان کی تدفین نہ کی جائے۔

لیکن ان کی اس خواہش پر عمل نہ کیا جاسکا کیونکہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق میت کو اتنی دیر تک روکنا ممکن نہیں تھا۔ لہذا جتنی جلدی ممکن ہو سکا تدفین کر دی گئی (غالباً اس دور میں کوئلہ اسٹوریج کا بندوبست نہیں تھا جیسا اب ہے۔)

بہر حال سہیلی مراد جمعہ کی شب جب قیل کی رسم بھی ادا کی جا چکی تھی اپنی گیارہ سالہ بیٹی عالیہ مراد کے ہمراہ لاہور پہنچیں۔ جنہیں لینے محمد علی، زبیا، قوی خان، ان کی بیگم اور چند عزیز رشتے دار ایئر پورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

جہاز سے اترتے ہی سہیلی نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ محمد علی اور زبیا وغیرہ نے انہیں دلاسا دیا اور اپنے ہمراہ اس کی رہائش گاہ پر لائے۔ یہاں پہنچتے ہی سہیلی اپنے بیٹے عادل مراد کو اپنے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگیں انہیں اس موقع پر بھی بڑی مشکل سے چپ کرایا گیا۔

اس وقت وہاں موجود کچھ لوگ ان کی بھری جوانی میں بیوگی پر دل ہی دل میں افسوس کر رہے تھے۔

دوسری طرف عالیہ اپنی دادی کے گلے لگ کر روتی رہی۔ وحید مراد کی والدہ کی حالت اس وقت بھی نارمل نہیں تھی۔ وہ بھی بیک بیک باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ اس قسم کی باتیں گویا نیم بے ہوشی کے عالم میں کہہ رہی ہوں۔

”ختم سب کیوں رو رہی ہو، جب اسے تمہاری ضرورت تھی تم اسے چھوڑ کر اس سے دور چلی گئیں۔ تمہاری اس بے مروئی پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ کار کے حادثے سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔“

وہاں موجود لوگوں نے ان کی بڑی بڑا ہٹ کو روکنے کے لیے انہیں دوائی کھلا کر سلا دیا۔ ان کے لیے جوان بیٹے کی جدائی ایک جاں کاہ صدمہ تھا۔ جب ایک عام آدمی ایک عام پرستار خیم سے اس قدر ٹھنڈا تھا تو انکو تے بیٹے کی ماں کا کیا حال ہو سکتا ہے، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام تھا۔ بہر حال یہ بھی حقیقت تھی کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ وقت سہیلی مراد کو بھی دکھ دینے کا نہیں تھا۔ وحید بہر حال ان کے شوہر تھے۔ جیون ساسھی تھے۔ میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ میاں سے لڑ کر امریکا چلی گئی تھیں مگر وہ یہ کب چاہتی تھیں کہ وہ

فلوں کے دن اینڈ اوٹلی شو میں سید نور ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”میں آج تک ان کی یادوں کے گھرے سے نہیں نکل سکا۔ میں آج بھی اس خوشبو کو محسوس کرتا ہوں جو ”ارمان“ دیکھتے ہوئے میں نے اپنی ٹین ایتھ میں پہلی بار اپنے دل سے اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ مجھے یقین ہے وہ خوشبو، وہ احساس وہ چاہت وحید صاحب اور ان کی فلموں کے لیے مرتے دم تک قائم رہے گی۔“

وحید مراد صاحب پاکستان فلم انڈسٹری کا وقار تھے، ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ذاتی زندگی شاید بہت شاندار نہ رہی ہو لیکن ان کی فلمی زندگی اور اس کی یادیں پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بہت بڑا فخر ہیں۔

مصنف و ہدایت کار پرویز ملکیم نے وحید مراد کے نام ایک ایسا خط لکھا جو پتا نہیں اس کے پاس پہنچا یا نہیں مگر اس کے بے شمار پرستار اسے بڑھ کر اپنے محبوب فنکار کی عظمت اور بڑائی سے اور ان کی مقبولیت اور چاہت سے ایک نئے انداز سے ضرور واقف ہوئے ہوں گے۔ اس خط کے کچھ اقتباس۔ ”تمہاری ہر برسی پر تمہاری یادیں تمہارے چاہنے والوں میں باشتا نہیں بھولتا۔ لگتا ہے تمہاری موت نے تمہیں بھی عمر کی ایسی دھادی ہے جو تمہیں لگ چکی ہے۔“

”وحید! تمہیں یاد ہے تم نے اپنی ایک بھری دن کا نام رادھا رکھا تھا۔ تمہاری رادھا بوڑھی ہو چکی ہے اس کے سر میں چاندی کے تار آتے ہیں مگر اس کی آنکھوں کا گرم پانی آج بھی جوان ہے۔“

”تمہاری تصویر دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ ہم اسے کیا تسلیاں دیں۔“

”زیبا، دیبا، عالیہ، شبنم، ماہرہ، سگیتا، کویتا، نشوونہ سب تمہیں بھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ فلمی محبتیں بھول جے مگر وہ لمحے، وہ پہل، وہ گھر نیاں نہیں بھلائی جاتیں جو ہنس ہنس کے گزاری ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو ماضی کا ہاتھ تھام کر اپنے آج پھر چپ کر رو لیتے ہیں اور کچھ بیٹھے ہوئے چہرے، روئی ہوئی آنکھوں سے تمہیں خراج تحسین پیش کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔“

تمہیں بھلا تا ہی اول تو دسترس میں نہیں

جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے؟

چاہتی تھیں، اس پر اسرار موت کی تقدیر کو دانا چاہتی تھیں مگر انہوں نے بہت صبر و ضبط سے کام لیا۔ کسی کا نام لے کر یا بغیر نام لے کر کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ جانے اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے شاید اس مسئلے کو اس لیے نہیں چھیڑا کہ..... ایسا کرنے سے ان کی شخصیت کو بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

بہر حال ان کا چہرہ ہٹا ہی ہتر تھا۔ سانپ تو گزر چکا تھا۔ اب اس کی پھوڑی ہوئی لکیر پر لٹھی پٹینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں تھا کہ وحید مراد کا گزرتا، اس کے گھر والوں ہی کے لیے نہیں بے شمار لوگوں کے لیے صدمہ عظیم تھا۔ مصنف و ہدایت کار شوکت ہاشمی نے اپنے جذبات و احساسات کا جو اظہار کیا ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھئے۔

”اس سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب اس کی میت لحد میں اتارنے سے پہلے میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ خاموش لب، پُرسکون چہرہ، زندگی کے تمام نظرات سے آزاد۔ وہ کسی ڈپریشن کا شکار نہیں تھا۔ اب اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنے قدر دانوں، اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں سے بے نیاز آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر پھول بھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کوئی فلم باکس آفس پر پٹ ہو گئی ہے اور اس کے دوستوں نے اس کو پھولوں سے لا دو یا ہے۔“

قبرستان کے گرد اس کے ہزاروں پرستار پھیلے ہوئے تھے لگ بھگ پچیس تیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور وہ سب ایک آواز نعرہ لگا رہے تھے۔ ”وحید مراد زندہ باد۔ وحید مراد زندہ باد۔“

اور گورنر اس عظیم فنکار کی میت پر مٹی ڈال رہا تھا جس کی اداکاری نے پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک نیا اسلوب دیا تھا اور جس نے فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ فنکاروں کی آمد کے راستے کھولے تھے۔ جس کی جواں مرگی پر پاکستان ٹیلی ویژن نے صرف ایک سطر کی خبر ٹیکل کاسٹ کی تھی۔ ”مشہور اداکار وحید مراد آج صبح کراچی میں انتقال کر گئے۔“

ٹی ٹی وی کے اس رویے سے وحید مراد کی فنی شخصیت اور ان کی شہرت اور مقبولیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ پاکستانی



## بابائے جغرافیہ

طارق عزیز خاں

جغرافیہ ہی وہ کلیہ ہے، وہ ذریعہ ہے جو کرٹھ ارض کی معلومات فراہم کرتا ہے لیکن یہ علم بہت زیادہ پرانا نہیں، اس علم کی بنیاد رکھنے والے نے کس طرح اسے تخلیق کیا کن مصائب سے گزر کر اس نے دوسروں کے لیے رہنما طریق کار واضح کیا اسی کا بیان۔

### معلومات کے شائقین کے لیے تحفہ خاص

ہے۔ اسے زمین کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔ آج تک نئی نو انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ سب جغرافیہ کی ہی مرہون منت ہے۔ اس علم کا آغاز بطور سائنس یونان میں ہوا۔ وہ پہلا انسان جس نے لفظ جغرافیہ استعمال کیا، اریاتو ستھینز

جغرافیہ جیسے انگریزی میں Geography کہتے ہیں دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین کا بیان۔۔۔۔۔ یہ وہ علم ہے جس میں زمین کی خصوصیات، اس کے باشندوں اس کے مظاہر اور اس کے نقوش کا مطالعہ کیا جاتا



(بحرالکابل، بحر اوقیانوس، بحر ہند) اُس مقام پر موجود تھے کہ جہاں آج ہم آئیں دیکھتے ہیں۔

لگ بھگ 300 قبل از مسیح تک خلیج فارس اور بحیرہ روم کے اطراف میں بسنے والی اقوام کی پہنچ جنوب مغربی ایشیا، وسطی ایشیا اور وسطی و مغربی یورپ کے کچھ علاقوں کے ساتھ ساتھ افریقہ کے دور دراز خطوں تک ہو چکی تھی۔ افریقہ اور ایشیا میں ابتدائی مہمات کے بعد مصری، ایرانی اور فونیسیائی تو تھک ہار کر پیٹھ گئے لیکن یونانیوں کی بے چین طبیعت نے انھیں چین لینے نہ دیا۔ اُن کی فطرت ایسی تھی کہ وہ ہر روز ایک نیا ہنگامہ چاہتے تھے۔ اُن کی آنکھیں ہر روز ایک نیا تماشا اور اُن کی زبانیں ہر دن کسی نئے مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتی تھیں۔ یونانیوں کی یہ خصوصیات انھیں ایک مخصوص ذکر پر مبنی تھیں۔ وہ خود کو اس عہد کی سب سے ترقی یافتہ تہذیب سمجھتے تھے، تاہم کہہ کر ارض سے متعلق ان کے خیالات دقیقہ نوسی تھے۔ اہل یونان کے نزدیک زمین چمپی اور کائنات کا مرکز تھی۔

مشہور زمانہ یونانی فلسفی ارسطو (Aristotle) نے 340 ق م میں اپنی کتاب ”افلاک پر“ (On the Heavens) میں پہلی بار زمین کے گول ہونے کے بارے میں دلائل دیے۔ عام یونانیوں نے تو ارسطو کے خیالات کا مذاق اڑایا، تاہم اس کے سب سے قابل شاگرد نے اپنے استاد کے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے کرہ ارض کو دریافت کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ اسکندر نے 334 سے 323 قبل از مسیح کے دوران شمال مشرقی افریقہ سمیت جنوب مغربی ایشیا کے وسیع علاقے کو دریافت کیا۔ تاہم وہ زمین کے گول ہونے کو ثابت نہ کر سکا۔ اسکندر کی ایشیا میں مہمات کے دوران یونانی ملاح پائے تھے اس نے شمال مغربی یورپ میں مہمات سرانجام دیں۔ لیکن وہ بھی بحیرہ شمالی (بحرالوقیانوس) کی وسعت کے آگے بے بس ہو گیا۔

یونانیوں میں اسکندر کا کوئی وارث تو پیدا نہیں ہوا، تاہم اسکندر اعظم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ایران، مشرق وسطیٰ اور مصری علاقوں پر مشتمل ایک وسیع یونانی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ یونانی سلطنت کے دور عروج میں شمالی مصر میں اسکندر کا قائم کردہ شہر اسکندریہ، بحیرہ روم کی اہم بندرگاہ کے ساتھ ساتھ تجارت، ثقافت اور تحصیل علم کے عالمی مرکز کے طور پر ابھرا۔ انسان کی بہت سی اہم دریافتوں کی طرح کرہ ارض کے بارے میں بنیادی نوعیت کی تمام اہم دریافتیں عظیم عروس

(Eratosthenes) ایک یونانی تھا۔

قدیم جغرافیہ دانوں کی زمین سے متعلق تحریروں نے نہایت دلچسپ ہیں۔ ارسطو کا خیال تھا کہ ہوا زمین میں داخل ہو کر محبوس ہو جاتی ہے اور جب وہ واپس خلا میں جانے کی کوشش کرتی ہے تو زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان عجیب و غریب نظریات کے باوجود یونانیوں نے جغرافیہ کے حوالے بعض حیرت انگیز دریافتیں بھی کیں۔ دو سو سال قبل مسیح کے قریب ارسطارخس نے مدوجزری لہروں میں تناسب معلوم کرنے کے بعد اعلان کیا کہ نہ صرف بحر اوقیانوس اور بحر ہند آپس میں منسلک ہیں بلکہ بحر اوقیانوس کے مغرب میں ہزاروں کلومیٹر دور شمال سے جنوب کی طرف ایک بڑا خطہ زمین واقع ہے۔ ارسطارخس کی اس تحقیق کے 1700 سال بعد کولبس نے امریکا دریافت کیا۔ یونانیوں کے بعد قرون وسطیٰ میں مسلم ممالک میں جغرافیہ کے حوالے اہم پیش رفت ہوئی۔ اس دور کے اہم جغرافیہ دانوں میں ابن بطوطہ، ابن خلدون اور اداریسی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں کے علمی زوال کے بعد یورپ میں زمین کے جغرافیہ سے متعلق شغف اور مستند تحقیقات سامنے آئیں۔ آج ہم کرہ زمین سے متعلق جس قدر معلومات رکھتے ہیں ان کا بیشتر ماخذ یورپین جغرافیہ دانوں کی تحقیق ہے۔

آج کی جدید خلائی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ لگ بھگ 13 ارب 70 کروڑ سال پہلے بگ بینگ دھماکے کے ذریعہ کائنات کی تشکیل شروع ہوئی۔ قریب 14 ارب 60 کروڑ سال پہلے نظام شمسی وجود میں آنا شروع ہوا اور تقریباً 4 ارب 50 کروڑ سال پہلے کرہ ارض کی پیدائش ہوئی۔ زمین کی پیدائش کے ابتدائی 50 کروڑ سال کے دوران پوری زمین پر محیط ابتدائی سمندر ظاہر ہوا۔ اگلے 2 ارب سال کے دوران سمندر کی تہہ کے نیچے موجود ٹیکٹو ٹک پلیٹس (Tectonic Plate) میں ہوتی حرکت کی وجہ سے سطح سمندر پر ابھرنے والے خشکی کے عظیم خطوں میں جغرافیائی تبدیلیاں رونماں ہوتی رہیں۔ آج ہم جانتے ہیں کہ لگ بھگ 300 ملین سال پہلے کرہ ارض پر صرف ایک عظیم براعظم پانگیا (Pangaea) اور اُس کے چاروں اطراف میں ایک ہی وسیع وعر یعنی سمندر ٹھانٹھیں مار رہا تھا۔ 280 ملین سال پہلے پانگیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور قریب ترین اندازہ ہے کہ تقریباً 20 ملین سال پہلے کرہ ارض پر موجود سات براعظم (ایشیا، افریقہ، شمالی امریکا، جنوبی امریکا، یورپ، انٹارکٹیکا) اور تین بڑے سمندر

تھا۔ اس دوران وہ اسکندریہ پہنچا اور محض 36 سال کی عمر میں اپنے علم و تحقیق کے بل بوتے پر اسکندریہ کے عظیم کتب خانے کا نگران مقرر ہو گیا۔ اسکندریہ میں قیام کے دوران اسے اپنے زمانے کے نامور جغرافیہ دانوں کی تصنیفات کے مطالعے کا موقع ملا۔ خود اس نے بھی فلکیات، تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق مقالے تحریر کیے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ زمین کی پیمائش سے متعلق درست نقشے بنائے۔ بد قسمتی سے اسکندریہ میں قیام کے دوران ہی ایراتو کی نظر اس حد تک کمزور ہو گئی کہ اسے مطالعے اور تحقیق کے لیے اپنے شاگردوں کی مدد لینا پڑی تھی۔

چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ایراتو کی تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس کی کتابوں کے عنوانات فلکیات سے لے کر ”دھکے نجات“ تک محیط تھے۔ تاہم اس کی دلچسپی کا مرکز کرہ ارض کا جغرافیہ تھا۔ اپنے ہم عصر یونانیوں کی طرح وہ زمین کو چپنا نہیں مانتا تھا۔ اس کے دن رات اسی تحقیق و جستجو میں بسر ہو رہے تھے کہ زمین کا ٹھیک ٹھیک طول و عرض معلوم کرے۔

اس دوران اس نے ایک کتاب میں پڑھا کہ سائنس شہر (قدیم نام سائنس Syene موجودہ نام اسوان) کے جنوبی سرحدی علاقے میں دریائے نیل کی پہلی آبشار کے نزدیک، 21 جون کو عین دوپہر کے وقت زمین پر گاڑی عمودی چھڑی کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موسم گرما کے اس طویل اور گرم ترین دن میں دوپہر کے وقت سائنس شہر کے جنوبی حصے میں واقع معدود کے ستونوں کے سائے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت کسی گہرے کنویں کی تہ میں سورج کا عکس دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ وہ عین سر پر چمک رہا ہوتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس مشاہدے کو نظر انداز کر دیتا۔ سائے، کنویں میں عکس، سورج کا مقام اور عمودی چھڑی جیسے بے سرو پا الفاظ کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ لیکن ایراتو تھمیز جغرافیہ دان ہونے کے ساتھ ساتھ ریاضی دان بھی تھا۔ اس نے ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا اور 21 جون کے دن اسکندریہ میں اپنی لائبریری کے کھن میں عین دوپہر کے وقت ایک عمودی چھڑی گاڑی اور پایا کہ چھڑی کا زمین پر سایہ پڑ رہا تھا۔ لیکن قریب ہی کھودے گئے کنویں کی گہرائی میں موجود پانی میں سورج کا عکس غائب تھا۔ ایراتو نے خود سے سوال کیا، ایسا کیوں تھا؟ ایک ہی تاریخ کے ایک ہی وقت میں شمالاً جنوباً دو جگہ دوسری شہروں میں کیے گئے ایک جیسے تجربے کے نتائج

الہا و اسکندریہ میں کی گئیں۔ یونانیوں نے اسکندریہ کی تعمیر پر بے شمار دولت خرچ کی تھی۔ شہر کو 30 میٹر چوڑے کشادہ بازاروں نفیس انداز تعمیر، مجسمہ سازی، اسکندر کے یادگاری مقبرے اور ایک بہت بڑے مینارہ نور فرس (Pharos) (قدیم دنیا کے سات عجوبوں میں شامل ایک عجوبہ) سے شایان و سرفراز کیا گیا تھا۔ ان سب کے علاوہ اسکندریہ کا سب سے بڑا عجوبہ اس کا کتب خانہ اور اس سے ملحقہ عجائب گھر تھا۔ مصر کے یونانی بادشاہ جانے اور سیکھنے کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ انھوں نے اس کتب خانے کے قیام کے بعد اعلیٰ کی صدیوں تک تحقیقی کام کی اعانت کی اور اسکندریہ کے کتب خانے میں اپنے عہد کے بہترین اذہان کے لیے ایک علمی ماحول قائم رکھا۔ کتب خانے کے 10 بڑے کمرے اور ہر کمرہ علیحدہ موضوع کے لیے وقف تھا۔ چشمے اور ستونوں کی قطاریں، نباتاتی باغ، چڑیا گھر، جراح خانے، رصد گاہ، کھانے کا کمرہ اور پانچ لاکھ نادر و نایاب کتابیں اس کتب خانے کی شان تھیں۔ یونانی حکمرانوں کو اسکندریہ میں کتابیں جمع کرنے کا اس حد تک شوق تھا کہ ان کی پولیس یونانی سلطنت کی حدود میں داخل ہونے والے ہر بحری جہاز کی تلاشی لیتی اور جہازوں سے کسی بھی قسم کے کتابی نسخے کے برآمد ہونے کے بعد ان کی نقل تیار کر کے اسکندریہ روانہ کر دیتی۔

240 قبل از مسیح میں اسکندریہ کے اس عظیم کتب خانے کا ڈائریکٹر ایراتو تھمیز تھا۔ ایراتو 276 قبل مسیح میں لیبیا کی بندرگاہ بن غازی (Banghazi) سے 180 کلومیٹر مغرب میں واقع ایک قدیم صحرائی قصبے سائے رہنے، قدیم نام Cyrene) موجودہ شاہات (Shahhat) میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن لیبیا کے ساحلی علاقوں میں گزرا۔ بہت کم عمری میں ہی وہ ایک بحری جہاز پر ملازم ہوا اور اس نے تینس اور الجوزا کی سیاحت کی۔ اسے جغرافیہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ جوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے ہم عصر جغرافیہ دانوں کی بیشتر تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اب اس کی دلچسپی کا مرکز بحیرہ روم سے پار کی دنیا تھیں۔ وہ دنیا کے چپنا ہونے سے متعلق نظریات سے کبھی بھی متفق نہیں ہوا۔

ایراتو کا دلیدہ مشغلہ بن غازی کے ریشیلے ساحلوں پر دنیا کے نقشے بنانا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر نوجوانوں کو ساحل پر جمع کرتا اور پھر چھڑی کی مدد سے نقشے بنا کر انھیں دنیا کے جغرافیہ سے متعلق اپنے خیالات سے آگاہ کرتا۔ بیس سال کی عمر میں وہ بحیرہ روم کے قرب و جوار کی سیاحت کر چکا

مختلف کیوں تھے؟

ایراتو نے قدیم مصر کا ایک نقشہ لے کر اسکندریہ اور سائے پر دو چھوٹی تیلیاں عمودی لٹری کیں۔ وہ سوچنے لگا فرض کریں کہ سورج کے عین سر پر ہونے کی صورت میں کسی ایک لمحے میں دونوں ہی چھڑیوں کا سایہ زمین پر نہ پڑے یا ایک ہی وقت میں دونوں چھڑیوں کے سائے ایک ہی جتنے لمبے ہوں تو اس کا ایک ہی مفہوم نکلے گا یعنی زمین چھنی اور اس بات ہے۔ لیکن ایک ہی وقت میں کسی ایک چھڑی کا سایہ پڑنے اور دوسری کا نہ پڑنے کا کیا مطلب تھا؟ ایراتو نے غور کیا کہ کدہ ارض کی سطح کا خنیدہ ہونا اس پہیلی کا واحد ممکنہ جواب تھا۔ مطلب یہ کہ زمین گول تھی۔ ایک بار کدہ ارض کو گول تصور کر لینے کے بعد ایراتو کو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ دونوں چھڑیوں کے سایوں میں مشاہدہ کیے گئے فرق کے لیے اسکندریہ اور سائے کے درمیان فاصلہ کدہ ارض کی سطح کے ساتھ 7 ڈگری ہونا چاہیے تھا۔

یعنی اگر ہم چھڑیوں کو کدہ ارض کے مرکزی نقطہ تک پہنچے ہوئے تصور کریں تو وہاں دو ایک دوسرے کو سات ڈگری پر قطع کر رہی ہوں گی۔ ایراتو نے اسی پر بس کرنے کی بجائے ایک آدمی کو اُجرت دے کر سائے اور اسکندریہ کے درمیان فاصلے کو ناپا جو اس وقت کے اندازے کے مطابق 800 کلومیٹر سے کچھ زیادہ تھا۔ ایراتو کے لیے بعد کا حساب آسان تھا یعنی 7 ڈگری کا فاصلہ کدہ ارض کے کل محیط 360 ڈگری کا 50 واں حصہ تھا اور یوں 800 کلومیٹر کے 50 گنا کا مطلب 40 ہزار کلومیٹر کے قریب تھا۔ ایراتو نے اعلان کیا کہ خط استواء پر کدہ ارض کا محیط 40 ہزار کلومیٹر یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔

ایراتو کی تحقیق کے بعد اطالوی جغرافیہ داں ہسٹرابو (Strabo) نے سمندروں کے پارے میں جیش گوئی کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ زمین گول تھی اور کدہ ارض کے تمام سمندر آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ہسٹرابو نے اپنی زندگی (63 ق م سے 24 عیسوی) میں یونان کی تاریخ و جغرافیہ سے متعلق 43 کتابیں لکھیں۔ اس نے ارتھارکس کے نظریات کا دفاع کرتے ہوئے بحراوقیانوس کے پار ایک خطہ زمین کے ہونے کی حمایت کی۔ ہسٹرابو کی رائے میں دنیا کے گرد چکر لگانے کی ناکام کوشش کرنے والے واپس آ کر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ کسی براعظم نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔ بلکہ ان کی ناکامی کی بڑی وجہ ہمت حوصلے اور رسد کی قلت تھی۔ ہسٹرابو نے ایراتو کی تحقیق کا دفاع کرتے ہوئے لکھا کہ زمین کا خط استواء پر محیط چالیس ہزار کلومیٹر کے قریب ہی ہونا چاہیے تھا۔

ایراتو کے آثار تھے اور ان آلات کی مدد سے اُس نے صرف چند ہی صدی کی غلطی سے کسی سیارے کا محیط بالکل ٹھیک ٹھاک ناپا تھا۔

تھوکر اگلے ایک ہزار سال تک عام یورپین باشندے زمین کو چھپائی مانتے رہے لیکن ایراتو تھمیز کی تحقیق نے کدہ ارض کے بارے میں بڑھے لکھے اور باشعور طبقے کی رائے کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ عظیم محقق تحقیق اور مطالعے کی زیادتی کی وجہ سے اپنی آخری عمر میں اندھا ہو کر 196 ق م میں مصر کے شہر اسکندریہ میں انتقال کر گیا۔ ایراتو تھمیز کے دور میں بحیرہ روم سیاحت اور تجارت کے لیے مشہور اور اسکندریہ وہاں واقع سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔

ایراتو تھمیز کی دماغ سوزی کے مقابلے میں آج کی جدید تحقیق کے مطابق دنیا کے نقشے پر کھینچے گئے ہر ایک ڈگری کے خط کا درمیانی فاصلہ 111.32 کلومیٹر ہوتا ہے۔ اسکندریہ 31.15 ڈگری شمال جبکہ سائے 23.97 ڈگری شمال پر واقع ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان 7.18 ڈگری کے فرق کا مطلب 799.27 کلومیٹر فاصلہ اور اس کے 50 گنا کا مطلب 40 ہزار کلومیٹر ہے۔ اور یہی کدہ ارض کا کل محیط ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں کہیں تو ہمیں خط استواء پر زمین کے گرد ایک دھاگا پلٹنے کے لیے کل چالیس ہزار کلومیٹر لمبے دھاگے کی ضرورت ہوئی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں محض چھڑیاں، پاؤں اور دماغ کے ساتھ تحقیق



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



ایک جدا گانا انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا سترھواں حصہ

## شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



کوشش کر رہا تھا۔ میرے جوابات نے انہیں کچھ حد تک نرم کر دیا تھا۔ اس افسر کے چہرے پر جو بے رحمی کی چھاپ تھی وہ کم ہو چکی تھی۔ ڈھالی گھٹنے سے زیادہ ہو چکا تھا، نتیجتاً عمل ہو کے نہ دی تھی مگر وہ سب کچھ حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ اسی لیے مجھے

روزمرہ کے استعمال کی معمولی سی دوا اموسکیل میرے گلے کا پھندا بن گئی۔ تفتیش کرنے والے افسران مجھے یوں گھیرے کھڑے تھے جیسے میں کوئی خطرناک مجرم ہوں۔ وہ سوالات پر سوالات کر رہے تھے اور میں انہیں مطمئن کرنے کی

ستمبر 2017ء

123

ماہنامہ سرگزشت



جا کر یہ کالی رات ٹلی تھی۔ اسے میں ایک آفیسر میرے پاس آیا اور پوچھا۔ ”بس کا انتظار کر رہے ہو؟“  
اس کا احقنا سوال سن کر بھی میں نے اپنے آپ کو خوشگوار رکھا اور مسکرا کر کہاں میں جواب دیا۔  
اس نے پھر پوچھا۔ ”کیا بس نکل گئی تھی؟“  
میں نے سارا ماجرا اسے سنایا۔ سن کر بولا۔ ”کوئی پیچہ تم کو دیا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگا۔ ”پھر تم پر کوئی کیس نہیں ہے فکر مند نہ ہو۔“

وہ چلا گیا مگر میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا شکل سے میں اسے فکر مند لگ رہا تھا؟ جس کی وجہ سے وہ افسر مجھے اطمینان دلانے آیا تھا۔

مزید آدھا گھنٹا گزر گیا تب جا کر گرے ہاؤس کی بس آئی۔ میں نے ٹکٹ دکھایا تو اس نے میرا سامان پیچھے کپارٹمنٹ میں رکھ دیا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور کچھ دیر بعد اس دہشت ناک ماحول سے نکل آیا۔

بس نیا گراشی میں رکی، لیکن مجھ میں نیا گرافال دیکھنے کا کوئی جوش و خروش باقی نہ تھا۔ حالانکہ دن نکلا ہوا تھا اور نیا گراشی کا چھوٹا سا حسین شہر میرے سامنے تھا۔ پریشانی میں دل بجا ہوتا تو نہ رنگ اچھے لگتے ہیں اور نہ ہی نظارے۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ جب شہریت ملتی ہے تو سارا ریکارڈ دوبارہ سے کھنگالا جاتا ہے اور اگر یہ بات سامنے آگئی تو پھر فیصلہ عدالت کرتی ہے کہ میں آیا سٹیرن کا اہل ہوں بھی یا نہیں۔

میں نے طارق کو فون ملایا۔ اسے سارا ماجرا بتایا تو اس نے سر پکڑ لیا اور مجھ پر برس پڑا کہ اس کے پوچھے بغیر میں نے یہ حرکت کیوں کی۔ وہ چلا رہا تھا۔ ”میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں نے برف ہٹائی ہیں، کانٹک کارڈ زینچے ہیں، کوئی پھولے نہیں بیچتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

بس نے ڈیڑھ گھنٹے میں ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو میں اپنے ٹرینل پراتار۔

☆.....☆

بڑی مشکل سے میں اپارٹمنٹ پہنچا۔ عیسیٰ کا کرایہ بچانا چاہتا تھا، اسی لیے ایک سے دوسرے سب دے میں اپنے بھاری بھر کم بیگز کے ساتھ اپنا ہوجمل جسم اور سن داغ بھی کھینٹ کر لایا تھا۔ راستے بھر میں یہ سوچتا آیا تھا کہ اگر پولیس نے زیادہ تفتیش کی اور کچھ نہ کچھ میرے کھاتے میں ڈال دیا تو میرے پاس جواب کیا ہوگا؟

امید ہو چکی تھی کہ اب وہ لوگ مجھے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ ذہن پر چھائی دھند بھی صاف ہو چکی تھی اور میری کھونٹی ہنسی بھی لوٹ آئی تھی۔ میں مسکانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس افسر نے پھر مجھے دہلا دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں تو بہت حد تک مطمئن ہو چکا ہوں لیکن ابھی ایک پولیس آفیسر آرہا ہے۔ اگر تم نے اسے بھی مطمئن کر دیا تو ہم تمہیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔“

اس جملے نے مجھے پھر سے دہلا دیا۔ میری امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اب میں پولیس آفیسر کا انتظار کرنے لگا۔  
وقت تیزی سے گزر رہا تھا رات ڈھل چکی تھی کمرے کے پانچ بجے ایک پولیس آفیسر آگیا۔ وہ کچی عرق کا تھا اور اس کے سر پر بال خال خال رہ گئے تھے۔ لہذا قد اور کرسی جسم۔ پہلے والا آفیسر اٹھا اور پولیس آفیسر نے اس کی سیٹ سنبھال لی۔ اس کا انداز بھی ایگریگیشن افسر جیسا تھا۔ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں پیوست کر کے وہ بولا۔ تم زیر حراست ہو اور اپنے وکیل کو بلا سکتے ہو؟ میرا وہی جواب تھا کہ مجھے وکیل کی ضرورت نہیں ہے اور میں خود ہی جواب دے سکتا ہوں۔

اس کے وہی سوالات تھے جن کے جوابات جو میں ایگریگیشن آفیسر کو دے چکا تھا۔ اب تو وہ جوابات مجھے ازبر ہو چکے تھے۔ وہ سوال کرتا اور میں فی الفور جواب دے دیتا۔ جو میں ایگریگیشن آفیسر کو دے چکا تھا۔ اس نے تین گھنٹے کے بجائے دو گھنٹے مجھ سے تفتیش کی۔ میرے سارے سامان کو بھی کھنگالا۔ اب میں بھی تھک چکا تھا۔ ارد گرد کھڑے لوگ بھی بور ہونے لگے تھے۔ آخر میں وہ بولا۔ ”ہم کیس کی تفتیش پھر سے کریں گے اور پھر کوئی فیصلہ کر کے تم کو اطلاع کر دیں گے۔“ اس نے مجھ سے میرا فون نمبر اور ایڈریس لے لیا۔ اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میری بس تو جا چکی ہے، اب میں کیسے جاؤں گا۔“

کہنے لگا۔ ”اگر ٹکٹ تمہارے پاس ہے تو وہی دکھا کر ٹورنٹو جانے والی کسی بھی بس میں بیٹھ جاؤ۔“

جب میں باہر نکلا تو صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ رات کی سیاسی روشنی میں بدل چکی تھی۔ میں شدید تھکتا تھا اور تھکاوٹ کی حالت میں تھا اور بس کے انتظار میں اپنے بھاری سامان کے ساتھ ایگریگیشن آفس کے باہر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ سردی نے بے حال کر رکھا تھا۔ پوری رات کا جاگا ہوا تھا اور بدن جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ بہت ہی سخت وقت سے گزرا تھا تب

میں دوش روم سے لیوگ روم میں آیا تو اس نے چائے بنا رکھی تھی۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔ میں اس کے لیے ایک جیکٹ لایا تھا جو اس کے حوالے کی اور اس کے مجر پور شکرے پر میں نے مخصوص الفاظ کہے۔ ”اس میں شکرے کی کیا بات ہے؟“

چائے کی کرسی اور شہباز کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ دونوں جاب پر گئے ہیں اور ایک کھٹے تک آئیں گے۔ مفتی سزگا اور امریکا کا احوال پوچھ رہا تھا جو سرجی نے پہلے ہی اسے گوش گزار کر دیا تھا۔ میں کچھ بتاتا تو یہی جواب ملتا کہ ”سرجی بتا چکے ہیں۔“ لیکن اب میں نے کہا کہ ”وہ بتاتا ہوں جو سرجی نے نہیں بتایا ہوگا۔“

پھر میں نے باڈر پر اپنے ساتھ ہونے والے سارے واقعے کی مختصر تفصیل بتائی۔ وہ سن کے حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ اسی وقت اس نے خان قیصر کو فون کیا۔ وہ گھر پر ہی تھا اور اسے آنے میں چند منٹ ہی لگے۔ اب دونوں بیٹھ کر پھر سے سب کچھ سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ سوالات بھی کرتے جا رہے تھے۔

خان قیصر نے ہمیشہ کی طرح تہہ لگا کر ایک تیلی دی اور کہا۔ ”کچھ نہیں ہونا! اور اگر کچھ ہو گیا تو میں انہیں چھوڑ دوں گا۔“ مفتی نے مجھے تیلی دی اور کہا۔ ”میرا ایک کزن مارحم کا کونسلر ہے۔ میں اس سے بات کر کے سب معاملہ ختم کر دوں گا۔“

دوست مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ میری پریشانی اب اتنی نہ تھی جتنی یہ میری تھی کر رہے تھے۔ یہ تو مجھے اعزاء ہو گیا تھا کہ اگر وہ کوئی کیس بنانا چاہتے تو مجھے یا تو کوئی پیسہ دیتے اور یا پھر مجھ کو ہی اپنے پاس رکھ لیتے مگر میرے دوست مجھے تسلیاں نہ دے رہے تھے بلکہ پولیس کی غیر موجودگی میں دھمکا رہے تھے اور میں بھی ان کی ان ”تسلیوں“ میں آنے والا نہ تھا مگر ان کے غلوں سے میں انکاری بھی نہ تھا۔ میں مطمئن تھا مگر ان دونوں کی تسلیاں زیادہ سے زیادہ پانے کے لیے اپنا منہ بسور سے بیٹھا تھا۔ ان دونوں کو ٹم میں کھلتے ہوئے دیکھ کر مجھے اندر سے طمانیت مل رہی تھی کہ میرے خیر خواہ بھی موجود ہیں۔

اسی دوران دو اور خیر خواہ سرجی اور شہباز ایک ساتھ وارد ہوئے۔ سرجی ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے بغل گیر ہوئے شہباز پہلے میں بغور دیکھا۔ اور پھر بولا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی نیا سیپا ضرور ہوا ہے۔“

کئی ایک خدشات میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ میں جب اپنے سامان سمیت بس اسٹاپ پر تھا ہمارا اتر اٹھا تو ایسا لگا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ ساری رات کا سفر اور پھر پولیس کی تفتیش نے میرا اور میرے دماغ کا کچھور نکال دیا تھا۔ اب اسٹاپ سے سو گز دور پاپارٹمنٹ تک آنا میرے لیے دو بھر ہو گیا تھا۔ اپنے سامان کو ادا کرنے آپ کو گھینٹا ہوا میں اپنے کمرے کی ڈور وال کے قریب آیا تو بے بسی سے ہتھیار ڈال دیے۔ سامان کو ڈور وال کے باہر جھانڑیوں کے قریب رکھا اور خود مشکل سا پاپارٹمنٹ میں آگیا، مگر میں کوئی نہ تھا۔ سب دے کے دھکے کھاتا، اپنے سامان کو گھینٹا پاپارٹمنٹ پہنچا تو دن کے بارہ بجے تھے۔ مفتی جاب پر گیا ہوا تھا۔ سرجی اور شہباز کہیں گئے ہوئے تھے۔

میں نے کمرے میں جا کر ڈور وال کو کھولا اور باہر بڑا سامان اندر کمرے میں کھینٹ لیا۔ ڈور وال بند کی اور بے ہوش سا اپنے میز پر گر کر پڑا اور غور و فکر کرتے کرتے میں سو گیا۔ کچھ دیر ہی سو یا ہوں گا کہ مفتی جاب سے واپس آگیا۔ اس نے کمرے میں جھانکا اور چیخ کر کہا۔ ”تم کب آئے؟“ میں بے شکل ایک ڈیڑھ گھنٹا سو یا تھا کہ مفتی نے اٹھا دیا۔ اٹھ کر بیٹھا اور اپنے مرتش ذہن کو یکجا کیا تھا لیکن مفتی سوالات پر سوالات کر کے میرے دماغ کے پرچے اڑاتا رہا۔ میں نے پورے غل سے یہ کہا۔ ”یاد رہے! میں ابھی منہ دھو کر آتا ہوں۔“

ہم سوئے ہوں تو کبھی کبھار اچانکے میں دوسرے آپ کی نیند کا خیال نہیں کرتے۔ پاکستان میں جب میں اپنے کمرے میں گہری نیند میں ڈوبا ہوتا تو میرا ایک کزن ہر وقت شاید اسی تاک میں رہتا تھا کہ میں کب سوؤں اور وہ کدو دروازہ کھول کر شور مچاتے ہوئے پوچھے۔ ”کیا سو رہے ہو؟“

میں جب امریکا سے ایک بار سردیوں میں پاکستان گیا۔ اپنے بستر میں گرم رضائی میں پلٹا سو رہا تھا۔ میرا ایک دوست ملنے آیا تو مجھے گہری نیند میں سوئے دیکھا تو اتنا خیال کیا کہ مجھے نیند سے نہ اٹھائے اور پھر اسی رضائی میں گھس کر میرے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ارد گرد کوئی مخلوق ہے تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے خاموشی سے سوچوں میں کم اپنی رضائی کے اندر بیٹھے دیکھا تو دل گیا۔ اپنے حواس میں آیا تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”دن میں ملنے نہیں، سوچا کہ فجر پڑھ کر ہی مل آتا ہوں۔“ میں خود فجر پڑھ کر سو یا تھا۔ اس دن مفتی نے بھی مجھے ایسے ہی جگایا تھا۔

بھی میں کہیں کال کرتا یا پھر کال آتی تو کچھ ہی لمحوں میں کوئی کلک کی آواز آتی اور مجھے محسوس ہو جاتا کہ سچ میں کوئی ہے۔ ایک بار رشید کافون آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمہاری وجہ سے اور اپنی بیوقوفی کی وجہ سے مجھ سے کیا تھا۔ اس نے سب معاملہ سنا تو پھر اس کافون بھی نہ آیا۔ میں نے یہ بھی فوٹ کیا تھا کہ اپارٹمنٹ سے نکلنے وقت ایک پولیس کی گاڑی باہر کھڑی نظر آتی تھی۔ یہ معاملہ کچھ دن چلتا رہا اور دوڑھالی ماہ بعد پولیس آفیسر کا فون آیا، اس نے کہا کہ ہم نے تمہارا سارا ریکس دیکھ لیا ہے۔ تم اس میں معصوم تھے اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔“ فون بند کرنے سے پہلے اس نے مزید کہا۔ ”تمہاری فائل اب ہم بند کر رہے ہیں۔“ پھر اچھے دن کی نوید سنائی اور فون بند کر دیا۔

آج جیسے کا دن تھا۔ مشکل کو مجھے بیسویں سال کو جوائن کرنا تھا۔

میرے ذہن میں یہ چل رہا تھا کہ بچنے کے پانچ دن بیسویں سال میں جاب کروں گا اور ایک انڈیپر ہولڈنگ سینٹر میں دن بارہ بجے سے رات بارہ بجے بارہ گھنٹے کی شفٹیں اگرتل گئیں تو وہ بھی کر لیا کروں گا۔ اسی طرح ہولڈنگ سینٹر سے نو سو ڈالر ایک ماہ میں بن جایا کریں گے۔ میرا ماہانہ خرچ پانچ سو ڈالر تھا اور اس کے علاوہ بیسویں سال کی تنخواہ کی بھی سیدھی ہو جایا کرے گی۔

بیسویں سال میں ایک ہفتے مارتھ یعنی چار سات بجے سے تین بجے شفٹ ہوتی تھی اور دوسرے ہفتے دوپہر تین سے رات گیارہ بجے۔ وہاں رات کی شفٹ کا ایک الگ عملہ تھا جو صرف رات میں کام کرتا تھا۔ اسی طرح آرمین ہفتے میں پانچ دن چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔ میری ٹیلی نے پاکستان سے آنا تھا اور مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اپارٹمنٹ بھی لینا تھا اور گھر کا سارا فرنیچر اور دوسرے ضروری سامان کے لیے بھی ڈالر چاہئیں تھے۔ اس لیے مجھے دن رات کام کرنا تھا۔ جب سے بیسویں سال کی جاب ہوئی تھی تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ ماہانہ دو ہزار ڈالر وہاں سے مل جایا کریں گے۔ کینیڈا کی حکومت بچوں کا الالونس بھی دیتی ہے اور میرے دو بچوں کو چار سو ڈالر تک ملنے کی امید تھی۔ اب مالی گھرمندی نہ تھی۔ بچوں کے اسپانسر کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ چند ماہ میں وہ میرے پاس کینیڈا میں ہوں گے۔ سر جی نے بھی ٹیلی اسپانسر کی ہوئی تھی۔ موسم بدل رہا تھا اور مشکل دن بھی بدلنے والے تھے۔

اپارٹمنٹ آٹھ سو سے نو سو ماہانہ کرائے پر ملتا تھا۔ گاڑی ابھی میرے پاس نہیں تھی مگر گاڑی خریدنے کی زیادہ فکر نہ تھی بلکہ ڈرائیونگ لائسنس لینا دشوار تھا۔ مفتی ڈرائیونگ ٹیسٹ میں

خان اور مفتی دونوں نے مل کر میرے ساتھ ہونے والی پوری واردات کچھ مریج معاملہ ملا کر گوش گوار کی تو وہ دونوں پریشان ہو کر میرے ارد گرد بیٹھ گئے۔ اب ہم پانچ بندے بیٹھے تھے سیایا کا کام کر رہے تھے۔ کوئی تسلی دیتا اور کوئی کسی خدشے کا اظہار کرتا۔ اور میں ڈور وال کی کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا کہ موسم بدل رہا تھا۔ آسان نیلا اور شفاف تھا۔ برف باری تمام ہوئی اور زمین جیسے کسی مچھرے کی شہر تھی۔ بہار آنے میں گویا چند لمحے رہ گئے تھے۔

ہماری یہ پارٹنٹ کسی نتیجے یا کسی حل تک پہنچنے سے پہلے درخواست ہو گئی۔ خان قیصر سر جی کے ہاتھوں کی چائے پینے کے بعد شہباز کو گالیاں دیتا اور اس سے کچھ نہ کر رخصت ہوا۔ مفتی کو میں نے جیکٹ کا تختہ دیا تو وہ خوش ہو کر میٹرز پر چڑھ بیٹھا۔ شہباز اس بات پر خوش تھا کہ دو ہفتے بعد اسے ایک لیب میں ایلاٹ کے Op-Co پروگرام میں جاب شروع کرنی تھی۔ سر جی مطمئن ہو کر فرنیچر کو ملے جلے بیویوں بھرے لفافے پر لا چکی نظریں گاڑے کھڑے تھے۔

میں اپنے دل میں کوئی ترنگ لیے کمرے میں آیا اور نسرین کو فون ملایا۔ فون اس کے بیٹے سعد نے اٹھایا۔ میں نے پوچھا۔ ”ماما کمرے پر ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بات کروا سکتے ہو؟“

جواب دیا۔ ”آپ کون؟“

سچ میں سر جی کی آواز آئی۔ ”ماموں بات کر رہے ہیں۔“

سر جی نے اردو میں کہا تھا جو بچے کی سمجھ میں نہ آیا۔ میں کمرے میں بیٹھا فون کر رہا تھا۔ سر جی کو فون کرنے کی یونٹ روم میں آئے اور ریسپورڈ اٹھا یا تو اسی وقت میں سعد سے بات کر رہا تھا۔ اس نے میرا پوچھا تو سر جی نے اپنے جواب کی توپ چلا دی۔ میں نے غصے میں فون بند کر دیا اور یونٹ روم میں آ کر ان کی گردن پھڑکی۔ وہ ابھی تک ریسپورڈ تھا سے کھڑے تھے۔ میں سخت غصے میں تھا۔ شہباز اور مفتی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ قصور سر جی کا بھی نہ تھا۔ وہ تو اچانک سچ میں نادانستہ طور پر داخل ہوئے اور پھر غیر ارادی طور پر بول پڑے تھے۔ اب مجھے زیادہ غصہ کر کے اپنا دل نہیں جلاتا تھا۔ میں سونے چلا گیا۔ دن کے کچھ لمحے باقی تھے۔ میں کمرے میں آ کر سو یا تو پھر دوسری صبح اٹھا۔

بعد کے دنوں میں اپارٹمنٹ کافون ٹیپ ہوتا رہا۔ جب

ہو جاتی ہیں۔

آج درجہ حرارت غیر معمولی طور پر میں کے قریب تھا۔ سرجی نے چولہے پر ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ وہ متواتر اسی جانب متوجہ تھے۔ میں نے اعلان کیا کہ نماز جمعہ کے بعد کسی پارک میں جا کر لطف اندوز ہوں گے۔ شہباز پھر کراہا۔ سرجی یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ ہمارے کپڑے استری کر دیں گے۔ شہباز اور میں نے انہیں سختی سے ہنڈیا کی جانب توجہ رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ ہم اپنے کپڑے خود استری کر لیں گے۔

جمعہ نماز پڑھ کر نکلے تو ہمیشہ کی طرح سرجی نے سڑک پار دیسی دکانوں کی جانب دوڑ لگائی۔ میں اور شہباز ایک دوسرے کو خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ اب سرجی کی جلیبیوں پر ہم نے بولانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ واپس آئے تو خالی ہاتھ نہ تھے۔ ایک لفافے میں سموے ڈالے ہمارے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”اب جلیبیوں کی جگہ کیا سموں نے لے لی ہے؟“

کہنے لگے۔ ”اپنا تو یہ اصول ہے کہ آتا نہ چھوڑے اور جاتا نہ موڑے۔“

شہباز اور میں نے اس بار اس مثل کی کوئی وضاحت نہیں مانگی۔ میں یہ تو سمجھ چکا تھا کہ آج انہیں جلیبیاں نہیں ملیں اور سموے اٹھا لائے۔ اسی پس منظر میں وہ اب آتا جاتا کر رہے تھے۔

یہاں آپ کسی اسٹور میں آگ جلا کر اس پر کوئی کڑھائی نہیں رکھ سکتے کہ جس میں سموے یا پکڑے تلے جائیں یا پھر کوئی اور چیز تیار کی جائے۔ چولہا جلانے کے لیے باقاعدہ ایک لائسنس لینا پڑتا ہے اور لائسنس بھی اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ ہمارے ایک جاننے والے نے ریسٹورنٹ کھولا۔ تندور کا لائسنس نہیں ملا۔ کئی کو اعتراض تھا کہ حفاظتی اقدامات ٹھیک نہیں، جگہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ خطرے کی صورت میں با آسانی باہر نکلا جاسکے۔ میرا دوست چھ ماہ خوار ہوتا رہا اور آخر کار ہتھیار ڈال کر اپنا نقصان کر گیا۔

میں یہ سوچتا تھا کہ دیسی اسٹوروں میں جو سموے، توے پر روٹیوں کے بنے پک اور یہ جلیبیاں شاید اسٹور والے اپنے گھر سے بخوا کر لاتے ہوں گے۔ بعد کے دنوں میں یہ عقدہ کھلا کہ کم آمدنی والے لوگ گھروں میں یہ چیزیں بناتے ہیں اور جس قیمت پر اسٹور کو سپلائی کرتے ہیں اسٹور والے دو گنی قیمت پر گا ہوں کو بیچتے ہیں اگر کوئی دکان دن میں سموے بیچے

ایک بار اس لیے نفل ہوا تھا کہ کوئی کتا اس کے ٹیٹ کے دوران کنبس سے نکل آ کر مرتے مرتے بچا تھا۔ اس کے بعد مفتی نے اعلان کر دیا تھا کہ یہاں ڈرائیونگ لائسنس لینا ایسے ہی ہے کہ کسی بھوکے شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا جائے۔ مفتی کے اس فتوے کے بعد ہم سب ڈرائیونگ ٹیسٹ دینے سے توبہ تابع ہو چکے تھے۔ ویسے گاڑی خریدنا اتنا مشکل نہ تھا۔ ڈیڑھ سو ڈالر ماہانہ انشورنس دینی ہوتی تھی وہ ایک اضافی بوجھ لگتا تھا۔ اتنا تو ایک ماہ کا دوسری کا خرچ ہوتا ہے۔

شہباز اور سرجی اپنے ایک مفتی کی سیکورٹی گاڑی کی جانب کاؤ کی مکمل کرنے کے بعد آج گھر پر بیٹھے تھے۔ سرجی ڈور وال کے باہر ان سوکھی چھانچوں پر نظر رکھے ہوئے تھے جن پر سے اب برف ہٹ چکی تھی۔ شہباز ان دھوکوں کو دور ہاتھ جو اس کی زندگی میں یا کسی کی بھی زندگی میں بھی آ سکتے تھے۔ مفتی اپنی جانب پر تھا۔ سرجی نے مجھے دیکھ کر اپنی کل فون والی حرکت پر معذرت کی۔ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، میں سرنین سے آج بات کروں گا۔“

وہ خوش ہو کر ادرک پستہ بڑے شہباز کو دیکھ کر بولے۔ ”آخر تو کب تک شام کے مردے کو روئے گا؟“ سرجی اپنے محاوروں سے کب باز آنے والے تھے۔

شہباز غصے سے بولا۔ ”اب آپ بدعنائیں بھی دینے لگے ہیں۔“ پھر میری جانب دیکھ کر اپنی بات بدھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نہیں تھے تو یہ بھی خاموش تھا اور جب سے آپ واپس آئے ہیں ان کی زبان پتلی کی طرح جلنے لگی ہے۔“

سرجی نے شکایت کی کہ انہوں نے کوئی بدعنا نہیں دی بلکہ یہ کہا ہے کہ کب تک اپنے دکھ بیان کرتے رہیں گے۔ شہباز ہر وقت کوئی نہ کوئی شکایت اور اپنا غم کھول کر بیٹھا ہوتا تھا تو سرجی نے ایک طرح سے نصیحت کی تھی۔

مارچ کے درمیانی دن چل رہے تھے۔ موسم بہار کی جانب گامزن تھا۔ امیدوں اور مسرتوں کے پھول گلنے کو تھے۔ آسمان وقفے وقفے سے آئندہ دنوں کی جھلک دکھلا کر پھر کہیں کوجا جاتا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ استعارہ کہ اب آگے کے دن کڑے نہ ہوں گے۔ مجھے وہ کنیڈا دیکھنا تھا جو بہار اور گرمیوں کے دنوں میں وہ نظارے لے کر آتا ہے جو خواب مستی میں نظر آتے ہیں۔ یہاں کی گرمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ درجہ حرارت میں کے آس پاس بھٹکتا رہتا ہے۔ تیس ہو تو بلا کی گرمی کھلائی جاتی ہے۔ اگر تپتیس ہو جائے تو لوگ بلبلا اٹھتے ہیں۔ پھر قدرت کا یہ ”ستم“ ایک دو دن بعد نرم پڑتا ہے اور بلا کی بارشیں شروع

پکڑے لفافے کو دیکھا۔ پھر وہ لفافے کی جانب لپکا اور سر جی نے لفافہ پیچھے چھپا کر کہا۔ ”یہ پکٹ میں کھائیں گے۔“ حیران مفتی کو پھر بتایا گیا کہ آج پہلی بار اچھے موسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی پارک میں کھلے آسمان اور فضاء میں بیٹھنے کا اردادہ ہے۔

نورنؤ میں آپ کہیں بھی رہیں۔ آپ کے ارد گرد محدود پارک ہوتے ہیں۔ اکثر میں جاگنگ ٹریکس بنے ہوتے ہیں۔ خوب صورت گھاس سے ڈھکے لان اور ان کے کناروں پر رکھی بنجیں۔ ساتھ کوڑے دان رکھے ہوتے ہیں اور اسی لیے ایک کانڈ کا ٹکڑا بھی آپ کو نظر نہیں آتا۔ ہم بھی ایک ایسے ہی پارک میں گھاس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ ایک قبر باس میں گرم چائے تھی۔ ساتھ چائے کے گگ اور ڈسپوزیبل پیلیں تھیں۔ شہباز چادر پر لیٹا تھا۔ مفتی اسے گھور رہا تھا بلکہ ہم سب سے ناخوش تھا کیونکہ ہم بیٹنج کی بجائے گھاس پر بیٹھے تھے۔ پاکستان کی طرح کوئی یہاں گھاس کو نہیں رو دیتا جس طریقے سے ہم ”ماہلوں“ کی طرح اس کا ستیاناس کر رہے تھے۔ سر جی اور مفتی کی بحث شروع ہو چکی تھی۔ سر جی کہنے لگے۔ ”یہ کیا پکٹ کا کڑا کر بیٹھوں پر بیٹھیں۔“ مفتی نے کہا۔ ”اوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔“ شہباز بولا۔ ”اگر کوئی بیٹنج پر بیٹھنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں درختوں کے سایوں میں نرم دھوپ پر بیٹھا اس نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا جو صدیوں بعد ایک بڑے انتظار کے بعد مجھ پر چھایا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹ میں کچھ بادل ہماری طرح آوارگی سے گھوم پھر رہے تھے۔ ہوا میں قدرے خشکی تھی مگر ہم اپنی جیکٹوں اور گرم ٹیوں کی وجہ سے بے آرام نہ ہو رہے تھے۔ گرم چائے مجھے دلا سے دیتی اور میں بہل رہا تھا۔ مارٹن گرو روڈ پر گاڑیاں اور بسیں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں مگر ان کا شور ہم سے دور تھا۔ کوئی بے ہنگم ٹریفک نہ تھی اور نہ ہی دھکم پیل۔ سارا نظام ایک قاعدے اور فریے سے چل رہا تھا سوائے ہمارے، جو قدرے بدتمیزی سے چادروں پر پاؤں پھیرنے کے لیے تھے۔ کچھ دیر میں مفتی بھی نارل ہو گیا اور پھر ہماری طرح وہ بھی نظریں چرا لے لیٹا تھا۔ مطمئن محسوس میں نیلے آسمان تلے تیرتے بادل رگ و پے میں کیا کیا سر میں بھرتے ہیں، اس کا احساس مجھے پہلے ہارکینڈز میں ہو رہا تھا۔ پہلے ہم چائے اور سو سے کھا کے خاموش بڑے رہے اور پھر ایک دوسرے سے دلوں کے حال جاننے لگے۔ دلوں کے تار چمڑے تو ہماری باتیں سڑوں کی طرح بننے لگیں۔ باتیں کرتے بھی آنکھیں خالی خالی نظر آنے لگیں اور کبھی مسکرانے لگیں۔

تو بتانے والے کو پچاس ڈالر ملتے ہیں۔ خرچا نکل کر اسے پچیس تیس ڈالر بچتے ہیں۔ یہ امریکا اور کینیڈا ہے جہاں کچھ لوگ اس طریقے سے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ کمروں میں کینٹرنگ کرتے ہیں اگر کسی کے گھر پر پارٹی ہو تو وہ کینٹرنگ کروا لیتا ہے۔ بریانی، نہاری، حلیم اور توڑم کے علاوہ سب کباب بھی آپ کو ہوں کی نسبت بہت کم قیمت پر پڑتے ہیں۔

صیبہ خاتم ہمارے ملک کی بہت بڑی اداکارہ تھیں۔ ان کی سنوٹش کمار سے شادی ہوئی۔ ایک باعزت مقام پایا۔ لاکھوں پرستار تھے۔ لوگ آگے پیچھے پھرتے تھے۔ پچھلے دنوں ایک خبر پڑی کہ وہ اسٹور پر مسو سے بنا کر رنج رہی تھیں۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر مقامی اخبار کی خبر تھی۔ اس کو میں برا نہیں سمجھتا۔ ہر انسان اپنے موجودہ عہد میں زندہ رہتا ہے اور یہ ان کی بڑائی ہے۔

سر جی مسموں کا بھرا لفافہ پکڑے مطمئن کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پارک میں بیٹھ کر پکٹ منائیں گے۔ سر جی ہر وقت بھلے ہی وہ وقت نکلتا ہی کڑا ہوا، اس میں مثبت پہلو نکال لیتے تھے۔ یہ صفت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ میرے کچھ بڑھنے والے اس بات پر غصہ کرتے ہیں کہ سر جی آپ کو تنگ بہت کرتے تھے۔ میں انہیں بتاتا چلوں کہ سر جی کی وجہ سے ہم کبھی پریشان نہیں ہوئے بلکہ جہاں میں ڈرا لڑکھایا تو سر جی کا ہاتھ میرے کندھوں پر ہوتا۔ جب میری اور ان کی فیملی کینیڈا آئی تو ہم ایک ہی اپارٹمنٹ بلاؤنگ میں رہتے تھے۔ ہمارے روکنے کے باوجود ہر روز ان کا کوئی نہ کوئی بچہ کھانے کی ٹرے پکڑے ہمارے دروازے پر آ جاتا تھا۔ وہ اکثر جب بھی کھانا بتاتے تو ہم کو بھی اس میں ہمیشہ شامل رکھتے تھے۔ سر جی پر مالی مشکلات بہت آئیں مگر وہ خاموشی سے کسی کو کچھ بتائے بغیر ایلے سبے رہے۔ میں مالی طور پر بہتر ہوا تو میں نے انہیں کچھ رقم دینا چاہی۔ میری منت سماجت کے علاوہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئی اور انہوں نے ہم آنکھوں کے ساتھ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے حالانکہ معلوم تھا کہ انہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ ایسی خود داری بہت کم دیکھنے میں آئی ہے اور خاص کر جب کسی کے بچے محرومیوں کا شکار ہوں۔ اگر سر جی اپنی کچھ خصوصیات کے حامل نہ ہوتے تو شاید میں اسے سے انہیں نہیں اور شفقت کر دیتا۔

ہم اپارٹمنٹ واپس پہنچے تو مفتی چکن میں کھڑا کچھ مینا جھانک رہا تھا۔ مفتی کا چکن سے واسطہ صرف یہی تھا کہ کھانا کھالیا اور اس کو چکن صاف لے۔ شہباز کو اعتراض ہوتا تو سر جی صفائی کر لیتے۔ مفتی نے ہمیں دیکھا اور پھر سر جی کے ہاتھ میں



☆.....☆

شام سے ذرا پہلے ہم اپارٹمنٹ آئے۔ سردی کہیں دیکھی پڑی تھی اور سورج کے جاتے ہی وہ باہر آکر ہم پر برسے گی۔ ٹورنٹو ٹرنے لگا تھا کہ ہم اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ سر جی نے مجھے شوکا دیا۔ ”کمرے میں جا کر نرسین کو فون کرو۔ میں اتنی دیر میں کھانا لگا تا ہوں اور باہر کے فون کو شہباز کی دسترس سے دور بھی رکھوں گا۔“

”فون تو پہلے بھی آپ نے ہی اٹھایا تھا اور اب مجھے بچ میں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔“ یہ شہباز تھا جو سر جی پر لال بھسوکا ہو رہا تھا۔

میں جب کمرے میں جا رہا تھا تو سر جی شہباز سے یہ کہہ رہے تھے۔ ”تم آڑے ترے مجھے کیوں ہوتے ہو جب دل میں کوئی میل نہیں ہے؟“ ان کی بات آگے بڑھ رہی تھی کہ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

میں نے فون ملایا تو نرسین نے ہی اٹھایا۔ مجھے یہ گمان تھا کہ وہ شکوے شکایتیں میرے سامنے رکھے گی اور میں جواب میں اپنے معروضات پیش کروں گا۔ مجھے یاپوی ہوئی جب وہ گھوڑے طراز نہ بنی۔ میری وضاحتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اس نے پوچھا۔ ”کب آئے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”کل میں نے فون کیا تھا تو سعد نے اٹھایا تھا۔“

وہ بولی۔ ”پھر فون بند کر دیا تھا؟“

میں نے سر جی کی غلطی بیان کی تو جواب میں صرف۔ ”ہوں“ کہا۔ میں نے پوچھا۔ ”ناراض ہو؟“

جواب آیا۔ ”نہیں، بالکل نہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔“

میرے سوالوں کے اس کے ہاں جوابات ختم ہو گئے تھے۔ میں خاموش رہا تو بولی۔ ”کوئی اور سوال نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ابھی کیا سوال پوچھوں جب کہ تمہارا جواب مجھے معلوم ہے۔“ یہ سن کر اس کی ہنسی مجھے سنا دی۔ میں نے پوچھا۔ ”نہیں کیوں رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”بیسو سال کب جوائن کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”تین دن بعد منگل کے روز۔“

اس نے جواب میں کہا۔ ”میں نے اپنے سوالات اس کے کر کے ہیں ملنے پر پوچھوں گی۔“ پھر ایک توقف کے بعد بولی۔ ”کل ویک اینڈ ہے۔ کیا مل سکتے ہو اگر فرمت ہے تو؟“

کسی نے سر جی کو کڑوا تو وہ بہنے لگے۔ دروازہ دکھان کی آنکھوں سے چپکنے لگا۔ باہر کی کھلی صاف ہوا کے جموے کے انہیں بیدار کر گئے۔ وہ کہنے لگے۔ ”میں پاکستان میں بڑی محنت اور مشقت کے بعد اپنے مقام پر پہنچا تھا۔ میں نے پڑھائی کی اور اس کا خرچہ اٹھانے کے لیے فٹ ہاتھوں پر سامان بیچا۔ شادی ہوئی تو معلوم ہوا کہ میری کوئی سالی امریکا میں عالی شان زندگی گزار رہی ہے۔ میں رشوت اور حرام کی آمدنی پر لعنت بھیجتا تھا۔ اپنی تنخواہ سے گھر جیسے بھی چلاتا مگر اچھا چلا رہا تھا۔ امریکا میں سالی صاحبہ ہر بار فون کر کے بہن کو کہتی کہ آپ لوگ بھی سب چھوڑ چھاڑ کر امریکا آجائیں۔ میں جاب سے گھر جاتا تو ہر وقت کہی سننے کو ملتا۔ اسی جبر کے تحت میں نے کینیڈا کی امیگریشن کے لیے درخواست دے دی۔ امیگریشن ملی تو گھر میں میرے علاوہ سب پر شادی مرگ کی کیفیت تھی۔ سب نے مل کر ”پوگرام“ یہ بنایا کہ میں کینیڈا میں انٹری دوں گا اور فیض صاحب وہیں سے مجھے لے کر امریکا چلے آئیں گے اور پھر میری زندگی بھی انہی کی طرح عالی شان ہو جائے گی۔ مجھے بھی آنے سے پہلے سب نے امام خاصن باندھے۔ داتا دربار بھی گیا۔ بہت سی امیدیں لے کر کینیڈا ایئر پورٹ آیا تو معلوم ہوا کہ فیض صاحب تو نہیں آئے۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ ندیم بھائی کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ انہوں نے مجھے لگے لگایا۔ میری تو تمام آرزو میں خاک میں مل گئی تھی مگر میں اپنے منہ سے کچھ نہ کہتا تھا۔“

پھر وہ کہتے کہتے رک گئے۔ اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ہم تینوں حالانکہ یہ سب جانتے تھے مگر ان کی دل سے نکلی باتیں سن کر خاموش اور اداس تھے۔

انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی اور پھر آسمان کی وسعتوں میں نظریں گاڑ کر بولنے لگے۔ ”میں اپنی جاب چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں شاید سیکوریٹی گارڈ کی جاب کے علاوہ مجھے کوئی اور جاب نہ ملے گی۔ فیملی کو اسپانسر بھی کر لیا ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو کر سوچوں میں ڈوب گئے۔ پھر سوچوں سے باہر نکلے تو بولے۔ ”کوئی بات نہیں۔ اللہ سب خیر کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے ان پر ایک سکوت طاری ہو گیا تھا۔

سارا ماحول بے رونق ہو گیا۔ شفیق جیسا شخص بھی کھوئی آنکھوں سے انہیں بک رہا تھا۔ ہم دل گرفتہ بیٹھے تھے اور سر جی پھر میری جانب دیکھ کر بولے۔ ”نرسین کو فون نہیں کیا؟ اس معصوم پر کیا گزر رہی ہوگی؟“ اور ہم سب کے کیوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

وہ ایک اکنز مزاج شخص تھا۔

باکمال جہاز راں کی حیثیت سے اسے بہت شہرت حاصل تھی۔ لیکن اس کی یہ خرابی بہت نمایاں تھی کہ وہ اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

اس وقت اس کا دماغ اس لیے آسمان پر تھا کہ اسے دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مضبوط مسافر بردار بحری جہاز کا کپتان بنا دیا گیا تھا۔

اس کپتان کا نام تھا کیپٹن ایڈورڈ زامستہ اور جہاز کا نام تھا ٹائی ٹینک۔ یہ وہی ٹائی ٹینک ہے جو ایک داستان بن کر رہ گیا ہے۔ نہ جانے کتنی کہانیاں اس پر لکھی گئی ہیں۔ ایک شاندار فلم بھی بن چکی ہے۔ دنیا کا بچہ بچہ اس جہاز کے نام سے واقف ہے۔ کیپٹن ایڈورڈ زامستہ کو وہ لمحات بہت اچھی طرح یاد تھے جب اس عظیم الشان بحری جہاز کو پہلے سفر پر انگلیشٹ سے روانہ کیا گیا تھا۔ اس کی منزل امریکا تھی۔

کیا شاندار انداز میں جہاز کی رخصتی ہوئی تھی۔ سیکڑوں لوگ بندرگاہ پر موجود تھے۔ ہزاروں غبارے اور کبوتر فضا میں چھوڑے گئے تھے۔ شاہی بینڈ مسلسل دھنیں بجا رہا تھا۔ خود کیپٹن زامستہ لوگوں سے مبارکبادیں وصول کرتے کرتے تھک چکا تھا۔

اس جہاز کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ اس جہاز کو اگر خدا بھی چاہے تو ڈیڑھ گھنٹہ (نحوذ باللہ) اس کی بناوٹ اتنی ہی مضبوط اور شاندار تھی۔

بالآخر یہ جہاز اپنے سفر پر روانہ ہوا۔

منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا وہ جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کیمین میں سویا ہوا تھا۔ اور خواب میں بھی وہ یہ

دوسری جب میں ادنی ٹوٹی رہی اور ناشتا کرنے کے بعد جائے کا ایک کپ میں کر باہر نکل آیا۔ مفتی، سر جی اور شہباز کیوں خاموش تھے، مجھے معلوم نہ تھا۔ میں اپارٹمنٹ سے باہر آیا تو کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ شاید سب جانتے تھے کہ باہر کا موسم میرے اندر آ بیٹھا ہے۔

میں کھانگ سب دے جانے والی بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا۔ شیشے کے کیمین سے ٹیک لگائے میں بس کے انتظار میں تھا۔ ویک ایڈ پر بیٹیں کچھ دیر سے نمودار ہوتی ہیں اور میں اس انتظار میں موسم کو سردی سے باہر آتے محسوس کر رہا تھا۔ برف پھل کر کبھی کی غائب ہو چکی تھی۔ درجہ حرارت دس کے قریب تھا اور سب لوگ اسی کو بہار کی آمد بتا رہے تھے۔ درخت گواہی تک بے برگ تھے مگر اب وہ بھی مسکراتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ بہار ٹی آد کی نوید انہوں نے بھی کہیں سے سن لی ہے۔ میرا ہاتھل بھی مجھے نئے موسموں کے

استعاروں کی خبریں دے رہا تھا۔ آج بھی موسم سرد تھا مگر بے چینی نہ تھی۔ اتنے میں ایک مظبوط الحال شخص کوئی پرانی سی جینٹ اپنے اوپر ڈالے گا تھا ہوا آیا اور شیشے کے کیمین میں رہی سچ برآ بیٹھا۔ میں بھی کھسک کر کیمین میں آ گیا تھا۔ اب میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کن انھیوں سے کیمین کے کونے میں دیکھ رہا

میں چپ رہا تو بولی۔ ”سجھ کے لیے کل بے بی سنگ کروالوں کی۔“

میں نے ہائی بھری اور کل کیل سب دے پر گیارہ بجے طے کا وعدہ کیا اور دنوں بند کر دیا۔

آج وہ ابھی ہوئی تھی یا کہ میں، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا اور سوچوں کو باہر پھینکا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کل کیا بات ہوئی ہے؟ کوئی بات ہوئی ہے یا آج فون والی ہاں ہوں میں بات ختم ہوگی۔ میں پرنس چارمنگ سے دوبارہ وہ ندیم بن گیا جو رتنوں کی تختیوں سے لڑتا چلا آ رہا تھا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو سر جی اور شہباز کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور میرے جوابات وہی صرف ہوں یا ہاں میں تھے۔ ان کی جانب سے کوئی سوال نہ آیا کیونکہ شاید میرے چہرے پر لکھے جوابات انہوں نے پڑھ لیے تھے۔

دوسرے دن کا موسم ویسا ہی تھا جیسا کل تھا۔ ٹھہرا ہوا اور خوشگوار۔ ہوا میں چل رہی تھیں مگر خوش ہونے والوں کو سلی دیتی ہوئیں۔ ٹیلا آسمان میرے سر پر چھایا تھا اور وہی بادلوں کے چند آوارہ بکڑے ہواؤں کی سمت رواں دواں تھے۔ میں نے جینٹ کی جیب میں سرین کے لیے خریدا گیا ریفریم رکھا۔

دیکھ رہا تھا کہ جب وہ امریکا کی بندرگاہ پر اترے گا تو وہاں کتنا شاندار استقبال ہوگا۔  
بہت سہانا خواب تھا اور اس سہانے خواب میں اس وقت گڑبڑ ہو گئی۔ جب کسی نے دروازے پر زور زور سے دستک دینی شروع کر دی۔

وہ بہت جھٹلایا ہوا بستر سے اتر اٹھا۔ پھاڑ کھانے والا انداز تھا اس کا۔ اس نے اپنے کین کا دروازہ کھولا تو اس کا ایک ماتحت بہت پوکھلایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا بات ہو گئی۔ کیا قیامت آگئی۔“ اسٹھ نے پوچھا۔

”جناب آئس برگر.....“ ماتحت نے بتایا۔ ”جہاز کے راستے میں آئس برگ آرہے ہیں۔“

”کس نے بتایا تم کو۔“

”ہمیں اطلاع دی گئی ہے جناب۔“

”بے وقوف انسان۔ کیا تم لوگوں نے ٹائی ٹینک کو معمولی بوٹ سمجھ رکھا ہے کہ آئس برگ سے ٹکرا کر الٹ جائے گی۔“

”پھر بھی جناب۔ خطرہ تو ہے نا۔“

”کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ یہ جہاز خود اپنی رکاوٹ صاف کر دے گا۔“

اور کیپٹن اسٹھ اور اس کے عملے کے کچھ افراد کی یہی ایک ایسی زبردست غلطی تھی جس نے ٹائی ٹینک جیسے جہاز کو برف کے تو دوں سے ٹکرا کر پاش پاش کر دیا۔

اسٹھ نے مائیکر ٹیک کو نظر انداز کر کے تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی کی تھی جس کی وجہ سے ایک اتنا بڑا حادثہ ہو گیا جو داستان بن کر رہ گیا۔

دوسرے کی نظروں کی زد میں تھے۔ آج اس نے سیاہ ڈریس پینٹ پر ہلکی نیلے رنگ کی شرٹ پہنی تھی اور اس پر براؤن جیکٹ بال شائوں پر بکھرے تھے اور رنگ پورے پلٹ فارم پر حاذی تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی اور ہنسی ہوئی میرے گلے میں جھول گئی۔ میرا اپنا وزن نورنٹو کی شدتوں نے بہت کم کر دیا تھا مگر میں اس کے وزن کو با آسانی سہہ گیا۔ میں اپنی فطرت کے تحت ہم کرار کر دو دیکھنے لگا۔ ایک دونوک پاس سے گزرے بھی تو ایسے جیسے کچھ دیکھا بھی نہ تھا۔ اس نے پہلے دن مجھ سے کہا تھا کہ نسرین ایران میں ایک پھول کا نام ہے اور اس دن واقعی معلوم ہو گیا کہ نسرین ایک پھول ہے۔ اس پھول کو توڑنے کی بجائے میں نے سوکھ کر احتیاط سے اپنی ٹخن پر بٹھ دیا مگر اس کی خوشبو میرے وجود میں بھرنے لگی۔

وہ مسکرا رہی تھی، پھر کہنے لگی۔ ”شکر ہے تم نے اپنے جنگلی بال کو کٹوائے۔“ پھر دیکھ کر بولی۔ ”بال کٹوانے سے کوئی فرق تو نہیں پڑا مگر ٹھیک ہے۔“

میں خاموش کھڑا مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دراصل اس کے اس طرح گلے گلنے سے میں ذرا گھبرا گیا تھا۔ کین سینٹر میں تو ایک دو بار کسی وجہ سے ہاتھ پکڑا تھا ایک آدھ بار

ہے۔ میں ذرا متوجہ ہوا تو وہ سامنے شیشے کے پار میز پر آتی جانی ٹریفک دیکھنے لگ گیا۔ یہ تماشیا پھر شروع ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ کین کے کونے میں کوئی جیتی چیز پڑی ہے اور وہ میری نظریں بجا کر اسے اٹھانا چاہتا ہے۔ میں نے غور سے جواب کین کے کونے میں زمین پر دیکھا تو دس سینٹ کا سکہ پڑا تھا۔ وہ ”جیتی چیز“ اس کی نظر میں قارون کا خزانہ تھی جو وہ مجھ سے چھپ کر اسے بھھاننا چاہتا تھا۔ میں اندر سے دلی گیا۔ میں دنیا کے ترقی یافتہ ملک میں کھڑا تھا اور وہ ملک جو ناروے اور سویڈن کی طرح سوئٹل امداد دیتا ہے۔ اب اس شخص نے اپنی بائیں ٹانگ کو لمبا کیا اور اپنے پاؤں سے آہستگی سے اس خزانے کو اپنی طرف کھینچنے لگا اور آخر کار وہ کامیاب ہو گیا۔ کینیڈا کی حکومت ناکام ہوئی۔ میرے ذہن میں یہ خیال اسی لمحے اتراکہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی ہر ایک کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔ بھلے وہ دنیا کے امیر ترین ملک ہی کیوں نہ ہوں۔

بس آئی اور میں کینک سے ہوتا ہوا کیل سب دے پر اتر۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا اور سامنے چمکتے فرش پر رکھی بیچ پر دکتی نسرین بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں اترتے مسافروں پر تھیں۔ چند لوگ میرے ہمراہ اترے اور ہم ان لمحے ایک



اس حادثے میں 1514 افراد ہلاک ہوئے اور ایک سو اسی کمین کا نقصان ہوا تھا۔  
انسان اگر غلطیاں نہ کرے تو اتنے بڑے حادثے کیوں رونما ہوں۔ ایسے حادثے نہ یاد دلاتے ہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔  
بعض غلطیاں انسان کی اپنی ذات یا اس کے گھروالوں تک محدود رہتی ہیں۔ لیکن کچھ خطاں ایسی ہوتی ہیں جو تاریخ کا حصہ  
بن جاتی ہیں، اور ان کی وجہ سے تاریخ بدل جاتی ہے۔ اور بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔

جو زمین اور ول سن کی جوانی گزر چکی تھی۔ اور اب بڑھاپا آ گیا تھا۔  
ان کی شادی کو چالیس سال ہو چکے تھے۔ چالیس سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ سلیس پیدا ہوئیں اور جوان ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان  
کی زندگی میں بھی وہ دن نہیں آئے تھے جب انہیں معاشی طور پر فراغت حاصل ہوتی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ میکس ویل قصبے میں  
گزر رہا تھا۔ وہ اسی قصبے میں بڑھتی کا کام کیا کرتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ فرنیچر بنایا کرتا تو گویا جوانی محنت کرتے ہوئے ہی گزر گئی۔  
دونوں میاں بیوی ملازمتیں کیا کرتے اور اچھے دنوں کے خواب دیکھتے۔ بیوی ہمیشہ ایک خواب دیکھا کرتی کہ ان کے پاس  
اچانک کہیں سے دولت آگئی ہے۔

وہ جب اپنا یہ خواب اپنے شوہر کو سناتی تو وہ اس پر افسوس ہی کرتا رہ جاتا۔ دن اسی طرح گزرتے چلے گئے۔  
اولاد بھی ہوئیں اور وہ اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بیٹے انگریز سے امریکا چلے گئے اور وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔  
اب یہ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو چکے تھے اور اپنے اپنے خوابوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ بیوی کو لائبریری کے کلکٹ  
خریدنے کا شوق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کوئی نہ کوئی لائبریری اس کے نام نکل آئے گی۔  
اس بار بھی اس نے ایک کلکٹ خرید کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار ضرور کوئی عجز ہوگا۔  
وہ اپنے شوہر سے کہتی۔ ”فرض کرو۔ اگر ہمارے پاس ڈیجری دولت آگئی تو ہم کیا کریں گے۔“

رکے۔ جمیل کے بچوں بچ ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہمبر پارک  
میری اور جمیل نظروں سے نکل کر اپنے دلکش منظروں میں پھیلتا چلا  
گیا۔ ہم پارک میں گاڑی سے نیچے اترے اور میری نگاہیں  
نیلے شفاف آسمان پر جمیں جہاں کہیں کہیں بادل منڈلا رہے  
تھے۔ جمیل کا پانی برف کی تہوں سے نکل کر آسمان کے رنگوں میں  
رنگ گیا تھا۔ سردی تھی مگر گداز حدت بھی تھی، اسی لیے ستانی نہ  
تھی۔ میں دل میں نرسین کے ذوق پر اسے داد دے رہا تھا۔  
کیب چلی گئی تھی۔ نرسین مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ ”کہیں  
ان مناظر میں کھو کر مجھے بھول ہی نہ جاؤ؟“

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب میں کہا۔  
”جہیں یاد رکھنے کے لیے یہ مقام اور وقت ہی بہت ہے۔“  
یہ پارک جمیل کے اعتراف ایک جزیرہ نما میں بتایا گیا تھا۔  
دریا ہمبر نورڈن کے مغربی حصوں سے گزر کر اس میں آگرتا ہے۔  
اس جزیرے میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی شفاف پانیوں والی  
جھیلیں تھیں۔ ان جھیلوں پر عریضیاں تیر رہی تھیں اور بہت سے  
پانیوں پر اپنی پرواز بھر رہی تھیں۔ پختہ اور کچے راستے تھے جن پر  
کچھ لوگ ہماری طرح چل رہے تھے۔ درخت تھے مگر سونے  
تھے۔ چندا بعد انہی پر بزم لباس اترا تھا اور وہ مختلف رنگوں اور  
عکسوں میں پانیوں کے اندر نظر آنے لگے تھے۔ گھاس کے لان

مجھ سے کھرا تھی۔ آج کا دالہا نہ پن میں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔  
ٹرین شور مچاتی چلی گئی اور ہم ابھی دم کھڑے تھے۔ میں نے  
پوچھا۔ ”کیا یہیں کھڑے رہنے کا پروگرام ہے؟“  
وہ بولی۔ ”آج میں تمہیں کہیں لے چلوں گی۔“ پھر کچھ  
لے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور سوال کیا ”چلو گے؟“  
میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سب دے کی  
سیر حیاں چڑھ کر باہر نکل آئے۔ موسم ایک دم سہانا ہو گیا تھا۔  
میں دونوں ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالے کھڑا تھا تو وہ کہنے لگی۔  
”خاموش کیوں ہو؟“

میں نے جواب دیا۔ ”جہیں معلوم تو ہے کہ میں ایسی ہی  
رہتا ہوں۔“

وہ مجھ سے گئی اور میرا بازو پکڑ کر بولی۔ ”کبھی تو میرے  
ساتھ اپنی اس خاموشی کو تو ڈبا کرو۔“  
یہ کہہ کر اس نے ایک کیب کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور سے  
بولی۔ ”ہمبر پارک جانا ہے۔“

ڈرائیور کو گھورا۔ اس نے سر ہلایا اور ہم دونوں کھجلی سیٹ  
پر بیٹھ گئے۔ کیب نے موڑ کاٹا اور جنوبی سمت بڑھتی چلی گئی۔  
چندہ منٹ بعد کیب نے گاڑی اکیس پھریں دے کر اس کی اور  
پارک لائنز سے ہوتے ہوئے ہم اٹار پو لیک کے سامنے آ

”کرنا کیا ہے۔ دنیا کی سیر کو نکل جائیں گے۔“ شوہر جواب دیا کرتا۔  
ایک صبح بیوی نے نررتے ہوئے ہاتھوں سے شوہر کو جھنجھوڑ کر بے دار کیا۔ ”یہ دیکھو۔ یہ دیکھو۔“  
”کیا دیکھوں۔“

”یہ ڈائری۔ یہ اخبار۔“ بیوی نے کہا۔ ”میں نے اس پر لائٹری کے ٹکٹ کا نمبر لکھ لیا تھا۔ یہ نمبر دیکھو۔ یہ اخبار دیکھو۔ ملاؤ نمبر۔“

اب تو شوہر کی بھی نیند ہوا ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی نمبر ملایا۔ دونوں ایک ہی نمبر تھا۔ اس کی آواز کا بچنے لگی تھی۔ ”ہاں ہاں۔ وہی نمبر ہے۔ جاؤ، جلدی سے ٹکٹ لے کر آ جاؤ۔“

بیوی دوڑتی ہوئی بکن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آئی تو اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ”وہ۔ وہ ٹکٹ تو نہیں ہے۔“

”نہیں ہے۔ کہاں رکھا تھا تم نے۔“

”میں نے کافی کی خالی شیشی میں رکھا تھا۔“

”اوہ گاڈ۔“ شوہر نے اپنا سر تھام لیا۔ ”وہ شیشی۔ وہ تو میں ڈسٹ بن میں پھینک آیا ہوں۔“

”کیا۔“ بیوی کے بھی ہوش اڑ چکے تھے۔

”اس کے بعد نہ تو ان بے چاروں کو وہ ٹکٹ مل سکا اور نہ ہی انعام مل سکا۔ آپ کو معلوم ہے۔ انعام کی رقم جتنی تھی۔ 181 ملین۔“

جی ہاں 181 ملین۔ میرا خیال ہے کہ کسی انعام کے حوالے سے کسی غلطی کی اتنی بڑی سزا کسی کو نہیں ملی ہوگی۔

نعمان اشرف، راولپنڈی

نسرین نے میرا دیا پر فحوم اپنی جیکٹ کی جیب سے نکالا جو میں نے نمٹھن سے نسرین کے لیے خریدا تھا۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی اور تارو پر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”کیا تم نے مجھے نیویارک میں باور کھایا پھر سرجی تم کو یاد کراتے رہے؟“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم یاد تو نہیں مگر سرجی کو شاید بہت یاد آ رہی تھیں۔ جی تو وہ اپنی طرف سے مجھے یاد دلاتے رہے تھے۔“

وہ خاموش ہو کر جمیل کے نیلے پانیوں کے پار ڈاؤن ٹاؤن کی سر بلند عمارتیں دیکھنے لگی۔ ایک مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سکوت کی دیوار تھی جو ماحول میں کہیں کھڑی تھی۔ اس فضاء میں بولنا جرم لگ رہا تھا اور ہم بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں کی خاص بات مختلف پرندے اور ان کے گونسلے تھے۔ پرندے چلی پرواز کرتے اور ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔ انہی کی آوازیں تھیں جو تنہائی کو زیادہ اجاگر کر رہی تھیں۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ”تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں کتنا ڈارک لگتا ہے۔“ میں ہنس پڑا اور کہا۔ ”نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میرے

تھے، جن پر بزنہ اس موسم میں بھی نمایاں تھا۔ بعد کے مہینوں میں انہوں نے کیا کیا رنگ و روپ دکھانے تھے اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ یہاں تنہائی کے گوشے تھے جن میں کوئی محل نہ ہوتا تھا۔

ہم ایک راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ارد گرد بانی تھا اور سامنے لیک انٹار یو کا حدنگاہ تک نیلا پانی جھلجھل کرتا نظر رہا تھا۔ دوسری جانب اونچی پارٹمنٹ بلڈنگز تھیں اور دور بڑے ٹورنٹو کا ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتیں آسمان کی بلند یوں کو چھوئی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے درمیان سی این ٹاور اونچائی میں سب سے یکساں نظر آ رہا تھا۔ جمیل کے پانیوں پر کچھ کشتیاں معلوم نہیں نیلے پانیوں میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ بس ایک منظر تھا جس نے مجھے محو کر دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے جمیل کنارے ایک درخت تلے رکھی بیچ پر آ بیٹھے۔ دھوپ ہم پر پڑتی تھی اور آج اس کی ہلکی سی پش محسوس ہو رہی تھی۔ وقت گھبر سا گیا تھا۔ آسمان چپ تھا اور سارے نظارے چپ تھے۔ دھیرے سے چلتی ہوئی ہم خاموش تھے اور ہمارے علاوہ سب ہی ہماری باتیں کر رہے تھے۔ ایسا نظارہ ایک انعام تھا جو مجھے آج نسرین کے ذریعے ملا تھا۔



ہم اس لٹچ کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ کچے اور کچھ پکے راستے تھے۔ مجھے راستے کی ساخت نہیں بلکہ راستہ دیکھنا تھا۔ اس جزیرے میں ایک جمیل کے بزرگ پانی اور اس پر تیرتی مرغائیاں تھیں۔ ہم وہیں ایک بیٹھ گئے۔

میں اب اپنے اصلی سوال پر آیا۔ ”بھائی نے دوبارہ رابطہ کیا؟“

وہ کچھ اداس ہوئی۔ پھر بولی۔ ”ہاں! کئی بار۔“

”پھر کیا سوچا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ چپ ہوئی۔ میں نے اس کا رخ اپنی طرف کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”اگر نہیں جانا چاہتی تو مت جاؤ۔“

اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے جواب دیا۔ ”وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

”پھر سے ایک بار بتاؤ؟“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے جمیل میں تیرتی مرغائیوں پر نظر ڈال کر کمزور لہجے میں کہا۔ ”تمہارا داپس پلے جانا ٹھیک ہے۔“

وہ رک سی گئی۔ بہت سی پرچھائیں اس کے چہرے پر آئیں۔ اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ میں نے اس کا سر قدام کر اپنے کندھے پر رکھ دیا اور پھر وہ آنکھیں برس پڑیں۔ میں خود آبدیدہ ہو گیا تھا۔ میری جیکٹ کندھوں پر کیلی ہو رہی تھی۔ میرے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں میں تھیں اور دائیں ہاتھ اس کے گرد اسے قہارے ہوئے تھا۔ بہت دقت گزر گیا۔ وہ تب تک بیتی رہی جب تک اس کے اندر کا دریا اتر نہ گیا۔ ہم اٹھے تو سائے لہے ہو رہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ کہنے لگی۔ ”اب کہاں جانا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تم نے ہی تو کہا تھا کہ ڈر تمہارے گھر پر ہوگا۔“

دوسرے آنکھیں میری جانب اٹھیں اور بولیں۔ ”نہیں! اب تم گھر جاؤ۔“

میں سمجھ گیا۔ اسے کیب پر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر اتارا۔ جانے سے پہلے وہ بولی۔ ”پھر ملو گے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”سعد کا سکول جون تک ہے۔ تب تک مجھے برداشت کرنا اور رابطہ ختم نہ کرنا۔“

میں نے وعدہ کیا اور اس نے اعتبار شاید نہ کیا۔ پھر میری آنکھیں پھر آئیں اور انہی نظروں سے دیکھا تو اسے اعتبار آ گیا

اور وہ مجھے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ تادیر سسکیاں لیتی رہی اور میں

ہاتھوں میں بھلے لگتے ہیں۔“ بات سمجھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا اور ہمارے سر کے اوپر گزرتے پرندوں نے اس کی ہنسی شاید پہلی بار سنی کیونکہ ایسا لگا کہ وہ ذرا دیر کو ختم گئے ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ”اس پارک کو تم نے کہاں سے ڈھونڈا؟“

وہ جمیل کے نیلے پانی میں کٹر پھینکتے پھینکتے رک گئی۔ کچھ سوچا اور پھر کٹر پھینک کر بولی۔ ”اگر بتا دوں تو میرا یقین کر لو گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں کر لوں گا۔“ اتنے میں سر ہوا کا کوئی جھونکا کہیں سے ہمیں ڈھونڈتا آیا اور وہ میرے ساتھ آگئی۔ جھونکا چلا گیا تھا مگر وہ جانا نہ ہوئی۔ کہنے لگی۔ ”تم ہر وقت مجھ سے کہتے تھے کہ ہائی پارک مجھے لے چلتا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں تنہائی اور خوب صورت مناظر بہت پسند ہیں۔ تم نیند پارک میں تھے اور میں نے تمہارے پیچھے اسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ لچاتی توقف کے بعد بولی۔ ”ایک بار میں یہاں اکیلی آئی تھی۔ یہ دیکھنے کے کیا واقعی تمہیں پسند آسکتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر تم نے کیا ڈھونڈا؟“ کہنے لگی۔ ”میں تین گھنٹے اس میں پھرتی رہی۔ اس میں تین چھوٹی چھوٹی جھیلیں دیکھیں۔ بہت سے پرندے اور خاموش پھر محسوس کیا کہ تمہیں یہ سب بہت پسند آئے گا۔“

میں حیران ہوا کہ میں بھی اس قابل ٹمبرا کہ ایک مہتاب جیسی لڑکی مجھ جیسے کے لیے یہ سب کر سکتی ہے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی مگرانی آنکھوں میں چمک تھی۔ پہلی بار میں نے اپنی گرفت اس کے کندھوں پر بھرائی اور اس نے سر میرے کندھے پر رکھ لیا۔

یادوں کے در تہے۔ وہ دیتی رہیں دستک کل رات بہت مجھ کو ستانی روئیں وہ آنکھیں

میں اتنے سالوں بعد یہ یادیں تحریر کر رہا ہوں اور اب بھی میرے ذہن کے پردے وہ چمکتی اور مسکراتی آنکھیں نمایاں ہیں۔ ہم بہت دیر بیٹھے رہے۔ زیادہ دیر خاموش رہے مگر کچھ نہ کچھ سنتے رہے۔ شاید کچھ سرگوشیاں، کچھ چاہیں، کچھ سرسراہٹیں اور کچھ ان کی باتیں۔

وہ اپنے ساتھ کچھ سینڈویچ بنالائی تھی۔ کوک کے دوٹن پیک اور دو پانی کی بوتلیں۔ مجھے بھوک نہ تھی مگر پھر بھی میں نے اس کے ہاتھوں سے سینڈویچ لے لیا۔ ایران میں مروج کا استعمال نہیں ہوتا۔ اچھا ہوا کہ نسرین نے بھی نہیں ڈالی تھیں۔

سے بمشکل اس محاورے کا مطلب پوچھا اور انہوں نے اس کا مطلب غلط بتایا کہ اللہ سب پر ایک نہ ایک دن اپنا کرم کرتا ہے۔ شہباز نے سنا تو اس کے زرد چہرے پر سوچ کی ایک لہر آئی۔ مفتی نے بھی میری بات کی تائید کی تو شہباز بہل گیا۔ حالانکہ سرجی نے بعد میں جو مطلب مجھے سمجھایا وہ یہ تھا کہ چھوٹے آدمی کو بڑا رتبہ مل گیا ہے مگر ہمیں شہباز کو رام کا تھا اور وہ ہو گیا۔ جب وہ مسکرایا تو سچی دھل گئی۔ سرجی نے ماحول کو نرم پایا شہباز سے مذاق کے موڈ میں آ گئے۔ پہلے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور پھر اس سے مخاطب ہوئے۔ ”یار مجھے تمہاری عقل کی سمجھ نہیں آتی کہ تم آدمی ہو کہ بے دال کے بدم۔“ مطلب ہم سب کو سمجھ میں آ گیا کہ تم تو نرے احمق ہو۔ شہباز تبھی سے تو اکھڑا اور ساتھ مفتی بھی۔ پھر کوئی شور اٹھا اور میں سیدھا کمرے میں جا گھسا اور دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔

☆.....☆

خان قیصر کا ایک دوست شیخ صاحب پاکستان سے ایگریگیشن لے کر آیا ہوا تھا۔ اس کا شاید کسی امیر کبیر خاندان سے تعلق تھا ایسے لیے خان صاحب اسے ہر وقت آنکھوں پر بٹھائے رکھتا تھا۔ خان صاحب نے اسے اپنے گھر پر رکھا ہوا تھا بلکہ شاید گود لیا ہوا تھا۔ ہر جگہ اسے ساتھ رکھتے۔ پہلی بار تعارف اس طرح سے ہوا۔ ”یہ میرے دوست شیخ صاحب ہیں۔ میرے کلاس فیلو تھے۔“ یہ تعارف کرا کر وہ ان کے گن گانے لگتے کہ ان کی اتنی ٹیکسٹریاں ہیں، اتنے پلازے اور اتنے گھر ہیں۔ ”یہ سب کہہ کر وہ مرعوب نظروں سے شیخ صاحب کو دیکھتے اور پھر شیخ صاحب مسکراتی اور تائیدی نظروں سے اس کے بیان کی تصدیق کرتے۔ یہ سب ہو چکا ہوتا تو خان صاحب دوبارہ سے وہی تعارف ایک نئے انداز میں شروع کر دیتے۔ ایک دن میں اس تعارف کا قصیدہ ہمیں اڑا ہوا گیا۔ یہ قصیدہ گوئی اتنی بڑھی کہ کئی بار شیخ صاحب اپنے تعارف پر سوچ میں بھی پڑ جاتے تھے۔ شیخ صاحب پہلے بھی کینیڈا آچکے تھے اور ان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ وہ کوئی پرانی سی گاڑی خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”شیخ صاحب! کون سی گاڑی لے رہے ہیں؟“

شیخ صاحب نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ہمیشہ کی طرح خان صاحب بول پڑے۔ ”یہ ہماری طرح کا کھٹا تو نہیں ہے۔ شیخ صاحب نئی گاڑی نکلو! میں گے۔“ پھر خان نے بھی مٹی والا مخصوص تہقید لگا کر شیخ صاحب کی سٹی کم تھی۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خان قیصر کی کھٹارا

خاموش کھٹارا ہا۔ وہ تھی تو آہستگی سے اسے اپنے سے جدا کیا۔ پھر سوچوں میں ڈوبا یکب میں آ بیٹھا۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو ان سوچوں کا ربط ٹوٹ گیا۔ میں خالی خالی سا اپارٹمنٹ کی جانب بڑھ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو لان میں کھڑے درخت بھی سوچوں میں ڈوبے تھے۔

☆.....☆

مہینوں گزر گئے مگر ہمارے اپارٹمنٹ کا ماحول تبدیل نہ ہو سکا تھا۔ ہم اس ماحول کے عادی ہو گئے تھے بلکہ اس کیفیت سے نکلنا بھی نہ چاہتے تھے جس دن سرجی اور شہباز کے چٹکنے نہ ہوں وہ دن بہت بھاری گزرتا تھا کمرے میں دن کم تھے جب ہم مسکرائے نہ ہوں۔ میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی سمیت تینوں کی بحث اور شور شرابے میں گھرے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا اور کوئی میری طرف زیادہ متوجہ نہ ہوا۔

معاملہ یہ تھا کہ شہباز کی Op-Co کے پروگرام کے تحت ایک لیب میں انالسٹ کی جانب ہوجی تھی۔ وہاں اسے ایک دو ماہ بعد منتقلی جاب ملنے کی پوری امید تھی۔ وہ سرجی کو کہہ بیٹھے تھے کہ آپ کو اپنی جاب کی فکر بھی نہیں اور ہمیشہ ایسے ہی نہ رہ جائیں۔ ایسے نہ رہ جانے کا مقصد یہ تھا کہ اسی سیکڑی گارڈ کی جاب میں جھپٹنے نہ رہ جائیں۔ سرجی نے اس کو طعنے سمجھا اور بہت کچھ اور سنوانے کے بعد یہ بھی بول گئے تھے۔ ”واہ بھائی واہ کیا تھے اور کیا اپنے آپ کو سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ تو ایسے ہوا کہ سمجھو نہ کہ سرجی کی جاب۔“

اب آج کے فساد کی وجہ تو چھوٹا ہی تھا۔ شہباز نے اسے اپنے دل پر لے لیا تھا اور سرجی اپنی بات پر جزم چکے تھے کہ انہوں سے صحیح بولا ہے اور ساتھ ساتھ رات کے کھانے پر بھی شہباز پر پابندی لگا دی تھی۔ کیونکہ وہ انہوں سے ہمیشہ کی طرح خود بنایا تھا۔ مفتی میٹرز سے فیک لگائے سرخ بننا بیٹھا تھا۔ شہباز لال جھجھکا ہو کر کارپنٹ پر ہو کر رہا تھا اور سرجی اپنے گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھے اپنے چہرے پر آرزو کی طاری کیے تھا بیٹھے تھے۔ میرے لیے یہ یہ صورت حال کوئی نئی نہ تھی اور اسی لیے میں واش روم میں داخل ہو گیا اور نہا کر تازہ دم ہوا۔ کپڑے تبدیل کیے اور باہر لیونگ روم میں آیا تو سبھی اپنی اپنی پوزیشن پر براجمان تھے۔

سب نے فل کر سارا واقعہ میرے گوش گزار کیا۔ میں نے شہباز کو سمجھایا کہ سرجی نے تمہاری بات کو طعنے سمجھا اور محاورہ بول گئے جو تمہاری سمجھ میں نہ آیا۔

شہباز کہتا رہا کہ چھوٹا ایک گالی ہے۔ میں نے سرجی

ہم خان کی گاڑی میں بیٹھے تو اس نے آگے بڑھ کر شیخ صاحب کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ شیخ صاحب ایسے بیٹھے جیسے انہیں ہم اغوا کر کے لے جا رہے ہوں۔ سرجی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے اپنی تمام تر توانائی لگا تے ہوئے میرے کان میں منگنٹا تے۔ ”یہ خان اپنی آمد کو خاک میں ملارہا ہے۔“

میں نے جواب میں اپنی دھن ان کے کان میں پھیڑی۔ ”مجھے لگتا ہے یہ شیخ کو خاک میں ملارہا ہے۔“

ہم مسی ساگا جی ایم موٹرز کے شوروم کی بارکنگ میں آ کر کے۔ میں متعجب تھا کہ کسی ایک شوروم میں اتنی زیادہ گاڑیاں ہو سکتی ہیں۔ پارکنگ کا ایک بڑا حصہ گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم تو صرف حیران تھے اتنی ساری گاڑیاں دیکھ کر مگر شیخ صاحب کو توش پڑ رہے تھے۔ ایسا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود نہیں بلکہ ہمیں دلائے آئے ہیں۔

خان شیخ صاحب کو پیچھے سے سہارا دیا دھکا دے کر شوروم کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر اس ہال میں کھڑے تھے جہاں چھوٹی بڑی کئی گاڑیاں چمکتی دکھائی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ گودن کا وقت تھا مگر شوروم کا وسیع ہال ٹیوب لائٹوں کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کسی ایک سیلر مین اور سیلر گرلز بھائی پھر رہی تھیں۔ مردوں نے کالے سوٹ پہنے تھے اور لڑکیاں گھٹنوں سے ذرا نیچے سیاہ اسکرٹس پہنے لہرا رہی تھیں۔

شہباز بولا۔ ”یہاں تو بڑا رونق میلہ لگا ہے۔“  
سرجی نے فرمایا۔ ”لگتا ہے میں ٹائم اسکوائر میں آ گیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”سرجی! خدا کا خوف کریں۔ کیوں ٹائم اسکوائر کو ایک شوروم سے ملارہے ہیں؟“ میں اندر سے خود بھی اتنی زیادہ گھبراہٹ دیکھ کر خوش تھا۔ ایک نیا تجربہ مجھے درپیش تھا۔ بعد کے سالوں میں یہ عید کھلا کہ شوروم میں اکثر لڑکیاں خوب صورت اور بے حجاب رہی جاتی ہیں۔ خان قیصر شیخ صاحب کو تھامے کسی سیل گرل کی تلاش میں تھا۔

اتنے میں ہم سب کی دعا قبول ہو گئی۔ ایک ایسی لڑکی جسے کسی شوٹس میں ہونا چاہیے تھا کہیں قریب سے طلوع ہوئی۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں اور رنگت چاندنی جیسی۔ کالے رنگ کے اسکرٹ تلے نئی ٹائیں اور بڑی ہیکل کی جوتی میں وہ سب سے نمایاں تھی۔

خان بے خیالی میں وہ قدم آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب

گاڑی پانچ چھ سو ڈالر میں لینا چاہتے تھے مگر خان صاحب نے ان کا مرتبہ اتنا زیادہ بلند کر دیا تھا کہ وہ اب اسی مقام سے باعزت اترنا چاہتے تھے مگر خان انہیں اترنے کا موقع نہیں دے رہا تھا اور شیخ صاحب بہت بے چینی کا شکار تھے۔ میں معاملے کو سمجھ گیا تھا۔ خان اس کی دولت سے ہمیں متاثر کرنا چاہتا تھا جیسے اس کی جاہلاد میں کچھ خان کو بھی ملے گا۔ شہباز یہ کہتا پایا گیا تھا۔ ”خان اور شیخ کا سیاہ جلد سامنے آجائے گا۔“ بقول شہباز کے کہ شیخ صاحب بس کے کمین میں اپنا ستر لگا لے گا پرنی گاڑی کبھی نہیں لے گا۔ سرجی پوچھ بیٹھے۔ ”ناشاء اللہ اتنی دولت ہے پھر پرنی گاڑی لینے میں حرج کیا ہے؟“

شہباز بولا۔ ”تم یہ نہ دیکھو کہ اس کے پاس دولت ہے۔ بس یہ دیکھو کہ شیخ صاحب شیخ ہیں۔“  
دوسرے دن خان صاحب اپنے کم شدہ شیخ صاحب کے ساتھ آئے۔ شہباز کو پہلے کچھ گالیاں دیں اور پھر بولے۔ ”شیخ صاحب آئے ہیں اور تم نے ابھی تک چائے کا بھی نہیں پوچھا؟“

سرجی بولے۔ ”ہمیں ان کا چہرہ مبارک دیکھ کر لگا کہ شاید آٹھ پہری روزے سے ہیں۔“  
خان صاحب نے ان کے چہرے کو بغور دیکھا اور تادیر دیکھتے رہے پھر بولے۔ ”پلاٹ تو ہے۔ لگتا ہے آج سے انہیں روزانہ اناروں کا جوس پینا پڑے گا۔“

اناروں کے ذکر پر شیخ صاحب اور زیادہ پیلے پڑ گئے۔ اناروں کے جوس کی جگہ چائے نوش کی۔  
خان ہم سے مخاطب ہوا۔ ”شیخ صاحب کوئی گاڑیاں دکھائی ہیں۔ تم لوگ بھی جی ایم موٹرز کے شوروم ہمارے ساتھ چلو۔“

میں نے کہا۔ ”گاڑی شیخ صاحب نے لینی ہے پھر ہم جا کر کیا کریں گے۔“  
جواب آیا۔ ”اسی بہانے تم لوگوں کو بھی گاڑیوں کی کچھ سمجھ بوجھ ہو جائے گی۔“

سرجی نے ترنت ہاں کر دی۔ میں نے بھی سوچا کہ اسی بہانے پہلی بار کوئی گاڑیوں کا شوروم بھی دیکھ لوں گا۔  
ہم تیار ہوئے اور میں نے بھانپ لیا تھا کہ شیخ صاحب گہری سوچوں میں کم ہیں۔ حالانکہ خان نے اسے گھر میں کرا دیا ہوا تھا، کھانا خود پڑے میں سجا کر دیتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی استری کر دیتا تھا مگر شیخ صاحب ایسے لگ رہے تھے کہ کسی چنگل میں پھنس گئے ہوں۔

طرف لے آیا۔ قیمت میں وہ کم نہ تھی۔ شیخ صاحب اب باقاعدہ ناراض نظر آ رہے تھے۔ ہم تینوں یہ تو سمجھ چکے تھے کہ شیخ صاحب کسی ہزار پندرہ سو ڈالر کی گاڑی کے پیچھے ہیں۔ خان شیخ صاحب کی یہ ”رسوائی“ برداشت نہ کر سکتا تھا اور خان کے لیے یہ شیخ صاحب کی کسر شان کے خلاف تھا کہ وہ ہمیں ہزار ڈالر سے نیچے کی گاڑی لیں۔ اس لڑکی نے بھی ہمت نہ ہاری۔ دوسرے بھی مختلف ماڈل دکھائے مگر یہاں اس کی دال گلنے والی نہ تھی۔

آج کی ساری جدوجہد اور مشقت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم سب باہر خان کی گاڑی کے قریب کھڑے تھے۔ ارد گرد گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سرجی دور کسی نامعلوم گاڑی کی جانب اشارہ کر کے یہ بتا رہے تھے۔ ”میرے خیال میں وہ ٹھیک رہے گی۔“

شیخ صاحب سرجی کو گاڑی میں دھکا دے کر بھجلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ میں شیخ صاحب کی جگہ آگے والی سیٹ پر براجمان تھا۔ شہباز بھی روکنے کی پھر کوشش کر رہا تھا۔

بعد کے سالوں میں مجھے گاڑیوں کی خرید و فروخت کے بارے میں زیادہ معلومات ملنا شروع ہوئیں۔ دنیا میں سب سے کم قیمت کی گاڑی امریکا میں ہے۔ کینیڈا میں ایک تو ٹیکس زیادہ ہے اور ڈالر بھی کمزور ہے جو گاڑی کینیڈا میں پچاس ہزار کی ہے وہ امریکا میں پینتیس کی مل جاتی ہے۔ امریکا کی مارکیٹ اتنی بڑی ہے کہ ڈیلر دو سو ڈالر منافع پر گاڑی سل کر دیتا ہے۔ آپ کینیڈا سے امریکا داخل ہوں تو سب سے بڑا فرق ہائی ویز اور بڑی گاڑیوں کا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہونڈا اکارڈ جھ پیڈلز فلی لوڈیڈ اور زیرو میٹر کار جو امریکا میں تیس ہزار ڈالر کی ملتی ہے وہ کوئی بتا رہا تھا کہ پاکستان میں ایک کروڑ کی پتی جاتی ہے۔ اسی طرح ٹیوٹا کیسری بھی اسی قیمت پر ملتی ہے۔ امریکا میں زیادہ مقابلہ جرمن، امریکن اور جاپانی گاڑیوں کے درمیان رہتا ہے۔ جرمن گاڑیاں اونچے درجے کی ہیں پر بھی بہت ہوتی ہیں۔

یہاں آپ گاڑی لیز پر بھی لے سکتے ہیں اور فنانس بھی کرواتے ہیں۔ لیز پر ایسے ہی ہے کہ دو یا تین سال کے لیے گاڑی آپ کو کرائے پر دے دی جاتی ہے۔ سال میں بارہ یا پندرہ ہزار میل سے زیادہ نہیں چلا سکتے۔ آپ ہر ماہ کرایہ دیتے ہیں۔ فنانس اب زیرو فیصد پر ہو جاتی ہے۔ بائچ سالوں میں آپ کو گاڑی کی قیمت ادا کر پتی ہوتی ہے اور کوئی سود نہیں لیا جاتا۔ پاکستان میں تو بینک پاکستانوں سے تیس فیصد تک سود لے رہے ہیں۔

سرخ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ میں شہباز اور سرجی اپنی اپنی دنیا بسائے کھڑے تھے۔ لڑکی نے چمکتے دانت دکھاتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور خان نے اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ خان قبضہ چھوڑنے والا نہ تھا جب تک شہباز نے آگے بڑھ کر اپنا حصہ نہ مانگ لیا۔ شہباز کی بدولت ہم رہ جانے والے بھی سیراب ہوئے۔ شیخ صاحب کی اداسی ذرا دیر کو کم ہوئی مگر پھر دوبارہ سے طاری ہو گئی۔

لڑکی نے اپنا تعارف کر دیا۔ نام مجھے یاد نہیں آ رہا مگر نسل سے مشرقی یورپ کی گھٹی تھی۔ اس کا سوال سب سے تھا۔ ”میں آپ کی کیا دکر سکتی ہوں؟“

جواب میں خان صرف بولا اور بات شیخ صاحب کے قصدوں سے شروع ہوئی۔ ساری ٹیکنریاں، پلازے اور سب کچھ کھانچا تو لڑکی نے پوچھا۔ ”آپ کو گاڑی چاہیے؟“

شیخ صاحب کی بجائے خان نے زور زور سے سر ہلادیا۔ اس لڑکی نے اس خیال سے کہ کہیں یہ امیر و کبیر عرب شہزادہ اپنی توہن پر تملنا نہ اٹھے، وہ سیدھے ہم سب کو لے کر آٹھ سٹر ایکسپریس کی طرف آئی۔ وہ کسی بادبانی مینشی کی طرح کشادہ اور وسیع تھی۔ اس گاڑی کی ہوش رہا قیمت اور دل رہا خصوصیات ایک بڑے پوسٹر پر آویزاں تھیں۔ سرجی تو گاڑی کو ہاتھ بھی ایسے لگا رہے تھے کہ جیسے وہ چھوٹے پر کرنٹ مارنی ہے۔ گاڑی کی قیمت دیکھ کر خان بھی گرتے گرتے پچا۔ ہمارے چہروں کے بدلتے رنگ دیکھ کر سیل گرل ہمارے بارے میں شکوک و شبہات میں پڑ گئی۔ وہ شیخ صاحب کو پہلے کوئی عرب شہزادہ سمجھ بیٹھی تھی اور خان کو شاید وہ بان۔ پھر وہ ہماری ”اصلیت“ سمجھی تو کسی اور کونے میں لے آئی۔

وہ پھر اس سے چھوٹی گاڑی دکھلانے لگی۔ قیمت خان کی نظر میں شیخ صاحب کے لیے مناسب تھی۔ خان انہیں راضی کرنے لگا کہ صرف چالیس ہزار ڈالر قیمت ہے اور ٹیکس وغیرہ ڈال کر پچاس کے قریب کی پڑ جائے گی۔

اب شیخ صاحب نے ٹیکس لائن لی اور کہا۔ ”میں نے گاڑی لینی ہی نہیں۔“

خان انہیں سمجھانے کے لیے اس کی جانب بڑھے اور انہوں نے وہیں سے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے انہیں روک لیا۔ وہ لڑکی اب حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ہم محنت کے عالم میں اس لڑکی کے بے پناہ حسن سے لطف اندوز بھی نہ ہو سکتے تھے۔

نہ نہ کرتے ہوئے خان شیخ صاحب کو زبردستی پکڑ کر امپالا کی

یہ سب سامان خریدا گیا۔ پھر گرمی شاپ سے آئے۔  
مصلے، دالیں اور سب کچھ خریدا گیا جو ہم پچھلے ایک ماہ میں  
ختم کر چکے تھے۔ المیز ان سے تازہ یعنی چکن اور چکن لیگ بھی  
دستیاب تھی۔ سر جی جاتے جاتے وہ بھی لیتے آئے۔ شہباز چننا  
رہا کہ بہت خرچا ہو رہا ہے۔ یہ سارا سیپا سر جی کا پھلپلا ہوا ہے  
اور یہ بھی دھمکی دی کہ آج وہ مفتی سے بات بھی کرے گا۔

سر جی نے یہ کہہ کر شہباز کو چپ کر دیا۔ ”تو ٹھیک ہے،  
اپنا چکن علیحدہ کرلو۔“ شہباز قن کھڑا رحم طلب نظروں سے مجھے  
دیکھ رہا تھا۔ میں نے شہباز کو سمجھایا۔ ”سر جی کا جود مل چاہے  
خریدنے دو۔ آخر چکا کر کھانا تو ہمیں ہی ہے ناں۔“

ہم اپارٹمنٹ پہنچے تو مفتی جاب سے آچکا تھا۔ ہمیں لدا  
پھداد دیکھا تو خاصا غظا نظر آنے لگا۔ پھر مجھے یقین دہانی کروائی  
کہ کل نوبت سے پہلے ہی ہوسال جاب پر بھی پہنچا ہے۔

رات کو سوتے تو درجہ حرارت سترہ تھا۔ صبح میں جلد اٹھ  
گیا۔ آج میرا بیسوا سال میں پہلا دن تھا۔ صبح کی نماز پڑھی۔ سر  
جی نے بھی سکیورٹی کی جاب پر جانا تھا۔ وہ بھی کلمہ پڑھتے اٹھ  
گئے۔ ان کا کلمہ مکمل ہونے سے پہلے میں وائش روم میں جا  
گھسا۔ وہ وائش روم کے دروازے تک میرا پیچھا کرتے مجھ پر  
کچھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ میں شاور لے کر تیار ہو کر باہر نکلا تو  
سر جی کمرے کا پردے ہٹاتے حیران و پریشان کھڑے تھے۔  
میری باہر نظر پڑی تو میں بھی ششدر رہ گیا۔ باہر کی ساری زمین  
اور درخت برف سے ڈھکے تھے۔ رات بھر برف پڑی رہی تھی۔  
ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ سترہ درجے سے رات کو یہ منہ بنی دس  
ہو جائے گا۔ یہ نورنڈو ہے۔ موسم بدلتے یہاں چند گھنٹے بھی نہیں  
لگتے کل تک ہم بہار کی آمد کو محسوس کر رہے تھے اور آج صبح  
برف نے ایک دلغریب منظر زمین پر بچھا دیا تھا۔ ایک خاموش  
اور نواں گورن جیسے ہمارے انتظار میں تھم کر کھڑا تھا۔ برف کی  
چادر پر ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔ جیسے کسی مستری نے قرینے سے  
اس کو ہموار کر دیا ہو۔ درخت برف تھامے جیسے مسکرا رہے تھے  
کیونکہ آج میری جاب کا پہلا دن تھا۔

سر جی حیرت کے سمندر سے باہر نکلے تو بے لگام بولنے  
لگے۔ ان کے بوتلے پر سوتے شہباز کے جسم نے پہلے جھٹکے لیے  
اور پھر سیپا سیپا کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”جاب  
تمہاری ہے اور سر جی کو کیا خوشیاں چڑھی ہیں؟“

سر جی نے باہر کے منظر اور برف باری کے قصیدے  
پڑھے تو وہ باقاعدہ گالیاں دینے لگا۔ ”یہ برف کا سیپا شاید  
ہمارے مرنے تک جاری رہے گا۔“

ہم گاڑی میں بیٹھے تو سر جی نے خان سے کہا۔ ”ہمارے  
آب و خوش میں آج کل کچھ فرق آ رہا ہے، کیا آپ ہمیں البین  
مارکیٹ اتار سکتے ہیں تاکہ کچھ گرمی کر لی جائے۔“

میں سر جی اور شہباز ایک ساتھ البین مارکیٹ پر  
اتر گئے۔ البین مارکیٹ ایک دسویں بازار ہے۔ اس میں حلال  
گوشت کی ایک بڑی دکان ہے جسے افغانی چلاتے ہیں۔ نام  
المیز ان ہے۔ ایک ہی جانور کے مختلف حصوں کے گوشت کے  
نرخ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ران کا گوشت اور چانپیں سب سے  
مہنگی ہوتی ہیں۔ سب سے علیحدہ علیحدہ کر کے ٹوکسوں میں سجا  
کر رکھے ہوتے ہیں۔ قیمہ چڑی اور بغیر چڑی کے دونوں طرح  
کا دستیاب ہوتا ہے اور نرخ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ شوکیوں  
کے پیچھے افغانی سفید اپھرن پہنے کھڑے مسکراتے ہوئے ہم  
سے بات کر رہے تھے۔

بکری کے پائے بھی صاف و شفاف کر کے رکھے  
ہوئے تھے۔ سر جی نے پہلے کچھ پائے خریدے۔ شہباز بولا۔  
”اتنے زیادہ پائے کھانے سے نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے۔“  
پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں نہ کھاؤں گا اور نہ ہی  
میرے حساب میں انہیں روج کرنا۔“

سر جی بولے۔ ”یہ مردوں کی خوراک ہے، مردوں کی۔  
تمہارا اس سے کیا لینا دینا۔“ سر جی کا شہباز کو مرد ہونے کا طعنہ  
دیتے سن کر افغانی بھی ذرب مسکرانے لگے۔ شہباز طیش میں  
آچکا تھا اور لالہ بھسوکا ہو کر سر جی کو کہنے لگا۔ ”میں نام کا نہیں  
عملوں کا بھی شہباز ہوں۔ کسی کو آزار نہ ہو تو آزما لے۔“

سر جی بولے۔ ”ایسے شہباز ہم نے بہت پڑھے  
ہیں۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”پڑھے ہیں یا دیکھے  
ہیں؟“

بولے۔ ”اقبال نے اسی شہباز کا بولا تھا جس کو مولے  
نے مار بھاگایا تھا۔“

سر جی کا اشارہ دراصل اقبال کے ساتی نامہ کے اس  
مصرعے کی جانب تھا

اٹھا ساتیا پردہ اس راز سے

لڑا دے مولا کو شہباز سے

اس سے پہلے بات آگے بڑھتی افغانی نے مداخلت کی۔  
”اور کیا کیا چاہیے۔“

سر جی سب بھول کر قیمہ، گوشت اور چکن کے بھاؤ  
پوچھنے لگے۔



## سرخ پیاز کینسر کے لیے مفید

نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں پیاز کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے، مگر سب سے لے کر بھول پر کھانا کھاتے وقت اسے سلاکے طور پر بھی کھایا جاتا ہے۔ پیاز کو جہاں گھروں میں کھانے تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہیں اسے گھریلو طبی ٹوکوں کے لیے آزمایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں پیاز کی کم سے کم 15 اقسام پائی جاتی ہیں جو تقریباً ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پاکستان میں زیادہ تر توت سفید پیاز ہوتی ہے، تاہم ملک میں ہلکے سرخ رنگ کی پیاز بھی پائی جاتی ہے۔۔۔ جو طبی حوالے سے پیاز کی دیگر اقسام سے نہایت مفید ہیں۔ ماہرین صحت کے مطابق سرخ پیاز بریسٹ اور کولون سمیت کینسر کی تمام اقسام کے لیے نہایت ہی مفید ہیں۔ سائنس جرنل میں شائع کینیڈا کی یونیورسٹی آف گیولف اونڈاریو کے ماہرین کی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق سرخ پیاز میں ایلتھو سائین اور کیور سٹین کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے، جو کینسر کے سیز کی افزائش کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ یونیورسٹی آف گیولف کے ماہرین نے پیاز کی 15 اقسام کا تجزیاتی مطالعہ کیا، اور ان کے استعمال کی وجہ سے صحت پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا۔ مطالعہ سے پتا چلا کہ پیاز کی پانچوں اقسام انسانی صحت کے لیے مفید ہیں، مگر باقی تمام اقسام میں کوئی اضافی فائدہ نہیں ہے، لیکن سرخ پیاز دنیا کی بڑی بیماری کے جراثیم کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں پیاز کی کسی بھی قسم کو نقصان دہ قرار نہیں دیا، جب کہ لوگوں کو تجویز دی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرخ پیاز کا استعمال کریں۔ سرخ پیاز نہ صرف کینسر کے مریضوں کے لیے مفید ہے، بلکہ یہ عام لوگوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کینسر کے امکانات سے محفوظ رکھنے میں بھی مدد فراہم کرتی ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

سرہی نے قرآنی آیات پڑھ کر ترجمہ کیا۔ ”تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو ٹھکراؤ گے۔“  
شہباز نے پل بھر کے لیے باہر کی نعمتیں دیکھیں اور پھر کروٹ لے کر کے بڑبڑاتا ہوا دوبارہ سو گیا۔

لیونگ روم میں سرہی نے ناشتا تیار کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے تئیں اچھا لباس پہنا۔ مفتی کو دوپہر کی شفٹ میں جانا تھا۔ اس نے مجھے کچھ نصیحتیں کیں اور پھر ان نعمتوں کو مجھ سے زبانی سنا۔ سن کر خوش ہوا اور اسی کے صلے میں اپنا خفیہ پرفیوم نکالا اور ہلکا سے مجھ پر چھڑکا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے اپنے لباس پر جیکٹ ڈالی جس کو میں نے آئندہ کی سردیوں تک کے لیے بھلا دیا تھا۔ سرہی اسی دوران کچھ زربل پڑھتے رہے اور میرے اپارٹمنٹ سے نکلنے تک مجھ پر پھونکتے رہے۔

ہیوسال کے مین دروازے کے بائیں جانب ایک آراستہ کمر تھا۔ ایک بڑی بیضی میز کے گرد آرام دہ کرسیاں بڑی تھیں جن پر ہم چھ مٹے بھرتی کیے ہوئے لوگ بیٹھے تھے۔ دو فلمائیں کے تھے۔ دو چائے کے اور میرے علاوہ ایک ساؤتھ امریکن ڈیانا تھی۔ ڈیبی (Debby) ہیوسال کی ٹریز تھی۔ کمر اردنشینوں سے جگمگا رہا تھا۔ فرش پر دبیز کارپٹ بچھا تھا۔ دیواروں پر گہرے رنگ کا دبیز پیر لگا تھا۔ ڈیبی اگر آج یہاں نہ ہوتی تو کوئی ماڈل ہوتی۔ دروازہ، نیلی اسکرٹ پر سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ براؤن بال کندھوں تک بھوم رہے تھے اور سبز آنکھوں کے ساتھ گوری رنگت میں وہ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔ میز پر اس نے موٹی موٹی فائلیں رکھیں تھیں۔ پروڈیکٹر اور اسکرین کی مدد سے وہ ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب خالی خالی نظروں سے اسے ہٹا جلد دیکھ آ رہے تھے۔ ڈیبی کے علاوہ جو چیز متحرک تھی، وہ ڈیانا تھی۔ دبلی پتلی، گندی رنگ اور کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ اس کی یہ خصوصیت مجھے بے چین کر رہی تھی کہ ڈیبی کی ہر بات کو وہ دہراتی اور پھر قہقہہ لگاتی تھی۔ اس کے قہقہے سے جو کچھ میں سمجھ پاتا وہ ہوا میں اڑ جاتا تھا۔ میں یا تو ڈیبی کو مسکرا کر دیکھتا اور یا پھر ڈیانا کو گھور کر۔

یہاں ہر فیکٹری میں ہیملٹن ایڈیٹنگ لاء پر پورا عمل کیا جاتا ہے۔ قانون حکومت بناتی ہے اور ہر جگہ اسے لاگو بھی کر دانی ہے۔ میں مختصر طور پر بیان کر دیتا ہوں کہ اگر آپ نے فیکٹری میں کسی سیکشن کا دروازہ کھلی کھول کر جانا ہے تو اس کا ایک طریقہ کار لکھا ہوتا ہے۔ آپ کو وہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کو دہرایا جاتا ہے۔ پھر آپ کی ٹریننگ شیٹ برآپ کے دستخط لیے جاتے ہیں اور وہ شیٹ آپ کی فائل میں لگ جاتی ہے۔ اگر کوئی دروازہ

ساتھ ایک بڑا سبک تھا جس میں ہر ایک اپنے برتن دھویا کرتا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ڈش واش تھا۔ یہاں ہر گھر میں اور کسی بھی لُج روم میں ڈش واش کی موجودگی بڑی اہم ہوتی ہے۔ اپنے استعمال شدہ برتنوں پر پانی ڈال کر اسے ڈش واش میں رکھتے جاتے ہیں۔ جب بھر جاتا ہے تو ایک بین دبا کر اس کو چالو کر کر دیتے ہیں۔ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اپنا کام خود کرتا ہے۔ برتنوں کو کٹی بار ایک اپنے نظام کے تحت ڈھوتا ہے۔ واشبک پاؤڈر سے صاف کرتا ہے، پھر پانی بہا کر انہیں چکاتا ہے اور آخر میں گرم پھونکیں مار کر سب کو خشک کر دیتا ہے۔ آخری زحمت آپ کو یہ کرنی پڑتی ہے کہ انہیں نکال کر دوبارہ ریک میں سجا دیں۔ برتن جانے کی یہ ڈیوٹی کوئی دور کر انجام نہیں دیتا۔ بلکہ مینیجر اور ڈائریکٹر کی سطح کے لوگ باری باری یہ کام سر انجام دیتے ہیں۔ کس دن کس نے یہ کام سر انجام دینا ہے اس کی لسٹ دیوار پر لگی ہوتی ہے۔

مجھے پہلے دن تو اس ماحول کا ادراک نہ ہوا۔ بعد میں ایک دن میں کافی پی رہا تھا کہ ہمارا ڈائریکٹر آپریشن لُج روم میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کاگ تھا۔ اس نے کافی مشین سے کافی نکالنا چاہی تو وہ خالی تھی۔ اس نے اوپر کے فیلٹروں کو کھولا۔ کافی کا ایک چمک نکلا، مشین کو کھول کر اس میں کافی ڈالی اور بین دبا کر گرم کافی نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر نہ کوئی عین اور نہ چہرے پر کوئی بیزاری تھی کہ کافی کیوں ختم ہوگئی ہے۔ اس نے پھوٹک بھرا اور مسکرا کر مجھے دیکھا تو ہابا ہابا ہل گیا۔ میں ششدر بیٹھا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد رہا تھا کہ میں یونیورسٹی میں پیکر تھا۔ صبح اپنے آفس میں بیٹھا تو چڑا اسی میرے پوچھے بغیر چائے بنا کر کپ میرے سامنے رکھ دیتا۔ ہم سب پیکر کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ تو سر اٹھا کر چڑا اسی کا شکر یہ بھی ادا نہ کرتے تھے۔ یہاں آپ کو کوئی چیز اسی نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی ایسی پوسٹ ہے۔ نہ کوئی کسی کا ڈرائیور ہے اور نہ کوئی گاڑی ہے۔ نہ کوئی آپ کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہے اور نہ کوئی آپ کا برف کیس تھامے آپ کے ساتھ چلا ہے۔ کیا نظام ہے جو پُر دقار انداز سے چل رہا ہے۔

پہلی بار میں نے ایک ڈائریکٹر کا ڈش واش سے پلٹیں اٹھاتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ اس کی مدد کروں۔ میں اس کے پاس گیا اور اندامہ عایان کیا تو وہ پہلے تو حیرت سے مجھے تنہا رہا پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ ”میرے ہی ڈیوٹی ہے۔ آپ کیوں زحمت کرتے ہیں؟“

کھولتے ہوئے اپنے آپ ہانسی اور کو معمولی سا زخمی کر بیٹھے تو وہ کہنی پر کیس کر سکتا ہے کہ مجھے دروازہ کھولنے کی ٹریننگ نہیں دی گئی۔ اس ٹریننگ کا کہنی کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی کسی مشکل سے بچ جاتی ہے اور درکار کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ ہر کام ایک ضابطے کے تحت کرنے لگتا ہے۔

جب تک ہماری دو ہفتے کی یہ ٹریننگ ختم نہ ہوتی، ہم کسی بھی طور فیکٹری کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ ٹریننگ آپ کو ہر سال دی جاتی ہے کیونکہ یہاں کا قانون اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

ڈیوٹی آج ہمیں مختلف چیزوں پر ہیلتھ اینڈ سیفٹی کی ٹریننگ دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ ڈیٹا کی بلاوجہ مداخلت پر مسکراتی بھی رہی تھی۔ بہت مشکل ہو گیا تھا میرے لیے کہ ایسے وجود کو نظر انداز کروں جو آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا اور ان کی ٹانگیں، سر، ہاتھ اور زبان سواڑ چل رہی ہو۔ یہ ڈیٹا تھی جس کے ساتھ میں نے ڈھائی سال کا کیا۔ ہم سب اس آگہا دینے والے پیکر سے قدرے بیزار اپنی ٹریننگ فلیس پر دستخط کرتے جا رہے تھے۔

درمیان میں کافی کا وقفہ ہوا۔ ڈیوٹی ہم سب کو اپنے پیچھے لگا کر لُج روم میں ایسے گئی جیسے لُج کے پیچھے اس کے چوڑے چلے ہیں۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے لُج روم تھا جس میں داخل ہوئے۔ چینیٹس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا لُج روم تھا جس میں ہم جا بیٹھے اگلے سالوں میں وہ ہمارے لیے ایک ہینکھ کا کام کرنا رہا۔ کئی رنگین میزیں تھیں جن کے گرد کرسیوں پر سفید پیٹ شرت میں لمبوں در کر بیٹھے کافی پیتے تھے اور ساتھ آنکھوں سے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہتے تھے۔ بیشتر گورے تھے۔ دہی بھی تھے جنہوں نے ایک میز کے گرد اپنا حلقہ بنایا ہوا تھا۔ ان میں پاکستانی اور اڑنی تھے۔ یہ دونوں ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں۔ اس میں منظر و انیس بھی بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی تراشیدہ داڑھی، چہرے پر بخجیدگی پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہا۔ منظر نے میرا ریفرفنس دیا تھا اور یہ جاب ملنے میں بہت سی وجوہات میں منظر کی سپورٹ بھی ایک بڑی وجہ تھی۔

دائیں جانب پوری دیوار پر شیشے کی بڑی بڑی کڑیاں تھیں جن کے بائیں طرف پرکری برف نظر آ رہی تھی۔ مکمل سناٹا تھا باہر اور جو شور تھا وہ صرف لُج روم میں گونجتا تھا۔ لُج روم کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر رکھا تھا جس پر بائیں جانب ایک بڑی کافی مشین تھی، کوئے میں ایک بڑا فریج بھی موجود تھا۔ ساتھ ایک ریک میں مگ، پلٹیں، گچ اور کانٹے پڑے تھے۔

میں بہت بہتر تھی۔ فلپائن کا فرڈی اور دوسرا فرانس تھا۔ فرڈی شکل سے فرڈی لگتا تھا اور بعد میں میرا اندازہ بھی ٹھیک نکلا۔ چھوٹے قد کا فرڈی جس نے سر کو شیو کیا ہوا تھا۔ تاؤ تاؤ کر ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ پانچ بجے یہ ٹریننگ ختم ہوئی۔ درمیان میں لچ بریک بھی تھا اور میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ منظر نے اپنی دور دہائیوں سے ایک جیسے دی اور ادھاساں دیا۔ میں آج بھی اس کا مشکور ہوں۔

پانچ بجے میں باہر نکلا تو سردی اپنے عروج پر تھی۔ مجھے پیدل آدھا میل چل کر ائر پورٹ روڈ جانا تھا۔ وہاں سے بس لے کر ڈکسن اترتا تھا اور پھر ایک اور بس سے اتر کر اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچتا تھا۔ گاڑی اپنی ہو تو دس منٹ بھی نہیں لگتے مگر ان بسوں سے پینتالیس منٹ کا یہ سفر پڑتا تھا۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو اسے خالی پایا۔ مفتی دوپہر کی شفٹ میں بیسویں سال گیا ہوا تھا۔ اس سے وہاں ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ سر جی اور شہباز ابھی اپنی جاب سے واپس آنے والے تھے۔ اگلے ہفتے شہباز کو بھی اپنی Op-Co کی جاب شروع کرنی تھی۔

میں نے خالی اپارٹمنٹ کو اپنے سکون کے لیے غنیمت جانا اور کپڑے بدل کر اپنے میزرس پر جا لیٹا۔ آج مجھے انتہائی خوشی تھی کہ مجھے اللہ پاک نے اتنے کم عمر سے میں اتنی اچھی جاب دے دی تھی۔ میری فیملی کی ایگریگیشن کا پروس چل رہا تھا اور امید تھی کہ چند ماہ میں وہ میرے پاس ہوں گے۔ میں اپنی سوچوں میں ڈوبا اپنے ایک ایک اس لمحے کو یاد کر رہا تھا جہاں سے نر کر کر آج میں یہاں آ پہنچا تھا۔

ٹورنٹو اترنے کے دو دن بعد میں ایک ڈنچی کرب میں جتلا ہو گیا تھا۔ آگے کھائی نظر آتی تھی اور پیچھے کا ہر نشان کھو بیٹھا تھا۔ اپنے آپ کو سنبالنے کی کوشش کرتا تو اور زیادہ کمزور ہونے لگتا تھا۔ سر اور کندھے جھکا کر چلتا تھا۔ پھر مجھے سر جی اور شہباز کا ساتھ ملا تو انھیں اوپر کو انھیں۔ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ ہمت نہیں ماری۔ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اللہ کی ذات پر عمل بھروسہ کر کے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ کین سینٹر میں گزرا وقت اور سرین کی دوستی نے مجھے بہت سہارا دیا۔ کین سینٹر نے مجھے کینیڈا کے نظام سے مکمل آگاہی دی۔ میں نیڈا اور اس کے نظام کو سمجھنے لگا۔ نئے آنے والوں کے لیے یہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس چیز کو سمجھنا اور جاننا بھی ضروری ہے کہ یہاں کے لوگ کون کون سے کمپلیوں میں دلچسپی

میں شرمندہ ہو کر واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ بعد میں دیکھا کہ اپنا کھانا یہ خود گرم کرتے تھے۔ کرسیاں بھری ہوتیں تو کوئی ان کے لیے اپنی کرسی نہ چھوڑتا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کچھ نہ کچھ نگل لیتے۔ بعد میں ہم بھی بدقیمر ہو گئے۔ کوئی ڈائریکٹر آ کر ہاتھ ملا کر آپ کی جانب مسکرا کر اشارہ کرتا تو میں دو انگلیاں جوڑ کر بیٹھے بیٹھے جواب دیتا تھا۔ ہم سب کام کرنے والے برابر تھے۔ ہر ایک نے اپنا کام سرانجام دیا تھا نہ کہ افسروں کو خوش رکھنا تھا۔

یہ نہیں کہ یہاں پر سیاست یا گروپ بندی نہ تھی۔ ہر سپروائزر کا اپنا گروپ تھا۔ چٹلیاں بھی ہوتی تھیں اور کان بھی بھرے جاتے تھے مگر شاید اپنے ملک کا دس پندرہ فیصد یہ کام یہاں ہوتا تھا۔

ہم لچ روم میں داخل ہوئے تو دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر تھا جس پر بہت سے بچ باکس پڑے تھے۔ ایک کپڑو بھی رکھا تھا۔

میں سیدھا اپنی ازلی عادت کے تحت دیسیوں کی ٹیبل پر گیا۔ منظر نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ اس میز پر سب ہم خیال لوگ بیٹھے تھے۔ میرا تعارف ہوا۔ سب نے مبارکباد دی۔ ان میں ایک فزیکا یا کیمیا کی گندمی رنگ کا شخص بھی تھا۔ موٹی عینک کے پیچھے سے مجھے جھانک رہا تھا۔ یہ تیز انیہ کار بنے والا یہودی تھا۔ وہ دیسیوں کی ٹیبل میں خوش رہتا تھا اور ہمارے اردو یا ہندی کو سمجھنے کے باوجود ہمارے لطفیوں پر ہم سے زیادہ ہنستا تھا۔ ایک پاکستانی اختر بھی تھا۔ چہرے پر ہر وقت غصہ چڑھا رہتا تھا۔ گوروں سے بہت متاثر تھا اور اپنا دیسی مذاق اسی وجہ سے ہمارے کانوں میں کرتا اور ہنسنے سے بھی منع کرتا تھا۔ ایک ہندوستانی پینک تھا جو سب سے ان کی تحوہ پوچھتا رہتا تھا۔ ایک سریش تھا جو کبھی کو گالیاں دیتا پایا جاتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ تھے اور ان کی کئی قسم کی باتیں تھیں۔ یہ لچ روم نہ تھا بلکہ ایک کلب تھا جہاں بیٹھ کر سب ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے۔ لڑتے بھی تھے اور کئی دن خوار بننے کے بعد مان بھی جایا کرتے تھے۔

پہلے دن منظر نے مجھے کافی بنا کر دی۔ میں میز پر خاموش بیٹھا سب لوگوں کا مزاج پر کھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دو گھنٹ بھر کے میں نے کافی کاک سمک میں رکھا جس کو منظر نے آ کر ڈش واشر میں رکھ دیا۔

ہماری کلاس یا ٹریننگ دوبارہ شروع ہوئی۔ ڈی جی کے انداز اور ڈیٹا کی مکملی دیکھتا رہا۔ ایک چینی لڑکی کینیڈی تھی۔ شکل

شہباز کھینا ہو کر اٹھا اور بولا۔ ”ہم مل کر کھانا بناتے ہے۔“

سرجی نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور یہ کہہ کر کچن میں گھس گئے۔ ”آپ کام مہا کام“ مطلب یہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے کیا کام سب سے اچھا ہوتا ہے۔ شہباز کوشن نے مطلب بتایا تو وہ کراہتا ہوا دوبارہ کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا اور اپنے پیٹ کو سہلانے لگا۔

سرجی نے آلو قیمہ بنایا اور اسے بھون بھون کر اس کا لطیفہ بنا ڈالا۔ میں نے روٹیاں گرم کیں اور رائیو بنایا۔ شہباز نے دسترخوان لگایا اور ساٹھ پانی جاگ بھر کر رکھا۔

اتنے میں مفتی آپہنچا۔ پہلے اس نے دیکھے میں جھانکا اور پھر مجھے مبارک باد دینے کے بعد آج کا احوال پوچھنے لگا۔ دبی کی برائیاں پہلے کیں کہ وہ ہم لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔ بس کر اگر ملے تو اس پر اعتبار نہ کرتا۔ اس نے سب کا ایک ایک کر کے غائبانہ تعارف کر دیا اور اس تعارف میں کوئی بھی اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔

کھانے کے دوران وہ ان سب کے ”شُر“ سے بچنے کی ترکیبیں میرے دماغ میں بٹھانے لگا۔ کون کتنا زائد ہر اسے اور کس کس سے کیسے بچ کر رہتا ہے، یہ سب میرے گوش گزار کرتا رہا۔ وہ جب خاموش ہوا جب میں نے سرجی کا محاورہ دہرایا۔ ”آدی جانے بے سونا جانے کے“ اس کی تشریح شہباز نے کی اور پھر مفتی سرخ آنکھوں سے بڑے بڑے نوالے لینے لگا۔

مفتی مجھے بتانے لگا کہ بیسویں سال میں سب سے زیادہ تکنیکی کام دو ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ ایک کرومیٹوگرافی (Chromatography) ہے اور دوسرا ڈیپارٹمنٹ کراس لنکنگ (Linking-Cross) ہے۔ بانی سب ڈیپارٹمنٹ اپنے ہی ہیں جیسے کوئی برتن دھوئے جاتے ہیں۔ وہ خود کرومیٹوگرافی میں کام کرتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”لگتا نہیں کہ تمہیں ان دونوں میں سے کسی ڈیپارٹمنٹ میں بھیجنیں اور اگر بھیج دیا تو معجزہ ہی ہوگا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بعد کے دنوں میں معلوم ہوا کہ ہر ایک کی خواہش تھی کہ انہیں ان میں سے کسی ایک ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا جائے۔ یہ دونوں ڈیپارٹمنٹ ہائی ٹیک مشینوں پر کام کرتے تھے جو یہاں کا تجربہ لے لیتا تو اسے کسی بھی بائیو ٹیک انڈسٹری میں یا آسانی جانب مل سکتی تھی۔

یہ سب جتنا مفتی نے میرے اندر خواہشات کے نئے سانپ کھڑے کر دیے۔ انسان کسی ایک مقام کو جب پاتا ہے تو

لیتے ہیں۔ آپس میں بیٹھ کر کن چیزوں کو زیادہ موضوعِ سخن بناتے ہیں اور کن چیزوں سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا مذاق کیسا ہوتا ہے اور کہاں کہاں کیا کرتے ہیں۔ آپ ان کے ملک میں آتے ہیں تو ان کو کھانا ضروری ہوتا ہے۔ وہ محاوروں میں بات کرتے ہیں اور مذاق بھی محاوروں میں کرتے ہیں۔ میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے کوئی جملہ لگایا لیکن میں نہ سمجھ سکا اور اس پر وہ ردِ عمل نہ دیا جس کی وہ توقع کر رہا ہوتا تھا۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ درمیان کے فاصلے بڑھتے چلے گئے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گورے اور دیسی علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے ہوتے جیسے میں بیسویں سال میں پہلے دن دیکھ آیا تھا۔ یہ ملک آپ کو اپنا ٹھکانا نہ چھوڑنے کا نہیں کہتے بلکہ یہ دوسرے ٹھکانے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پہلے سرجی وارد ہوئے اور کچھ دیر بعد شہباز داخل ہوا۔ سرجی آج کا احوال پوچھنے لگے۔ جب میں نے یہ بتایا کہ ہماری انٹرکٹو دبی بہت حسین نازنین ہے تو اس کا شجرہ نصب پوچھنے لگے۔ میں نے جب انہیں کچھ میرے ہمراہ لے بھرنی ہونے والے درکروں کے بارے میں بتایا تو بولے۔ ”یہاں کوئی نسرین والا چکر نہ چلا لیتا۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا پر خاموش رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنا ردِ عمل دینا ایسا ہی تھا جیسے آئیل مجھے مار۔ میں تو خاموش رہا مگر شہباز سرجی سے مخاطب ہوا۔ ”آج تو پہلا دن ہے اور ایک دن میں تو ان گوروں کے نام بھی مشکل زبان پر چڑھتے ہیں۔“

سرجی نے دانشمندی سے سر ہلایا اور شہباز سے بولے۔ ”تم بجافرا رہے ہو۔ آدی جانے بے سونا جانے کے۔“

شہباز تلملایا اور میں نے بڑھ کر کاپی جینسل اٹھالی۔ مطلب یہ بتایا کہ آدی کی پہچان ساتھ رہنے سے ہوتی ہے جیسے سونا کسوتی پر پہچانا جاتا ہے۔ سرجی کے بروقت محاورے محفل کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جب کبھی بر محل بولے تو اس کی بھی توجی بہت خوبصورت انداز میں کر لیا کرتے تھے۔

شام اتر چکی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر اندھیرا نہ تھا بلکہ

لیپ پوسٹ کی دو دھیاروشنیوں میں بے موسموں کی برف زرہ زرہ چمک رہی تھی۔ ٹھنڈ سے زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ہم آج سب مطمئن بیٹھے تھے۔ سرجی یہ کہہ کر اٹھے۔ ”کسی کو بھی رات کے کھانے کا احساس نہیں ہے۔“ کچن کی جانب جاتے جاتے شہباز کو بری طرح گھورا اور بولے۔ ”لوگ بھوک لگنے پر میری طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے بچہ ماں کی جانب دیکھتا ہے۔“

یہ پیغام لے کر ہم کسی دوسرے گھر میں داخل ہو جاتے۔ پھر ایسا بھی کئی بار ہوتا کہ ہم ان جانوروں کی آپس میں لڑائی بھی کرواتے۔ جیسے جیسے عید قریب آتی اور ہمارا جوش و خروش بڑھتا جاتا۔ اس عید پر کپڑوں اور نئے جوتوں کی فکر نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ ہم نے خریدنے ہی نہ ہوتے تھے۔ ہم وہی کپڑے پہنتے جو چھوٹی عید پر پہنتے تھے۔ ماں انہیں سنہال کر لوہے کے ٹریک میں کہیں چھپا کر رکھ دیتی تھیں۔ جوتے بھی کسی خفیہ جگہ پر محفوظ پڑے ہوتے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ سب خفیہ مقامات مجھے معلوم ہوتے۔ اس عید پر میری خوشی یہ ہوتی کہ ماں کی نظر بچا کر میں ان خفیہ خانوں میں اپنے خزانے کو ایک نظر دیکھ کر شاد ہو جاتا۔

عید کی نماز پڑھنے کے بعد گھر آتے۔ اس عید میں سویاں بہت کم کھاتا کیونکہ کچھ دیر بعد گوشت کھانا ہوتا تھا۔ قسانی کا انتظار بہت بے چینی سے ہوتا۔ میں کل میں کھڑا ہوتا۔ قسانی لیٹ ہو جاتا اور پھر مایوس ہو کر یہ ”اندھ ہٹا“ خبر سب کو سناتا۔

جانور ذبح سے بوٹیاں بنانے تک کا ایک ایک مرحلہ دیکھا جاتا۔ قسانی چلا جاتا تو میں کوشش کرتا کہ ان گھروں میں گوشت کا حصہ میں لے جاؤں جہاں سے عیدی ملنے کی امید ہوتی۔ بقر عید پر عیدی دینے کا زیادہ روانہ نہیں ہوتا تھا مگر میں نے امید کا دامن بھی نہ چھوڑا۔ کہیں سے کچھ نہ کچھ لے ہی آتا۔ پھر گوشت بھوننے کا مرحلہ آتا۔ کچھ کی بھنڈیا اماں جی بنا تیں مگر وہ اتنے بڑے کنبے پر پوری اترتی۔ گوشت بھوتا جاتا اور ہمیشہ کی طرح کچا کھاتا کر کھاتے۔

پورے علاقے میں گوشت کی ایک مخصوص بو بھیلی ہوتی۔ زیادہ تر کے پیٹ خراب ہو جاتے اور دوسرے دن اکثر ڈاکٹر اپنے متوقع مریضوں کے لیے اپنے کلینک کھولا کرتے تھے۔ ویسے ہی عید میلے ہوتے۔ وہی سنہیا گھروں پر رش پڑتا جیسے چھوٹی عید پر ہوتا تھا۔ تین دن خوب گزرتے۔ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ آج کل تو خوشی صرف اپنے انٹینس برکسی جاتی ہے۔ ان دنوں خوشی لپٹ جایا کرتی تھی۔ ان دنوں خوشیاں چھوٹی چھوٹی بھی ہوتی تھیں اور بڑی بھی ہوتی تھیں۔ ہر ایک کا اپنا لطف ہوتا تھا۔ ان دنوں ایک چنل بھی خرید لی تو کھنٹوں اسے دیکھتے رہے۔ آج کل کے مہنگے جوتے بھی لے آئے تو انہیں صرف پہننے وقت ایک نظر دیکھنا ہی بہت ہوتا ہے۔ آج کل سستی چیزیں کچھ بھی ہو گئیں اور ہنگی سستی ہو گئیں۔ اچھا کھانا ہم دن روپے میں کھا لیتے تھے اور جوتا پچاس روپے میں مل جاتا تھا۔ آج کل کھانا

اگلے دن اس کے آگے کا سوچنے لگتا ہے۔ خواہشوں کے گھوڑے بھی جھٹکتے نہیں۔ دودھ دودھ کر گر جاتے ہیں مگر ہر وقت سر پٹ بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ میں اور تمنا جاتا تھا مگر تمنا نے ایک تازہ چارہ میرے آگے ڈال دیا۔ میرے اندر کے ناشکرے انسان کے منہ سے ایک بار پھر رال کھینچنے لگی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمجھایا، ڈانٹا تو پھر کہیں جا کر ڈراپر سکون ہوا۔

کھانا کھا کر شہباز نے قہوہ بنایا۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ میرا مقام ڈور وال سے یک لگا کر بیٹھنا تھا۔ جہاں موری بیٹھے سے لگی ڈک سے گرم ہوا خارج ہو کر کمرے کی حدت بڑھاتی تھی۔ اس ہوا کا لمس میرے پیچھے گرم رکھتا تھا۔ اس جگہ بیٹھ کر میں ہر وقت طمانیت محسوس کرتا تھا۔

قہوے کی چٹکی بھر کر مفتی بولا۔ ”پرسوں بقر عید ہے۔“ چھوٹی عید کی خبر بھی مفتی نے ہم پر اسی طرح کرنا ہی تھی اور آج کا ہم بھی اس طرح آج ہم پر چھوڑا تھا۔ اس دن بھی ہم سکتے میں آگئے تھے اور آج بھی ہم اسی ماحول میں زرد چھروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ عید کا تہوار ہواور میں بے خبر رہوں؟ مگر میں بے خبر ہی رہا تھا۔ تہوار ماحول سے جنم لیتا ہے نا کہ کلینڈر سے۔ میرے اور مفتی کے علاوہ سب ساتھیوں کے لیے ضبط ناممکن ہو گیا تھا۔ ہم تینوں پتھرائی نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ آج میں جاب کی خوشی لا کر اپارٹمنٹ پہنچا تھا مگر عید کی ”خوشی“ اسے نگل گئی تھی۔ یہ کیسی عید تھی جو ہمیں افسردہ کر گئی تھی۔

ذرا ج کچھ نظر آ جاتا اور عید کا ڈنکا بجنے لگتا تھا۔ اس عید پر سب سے بڑی خوشی قربانی کا جانور لینے کی ہوتی تھی۔ آج کل جو پیسوں کی ریل پیل جانور لانے میں نظر آتی ہے وہ پہلے نہ تھی۔ ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق کوئی جانور خرید لیتا۔ ہم عید سے ایک ہفتہ پہلے بھیڑ لے آتے۔ ہمارے علاقے کے لوگ بکرا نہیں کھاتے ہیں اور اسی لیے بھیڑ کا رواج تھا۔ پہلے ایک نائی کو گھر بلوا کر اس کے بدن کے سارے بال اتارے جاتے۔ بال کاٹنے کے بعد اس کی صحت کا ٹھیک سے اندازہ ہو جاتا۔ پھر اس پر مختلف رنگ لگائے جاتے۔ ایک عدد بار اس کے گلے میں ڈالا جاتا۔ پھر اسے لے کر بچے بالے گھر گھر گھومتے۔ جس گھر جاتے وہ یا تو ہمیں نظر انداز کر دیتا یا کوئی تبرہ کرنے کے بعد کہتا۔ ”ماں سے کہنا ہمارے گھر اچھا حصہ بھیجے۔“



وہ خاموش ہو کر مجھے نکلنے لگے۔ بعد کو میں اپنے اس لہجے پر پچھتا یا بھی تھا۔ دوسرے دن ان سے اس کا اظہار بھی کیا۔ سن کر بولے۔ ”میں بھی سمجھوں کہ کل آپ کیوں آئیں چڑھائے بیٹھے تھے؟“

دوسرے دن وہی رخ دن تھا۔ میں وقت سے پہلے ہیو سال پہنچ گیا۔ فلپائن کا فرڈی جھ سے پہلے آیا ہوا تھا۔ ڈیانا اپنی کرسی پر اسی حالت میں بیٹھی تھی جسے کل اسے چھوڑ گیا تھا۔ ڈیانا کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک دو بار اچھلی اور پھر مجھے گڈ مارننگ کہہ کر زیادہ اچھلنے لگی۔ میں اسے جواب دے کر فرڈی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ ہاکڑی سے باہر مرکب پر بھی رُف کو دیکھے جارہا تھا۔ اسے گڈ مارننگ کہا تو جواب میں کہنے لگا۔ ”ایک اور لمبا اور بورگ دن شروع ہونے والا ہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جواب نہ پا کر فرڈی میری جانب مڑا اور پوچھا۔ ”لگتا ہے تم کو ایسی بورگ کلاس میں لطف آتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں خود کچھ چکر رہا ہوں اور کچھ سیکھنے میں پور نہیں ہوتا۔“

لیکچر کلاس میں اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کہنے لگا۔

”پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟“

پھر اپنے گمنے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تم کو تو کسی یونیورسٹی میں جاب کرنی چاہیے۔“ میری تعلیم پوچھ کر جواب میں کہا۔ ”ہم میں سے کوئی یہاں پر کرڈی بارہ سے اوپر نہیں ہے۔“

میں خود حیران رہ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بی ایس سی کی ڈگری یہاں سب سے بڑی ڈگری بھی جاتی ہے۔ ڈیسی خود بی ایس سی کی اور سپروائزرنگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ ماسٹر ڈگری لے کر اس لیے پیچھے تھے کہ ہماری ایک تو تعلیم معاشی نہ تھی اور نہ ہی کوئی تجربہ تھا۔ ہمارے مطمئن ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب ہم اپنی خواہ کا موازنہ پاکستان سے کرتے تھے تو اسی کو اپنے لیے بہت بڑی نعمت سمجھ لیتے تھے اور مطمئن ہو جاتے تھے۔

دوسرے لوگ بھی آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈیسی کل سے مختلف لباس میں ہماری فائلوں کا پوچھ اٹھا کر مفتی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔ سب کو گڈ مارننگ کہا۔ جواب میں سب نے گڈ مارننگ کہا اور ڈیانا ایک بار کہہ کر دہرائی چلی گئی۔ جب بھی تو بلاوجہ ہنسنے لگی۔

کلاس شروع ہوئی۔ کچھ نئی باتیں سیکھنے کو ملیں۔ میں نوٹس

ڈیڑھ ہزار میں اور جوتا ایک ہزار میں۔ عید کی یاد میں سب کو مفتی نے ڈبا دیکھا تو سب سے مخاطب ہوا۔ ”میری بہن نے آپ تینوں کو میرے سمیت عید رات کو دعوت دی ہے۔ ہم رات وہیں ٹھہریں گے۔ دوسرے دن عید کی نماز پڑھ کر اور دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آئیں گے۔“

یہ سب سنا کر وہ ہم سب کو خاموش پا کر حیرانگی سے دیکھتا تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی کیونکہ ہمیں رات کے طور پر خوشی سے شور مچانا تھا۔ نعرے لگانے تھے مگر ہم اس لیے خاموش تھے کہ پرسوں سب کی جاب تھی۔ میری تو فی جاب کا تیسرا دن تھا اور میں چھٹی کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

سب کو اپنی مجبوریوں بتائیں مگر مفتی اڑ گیا۔ سربئی اور شہباز نے تو کہہ دیا کہ ہم کل فون کر کے سیکورٹی کی جاب سے پرسوں کی چھٹی لے لیں گے۔ اب مسئلہ میرا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جاب کے تیسرے دن اپنی ٹریننگ میں چھٹی نہیں کر سکتا۔ یہی بحث ہوئی۔ مفتی نے لکار لکار کر مجھے سمجھایا۔ محبت میں اس کی آنکھیں تک سرخ ہو گئیں۔ منہ سے جھاکا بہنے لگی۔ مجھے وارننگ دی کہ اگر تم نے چھٹی نہ کی تو دوستی ختم۔ میں نے پوچھا۔ ”آخر یہ دوستی کیوں ختم۔“

کہنے لگا۔ ”بہن کے سامنے میری بے عزتی ہوئی۔“ پھر چلا کر بولا۔ ”اس نے رات کے کھانے صبح کے ناشتے اور پھر عید کے دن کھانے کا سارا انتظام کیا ہوا ہے۔“

مفتی کی بہن اور بہنوں کا وکٹ تھے۔ مالی حیثیت بہت اچھی تھی۔ رہن بہن بہت اونچا تھا۔ مفتی ان سے چھوٹا بھی تھا اور پھر سب کچھ ملا کر وہ ان دونوں کے آگے دیتا تھا۔ اپنی بہن کے سامنے تہذیب و تمدن کا بہت خیال رکھتا تھا۔ خود تو رکھتا اور ساتھ میں بھی یہ سب کرواتا تھا۔ جب اس کی بہن کبھی اس سے ملنے آتیں تو یہ پہلے ہمیں لیکچر دیتا۔ سربئی سے تو ایک دو بار رہہرسل بھی کروا چکا تھا۔ مجھے اس ماحول میں رات گزارنا ہماری بھی لگ رہا تھا مگر مفتی نے بقول شہباز ”سیا“ ڈال دیا تھا۔ میں نے کل ڈیسی سے چھٹی کی بات کرنے کی ہائی بھری مگر اندر سے میں سخت غصے میں تھا کہ یہ مجھ سے زبردستی کروا رہا ہے اور اسے میری نئی فی جاب کی فکر بھی نہیں ہے۔

میں کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ غصے میں تھا۔ سربئی پھر سے نازل ہوئے۔ میرا چہرہ دیکھ کر بولے۔ ”آپ بھی ہمیشہ آٹھ پہر سوکے بنے رہتے ہیں۔“

میں جھنجھلا گیا اور غصے میں کہا۔ ”یہ محاوروں کا مذاق ہر وقت نہ چلایا کریں۔“

کھڑا تھا کہ کس طرح ڈھنسی سے کل بقرعید کی چھٹی کا پولوں؟ آج مزدور رادان تھا اور چھٹی کا کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی مگر دوسری جانب مفتی کا اصرار تھا کہ چھٹی گئی بھی ضروری ہے۔ اس نے اپنے وقار کا مسئلہ بتایا ہوا تھا۔

سچ میں ڈھنسی سے میں نے کہہ دیا کہ کل ہماری عید ہے اور اگر ایک دن کی چھٹی مل جائے تو مسائل ہی حد مشکور ہوگا۔ پہلے تو عید کے نام پر اس نے اپنی بنز آ نکھیں سکیزیں۔ پھر پوچھا۔ ”یہ عید کہاں ہوتی ہے؟“

مجھے سمجھ نہ آئی کہ کس طرح اس کی بابت اسے بتاؤں۔ میں نے صرف یہ کہا کہ جس طرح آپ کی کرکس ہوتی ہے تو مسلمانوں کی عید ہوتی ہے۔ اس کی سکری آنکھیں کوئی چمک لیے پھیل گئیں۔ کچھ اور پوچھا میں نے سنت ابراہیمی اور حج کی بابت بتایا یا پھر عید کا ذکر دوبارہ مہابت احرام سے کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا سب مسلمان یہ تہوار مناتے ہیں؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں تو ذرا ہر تھا کہ وہ بھڑک نہ جائے مگر اس کا جواب نہایت حوصلہ افزا تھا۔ کہنے لگی۔ ”ہم کسارے لوگوں کے پھر اور مذہبی رسومات اور تہواروں کا احترام کرنا چاہیے۔“ پھر اس نے بیوسوال کی پالیسی بتائی کہ کنیڈا کے قانون کے مطابق ہر ایک کو اپنے مذہب اور پھر کو اپنانے کی مکمل آزادی ہے۔ اس نے پھر میری تعریف کی کہ اس کو اپنے تہوار کے بارے میں بتایا۔ مجھے اس نے کل کی چھٹی دے دی۔ اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ بیجنٹ سے بات کر کے چھ سات یا چھٹے بھی مسلمان بیوسوال میں کام کر کرتے تھے، ان کی چھٹی بھی منظور کروادی۔

مفتی تو پہلے ہی اپنی سالانہ چھٹیوں میں سے ایک چھٹی لے چکا تھا مگر منظر کے ساتھ باقی سب کو بھی عید کی چھٹی مل گئی۔

میرا پہلا تاثر بہت اچھا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے اپنا سیت ملنے کا احساس ہوا۔ بعد کے دنوں میں اپنی اہیت کا احساس توانا ہوتا گیا۔ ہر سال بیوسوال کا سالانہ کنونشن ہوتا تھا۔ اتفاق سے وہ جب بھی ہوا تو وہ رمضان شریف کے دن تھے۔ بیوسوال میں کام کرنے والے تمام مسلم روزے سے ہوتے تھے۔ پہلے کنونشن صبح سے شام تک جاری رہا اور حج میں لے جانے کا وقت ہوا۔ ہم تو روزے سے تھے۔ اسی لیے ایک مینیجر سے اجازت لے کر باہر چلے آئے تھے اگر روزے سے نہ بھی ہوتے تو ان کا کھانا ہم سے نہیں کھایا جاسکتا ہے۔ ان کے کھانوں میں سلاوا کچھ کئے ہوئے پھل، پھنکی مچی کی چھلی اور اسی ڈانٹے کی چکن ہوتی۔ لیکن بھی ہوتا جس کی طرف ہم نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

لیٹا رہا۔ فرڈی اونگھتا رہا۔ ڈیانا ہلتی رہی اور کینٹی اپنے چمکدار چشموں کے پیچھے پلکیں چمکاتی رہیں۔

نچ بربک ہوا اور ہم اسی لچڑوم میں آ بیٹھے۔ منظر نے کل کی طرح اپنی ایک روٹی مجھے دی۔ سالن گرم کیا۔ کچھ میری پلیٹ میں ڈال کر چہرے پر شجیدگی کا ماسک لگا کر سر جھکا کر کھانے لگا۔ منظر سے میری زیادہ دعا سلام نہ تھی۔ وہ میرا حسن تھا مگر اتنی شجیدگی مجھے ہضم نہ ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ کام کرنا تھا۔ بھی کہ یہ کرخت ماحول توڑنا تھا۔ کھاتے کھاتے میں نے منظر سے پوچھا۔ ”ایک روٹی میں تمہارا پیٹ بھر جاتا ہے؟“ اسی متانت سے سر ہلا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“ جواب دے کر پھر سے کھانا کھانے لگا۔

میں نے خود سے اپنا جواب دیا۔ ”میرا تو گزارہ نہیں ہوتا۔ آپ بھابی سے کہہ کر کل سے تین روٹیاں اور کچھ زیادہ سالن لایا کریں۔“

یہ سن کر اس کا چلنا منہ اور چلتے ہاتھ رک گئے۔ میری جانب دیکھا تو میں مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بیٹھے بس رہے تھے۔ اتنے میں ایک آفٹ لڑکی لچڑوم میں داخل ہوئی۔ سرخ و سفید رنگت ایسے کہ دودھ میں شہد ملا دیا گیا ہو۔ خاموش چہرہ اور اس آنکھیں۔ پینٹ پر ایک تنگ جری پہنی تھی، میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ آئی اور سیدھا کاشٹین سے کافی لے کر اسی طرح چلی گئی۔ منظر بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے غویت زدہ دیکھ کر ہنسنے لگا اور بتایا۔ ”یہ تھی ہے۔ کوئی کنٹرول میں کام کرتی ہے۔“

میں سر جھکائے اپنا کھانا ختم کرنے لگا۔ منظر کچھ اور کھلا پھر بس کر بولا۔ ”گلتا ہے۔ کتنی پسند آتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایسی خوب صورت لڑکی کس کو پسند نہ آئے گی؟“

یہ سننے کے بعد منظر کچھ اور کھلا اور اسے بھابی بھابی کہنے لگا۔ آج بھی جب ملتا ہے تو اس کا ذکر بھابی کہہ کر کرتا ہے۔ اگلے چند ماہ میں نیٹھی سے اچھی خاصی کپ شپ ہوئی اور اسے بھی بتا دیا گیا کہ وہ اب بھابی کہلائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب بھی بتا دیا گیا اور پھر اسے باخبر رکھا جانے لگا کہ کہیں بھول نہ جائے۔

منظر کے ساتھ شجیدگی کا پردہ میں نے پھاڑ ڈالا تھا۔ بعد میں ہماری دوستی اتنی بڑھی کہ آج تک قائم ہے۔ ہم اب بھی بیٹھ کر بیوسوال کے دن اور وہاں کے لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔ کلاس دوبارہ شروع ہوئی۔ میرے سامنے ایک پھاڑ

کہ کچھ نہ کچھ ہم لچ میں ان کے لیے بنا کر لایا کریں۔ میری ایک سپروائزر لوئس (Louise) تھی۔ اس کو ایک بار نے اس کے ساتھ مرج مسالے والے پیناٹو کھلائے تو وہ میری گردیدہ بن گئی۔ ایک بار مجھے آفر دی کہ جب میں اسے اپنے گھر کا کھانا لاکر اسے کھلایا کروں گا تو وہ مجھے واڈ کا بدلے میں پلائے گی۔ اس آفر پر منظر کے علاوہ سب دیکھی میرا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ جب کوئی چیز بنا کر لاتا تو کہتے۔ ”آج واڈ کا پیٹے کا موڈ ہے۔“

مجھے عید کی چھٹی مل گئی تھی بلکہ مجھے آج۔۔۔ جلدی جانے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ پہنچ کر یہ مفتی کو دی تو وہ بھی بہت حیران ہوا۔

کچھ دیر بعد ہمیں سب دے سے مارکھم جانا تھا۔ مارکھم میں میکاؤن سب دے پر ہمیں مفتی کی بہن ملی جو ہمیں ساتھ لے جاتی۔ کل بڑی عید تھی اور ہم نے اسی حساب سے کپڑے ایک بیگ میں ڈال لیے۔ رات وہیں گزار لی تھی۔ شہباز نے مفتی سے پوچھا۔ ”معلوم تو کرو کہ کل عید ہے؟“ مفتی بولا۔ ”سارے نوروز کو پتا ہے کل عید ہے تو میں کس سے کیا معلوم کروں۔“

سرنی کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ بولے۔ ”کیا معلوم مارکھم میں عید نہ ہو جیسے پاکستان میں ہوتا ہے کہ آدھے گاؤں دیوالی آدھے گاؤں ہوتی۔“

میں نے کہا کہ یہ نگاہ کش صرف چھوٹی عید پر ہوتی ہے تو شہباز کے ساتھ سرنی بھی راضی ہوئے۔

میں نے سرنی کو فون کیا۔ اپنے بیسویں سال میں جاب جوائن کرنے کی خبر دی۔ مبارک باد وصول کی اور اپنی جانب سے عید کی مبارک باد دی۔ کہنے لگی کہ عید پر میرے گھر آ جاؤ۔ میں نے کہا۔ ”اس دن تو گھر کے باہر سے بھاگ دیا تھا اور آج بلا رہی ہوں۔“

پہلے خاموش رہی اور پھر کہا۔ ”ہاں! اب بلا رہی ہوں۔“ اس آفر پر میں خاموش ہو گیا۔ مجھے چپ دکھ کر اس نے کہا۔ ”اگر نہ آئے۔۔۔!“ وہ کچھ اور کہتی کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کل عید مفتی کی بہن کے ہاں جانا ہے۔“ میرا جملہ قسم بھی نہ ہوا تھا کہ وہ بولی۔ ”کچھ بھی ہو تمہیں آنا ہے۔“

اس نے مجھے پل صراط پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک جانب جانب مفتی تھا تو دوسری جانب سرنی۔

(جاری ہے)

چکن، چیزا بھی ہمارے لیے ممنوع تھا۔ خیر ہم وہاں سے چلے آئے۔ واپس آئے تو کسی نے ہمارے واک آؤٹ کی وجہ پوچھی تو ہم نے رمضان کے مہینے کے بارے میں بتایا اور پھر بھول گئے۔

کچھ دن بعد ہم سب مسلمانوں کو کمپنی کے سی ای او کا لیٹر ملا۔ بہت معذرت کی گئی تھی کہ آپ لوگوں کا مقدس مہینا تھا اور ہم نے لچ رکھا ہوا تھا۔ بار بار کی معذرت کے بعد آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانے کی یقین دہانی کروائی گئی۔

اگلے سال کنوٹن سے پہلے مسلمانوں سے رابطہ کیا گیا کہ آپ کس وقت کھانا کھا سکتے ہیں تاکہ ہم کنوٹن کا ڈزاسی وقت پر اسٹارٹ کر سکیں۔ ہم نے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا اور ہومین ریسورس ڈیپارٹمنٹ میں اپنی افطاری کا ٹائم بتایا اور یہ بھی مطلع کیا کہ ہم حلال فوڈ استعمال کرتے ہیں۔ پھر باہمی مشورے سے ہم نے ایک کٹرنگ والے کافون نمبر دیا اور ساتھ ہی دیکسی کھانوں کی فہرست دی جس میں برانی، چکن، روٹ، تورمر، رائس اور ساتھ ساتھ سموسے پکڑے بھی لکھوا دیے۔ اب ہم مسلمان چھ سات سے بڑھ کر پندرہ کے قریب ہو چکے تھے اور انڈین بھی ہمارے ہمنوا بن گئے۔ وہ اپنے ملک میں شاید چکن نہیں کھاتے مگر اکثر باہر کے ملکوں میں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

کنوٹن شروع ہوا اور ہماری افطاری سے آدھا کھانا پہلے ختم ہوا۔ ہم نے ٹائم پوچھا گیا اور ہم نے ٹائم بتادیا۔ اعلان ہوا کہ کوئی غیر مسلم اس ٹائم سے پہلے کھانا شروع نہیں کرے گا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ سب کوروں نے اپنی ٹیلیفون پکڑی ہیں اور لائن میں لگے کھڑے ہیں تاکہ افطار کا ٹائم ہو اور وہ کھانا شروع کر سکیں۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ان کی نظر میں ہم غیر مذہب لوگ تھے اور ہمارے مذہب اسلام کا یہ احترام مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہم نے ہی اپنی افطاری کا اعلان کیا اور انہوں نے اپنا ڈنر شروع کیا۔

ہمارا کھانا ایک سائیز پر میزوں پر رکھا تھا۔ سب کچھ بڑی مقدار میں تھا جس کی ہم نے فہرست دی تھی۔ دیکھتے دیکھتے تمام گورے ہمارا کھانا جیسے لے لے کر چٹ کر گئے۔ کھانا اتنا زیادہ تھا کہ ہم بھی بھوکے نہ رہے۔ گورے تعریف کرتے نہ تھے تھے۔ ہم بھی اس طرح خوش ہو رہے تھے کہ جیسے یہ سب کچھ ہم نے بنایا ہو۔ کچھ انڈین ہماری آنچ پڑا پڑا ناراض بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کی اتنی جرأت نہ تھی کہ کوئی بات کر سکتے۔ بعد میں جب بھی کسی کوئی کنٹیکشن ہو تو حلال فوڈ کھانے والے زیادہ گورے ہوتے۔ وہ اب ہم سے فرمائشیں بھی کرنے لگے تھے

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کیڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



## قلم کار کی بیگم

سلمیٰ اعوان

وہ عالمی شہرت کا حامل ایک بڑا قلم کار تھا۔ اس کی تحریروں کو پسند کرنے والے ہر ملک میں ملیں گے لیکن خود اس کی زندگی الجھی ہوئی تھی اگر اس کے ساتھ اس کی شریک سفر نہ ہوتی تو شاید وہ ایسا نامور مصنف بھی نہ بن پاتا۔

### ایک بڑے مصنف کی زندگی کا عکس

تغیر کی فنکار یوں، فنون لطیفہ کی گھمبیر تاؤں اور ان کی بولمونیوں میں یوں الجھی کہ دوستوں کی دل سے اوجھل ہو گیا۔ چوتھے دن صبح سویرے مجھے اس کی ہڑک اٹھی تھی۔ میں بک گائیڈ ہاتھ میں پکڑے ریپشن پر چلی گئی۔ ریپشن پر ہر

سچ تو یہی تھا کہ میں اس عظیم ناول نگار کے گھر جانے کی خواہش میں بے حال تھی۔ پر مصیبت یہ تھی کہ میری ساتھی محل بیناروں کی شیدائی تھی۔ ونٹر ٹیلز اور ہرچ کا سبق گھر سے پڑھ کر آئی تھی۔ میں خود بھی محلات اور چرچوں کے طرز



میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میری پلٹیں اظہار تشکر کے طور پر بھگ سی گئی تھیں۔ بھلا میری اتنی اوقات کہاں تھی کہ میں تاریخ و ثقافت سے لبالب بھرے اس شہر میں آنے اور اس عظیم مصنف کے در پر حاضری دینے کا سوچ سکتی۔ تیری عنایت ہی ہے نا۔

اور پھر میں بھاری بھر کم چوٹی دروازے کو دھکا دے کر فیدر دوستوؤں کی کمر میں داخل ہوئی۔ سورویل کانکٹ خرید کر چھوٹی سی راہداری میں کرسی میز بچھائے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرتی خاتون کے گائیڈ کرنے پر سیزر حیاں چڑھتی ہوں سامنے ایک بڑا کمراسانے آتا ہے۔ یہ ہال کمراتھا جس میں رکھے بیوی کی اسکرین پر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ڈاکو میٹری پل رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا۔ صوفے پر ہی آرام کرتا ہوا کھانے کی میز پر، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، دریائے نیوا کے کنارے سیر کے لیے جاتا ہوا، کینڈل پکڑے، بر فباری کے دوران بیٹھے سے برف ہٹاتے، پودوں کو پانی دیتے، اس کی زندگی کے بے شمار روپ ہم نے زہر مہرہ رنگے میٹ پر چکڑی مار کر بیٹھے ہوئے دیکھے۔ اس کمرے میں ہمارے علاوہ ساڈو تھ کوریا کے دوڑ کے اور کرسی پر براجمان مولی تازی روی نگران خاتون تھی۔

قلم ختم ہونے کے بعد بھی میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے دیے جل رہے تھے۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی اور یہ سوچتی ہوئی کہ اس گھر میں اس کا دوبارہ آنا کس قدر شدید جذباتی صدمے کا نتیجہ تھا۔

میرے سامنے اس کی بیوی "لینا" کی وہ تحریر تھی جس میں ممتا کا وہ دکھ جھلکتا تھا کہ جب ان کا سب سے چھوٹا بیٹا لائیو شافٹ ہوا۔ اسے مرگ کی بیماری اپنے باپ سے ورثے میں لٹی تھی۔ دونوں میاں بیوی کو وہ گھر جس کے چنے چنے پران کے لاڈلے بیٹے کی یادیں بھری ہوئی تھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بیٹے کے اس دکھ نے انہیں ایک نئے تجربے سے روشناس کیا۔ جہاں انہوں نے گھربلا، وہیں وہ ولادی میر سلوودو کے کہنے پر آپن مناسٹری زیارت کے لئے گئے جہاں "ایلمڈر" نے ان کی پریشان اور غم زدہ حالت پر اپنی محبت اور دعاؤں سے نوازا۔ دوستوؤں کی کا یہ روحانی تجربہ اور نکلی طمانیت اس کے ناول The Brothers Karamazov میں نمایاں ہوئی۔

دوسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی۔ دوستوؤں کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے میں نے ہاتھ فضا میں استقبالیہ تاثر دیتے ہوئے لہرایا۔

”دیکھی۔“ وہ بولی۔

”نیت۔“ (نہیں) میٹرو یا بس۔“ میں نے جوابا کہا۔ گو وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی کہ تم کسی کو لکھتے رہو گی۔ ”ارے مجھے کتنے تے کاٹا ہے جو ٹیکسی کرلوں۔ ایک دو کلو میٹر کا راستہ اس نے گھما پھرا کر دس کا کر لیتا ہے اور پانچ سو چار سو روپل جھاڑ لیتے ہیں۔ روس کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اول درجے کے کاریاں ہیں غیر ملکیوں کو لوٹا جاتے ہیں۔ ایسی ایسی پھر تیاں دکھاتے ہیں کہ مانو لگتا ہے جیسے سواری کو تو اوپر پچھا کر ہی دم لیں گے۔“

لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔ ”آپ تو میرے سامنے زمین پر زندہ سلامت کھڑی ہیں۔ یہ بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ گھبرا نہ کریں۔“

”بس تم مجھے سمجھا دو۔ میٹرو یا بس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔“

”میٹرو۔“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

اس کی حیرت پر مجھے اچھٹا ہوا۔

”لو یہ ہمیں کیا گاؤدی سمجھ رہی ہیں۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

کچھ زبان اور کچھ اشاروں نے سمجھا اور سمجھایا۔ اور ہم لوگ نکل پڑے۔ ساڈوویا Sadovya میٹرو سے دوستوؤں کی سکایا میٹرو پر اترے۔ باہر آئے۔

گاڑیوں بسوں سے بھرا ہوا یہ چوک جس کے عین سامنے خوبصورت ولادی میر چرچ تھا جس کے ساتھ ہی کڑچنی لین ہے۔ نقشے پاس ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو روک کر پوچھنے میں ذرا سائل نہیں کرتے تھے۔ پرانی ہم سکایا اسٹریٹ جواب دوستوؤں کی کھلائی ہے۔ یہیں کونے پر وہ چار منزلہ عمارت کھڑی ہے جس کے ایک ایبارشمنٹ میں اکتوبر 1878ء میں وہ میرا محبوب لکھاری اپنی پتی کے ساتھ شفٹ ہوا اور یہی وہ گھر تھا جہاں 1846ء میں بھی اس نے کچھ وقت کرایہ دار کی حیثیت سے گزارا تھا۔ گویا یہ گھر اس کی تخلیقی زندگی کی ابتداء اور انتہا تھا۔

میں دروازہ پیمنٹ کی چند سیز حیاں اتر کر تھا۔ پہلے پوڑے پر قدم دھرنے سے قبل میرا جی چند لمحوں کے لیے چوڑے پر بیٹھ جانے کو چاہا۔

## ناٹ شفٹ میں کام کرنا

### امراض کا شکار بناسکتا ہے

ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ جو لوگ رات میں بھر پور نیند نہیں لیتے ہیں یا نائٹ شفٹ میں کام کرتے ہیں ان میں ڈی این اے سے مرمت کرنے والا قدرتی نظام متاثر ہوتا ہے جو آگے چل کر کئی امراض کی وجہ بن سکتا ہے۔

اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مطالعہ ہے لیکن اس میں دیکھا گیا ہے کہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے افراد کے جسموں سے ایک خاص کیمیکل 8-OH-dG کم خارج ہوتا ہے جو انسانی جسم میں ڈی این اے کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کرسٹل بھی عمل جاری رہے تو اس سے موٹا ہے، ڈی این اے اور امراض قلب کے علاوہ کینسر کا خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ امریکی شہر سائٹل میں فریڈ ہینس کینسر سینٹر کی پروین بھٹی نے تحقیق کی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس تحقیق سے ان امراض کے خطرات کی ایک وجہ سامنے آئی ہے۔ ہمارے جسم میں قدرتی طور پر ڈی این اے کی ٹوٹ پھوٹ جاری رہتی ہے لیکن اس کی مرمت کا قدرتی نظام بھی موجود رہتا ہے اور جیسے ہی ڈی این اے کی مرمت ہوتی ہے تو پیٹاب میں 8-OH-dG کی زائد مقدار خارج ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی کم مقدار کا خارج ہونا ظاہر کرتا ہے کہ شاید ڈی این اے کی درستگی مناسب نہیں ہو رہی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ڈی این اے متاثر ہونے سے کئی امراض لاحق ہو سکتے ہیں جن میں کینسر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ نائٹ شفٹ میں کام کرنے سے ایک جسمانی ہارمون میلاٹونن بھی کم ہو جاتا ہے، جو جسم کی اندرونی گھڑی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دیگر ماہرین کا اسرار ہے کہ اس تحقیق کی یہ شرح کرنا درست نہ ہوگا۔ سائنسدانوں کے مطابق اس تحقیق میں میلاٹونن کا کردار واضح نہیں ہو رہا۔ اسی طرح شفٹوں میں کام کرنے سے ڈی این اے متاثر ہونے کے بھی مزید ثبوت درکار ہوں گے، تاہم پروین بھٹی کی ٹیم نے انکشاف کیا کہ تحقیق کے مطابق جب ملازمین رات کی نیند لینے لگے تو... ان میں 8-OH-dG کی شرح واپس بحال ہو جاتی ہے۔

اس تحقیق میں 223 افراد کا جائزہ لیا گیا ہے جو مختلف شفٹوں میں کام کر رہے تھے۔ ان میں سے دن کی نیند اور رات کی نیند لینے والوں کے جسم میں 8-OH-dG کا جائزہ لیا گیا۔

مرسلہ: شمیمہ خانم۔ ملتان

چھپ کر دین کے اپارٹمنٹ میں بھی وہ ہال تھا جس کا ذکر ایٹانے بہت تفصیل سے کیا تھا۔

میں ابھی۔ سامنے دیوار پر پیٹرز برگ کی اٹھارویں صدی کی طبعی صورت کی بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ مردوں کے لمبے فرائک نما پہناوے اور عورتوں کی زمین بوس ہوتی فرائک نما میکیاں، سروں پر اسکارف نما بڈ اور کوٹ نما گاؤں تھے۔ بیٹا اسکوائر میں خرید و فروخت کا ایک منظر زندہ تھا۔ ہال نایاب تصویروں، خوبصورت کچ پینٹنگز جن میں لندن کا سینٹ پال کتھڈرل، کرسٹل پیل، روم کا پیٹر اسکوائر اور میلان کے کتھڈرل چرچ بہت نمایاں تھے۔

پھر یوں ہوا میں ٹھنک گئی۔ ایک ایسی تصویر میرے سامنے تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

”یہ میگز ہولین دی پیٹر“ کی ”دی ڈی۔ جھ آف میسر“ The death of Jesus پر وہ شاہکار اور نایاب پینٹنگ تھی جس میں اس نے میسر کے پورے وجود پر بھری موت کی اذیت اور دردناکیوں کو پنٹ کیا تھا۔ میسر کے جسم کی اذیت کی عکاس ایک ایک ہڈی پکلی، زخمی ہاتھ پاؤں خوفناک کرب و درد سے ستا چہرہ، ہر احساس سے بے نیاز نیم کھلی آنکھیں، ناک ٹھوڑی اور منہ نیلا ہٹوں میں ڈوبا ہوا۔

یہی وہ پینٹنگ تھی جسے دیکھنے کے لیے وہ خصوصی طور پر پائل سویٹزر لینڈ گیا اور اسی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔ ”اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پر ہولین ایک حیرت انگیز آرٹسٹ اور شاعر ہے۔“

انٹرنس ہال میں اس کی چھتیاں، ہیٹ اور صندوق دیکھتے ہوئے نرمی میں داخلہ ہوا۔ جب یہ خاندان یہاں شفٹ ہوا، اس وقت لیو بوینی نو سال اور بیٹا فو دو سو سات سال کا تھا۔

کمر ایک خوبصورت گڑیا، رانگ ہارس، چند کرسیوں، بچوں کی رائٹنگ ٹیبل اور میز پر رکھے بیٹے کی طرف سے باپ کو لکھے ہوئے لفافے سے سجا ہوا تھا۔

دوستوں کی اپنے بچوں سے کس قدر پیار کرتا تھا اور ان کے بارے میں کتنا فکر مند رہتا تھا اس کا اظہار اس تحریر سے ہوتا ہے جو ایٹانے اپنی یادداشتوں میں لکھی۔ اگر وہ اپنے علاج یا کاروباری معاملات کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو ”ایٹا“ کو ملنے والے خطوط اس کی اور بچوں کی محبت سے بھر پور ہوتے۔ وہ اپنے بچوں کو کم عمری سے ہی رومی اور یورپی ادب

گئے۔ انہی دنوں اس نے ایک جگہ لکھا۔ ”میری زندگی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔“

اپنے بھائی کے قرضے اتارنے کے لیے وہ کمیشن پر لکھنے لگا۔ وقت گئی ایسی ہی کڑی گھڑیوں میں اسے ایک ایسا ناول لکھنے کی پیشکش ہوئی جس کی مدت تکمیل صرف ایک ماہ تھی۔ معاہدے کی رو سے ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اپنے کام کی راہنمائی سے محروم ہو جاتا۔

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

”ایک اسٹیوگرافر رکھو۔“ دوست نے حل بتایا۔

تب چار اکتوبر 1866ء کی ایک آبرو کو دوپہر کو کتابی چہرے پر بچے ستواں ناک اور خوبصورت آنکھوں والی دلکش لڑکی جس کے براؤن فراک کے گلے اور آستینوں پر مگی دیدہ زیب لیسٹن لہرائی تھیں، اس کے گھر میں اسٹیوگرافر کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھی۔

”The Gambler“ چھپیں دنوں میں مکمل ہو گئی۔

کام کے اختتام پر اسے احساس ہوا کہ وہ اس مہربان اور ہمدرد لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

”میں اس سے کیسے بات کروں؟“ اس کے پارک بھینچے ہوئے ہونٹوں سے تذبذب میں ڈوبا ہوا یہ سوال ابھرا جو دل کی سرکشی میں اپنے آپ سے تھا۔

وہ روکے جانے سے ڈرتا تھا۔ پھر اس کا عندیہ لینے کے لئے اس نے فرضی ناول کا پلاٹ گھڑا۔ ایک چوالیس (44) سالہ مرد جو مرلیض بھی ہے کاٹائیس (20) سال کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتا اور اپنا سے یہ پوچھتا کہ ذرا سوچو تو کیا امنگوں سے بھری ہوئی اس نو جوان لڑکی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے مرد کی محبت کا جواب محبت سے دے؟

”کیوں نہیں۔“ اپنا نے نگاہیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر فکر بھری لکیریں تھیں۔ ”محبت تو ان سب باتوں سے بالا ہوتی ہے۔“

بس تو جیسے سوکھے دھاتوں میں پانی پڑ جائے۔ وہ بھی کھل اٹھا اور اپنا آپ کھول کر سامنے رکھ دیا۔

”اپنا میں جانتا ہوں میری عمر کا ایک مردم جیسی نو جوان لڑکی کے لئے قطعی موزوں نہیں پڑتا نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم مجھ جیسے بکھرے ہوئے انسان کو سیٹھ لوگی۔ مجھے پیار دو گی کہ تمہیں پیار دینا آتا ہے۔“

پڑھانے کا متنی تھا۔ گوگول، ہٹکن، ڈکنز اور دیگر ہیوگو سے تو بچے چھوٹی عمر میں ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو پاس بٹھا کر بائبل کو اونچی اونچی آواز میں پڑھاتا۔ ایک بار بیٹے کی شکایت پر اس نے لکھا۔

”اپنا تم فیودور کے باہر جانے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر پریشان ہوتی ہو۔ دیکھو وہ بچپن سے بلوغت میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت سی گہری باتیں میرے مشاہدے میں آئی ہیں۔ گہراؤ نہیں شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو کہ میں یہاں اس کے متعلق کتنا فکر مند رہتا ہوں۔ ہمیں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر اسے پڑھانا ہے۔“

اور یقیناً یہ اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بیٹی لیو بو نے بہت سی کتابیں جن میں ”Sick Girl“ وینکین لائر اور ”دوستوں کی اپنی بیٹی کی نظر میں“ بہت مشہور ہوئیں۔

فیودور گھوڑوں میں دلچسپی کے باعث ایک کامیاب ٹرینر اور ماہر ہارس بریڈر بننے کے ساتھ ساتھ شاعر اور تنقید نگار بھی تھا۔

زمری سے ہی میں اپنا کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اپنا جبرجوریتا کا کمر اسادگی کا نمونہ تھا۔ کھڑکی کے پاس کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل، ایک الماری، صوفہ نما کرسی میز اپنی کہانی خود بیان کر رہی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ روس میں ہر تاریخی محل، میوزیم، پارکوں، شاہراہوں پر جا بجا صوفے آرام دہ کرسیاں اور بیچ رکھے ہوتے ہیں۔ سیاح پیدل چلتے چلتے تھک جاتے تو بیٹھیں، سستانیں، سوچیں، خلقت کو دیکھیں، جو مرضی کریں۔ اسٹیبل میں کہیں بیٹھنا تو دور کی بات کسی دیوار کے ساتھ لچہ بھر کی ٹنگی بھی ڈیوٹی پر حاضر پولیس والوں کی نگاہ میں فی الفور آ جاتی ہے اور وہ کسی شکاری کی طرح حملہ آور ہو جاتا ہے۔

یقیناً میں وہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے اس عورت کی قربت کی مہک محسوس کرنا چاہتی تھی جو صرف بیس سال کی عمر میں اپنے سے دو گنی عمر کے شخص کی زندگی میں ایک ایسے وقت داخل ہوئی جب وہ مصائب کے ہاتھوں حدودِ رجب پریشان تھا۔

دوستوں کی کے لیے 1854ء کا سال بہت پر آشوب تھا۔ اس کی بیوی ماریا بھائی میخائل اور گہرا دوست نامور محقق اور شاعر اپولون جو اس کے ذاتی اخبار ”دی ٹائم“ اور ”دی آپوچ“ میں اس کا معاون تھا کیے بعد دیگرے اسے تنہا چھوڑ

بلوچ، پٹھان اور واپستہ نسلیں

دو بڑی قومیں، پٹھان اور بلوچ، پنجاب کے تمام مغربی علاقہ پر محیط ہیں۔ کوہ سلیمان کے مغربی رخ سے لے کر ڈیرہ غازی خان کے سامنے تقریباً کوسوں کے مغرب تک پھیلنے والے خط کے جنوب میں بلوچ اور شمال میں پٹھان نسل آباد ہے لیکن سندھ پارکی وادی میں اور کوہ سلیمان کے پنجاب والے رخ پر بلوچ شمال کی طرف اس سے بھی آگے تک ہیں اور ڈیرہ اسماعیل خان تحصیل کی جنوبی حد مشترکہ حد کی مبہم نشاندہی کرتی ہے۔ جب کہ دریا کے اس طرف پھر بلوچی دوسری طرف کی نسبت کچھ اور آگے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی مشترکہ حد پر دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ مخلوط قراچوں کا حامل قبیلہ سمیران آباد ہے، جو ڈیرہ غازی خان میں بلوچ، ڈیرہ اسماعیل خان میں پٹھان اور غالباً دونوں ہی میں جٹ ماخذ سے ہے جب کہ کھل میں انتہائی جنوبی پٹھان قبیلہ بلوچ (مل + اوچ) ممکن طور پر بلوچ نسل ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں از: سر ڈیوڈ ہارٹن  
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

ہوئی تھی۔ پیسے کی تنگی، مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں جیسی زندگی، بسا اوقات کمرے کا کرایہ ادا نہ کر سکنے پر لینڈ لارڈ کی مصلحتوں کی، دوستوں کی خراب صحت، اکثر اس کا جوا کھیلنا اور سب کچھ ہار جانا۔  
ان کے پہلے بچے صوفیہ کی سویٹزر لینڈ میں پیدائش اور تین ماہ بعد اس کا مرجانا۔ سب وہ کڑی آزمائشیں تھیں جنہیں اگر اپنا نہ جوصلے اور محبت کے مل پر سہا تو وہیں اس نے Idiot تخلیق کی۔

مہر النساء کوئی دو بار سارے کمروں کا پتھر لگا آئی تھی۔ اور میں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جب اس نے کہا۔

”سارا دن یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے کیا؟“

میں چیپ تھی۔ اس وقت میرے سارے جذبے اس عورت کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جس نے بقیہ زندگی کمرائے کے گھروں میں گزار دی۔ جس نے کسی مہربان اور مشفق ماں کی طرح اس پر اپنی محبتوں کی بارش کی۔ جس نے اس کے مرنے کے بعد اپنے بقیہ سارے سال اس کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنی یادداشتوں کو مرتب

اور اپنا نے اس کے چہرے کو دیکھا جو اپنی چپکتی بھوری آنکھوں میں آرزوؤں کا ایک جہاں سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔  
تب اس نے خود سے کہا کہ اگر وہ نفی میں جواب دیتی ہے تو یہ اس کی خودداری، اس کے پندار اور اس کی عظمت کے لیے کتاب پر ادھیچکا ہوگا۔

”نہیں۔ میں اسے افسردہ اور ملول نہیں دیکھ سکتی۔ یہ انسان مجھے بے حد عزیز ہو چکا ہے۔“

بیباہ کا دن پندرہ فروری طے ہوا۔ اور رسم کی ادائیگی کے لئے کرنٹی کھیڑ ل کا نام تجویز کیا گیا۔

یہ سب تو ہو گیا۔ پر کچھ ٹھہیر سے مسائل ابھی بھی اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سرفہرست اس کا ویدنگ ڈریس تھا۔

یہ کیا ہو؟ اور اس کی خریداری کہاں سے کی جائے؟ دوستوں کی کے لیے تو پیسے کی فراہمی بھی مسئلہ تھی۔

سمجھدار ذہن لڑکی نے ان بہت سارے سوالوں کو جنہوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا کا جواب دے کر اس کے تفکرات کو تحلیل کر دیا۔

”بھئی آخر میں سلائی کڑھائی کی اتنی ماہر ہوں۔ اپنا عروسی جوڑا خود پزائن کروں گی اور اسے تو بھرت ڈینا ملے سے خود ہی سجالوں گی۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ رہا کپڑا تو وہ میرے پاس ہے۔“

شادی ہوئی اور مصائب کا آغاز بھی ہو گیا۔ ابھی استقبال دعوت تھی۔ جب بیٹی نوکیلی دہن کو دولہا سنبھالنا پڑا کہ دوستوں کی نے سمجھن ضرورت سے زیادہ بی بی تھی۔ مرگی جس کا وہ پرانا مریض تھا اس کا دورہ پڑا تھا۔ ٹھنوں وہ درو سے بے حال رہا اور دہن اسے اپنی ہانہوں میں اور کبھی اس کا سراپنی گود میں رکھے اسے سنبھالتی رہی۔ پہلے ہی دن سے اسے اپنی ہانہوں میں سمیٹنے اور اس کے دکھ کو بانٹنے کا یہ کام اسے مل گیا تھا جو اسے ساری زندگی کرنا پڑا۔

صحت کا مسئلہ تو ایک طرف۔ اس کے ساتھ معاشی مصائب بھی خون چوسنے والی جوکوں کی طرح چٹے ہوئے تھے۔ قرض خواہوں کی خوفناک دھمکیاں، ان کا آئے دن تنگ کرنا، اس کی جائیداد بھتیانے کی سازشیں، بیس (20) سالہ لڑکی ان سب کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ذاتی چیزیں بیچیں اور کچھ سالوں کے لیے شوہر کو ان کے چنگل سے نکال کر باہر لے آئی۔

بیرون ملک یہ زندگی مشکلات اور مصائب سے بھری

کرنے میں گزار دیئے۔  
میں خاموشی سے اٹھ کر ملحقہ ڈائننگ روم میں آگئی۔  
ڈائننگ روم کی سجاوٹ پیٹریز برگ کے روایتی کمروں جیسی  
تھی۔ دوستوؤں کی خاندان کا انداز زندگی سادگی سے بھرپور  
تھا۔ میز پر کپ سجے تھے۔ کونے میں دھری چھوٹی میز پر پیتل کا  
وہ ساواری اور چائے دانیاں تھیں جس کا ذکر اپنا کی یادداشتوں  
میں ملتا ہے۔ الماری چینی کے نفیس برتنوں سے سجی تھی۔  
خاندان رات کے کھانے پر ضرور اکٹھا ہوتا۔ اکثر عزیز  
دوست اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔ اپنا کو اپنے شوہر کا گھر  
والہی بررات کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لانا بہت پسند تھا۔  
پراسے آئے دن دوستوؤں کی کاجول کو ٹریٹ دے دے کر  
خراب کرنے پر بھی لگد رہتا تھا۔

اسٹڈی روم میں کچھ وقت گزارنے کی ضرورت تھی اور  
وہ میں نے گزارا۔ کمرے کی کھڑکیاں باہر  
Kuznechny Lane پر کھلی تھیں۔ ولادی میر چرچ  
بھی سامنے تھا جہاں دوستوؤں کی اپنے آخری ایام میں عبادت  
کے لئے جایا کرتا۔

بیکہ وہ کمرہ تھا اور میرے سامنے ہشت پہلو میز پر دھرا  
وہ کلاک تھا جس کی سوئیاں 28 جنوری 1881ء بروز بدھ کی  
شام آٹھ بج کر 36 منٹ پر اس کمرے کے کیمین کے ساتھ ہی  
ساکت ہو گئی تھیں۔

کمرہ اساد کی تصویر تھا۔ عین وسط میں رائٹنگ ٹیبل اور  
دیوار کے ساتھ صوف تھا۔ تلخ زدہ فریم میں اس کی تصویر کے  
عین نیچے لیٹر بکس تھا۔ تین خانے والے ریک کے ہر حصے میں  
کتابیں تھیں۔ الماری میں بھی کتابیں جچی ہوئی تھیں۔ اس  
سادہ سے کمرے میں اسی میز پر اس نے اپنا آخری شاہکار  
ناول The Brothers Karamazov تخلیق  
کیا۔

پیدائش تو اس کی ماسکو کی تھی۔ 11 نومبر  
1821ء۔ بچپن ہی سے اسے قلم اور کاغذ سے دلچسپی تھی۔  
سوچنے کا شوق تھا۔ ماں کے مرنے پر اس کے باپ نے جبراً  
اسے ملٹری انجینئرنگ اکیڈمی پیٹریز برگ بھیج دیا اور گویا اس کی  
قسمت پیٹریز برگ سے وابستہ ہو گئی۔ فوج میں اپنی نوکری سے  
بالا خرایک دن اس نے یہ کہتے ہوئے استعفی دے دیا کہ میں  
اپنا حقیقی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ رشتہ داروں کے اعتراضات  
پر اس کا جواب تھا۔ ”میں اپنے بارے میں پُر امید ہوں۔  
انسان ایک سر بستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی  
چاہیے۔“

آغاز کا کچھ وقت اس نے فرانسیسی لکھاریوں کے  
ترجموں میں صرف کیا۔ یورپ اور روس کے راسخوز کو پڑھا۔  
پڑھنے سے اس نے ہمیشہ ایک روحانی آسودگی محسوس کی۔  
ابتداء میں اس کے محبوب ڈکنس، گوکول، ہٹلر اور چٹکن تھے۔

چائے اور اس کا اہتمام دوستوؤں کی زندگی میں بہت  
اہم تھا۔ چھتے پیتل کے ساواری کو دیکھی سے دیکھتے ہوئے  
میرے سامنے اپنا کی تحریر تھی۔ ”اچھی چائے اس کی کمزوری  
تھی۔ سونے سے قبل میں ساواری کو ڈائننگ روم میں ضرور چیک  
کرتی۔ چائے بنانے کا اہتمام خصوصی ہوتا۔ سب سے پہلے وہ  
اچھے پانی سے کٹینی کو کھٹکا لیا، اس کا کچھ مخصوص تھانے پیچے پایا  
کاج چمکتے تھے۔“

میری نظروں کے عین سامنے وہ چمچ اور چائے دانی  
تھی۔ میں اسے ہاتھ لگا کر چھوئی سکتی تھی کہ آگے حد بندی  
تھی۔ وہ تین چمچ چائے ڈالتا اور چائے دانی کا 1/3 حصہ پانی  
سے بھر کر اسے نیپکن سے ڈھانپ دیتا۔ پورے تین منٹ بعد  
وہ چائے دانی کے بقیہ کو کھولتے پانی سے بھرتا اور پھر اسے  
کپڑے سے ڈھانپتا۔

اس کی بیٹی Liubov کا کہنا تھا کہ پایا ہمیشہ چائے  
کے رنگ کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

”ہائے۔“ میں نے سرشاری کے سرور آگیاں احساس  
کے زیر اثر خود سے کہا۔

چلو اور کچھ نہ سہی پر یہ قدر تو مشہر کہ زندگی میں  
اچھی چائے کے سوا کوئی دوسرا شوق نہیں رہا۔ چائے کا رنگ  
کمزوری اور چائے بنانے اور پینے کا اہتمام خوشی۔

گلاس ہاتھ میں تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں آتا اور لکھنے  
میں محو ہو جاتا۔ چائے میں چینی کی ہمیشہ دو کیوبز ہی استعمال  
ہوتیں۔ چائے سے اس کی یہ محبت اس کے ناولوں کے  
اکثر کرداروں میں چھلکتی۔ ”The Devils“ کے کردار  
اسے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔



کیلیفورنیا اسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (کیلیف) میں ایرانی نژاد سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے دنیا کا سب سے پتلا کیرا ایجاد کر لیا ہے جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی عرصہ موجود ہی نہیں جبکہ عرصہ ہی کمرے کی روح ہے۔ بغیر عرصے کے کیرا کام ہی نہیں کر سکتا۔ آپٹیکل سوسائٹی آف امریکا ٹیکنیکل ڈائجسٹ (اوائس اے ٹیکنیکل ڈائجسٹ) میں شائع تحقیق کے مطابق اس ڈیجیٹل کمرے کو عرصے کی ضرورت سے آزاد کرنے کے لیے انتہائی باریک 'آپٹیکل فیئر ڈائری' (اولی اے) پر مشتمل ٹیکنالوجی وضع کی گئی ہے جس کا نسخا ماسکٹ بہت کم جگہ استعمال کرتے ہوئے عین وہی کام کرتا ہے جو دوسرے کمروں میں عرصے کے ذمے ہوتا ہے یعنی روشنی کو حسب ضرورت کسی خاص مقام پر اور کسی خاص انداز سے مرکوز کرنا، تاکہ عکس حاصل کیا جاسکے۔ اسے کیلیف کے تحقیقی انجینئروں رضا فاطمی اور بہروز ابریزی نے پروفیسر علی حاجی میری کی نگرانی میں مشترکہ طور پر ایجاد کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کمرے کا فوس (ارنگز) قریب سے دور کی چیز تک ایک سینکڑے کی صرف ارب ویں حصے یعنی محض ایک ٹینو سینکڑ میں منتقل کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جو اس وقت دنیا کے کسی دوسرے کمرے میں اتنی تیز رفتاری کے ساتھ وجود نہیں رکھتی۔ پروفیسر حاجی میری کہتے ہیں عرصے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اس کمرے کو اتنا زیادہ مختصر کیا جاسکتا ہے کہ جتنا اختصار کسی اور قسم کے کمرے کے لیے فی الحال ممکن ہی نہیں۔ علاوہ ازیں جب یہ ٹیکنالوجی پختہ ہو کر تجارتی پیمانے پر پہنچ جائے گی تو امید ہے کہ یہ کمرے بہت ہی کم خرچ پر تیار کیے جاسکیں گے۔ ملٹی شعبے سے لے کر عسکری میدان تک اولی اے ٹیکنالوجی والے کمرے کے لیے اطلاق کی ایک وسیع دنیا موجود ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح 1980 کے عشرے میں سی ڈی (چارنج کیلڈ ڈیوٹس) کی ایجاد نے آج کے جدید ترین ڈیجیٹل کمروں کی بنیاد رکھی اسی طرح آنے والے برسوں میں عرصے کی ضرورت سے آزاد اولی اے کیرا ٹیکنالوجی بھی ڈیجیٹل عکس نگاری کو ایک نئے انقلاب سے ہم کنار کرے گی۔ ایک مسلمان سائنس داں کی اس ایجاد نے ایک تھلکہ چا دیا ہے۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف۔ ملتان

پر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ حقیقت بذات خود بڑی خوبصورت شاندار اور حیرت انگیز ہے۔ آغاز کا لکھا ہوا سارا کام اس نے ضائع کر دیا اور نئے اعتماد اور چیلنج کے ساتھ Poor Folk میں ظاہر ہوا۔ اس کا پیپر کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا مہنہ ٹھہرایا۔

اور یہ یہی وہ دن تھے جب اس کا تعارف میخائل پیٹراشووکا سے ہوا جو روس کے بہتر مستقبل کے لیے درد رکھنے، انقلاب فرانس اور سوشلسٹ نظریات سے محبت کرنے والے نوجوانوں کو اپنے گھر بلاتا اور روسی معاشرے اور اس کے موجودہ حالات پر لمبی چوڑی بحثیں کر داتا۔

1848ء میں یورپ میں انقلابی تحریک چلی تو کولس اول نے خوف زدہ ہو کر روسی وزارت داخلہ کو ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں رپورٹ کے لیے کہا جو روس میں سرگرم عمل تھیں۔۔۔۔ اور نتیجتاً دوستوویکی سمیت میٹنگ کے تمام افراد 23 اپریل 1849 کو گرفتار ہوئے۔ چند ماہ پیٹرائنڈ پال قلعے میں گزارنے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے پر سائبیریا کے شہر اوسک کی سینٹرل جیل میں منتقل ہوئی۔

آٹھ ماہ بعد کولس اول کا انہیں عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ منظر عام پر آ گیا۔

یہ بائیس دسمبر 1849 کی سرد ترین صبح تھی۔ سیسو ورسکائے اسکوائر میں ایک بڑے شوکا اہتمام کیا گیا تھا جس کا اسکرپٹ زار نے خود لکھا اور خود تیب دیا تھا۔

اسکوائر کے ڈھلائی چٹوں والی عمارتیں برف باری سے سفید ہوئی پڑی تھیں۔ لوگوں کا ایک جم غفیر میدان میں موجود تھا۔ فوج اور پولیس کے دستے مستعد کھڑے تھے۔ پادری موجود اور جلا حاضر۔ کولس اول یہ نفس یہاں تھا۔ اس شو کو ایک عبرت انگیز مثال بنانے کے لیے ریاستی فنڈ ذمہ بے دریغ استعمال ہوئے تھے۔

مجرموں کی لمبی قطار موت کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیسا دل دہلانے والا نظارہ تھا۔ پلیٹ فارم سے کوئی بیس قدم پرے تین پوشیں بنائی گئیں۔ پہلے تین مجرموں کو پوسٹ پر لا کر گاؤن پہنانے جاتے جن کے ساتھ لمبے لمبے ہڈ ہوتے جوان کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتے۔ پادری "مکراس" کے ساتھ ہر ایک کے پاس جاتا۔ بازوؤں سے تمام کرٹریموں کو پلیٹ فارم پر لایا جاتا۔ فرد جرم اونچی آواز میں پڑھی جاتی۔ ڈرم بجتا

ہو گیا۔ مئی 1854ء میں اس نے ماریا سے شادی کی جو بیوہ تھی۔ اپنے بھائی کو ماریا کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے لکھا تھا۔ ”وہ صرف اٹھائیس سال کی ہے۔ چھ سال کا بیٹا بھی اس کے پاس ہے۔ وہ ایک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اور میں نے اسے مستقبل میں تحفظ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

زندگی کے آخری برسوں میں اس کے بڑھنے والوں کے سامنے اس کا ایک اور رخ آیا تھا۔ ہمارے اشفاق احمد صاحب کی طرح اس کا رجحان بھی روحانیت کی طرف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے مسائل سننا، اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے ان کے خط پڑھنا، ممکنہ حد تک ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور ان میں آسانیاں بانٹنے کی کوشش کرنا اس کا مطمح نظر ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب اس نے کہا۔ ”آج مجھے مرجانا ہے۔“

طبیعت تو دو تین دنوں سے خراب تھی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تو بہت پرانی تھی۔ اینا نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ ولادی میر چرچ کے پادری بھی آئے۔

اٹھائیس 28 جنوری کی صبح اس نے کہا۔ ”اینا آج مجھے دنیا سے چلے جانا ہے تم انجیل لاؤ۔“

اور اینا اسی انجیل کی کاپی لے کر آئی جو سائبریا جاتے ہوئے راستے میں اسے فونووزینا Fonvizina نے دی تھی جو 14 دسمبر کو زاروں کے خلاف انسانی حقوق کی ناکام بغاوت کے باغیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ جو دسمبر کی کہلاتے تھے۔

اس نے ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھا اور جب بھی وہ پریشان یا کسی مشکل میں ہوا اس نے ہمیشہ اسے کھولا اور پڑھا ”پس جیسو نے اسے کہا۔ اب ایسا ہونے دو۔“

اور اس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اینا تم سنتی ہو۔“  
Let it be so  
“now

”تم سمجھتی ہو میں مر رہا ہوں۔“  
اس نے آنکھیں موند لیں۔

گھڑی کی سوئیاں ساکت کر دی گئی تھیں۔ یہ اٹھائیس جنوری 1881ء تھا اور وقت آٹھ بج کر پچیس منٹ کا تھا۔ جب ایک عظیم لکھنے والا دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

اور ”موت“ فائزنگ اسکوڈ کے ساتھ۔“ الفاظ گونجنے اور زندگی بل جھپکنے میں موت کے ہاتھوں میں جھول جاتی۔  
اگلا مجرم نئی فوج کے ساتھ ملا یا جاتا۔

دو موتوں کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ اور تیاری کے بعد پانچ منٹ کا۔ اس پانچ منٹ کے جس تجربے سے دوستو وکی گزرا وہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش تھا۔

سمیو۔ سکائے اسکوائر کے چرچ کی سنہری چھت اور گنبد، لوگ، دھوپ، چمکتا سورج، ہوائیں، آسمان اور میدان میں موت کے سچے بازار سے بھجوتی کہیں آس اور امید کی کوئی موہوم سی کرن۔ نکولس اول موت سے خاصا محفوظ ہو چکا تھا۔ بقیہ کے لیے قید یا مشقت کا حکم دیتا اٹھ گیا تھا۔

”ایڈیٹ میں پرس ہائمن کی زبان سے اس نے اپنے اسی تجربے کو دہرایا ہے۔ زندگی ہمارے اندر ہے۔ باہر نہیں۔“

اومسک جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کاغذ اس کے ہاتھ سے جھپنے پر ہوئی۔ اسے اسی کا ذکر تھا اور یہی اس نے کہا۔ ”اگر مجھے لکھنے نہ دیا گیا تو میں مر جاؤں گا۔ کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کو بھی خوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔“

پیرکوں میں یہ چار سال چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ گزرا۔ ان گمراہوں میں جو گہرائی، توانائی اور خوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔ ”یہ تو بد صورت سیپیوں میں بندہ ہوتا ہے جن کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دکھ ہے۔ میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو تفصیل اور سچائی سے پڑھنے اور ان کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ میرے لیے بہت بڑا اثاثہ ہے۔ میں نے روس کو نہیں پر روسی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔ Crime

and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔“

اور اگلے چھ سال اس نے سائبریا کے قصبے میں ڈرل اور مارچنگ کرتے ہوئے گزرا، پر یہاں اسے لکھنے پڑھنے کی آزادی تھی۔ اپنے ہر خط میں وہ اپنے بھائی کو اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسالوں کے نام بھیجتا۔

اور سائبریا میں اس نے

”The My Uncle's Dream“ اور  
”Village of Stepanchikovo“ لکھیں۔

نکولس اول کی موت نے ملکی حالات کو تہل مل کر دیا اور وہ اپنے پیڑز بزرگ کے دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہا



## دیوار گریہ

خاندان قیوم

وہ دیوار دو ملکوں کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس دیوار کی وجہ سے بہت سے خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایسے خاندان کے تمام لوگ صرف ایک ہی دعا کرتے تھے کہ یہ دیوار گر جائے۔ وہ بھی یہی دعا کرتا تھا لیکن جب وہ دیوار گری تو وہ دنیا سے جا چکا تھا۔

### - دلوں کے بیچ کھڑی ایک دیوار کا تذکرہ

مال بردار بحری جہاز کے عرشے کے غلیظ اور پکنے فرش پر تیل سے لٹھڑے ہوئے موٹے رسوں کے بڑے سے بڈل پر میں اور برائن بیٹھے تھے۔ گو کہ اس وقت ہم تھکے ماندے اور ساری دنیا سے بدظن تھے مگر حیرت سے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے منہ موڑے ہوئے کہ یوں مشقت کا احساس بڑھتا نہیں۔ ہم اپنے اپنے سگریٹ بے دریغ پھونک رہے تھے۔ اس وقت یہ واحد عیاشی تھی۔ کڑوے کیلے دھوئیں کی عیاشی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ سیر بہت سے امراض کی نشاندہی کر سکتے ہیں جن میں جان لیوا مرض بھی شامل ہو سکتا ہے۔ ایک پیر میں 33 جوڑے 100 کے قریب غٹھے، عضلات اور لا تعداد خون کی رگیں اور شریانیں ہوتی ہیں جو دل، دماغ، حرام مغز اور ریزہ کی ہڈی سے جڑی ہوتی ہیں۔

سیر میں اسٹھن اور تکلیف: سیر میں تکلیف اور تباؤ کی وجہ جسم میں پانی کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیروں تک آسجین نہیں پہنچ رہی ہے۔ اسی طرح پیروں میں تکلیف بعض دواؤں کے سائیڈ انیکٹ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس کا حل ہے کہ پانی زیادہ پیا جائے، آرام دہ چیتا پہنا جائے اور باقاعدہ ورزش کی جائے تاکہ دوران خون بہتر رہے۔ اگر ہڈیوں میں تکلیف ہے تو یہ پورک ایڈ کی زیادتی کی طرف ایک اشارہ ہے جس کا ایک حل تو ڈاکٹر کو دکھانا ہے اور احتیاط یہ ہے کہ سرخ گوشت ترک کر دیا جائے۔

پیروں کا غیر معمولی ٹھنڈا ہونا: پاؤں اگر مسلسل سرد رہتے ہوں تو یہ کئی کیفیات کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو ڈیپریس، خون کی کمی اور دوران خون کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

پیروں میں سوجن: پیروں میں اگر مسلسل سوجن ہو تو یہ کئی سنجیدہ امراض کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ خون کی کمی، کمزور دل، جگر اور گردوں کے امراض سے بھی پیروں پر سوجن آ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈی وی ٹی یا بڑی رگ میں خون کے کوٹھڑے بننے یا دوران خون متاثر ہونے سے بھی یہ مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ علاج کے دوران ورزش کریں، نمک کا کم

”ہو سکتا ہے۔“

”تمہیں مانتا ہی پڑے گا خالدا!“

”ماں لیا..... تو پھر؟“ میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا

اور ایسے بھی وہ ایک کھرا انسان تھا۔

”تمہیں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میں ایک غریب گھرانے

کا فرد ہوں۔“

”ہاں کئی بار بتا چکے! جو کچھ بھی کہتا ہے بلا توقف کہو

برائے، تجسس مت پیدا کرو۔“

”اس سنائے اور چاندنی کی قسم، شہر کے مضافات میں

ہمارا چھوٹا سا گھر موسم سرما کی بے پناہ برف باری میں تقریباً

کھوسا جاتا تھا۔ اس عظیم موسم میں موت کے بھیاں کسائے

ہمارے ارد گرد منڈلانے لگتے تو خوراک کے ایک معمولی سے

ذرے کی توقیر اور قیمت کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ تمہیں اندازہ

نہیں موت کے مقابل چند بھوکے نادار اور ناتواں انسانوں کی

بھاکے لیے جدوجہد کا۔ ایک دفعہ ایسے ہی موسم میں ہمارے

پاس خوراک بہت کم رہ گئی۔ بہت ہی کم۔ ماں میرے لیے

دودھ کا ایک گلاس لائی اور نہایت ملائمت سے کہہ جاس کا شیوہ

ہے مجھے تاکید کی کہ میں پی لوں، لیکن مجھے شک گزرا کہ ماں

اکتوبر کی خشک شب کے اولین پیر کی چاندنی اور پھر اچھا  
سمندر۔ جہاز سوئے منزل رواں دواں تھا اور منزل تھی گوئے  
مالا جو کہ دو دن کی مسافت پر واقع تھی۔ یاد بخیر کی بیزار کئی  
سے جسم چپے ہو رہے تھے۔ میرے سر کے بال تیل اور ہاتھ  
انجن کی صفائی کی بدولت چلی ہوئی گریس سے آلودہ تھے جبکہ  
جوتوں میں پسینے اور نمی سے بھینکی ہوئی بدبودار جرابیں تھیں۔ کئی  
دن سے شیونہ بنانے کی وجہ سے داڑھی کے بال کھر درے  
پے پیگم اور سپرہ کے کانٹوں کی طرح کھڑے تھے۔

دفترا برائے نولنا شروع کیا تو باوجود اس کے کہ وہ  
مجھ سے منہ پھیرے ہوئے تھا مگر اس کی آنکھوں میں جو ایک  
داغی سی اداسی اور ہر لفظ کے ساتھ جو نمایاں سی سسکی نما آواز منہ  
سے خارج ہوتی، مجھے بخوبی محسوس ہوتی تھی۔ میں دل گرفتگی  
کے احساس سمیت بہترن گوش تھا۔

برائے نے کہا۔ ”میں ثابت کر سکتا ہوں۔“

”کیا؟“ میں نے چاند کے روشن پن کو بخور دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ دنیا میں سب کچھ برائی نہیں ہوتا۔ کچھ خوبیاں

بھی ہوتی ہیں۔“

استعمال اور وزن گھٹانے کی کوشش کریں۔

پاؤں کے چپہرنا ناخن: اس مرض میں پاؤں کے ناخن ابھرے ہونے کی بجائے چمچے کی طرح ہوتے ہیں اور یہ غذائی کمی، خون میں فولاد کی کمی یا اندرونی جریان کی علامات ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیر کے انگوٹھے کا چمچہ شکل کا ہونا جینیاتی امراض اور خون میں کمی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

انگوٹھے کے زرد ناخن: عموماً نیل یا پالش لگانے والی خاتون کے پیر کے ناخن پیلے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ دیگر امراض کی علامت بھی ہو سکتے ہیں۔ جگر کی خرابی، تی بی اور تھائی رائیڈ غدد میں گڑبڑ کی وجہ سے بھی ناخن پیلے ہو سکتے ہیں۔ پاؤں میں سویاں چھیننا: پاؤں میں سرسراہٹ اور سویاں چھبھتی محسوس ہوں تو یہ اعصابی نظام میں خرابی کا ظاہر کرتی ہیں۔ ذیابیطس کے مرض میں اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور سویاں چھبھتی محسوس ہوتی ہیں۔

پیروں کے جوڑ میں اینٹھن اور تکلیف: پیروں کی انگلیوں کے جوڑ میں اگر تکلیف اور مستقل اینٹھن ہو تو یہ گھٹیا کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ گھٹیا میں جوڑوں کا استر (لائنگ) سوچ جاتی ہیں اور نشوز متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اس میں ضروری ہے کہ مریض کو متاثرہ مقام پر برف سے گھور کیا جائے اور ادویہ دی جائیں لیکن یہ سب ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد ہی ممکن ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

نے خود کچھ بھی نہیں کھایا..... تو میں نے پوچھ لیا اپنی ماں سے؟  
”بولتے رہو برائے..... رکومت!“ آہ جیسے لفظ میرے لبوں سے نکلے۔  
”پوچھا اس لیے کہ مجھے گھر میں موجود خوراک کی مقدار کا خوب اندازہ تھا۔“ برائے نے بات جاری رکھی۔ ”دراصل خالد، وقت جب کڑا ہو تو آگے کا کرب کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے اور یہ جو مائیں ہوتی ہیں یہ اپنی اولاد سے بھی کبھی پورا بچ نہیں کہتیں۔ اس وقت ماں کے چہرے پر غضب کا سکون تھا۔ یقیناً ایثار اور اپنی بھوک پر ضبط کا سکون۔ ماں نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے اور پھر میری تسلی کو بھرے پیٹ کی ایک ڈکار کی آواز بھی نکالی لیکن ماں جھوٹ بول رہی تھی۔ دنیا کا سب سے سچا جھوٹ، بتاؤ اگر میں اصرار کرتا تو کہاں وہ دودھ نہ لیتی؟“  
”کبھی نہیں.....“ میری آواز رندھ گئی۔  
”پھر وہ ماں تو نہ ہوئی۔“ برائے کی آواز جذبے کی شدت سے تھر تھرا گئی۔ ”ایسی ہی ہوا کرتی ہیں مائیں۔ مہربان رحم دل اور وفا پیشہ۔ اس دن ماں کے اس ایثار میں گندھے ہوئے سچے جھوٹ نے مجھے ایک سبق دیا کہ ہمیشہ اپنی ضرورت

کو دوسرے کی ضرورت پر فوقیت دینی چاہیے۔ یوں جو ایک لافانی مسرت لٹی ہے وہ انسان کو کبھی غریب نہیں ہونے دیتی۔ غریب وسائل یا آسائشات سے محرومی کا نام نہیں بلکہ جذبہ خدمت اور قربانی کے فقدان کو غریب کہا جاتا ہے۔ ایک سگریٹ دینا پلیز..... میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔“ اس نے سلگتے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا۔  
”سیرھیوں کے نیچے جو اسٹور تھا اس میں ہماری پالتو کتیا نے سچے ڈیلور کیے تھے۔ کتیا بھوکے تھی اور جب کوئی جانور بھوکا ہو تو اس کی درد بھری کراہوں کو صرف اس کا مالک ہی سمجھتا ہے اور اس بے رحم کیفیت میں جانور کی خوشامد بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے اس دن کتیا میرے کچڑے سے آلودہ جوتے چاٹتی رہی تھی اور آخر کار مایوس ہو کر اپنے نومولود بچوں کے پاس چلی گئی تھی۔ تو ماں جو نبی کمرے سے نکلی تو میں نے دودھ کا وہ گلاس اٹھایا اور اسٹور میں جا کر کتیا کو پلا دیا کیونکہ مجھ سے زیادہ وہی حق تھی۔ وہ ہماری نیکی کا عملی آغاز تھا۔ دنیا میں سب کچھ برائی نہیں ہوتا۔“  
”تمہیں ماں یاد آتی ہے برائے؟“ کتنا فضول سا سوال تھا میرا۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔



پر جو دیوار کے ادھر ہے؟ دو سال۔، گھر نہ نہیں گئے تم کیوں؟ اور تمہاری چھوٹی بہن، کیا نام ہے۔  
ہاں..... اسٹھر..... وہ کہاں ہے؟“ اسنے بہت سارے سوال پوچھے تو برائن تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے پانچ سالہ رفاقت میں اسے پہلی بار روتے ہوئے دیکھا۔ میں بھی اٹھا اور اس کے بچے آنسو پونچھتا چاہے لیکن کمال نری سے اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ خاموش تھا اور اس کی آنکھوں میں ہنوز بہت سے آنسو تھے۔

”ہوسکتا ہے وہ دیوار اب تک گر چکی ہو۔ معلوم تو کرو۔“

”نہیں.....“

”کیوں برائن؟“

”زیادہ سوال مت پوچھو؟“ اس نے ہلٹ کر عرشے پر پڑے موٹے تیل زدہ رسوں کے بندل کو ناراضی سے ٹھوک ماری اور ادھر اچھے جلسے گریٹ کو سمندر کی طرف اچھال دیا۔ تیز ہوا کی وجہ سے تھکی تھکی چنگاریاں سی اڑیں جیسے چکنوڈں کا دستہ بکھر جائے۔ پھر یوں ہوا کہ تین سال کوئی سوال پوچھے بغیر گزر گئے۔ برائن کی یاد بھی بکھار ہی آتی تھی مگر جب بھی آتی تو پیٹ میں ایسی آٹھن محسوس ہوتی جو بے رحم زہریلے موسم میں بھوک سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

شام کا وقت تھا۔ میں لان میں بیٹھا اخبار کی بچی کھچی خبریں پڑھ رہا تھا کہ نظر اچانک ایک شہ سرخی پر پڑھ گئی۔ ”دیوار برلن گرا دی گئی۔“

میں دیوانہ وار اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف لپکا تاکہ برائن کو مبارک باد کا ایک زبردست سا خط لکھوں۔ خط تو لکھ ڈالا مگر اگلی صبح تک مجھے یاد ہی نہ رہا کہ اسے سپرد ڈاک بھی کرنا ہے۔ مصروفیات کچھ ایسی آڑے آئیں کہ خط کی طرف دوبارہ خیال ہی نہ گیا۔

کوئی ہفتہ بعد دفتر سے تھکا ہارا شام کو گھر پہنچا تو ماں نے پانی کے گلاس کے ساتھ ایک زرد رنگ کا لفافہ بھی تھما دیا۔ یہ بخلت تمام لفافہ چاک کیا مگر وہ خط کیا بلکہ ایک درد ناک اطلاع تھی۔ ”پیارے خالد!“

دیوار برلن تو آخر کار گر گئی لیکن میری عزیز ماں کی موت کے بعد۔

تمہارا۔

برائن (جبرمتی)

”ہاں..... بہت زیادہ۔“ اس نے تڑپ کر جواب دیا۔  
”میری عزیز ماں جو ساری دنیا میں صرف میری واپسی کے دن گن رہی ہوگی۔“

اور یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ برائن زور رہا تھا اور میں نہ دیکھنے کے باوجود دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی نہ تھی البتہ وہ چمک تھی جو بہادری کی سوچتی ہوئی تلواروں میں ہوتی ہے۔

”میں وہ دن کبھی نہیں بھلا سکتا!“

”کون سے دن؟“ میں نے قریب الختم سگریٹ کو اپنے جوتے کی ایڑی سے تکر گڑتے ہوئے پوچھا۔

”جب ماں ہمیں ہر ہفتے کی شام ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد دیوار برلن کے پاس لے جاتی۔ ایک بلند چوہترے پر چڑھ کر وہ دیوار کی مغربی جانب نگاہیں جمادیتی۔ میں اور میری چھوٹی بہن اسٹھر دونوں ماں کی بے کراں محویت کے احترام میں سانس بھی از حد احتیاط سے لیتے کہ کہیں اس کی توجہ نہ ٹوٹ جائے۔ کیسویں کہ اس عالم میں وقت ٹھہر سا جاتا اور جب بہت دیر بعد ماں اپنی نظر سمیٹ کر ہمیں دیکھتی تو ہم مچل کر اس کے مامون دانسن سے چٹ جایا کرتے۔ ماں کی مشفق ہاتھ کی لرزیدہ انگلیاں ہمارے سنورے ہوئے بالوں کو سہلانے لگتیں اور ہم اس ہستی کو دیکھتے جس کی آنکھوں میں دنیا کا سب سے قیمتی پانی چھلک رہا ہوتا۔ وہ بہت دھیرج سے ٹھوس اور مستحکم لہجے میں کہتی جاتی۔ آخر کب تک؟ ابھی تو جبر کی اس علامت کو گرتا ہوگا۔“

”کیوں کہتی تھیں وہ یہ سب برائن؟“ میں تجسس کے زیر اثر پوچھ بیٹھا۔

”اس لیے کہ.....“ برائن ذرا سا رکا اور پھر بولا۔ ”میرے باپ کی قبر دیوار کی مشرقی طرف ہے۔“

”اوہ۔ افسوس..... تو پھر؟“

”ماں بہت سے پھول اپنے لرزتے ہاتھوں سے دیوار کی دوسری سمت اچھال دیتی اور ہم بوجھل قدم اور خالی پیٹ لیے واپس کھر لوٹ جاتے۔“

خاموشی کا وہ وقفہ نہایت جان توڑ تھا۔

”برائن!“ میں نے ہمدردانہ جذبے کے تحت اسے

پکارا۔

”کیا ہے؟“

”کیا ماں اب بھی جاتی ہوں گی؟ اس چوہترے تک جو دیوار کے ادھر ہے اور پھول اب بھی گرتے ہوں گے اس قبر

## نہ قصہ کہانی

افتخار مجاز

کہتے ہیں کہ سات سمندر ہیں، سات ہی آسمان ہیں، سات کولکی نمبر کہا جاتا ہے۔ پاکستان بھی سات حروف سے لکھا جاتا ہے یعنی کہ یہ صرف ایک ملک نہیں برصغیر کے مسلمانوں کو شب قدر میں دیا گیا باری تعالیٰ کا تحفہ ہے لیکن ہم اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں۔

### پاگل خانے میں مقید ایک شخص کا دکھ بھرا پیغام

قیام پاکستان کا مقصد محض ایک الگ تھلک خطہ ارض کا حصول نہیں تھا بلکہ ایک ایسی نظریاتی مملکت کو وجود میں لانا تھا جہاں کے رہنے والے نہ صرف اپنے عقائد و نظریات اور مذہب کے مطابق اپنی ترقی و خوشحالی کے خواب دیکھ سکیں بلکہ ان خوابوں کی عملی تعبیر بھی پائیں۔ یہی وہ نصب العین تھا جس کے لیے قوم نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں لاکھوں جانوں کی قربانی دی تھیں مگر ہماری بدقسمتی کہ قیام پاکستان کے بعد اس پاک سرزمین پر خود غرضی، نفسانفسی اور لوٹ کھسوٹ کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ برائی برائی نہ رہی، نیک و بد، خیر و شر، آدم و ابلیس، حق و باطل اور حلال و حرام کی تمیز ختم ہو گئی۔ جذبہ ملک و ملت سے سرشار پاکستانی پر اس صورت حال کے باعث کیا کیا گزر جاتی ہے اس کا اندازہ آپ کو اس واقعے سے ضرور ہو جائے گا جو پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے میرے ساتھ پیش آیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔



ستمبر 2017ء

159

ماہنامہ سرگزشت

ابھی کیرا میں پاکستان ٹیلی ویژن کے الفاظ بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ تذکرہ ممبر جسے میں کئی دن سے مسلسل خاموش دیکھ رہا تھا نے پاکستان کا نام لے کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اگرچہ میں نے فوری طور پر شدید رویہ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ مادر وطن کو گالی نہیں دینی چاہیے۔ میری سرزنش پر وہ ذرا خنڈا ہوا تو میں نے محل سے اسے وطن کی اہمیت اور مقام و مرتبہ بتا کر سمجھانا شروع کیا کہ یہ وطن تو ہماری ماں کی طرح مقدس اور قابل احترام ہے۔ اسے ہم نے لاتعداد قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے لہذا اسے گالیاں نہیں دینی چاہئیں۔

وہ میری یہ جذباتی اور درویش گفتگو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ چپ چاپ سنتا رہا، پھر یکدم اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے غصے سے اپنے ہونٹ پیچھے ہوئے میری طرف دیکھا اور گویا ہوا۔ ”بھئیانیہ جدوجہد اور قربانیاں قیام پاکستان کے لیے تھیں مگر مجھے بتائیں کہ وہ پاکستان ہے کہاں جس کے لیے اتنی ذمہ ساری قربانیاں دی گئی تھیں۔ کیا یہ کہیں گمان تھا کہ نئے خطہ ارض میں جہاں ہم آزاد ہوں گے کوئی ہمارا استحصال کر سکے گا کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی، ہر شخص بلا امتیاز انصاف حاصل کر سکے گا۔ ہم آزاد بھی ہوں گے اور خود مختار بھی۔“ مجھے بہت تن گوش دیکھ کر اس کے لہجے میں ٹھہراؤ اور گفتگو میں زیادہ سنجیدگی در آئی۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم کہتے ہیں یہ وطن قربانیوں اور جدوجہد سے بنا ہے جب کہ ہمارے مخالفین ہندو کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ ملک لوٹ مار کر کے لوٹ مار کرنے کے لیے حاصل کیا ہے اور آج جب میں اپنے ارد گرد دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے مخالفین کا موقف درست لگتا ہے۔“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”برادر عزیز! مجھے آپ سے اختلاف ہے۔“ میں نے بہت ہی ملامت اور نرم لہجے میں کہا۔ ”بھائی! اگر ایسا ہو رہا ہے تو یہ تصور پاکستان کا نہیں۔“

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے بات کاٹ دی اور بولا۔ ”آپ اختلاف کریں۔ یہ آپ کا حق ہے بلکہ میں تو آپ سے یہ کہوں گا کہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ نہ بولنے لگا کہ آپ ایک پاگل سے گفتگو ہیں۔ برادر مر! وہ زور دے کر گویا ہوا۔ ”اگر میری باتیں آپ کو بری لگیں تو انہیں ایک پاگل کی گفتگو سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔“

اس کا یہ جملہ سن کر میں تقریباً سکتے میں آ گیا تھا۔ تاہم اس کے متوجہ کرنے پر میں اس کیفیت سے باہر نکلا۔ وہ کہنے

یہ غالباً نومبر 1982ء کے دنوں کی بات ہے میں راولپنڈی اسلام آباد سینٹر سے تبدیل ہو کر نیا نیا، لاہور کی وی سینٹر پر تعینات ہوا تھا انہی دنوں مجھے نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر رشید چوہدری کے زیر انتظام چلنے والے ذہنی معذور افراد کی بحالی کے ادارے ”فاؤنٹین ہاؤس“ کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اپنے اس فرض کی بجا آوری کے دوران مجھے تین چار روز تک مسلسل پاگل، نیم پاگل اور ذہنی طور پر بیمار افراد کے ساتھ بہت سادقت گزارنے اور انہیں قریب سے دیکھنے پر کھنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر کچھ تلخ مضمحیر کو جگا دینے والے واقعات بھی دیکھنے کو ملے اور بعض ذہنی بیمار، پاگل افراد کی ہوشمندانہ گفتگو بھی سننے کا اتفاق ہوا۔

فاؤنٹین ہاؤس میں تین چار روزہ شوٹنگ کے دوران میں نے اکثر ممبران (یہاں مریضوں کو کبیر کہا جاتا ہے) کو اوٹ پٹانگ کر تھیں کرتے دیکھا اور ان کی بے معنی ولائینی گفتگو سنیں اس سارے عرصے کے دوران اوٹ پٹانگ کر تھیں کرنے والوں کے درمیان صرف ایک رکن ایسا تھا جسے میں نے مسلسل کم کم سنجیدہ اور نارٹل Behave کرتے ہوئے پایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہماری شوٹنگ کے دوران وہ کبیرے کے سامنے آنے سے مسلسل گریز کرتا رہا ہے جب کہ باقی ممبران کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی تصویریں بنواتے اور ذہنی مریض ہوتے ہوئے بھی مسلسل کبیرے کے سامنے رہنے کی کوشش کرتے۔ یہ کم کم رہنے والا شخص مجھے سب سے مختلف لگا اور میرے ذہن پر سوار ہو گیا کہ آخر یہ ممبر سب سے منفرد کیوں ہے؟

فاؤنٹین ہاؤس میں زیر علاج ان مریضوں کو بطور علاج سیر و تفریح کے لیے بھی لے جایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری شوٹنگ کے دوران اس Sequence کی فلمینگ کے لیے انہیں ایک روز باغ جناح لاہور لے جایا گیا، یہاں بھی جب ہم شوٹنگ کر رہے تھے تو تقریباً سب ممبران بے معنی اچھل کود اور الٹی سیدی کر تھیں کرتے رہے مگر وہ واحد شخص تھا جو الگ تھلگ بیٹھا فلک کی جانب معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھ جاتا تھا۔ اسے چپ چاپ اور اکیلا پا کر میں اس کی جانب بڑھا، وہ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر احترازا کھڑا ہو گیا۔

”آئیے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی بھی تھوڑی سی فلم بنائیں۔“

اس نے پوچھا۔ ”یہ فلم کہاں چلی گی؟“ پوچھتا اس کے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا۔ کیرا میں بولا۔ ”پاکستان۔“

رہنے کی تلقین کرتے با انداز دیگر کسی غلط کام کرنے والے ہی کی طرف داری اور حمایت کرتے جب کہ وہ خود بھی اس کی زیادتی کا نشانہ بن رہے ہوتے۔ بہر طور اسی صورت حال میں جلتا، بھٹتا، کڑھتا کھڑا اور تاشتا زہر مار کر کے تیار ہو کر دفتر کے لیے روانہ ہو جاتا۔ یہاں میرا بھٹلا اس کنڈیکٹر سے ہوتا، جو کلٹ کے پورے پیسے لینے کے باوجود اکثر مسافروں کو کلٹ جاری نہ کرتا۔ چنانچہ میں حسب عادت یہاں بھی احتجاج کرتا مگر قسم یہ کہ یہاں بھی سامی مسافر میرے ہمنوا ہونے کی بجائے اسی کا ساتھ دیتے اور کہتے چلو یا جانے دو بے چارہ غریب آدمی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے اس کام کے عوض ہی تنخواہ وصول کرتا تھا مگر وہ اسی ادارے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف نظر آتا جو اس کے اور اس کے اہل خانہ کے رزق کا باعث تھا۔ چنانچہ جب میں اسے دیانت داری سے فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتا تو لوگ یعنی ساتھی مسافر مجھے اس فعل سے روکتے ٹوکتے اور میری دیانتداری کا مسخر اڑاتے، یوں میں بھی غصے میں آجاتا اور ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو جاتی بعض اوقات لڑائی بھٹلے کی صورت بھی پیدا ہو جاتی اور ہمیشہ مجھے ہی سبڑ رکنے پر مجبور کیا جاتا۔ بہر طور اس دلدل میں تھڑنے کے بعد جب میں اپنے دفتر میں داخل ہوتا تو یہاں بھی مجھے ایک ایسی ہی دنیا سے واسطہ پڑتا جو ان خوابوں کی تعبیر نہیں تھی جن کی خاطر ہم نے یہ الگ تھلک خطا ارض یعنی پاک سرزمین حاصل کی تھی۔ قصہ مختصر میرے دفتر میں جب مسائل اپنے کام کی غرض سے میرے پاس آتے تو میں ان کے کام نہ سنانے کو اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے دفتری اوقات کار کے بعد بھی اپنے ٹھیکری کی آواز پر درتیک بیٹھ کر کام کرتا لیکن میرے رشتہ کو میرا یہ رویہ برا لگتا۔ وہ مجھے سانکوں سے نذرانہ وصول کیے بغیر انہیں فارغ نہ کرنے کے مشورے دیتے گویا بدعنوانوں اور بے ایمانیوں کی حصار میں مجھے جکڑنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے مگر جب میں یہاں بھی قابو میں آنے سے انکار کر دیتا بلکہ اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو افسران بالا سے میری شکایات لگا کر مجھے تنگ و پریشان کیا جاتا۔ دوم جب جواب طلبی تک کرا دی گئی۔ تاہم میں اپنے ضمیر کے مطابق ہر جگہ دیانتداری کے لیے سرگرم عمل رہا اور جہاں بھی کوئی نا انصافی یا بددیانتی دیکھتا سراپا احتجاج بن جاتا کیونکہ میرے نزدیک پاکستان کا قیام لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے اور انہیں لوٹنے کے لیے عمل میں نہیں آیا تھا بلکہ اس خطے کے رہنے والوں کے لیے دارالامان اور دارالرحمت کے طور پر حاصل کیا گیا تھا۔

لگا۔ ”آپ دیکھ نہیں رہے کہ یہاں اکثریت لوٹ مار میں لگی ہوئی ہے اور اگر کوئی اس دوڑ میں شریک نہ ہو تو اس کا حال مجھ جیسا ہو جاتا ہے۔ اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا؟“ اس نے گفتگو کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک مجھے پاگل قرار دے کر میٹل اسپتال میں داخل نہیں کرا دیا گیا تھا میں بھی لاکھوں حساس اور آپ جیسے دردمند پاکستانیوں کی طرح پاکستان کے حوالے سے بڑی جذباتی سوچ رکھتا تھا مگر جب میں اپنے معاشرے خصوصاً اپنے گھر والوں کے لیے اپنی اسی حب الوطنی اور پاکستان سے وابستہ بے حد جذباتی سوچ کی وجہ سے ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر یہاں داخل کرا دیا۔ یوں میں اب باقاعدہ ڈکٹیٹر اور Bonafide رجسٹرڈ پاگل ہوں، گویا میں اگر پاگل کے اعزاز سے بہرہ مند ہوں تو یہ اعزاز مجھے پاکستان کی محبت ہی میں ملا ہے۔ میں پاکستان کی محبت ہی میں پاگل ہوا ہوں۔“

اس نے ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے، میں ایک ایماندار، دیانت دار، راست گو اور بے باک سچا محبت وطن جذباتی پاکستانی نوجوان تھا۔ معاشرے میں موجود بدعنوانیاں، بے ایمانیاں، بدعہدیاں، جھوٹ فراڈ اور سب سے بڑھ کر مافی انداز نظر رکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ میں اس صورت حال پر کڑھتا، لڑتا، احتجاج کرتا کیونکہ حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران بتایا گیا تھا کہ جب ہم آزاد ہوں گے تو ہمارے اپنے وطن میں یہ برائیاں نہیں ہوں گی۔ وہاں انصاف بھی ہوگا اور دیانت بھی ہوگی مگر مروج قدریں اور صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت ہوئی جارہی تھیں۔

میری ہرج و مرج کا آغاز ہی اس صورت حال پر میرے احتجاج سے ہوتا۔ ان دنوں میں ایک سرکاری ادارے میں ذمہ دار پوسٹ پر تعینات تھا۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں بازار سے دودھ لینے جاتا تو دودھ فروش سے جھگڑا ہو جاتا۔ سب اس روز کی جی جی اور بک بک کا یہ ہوتا کہ دودھ فروش پانی ملا طوٹ شدہ دودھ دیتا۔ میں احتجاج کرتا کہ کیا! جب تم نے دودھ کا ایک ریٹ مقرر کر رکھا ہے، وہی بھی خالص دودھ بیچنے کا کرتے ہو تو پھر پورے پیسے کے خالص کی بجائے پانی والا دودھ کیوں دیتے ہو۔ البتہ یہ تھا کہ ہر روز میں اکیلا ہی احتجاج کرتا، چنانچہ وہ بدتمیزی پر اتر آتا مگر کوئی اسے نہ روکتا تو کتا سب مجھے ہی ٹھنڈا

پاکستان زندہ باد کے نعرے لگوا رہا تھا۔ اس کے طرز عمل میں ایسی تبدیلی سے مجھے ایک عجیب سا سرور اور شادمانی کا تاثر ملا۔ تقریب ختم ہوئی تو میں آگے بڑھ کر اس سے ملا، اس نے فوراً مجھے پہچان لیا اور بولا۔ ”الزبتھ ٹیڑھی تو کسی کی ماں ہے اور ماں کبھی بری نہیں ہوتی۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے احساس دلایا تو میرے اندر سے یہ آواز اٹھی کہ اولاد میں سے اگر کچھ بچے ماں کی خواہشوں کی تکمیل نہیں کر رہے تو فرمانبردار بچوں کو نافرمان بچوں کے رویے کی گالی ماں کو تو نہیں دینی چاہیے بلکہ انہیں تو ماں کی اور بھی زیادہ فرمانبردار کرنی چاہیے تاکہ ایک تو نافرمانوں کے رویے اور عدم توجہ کی بھی مثال بن جائیں اور دوسرے ممکن ہے کہ اچھے بچوں کا رویہ اور طرز عمل دیکھ کر نافرمان خود یا ان کی آئندہ نسل اپنا طرز عمل بدل لے اور اچھے و مثبت رویے کا اظہار شروع کر دے۔“ وہ رک بھر کھری سانس لے کر بولا۔ ”سر میں باگل ہوں ناں! ڈیکٹر ڈیاگل، اس لیے اگر آپ کو میری باتیں اچھی نہ لگیں تو نظر انداز کر دیں۔“

وہ بظاہر تو باگل تھا کہ اسے ڈاکٹر کی شوقیت میں یہ اعزاز مل چکا تھا مگر اس کی باتوں میں بلا کی شجیدگی اور ذہانت بھی، کہنے لگا۔ ”برسوں پہلے جب کبھی میں نارتھ لوگوں میں رہتا تھا تو میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر کوئی نماز پڑھنے نہیں آتا تو مومن کا یہ کام نہیں کہ وہ اذان دینا چھوڑ دے۔ آپ نے فاؤنٹین ہاؤس میں مجھ سے ہونے والی گفتگو کو ایک باگل کی گفتگو سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوتا تو شاید آج کی تقریب میں پاکستان زندہ باد کے نعرے اتنے جوش و خروش سے سنائی نہ دیتے۔ آپ یقین کریں یہاں ہیں تو بظاہر سب باگل مگر آپ کی وی ہوئی روٹی میں، میں نے انہیں پاکستان کی جو اصل تصویر دکھائی ہے اس کی بناء پر اب یہ آپ سے زیادہ اور پہلے سے بہتر پاکستانی ہیں، میرے ساتھ آواز ملا کر دیکھ لیجئے۔ چنانچہ ہم دونوں نے با آواز بلند کہا۔ ”پاکستان“ دھڑ سے پرجوش جواب آیا۔ ”زندہ باد۔“

قاری محترم! سطور بالا کا مرکزی کردار اب بھی گا ہے بگا ہے مجھے ملتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا نے مجھے موع اور وسائل دیئے تو میں آنے والے وقت میں ایک ایسی دستاویزی فلم بنائوں گا جسے دیکھ کر آئندہ نسلوں میں سے ہر بچہ اس فلاحی اور استحصال سے پاک معاشرے کا اہم کردار ہو گا جس کی نوید بابائے قوم حضرت قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر قائدین نے قیام پاکستان کے وقت دی تھی۔ انشاء اللہ ہم اس کو ویسا ہی پاکستان بنا کر دم لیں گے۔

بہر طور میں بات کر رہا تھا ہر نا انصافی اور غلط بات پر لازماً React کرنے کی۔ میرے اس طرز عمل کی وجہ سے رفتہ رفتہ گھر میں میری مشکلات بڑھنے لگیں۔ انفسوس یہ کہ ہر شخص مجھے ہی اپنا درد اور طریقہ کار تبدیل کرنے پر مجبور کرتا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ انصاف کا راستہ وہ ہے جس کے لیے میں لڑ رہا ہوں اور یہ درست ہے، ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جو قیام پاکستان کی اس حقیقی منزل کی طرف جاتا ہے جو ظلم، استحصال، نا انصافیوں، بد اعمالیوں اور بد عہدوں سے بہت دور ہے۔ بہر طور قصہ مختصر جب گھر میں میری شکایات کی تعداد بڑھنے لگی تو میں جو پہلے معاشرے کے لیے ناقابل قبول تھا اب گھر والوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے اس مسئلے کا فوری حل بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ مستقل حل ڈھونڈ لیا تو غلط نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک روز ایک اسپتال کی انتظامیہ کو کچھ دے دلا کر انہوں نے مجھے باگل خانے جے مہذب زبان میں مینٹل اسپتال کہتے ہیں، میں داخل کر دیا۔ پہلے چند سال میں وہاں کے باگل خانے میں رہا اب کچھ برسوں سے یہاں فاؤنٹین ہاؤس میں ہوں۔ آپ یقین کریں کہ جب مجھے باگل ڈیکٹر کر کے مینٹل اسپتال میں داخل کرایا گیا اس وقت میں وقتاً پاگل نہیں تھا لیکن اب میں باگلوں کے ساتھ اتنے برس گزارنے کے بعد حقیقتاً باگل ہو چکا ہوں۔ آپ بتائیں مجھے باگل کس نے کیا، کیا پاکستان کی محبت نے؟ کیا میں پاکستان اور اہل پاکستان کے ہاتھوں نہیں لٹا؟ کیا اپنی زندگی کے چندہ قیمتی سال باگل خانوں میں گزارنے کے باوجود مجھ میں پاکستان سے محبت کروں؟“

وہ دلیل کے ساتھ بات کر رہا تھا اور مجھے اس کی باتوں میں ترشی نہیں کڑواہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فرض کرو اگر اپنی ماں اچھی نہ ہو تو کیا ہم الزبتھ ٹیڑھی کو اپنی ماں کہنا شروع کر دیں۔ وطن تو ماں کا ہی ایک دوسرا روپ ہے۔

دلیل سے بات کرنے والا وہ باگل اس لمحے مجھے لا جواب نظر آیا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں اختلاف کے دورے اب بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ بہر طور میں فاؤنٹین ہاؤس میں اپنی شونگ مکمل کر کے دیگر مصروفیات میں لگ گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد مجھے فاؤنٹین ہاؤس ہی میں یوم پاکستان کی ایک تقریب میں شرکت کا موع ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ جو کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کا نام سننا تک گوارہ نہ کرتا تھا سینے پر پاکستان کا جج آویزاں کیے بار بار

## انظریہ

ایاز راہی

اس دنیا میں مذاہب کی ایک قطار ہے۔ عجیب عجیب سے نظریہ پر چلنے والے لوگ ہیں۔ کوئی ایک خدا کی پرستش کرتا ہے تو کسی مذہب میں کئی کئی خدا کی پرستش ہوتی ہے۔

### دلچسپ حقیق پر مبنی ایک مختصری تحریر

سے بھی گزر جاتا ہے، اس صلے کی تمنا میں کہ وہ امر ہو جائے گا۔ تمام مصائب، تکالیف اور خوف سے اسے نجات مل جائے گی اور ہمیشہ کی آسودہ زندگی (سورگ۔ جنت) اس کا مقدر ٹھہرے گی۔ وہ آزاد رہے گا۔ خود کو قربان کرنے اور معبود پہ مرشنے کا جذبہ بالآخر اس حد تک بڑھا کہ غالب جیسا دانا و بیبا آدمی بھی بے اختیار کہہ اٹھا کہ۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی  
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
اسی چیز کو شاعر مشرق علامہ اقبال کچھ اس رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

مستاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی  
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی  
پوچنا، بندگی، مال کار، آسودگی، آزادی اور دوام۔ جس طرح کرۂ ارض کی تقسیم تین حصے پانی اور چوتھا حصہ خشکی (ریح مسکوں) ہے اسی طرح دنیا کا غالب حصہ کسی نہ کسی مذہب (دھرم) کے زیر اثر ہے۔ بہت کم آبادی مذہب (دھرم) کی باندیوں سے آزاد (دہریہ) ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال ہی

عبدالو معبود، ساجد و سجد، بت اور پجاری کا موضوع تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ آدمی۔ شاید حضری (تمدنی۔ شہری) زندگی سے پہلے آدمی جب غاروں اور درختوں پہ بئیرا کرتا تھا تب وہ غالباً مذہب سے نا آشنا تھا۔ آزاد ذہن و دہن کے ساتھ کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا تھا۔ ذہنی ارتقا اور بڑھوتری کا آغاز ہوا تو سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت نے جنم لیا۔ ساتھ ہی رفتہ رفتہ زمینی اور آسمانی آفات و حادثات نے اسے خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان آفات کے آگے بے بس ہو کے ان کی پوجا شروع کر دی اور بالآخر مختلف خداؤں دیوتاؤں کا پجاری بن بیٹھا۔ ان کے آگے جھکنا، ڈنڈوت یا سجدہ کرنا۔ دان پین یا نذر نیا ز گزارنا حتیٰ کہ اپنے آدمیوں، بچیوں اور اپنی قربانی بھی بہ طیب خاطر دینا اس کا دیرہ ٹھہرا۔ اپنی اور اپنی نسل کی بقا کا خیال۔ مرشنے کا خوف۔ عجیب و غریب معبودوں اور دیوتاؤں کا جواز بنا۔ معروف منکر سمندر فرایض کے بقول مذہب بنیادی طور پر خوف ہی کی پیداوار ہے۔ اس قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو خوف زدہ آدمی اپنے خدا یا دیوتا کو راضی کرنے کے لیے ہی بہادر بنتا ہے، اس حد تک کہ اپنی جان





کی نہاں میں۔

”سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بے زار بھی ہیں۔“

(شکوہ)

دھرم والوں نے بھی اپنے خداؤں یا دیوتاؤں کے ساتھ عجیب متغداد بلکہ دلچسپ رویہ اپنا رکھا ہے کہ ایک طرف تو اس کے لیے قربانی، خیر خیرات اور دان پن کو لازم و فرض قرار دیا اور دوسری طرف معبودوں (موجودوں۔ بتوں) کو مکمل طور پر بے نیاز گردان کر ایک طرح سے آدمیوں سے لاتعلقی اور علیحدہ کر ڈالا۔ کچھ اس بحث میں بھی الجھے (اب بھی ہیں) کہ خدا نے آدمی کو تخلیق کیا یا آدمیوں نے اپنے اپنے خدا کھڑے ہیں۔ ایک اور بات کہ تمام مذاہب (دھرم) میں خدا یا دیوتاؤں کا تصور و خیال آتے ہی آدمی کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں یا اپنے معبود کی جانب اشارہ کرتے اس کی انگلی بے اختیار اوپر آسمان کی طرف ہی اٹھ جاتی ہے، چاہے وہ بھگوان، خداوند، ربی یا زیرواں ہو، اوپر والا ہی کہلاتا ہے جب کہ اسے ہر جگہ موجود بھی کہا اور مانا گیا۔ یہ قول علامہ اقبال

بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جا جاتی ہے۔ (شکوہ)

یہاں لفظ۔ ہر جا۔ ہر دعویتوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی بے وفا اور ہر جگہ موجود۔ ایک اور شاعر کے یہ قول۔

ہو گئی نہیں اور ہر جا ہو

اسی طرح اُن دیکھے خدا کی عبادت بھی حضرت انسان کے لیے اک مسئلہ تھا اور ہے۔

خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر  
بستا پھر کوئی اُن دیکھے خدا کو کیوں کر  
(شکوہ از اقبال)

سو، خوف زدہ اور فریب خوردہ آدمی نے اس کا حل یہ نکالا کہ چاند، سورج، ستارے، حجر و پتھر اور مظاہر کا نسات کی پوجا شروع کر دی جن میں جانور۔ چند پرند اور درندے بھی شامل ہو گئے۔ یوں بے شمار دیوتاؤں کا اک سلسلہ سامنے گیا۔ وہی بات کہ دھرم خوف کی پیداوار ثابت ہوا۔ عقل انسانی نے ہاتھ پاؤں پھیلانے۔ پر پرزے نکالنے تو اس نے ڈھیروں خداؤں سے جان چھڑانے کی سوچی اور بالآخر سنا کر تین۔ دو۔ اور پھر ایک خدا پہ آن ٹھہرا۔ گو کہ ان گنت خداؤں کی پوجا آج بھی جاری ہے۔ مگر ان میں توحید (ایک خدا) تھیٹ (دودھا) اور تھیٹ (تین خدا) کے پیروکار نمایاں ہیں۔ توحید میں یہودی اور مسلمان۔ تھیٹ میں پارسی، بوجی یا آتش پرست اور تھیٹ میں عیسائی دنیا شامل ہے۔ عیسائی پیروکاروں کی

تعداد سب سے زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے صدیوں پہلے ایران میں محوی مذہب (دودھا) نے جنم لیا جو غالباً یہودی توحید کا تزویر تھا اس سلسلے میں حتیٰ بات کا تعین تاحال ناممکن ہے۔ اہل ہند ان گنت دیوی دیوتاؤں کی کثرت کا شکار تھے اب بھی ہیں۔ یہی صورت حال روم اور یونان کی بھی تھی مگر یونان میں عقل و خرد کی شمع روشن ہو چکی تھی جو مذہبی چہالت (دیوی دیوتاؤں) کے مقابل علم کی روشنی بکھیر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت اور یہودی توحید خود پرست علما اور پیشواؤں کے ہاتھوں مٹ ہو چکی تھی۔ ایسے میں انسان کا بنیادی مسئلہ خیر اور شر تھا۔ خیر و شر کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کی ماہیت اور حدود کیا ہیں؟ یہ مسئلہ کہاں سے شروع ہوتا اور کہاں تک دراز ہے؟ خیر اور شر میں آدمی کی حیثیت کیا ہے؟ آدمی خیر ہے یا شر؟ یہودی اور بعد میں عیسائی و اسلامی توحید کے مطابق اس کا نسات کا خالق ایک ہی ہے۔ تو خیر اور شر ایک ہی خالق سے منسوب ہیں؟ خیر اگر حسن ہی حسن ہے تو اس کے مقابل شر (بد صورتی) کا وجود کیوں عمل میں لایا گیا؟ یہ اور ان جیسے بے شمار سوالات کی بھول بھلیوں میں انسانی ذہن گم تھا۔ بھٹک رہا تھا۔ اسی جھنجھٹ سے نجات کے لیے عقل کے پیار یوں اور مادہ پرستوں نے آخر کار خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا اور صرف مادیت تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ اسی کا فکری و خیالی میں اک نئے مذہب نے جنم لیا جس نے انسانی فکر اور رویے پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور صدیوں تک رانی کی۔ آج سے چھبیس صدیاں یا اڑھائی ہزار سال پہلے 600 (قبل از مسیح) ایران میں پارسی مذہب منصفہ شہود پہ آیا۔ جس کی بنیاد دودھاؤں پر مبنی اس مذہب کا بانی زرتشت 600 ق م 551 ق م تھا یہ کسی بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا اصل اور خاندانی نام۔ اشٹاما۔ یا اسپتاما تھا۔ اس نے بھی گوتم بدھ 563 (ق م تا 483 ق م) کی طرح شادی کی مگر پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جنگلوں میں نکل گیا۔ دنیا ترک کر دی اور غور و فکر میں اتر گیا۔ آدمی ذہن اور اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا۔ واپس آیا تو منوجہر بادشاہ کی کول کارکن منتخب ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق مشہور فلسفی فیثاغورث 580 (500 قبل از مسیح) کا شاگرد بھی رہا۔ یہ شخص جنگل کی تنہائی میں گہرے سوچ بچار کے بعد روشنی لے کے آتا ہے۔ زرتشت کے لفظی معنی ہی سنہری روشنی کا مالک۔ ہیں۔ زر یعنی سنہری اور آتش۔ بے معنی روشنی۔ سو۔ سورج پوجا کی بنیاد پڑی The Crisis of the Modern World کے مصنف

بہار کا آغاز) مجوسیوں کا عقیدہ کہ اس دن دنیا کو پیدا کیا گیا سیاروں کو حرکت کا حکم ہوا حضرت آدم کی تخلیق ہوئی۔ ایک اور روایت کہ بادشاہ جشید جسے پہلے صرف جم کہتے تھے دنیا کی سر کر رہا تھا۔ آذر باجیان پہنچا تو حکم دیا کہ ایک مریض تخت کی اونچی جگہ پہ شرق کے رخ بچھایا جائے۔ خود تاج پہن کے تخت پہ بیٹھا۔ جوں ہی صبح سورج نکلا اس کے عکس سے تاج تخت جگمگا اٹھے لوگ بڑے خوش ہوئے کہ آج نوروز (نیا دن) ہے۔ پہلوی فارسی میں۔ شید بہ معنی۔ شعاع (کرن) آتا ہے پس جم کے نام میں شیدا اور یزہا دیا گیا (جشید) اور اس دن بھاری جشن منایا گیا اور پھر مستقل طور پہ نوروز عامہ قرار پایا گیا۔ نوروز خاصہ وہ دن جسے یوم خرداد (خوشی دینے والا) بھی کہتے ہیں جو نوروز عامہ کے بعد ساتویں دن منایا جاتا ہے اسے جشن نیوفر بھی کہتے ہیں اس دن بھی جشید تخت پر بیٹھا اور خاصان شاہی کو بلا کر عمدہ عمدہ ریشمیں جاری کیں، فرمایا کہ آج ہی کے دن خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو۔ پاکیزہ پانی سے غسل کرو۔ خوب نہاؤ دھوؤ اور خدا کے شکر میں نماز و سجود ادا کرو۔ ہر برس آج کے دن عید مناؤ۔ کہتے ہیں اس کا سرہ یعنی شہنشاہ نوشیرواں کی اولاد اور اس کے خاندان والے ہر سال نوروز عامہ سے نوروز خاصا (سات دن) تک لوگوں کی مرادیں پوری کرتے۔ قیدی چھوڑتے، بچرموں کے گناہ معاف کرتے عید مناتے۔ شاہان دہلی اور مغل بادشاہ (شاہی خاندان) بھی آج کے دن خوشی مناتے اور انڈے لڑایا کرتے تھے۔ جب کہ مسلمان عورتوں کے نام بھی نوروزی خانم۔ نوروزی بیگم۔ نوروزی بی بی اور مرد نوروز خان، نوروز بیگ و غیرہ ہوتے۔ اس مثنوی (دودخالی) مذہب نے بہت عروج پایا۔ ایران اور افغانستان کے آتش کدوں میں صدیوں تک آتش مسلسل روشن رہی۔ پارسی پشواہی ملاکو۔ موبد۔ کہا جاتا ہے (جمع موبدان) آج اس مذہب کے پیروکار پارسی لوگ ممبئی (بھارت) اور کراچی (پاکستان) تک ہی سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ کثرت معبود (دیوی دیوتاؤں) تین خدا (عیسائیت) دودخا (مجوسیت) اور ایک خدا (سرخ یہودی توحید) کے مقابل دین فطرت اسلام نے جب سیدھی سادی باطل توحید پیش کی تو صدیوں سے فریب خوردہ انسانی ذہن پھر بھی نہ سنبھل سکا۔

کچھ نہیں جانتا کہاں ہوں میں  
ہوش آئے گا تو بتاؤں گا  
دو خداؤں کے درمیان ہوں میں

رین گیناں (Rene Guenon) کا خیال ہے کہ لفظ زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے منصب کا نام ہے جس میں نبوت اور قانون سازی کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے زرتشت بہت سے گزرے ہیں جن میں آخری زرتشت کا زمانہ۔ 600 قبل از مسیح ہے۔ زرتشتی ان کا نام ابراہیم بتاتے ہیں۔ بہر حال زرتشت نے دودخاؤں کا تصور پیش کیا کہ یزداں خیر کا خدا ہے اور اہرن شر کا خدا۔ لہذا دونوں خدا ایک دوسرے کے مقابل ہیں، کبھی یزداں غلبہ پاتا ہے تو کبھی اہرن کا زور ہوتا ہے ان دونوں خداؤں کی یہ کش مکش روزِ محشر تک رہے گی لیکن بالآخر فتح یزداں یعنی خیر کے خدا کی ہوگی۔ خیر کا بول بالا ہوگا۔ زرتشت کی اپنی کتاب تو نہیں البتہ اس سے منسوب پارسیوں کی مذہبی کتاب کا نام ”اوستا“ ہے جو عذربان میں بھی اب بھی شاید ہوگی۔ ژند زبان پہلوی زبان سے پہلے فارس (ایران) میں رائج تھی۔ آج کل اس کا شمار مردہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ مذہبی کتاب اوستا کی تفسیر پاژند کے نام سے ہے۔ اردو شعر و ادب میں خیر کے خدا یزداں کا نام اور ذکر تو بہت ہے مگر شر کے خدا ہرن کا ذکر کم یا ب ہے۔ اردو زبان اور ادب فارسی کا خوشہ چمن ہے۔ پارسی اپنے مردوں کو دفناتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ ایک مخصوص اونچی جگہ پہ نقش کو چھوڑ آتے ہیں اس جگہ کو۔ ”منار خاموشی“ کہا جاتا ہے جہاں یہ میت حیوانوں کی خوراک بن جاتی ہے۔ یہاں مجوسیوں کے دوا اہم تہواروں کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک جشن سدہ ہے جو ماہ بہمن (غالباً۔ اگست) کی دسویں تاریخ کو ہوتا ہے۔ سدہ کے معنی بھڑکتی ہوئی آگ کے ہیں۔ یہ جشن نہایت پرانا ہے اور اس کی بنیاد یوں پڑی کہ ہوشنگ بن سیاک (سیاک) بہت زیادہ دودھ پینے والا) نے ایک بڑے کالے سانپ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر پتھر مارا۔ پتھر بہ جائے سانپ کے دوسرے پتھر پہ لگا اور اس سے آگ پیدا ہو کر ارد گرد کے شس و خاشاک میں لگ گئی۔ سانپ جل مرا۔ بس اسی وقت آگ کی پوجا شروع ہو گئی کیوں کہ اسے خدا کا نور اور دشمن کو ہلاک کرنے والا گردانا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس سے پہلے آگ کا ظہور بھی نہ ہوا تھا (وی یونانی دیو مالاروٹھس کی کہانی)۔ دوسرا بڑا تہوار جشن نوروز ہے اس کے معنی نیا دن کے ہیں یعنی وہ دن جس سے نیا سال شروع ہوتا ہے اور سورج برج حمل میں آتا ہے (میس بائیں مارچ) فارس والے دو۔ نوروز مناتے ہیں۔ (1) نوروز عامہ۔ (2) نوروز خاصا۔ نوروز عامہ پارسی جنتزی کے پہلے مہینے۔ فردوس۔ کا پہلا دن (میس بائیں مارچ) ہے (موسم



قسط نمبر: 8

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوه تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



### گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بھیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور اہرام اڑا گیا تھا۔ حسین پر اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زیرہہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بھیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لارڈی اڈے کی پوچھ میں تاہم ملٹی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بن کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ جیڑی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر ہلاکت دیتا رہی وہ اس سلسلے پر غور کر رہا تھا کہ رانا بھیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو حق تو لکھی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی جیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ جیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا بیچ آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن زیرہہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سننے جس نے رفتہ رفتہ کے واقعات کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیز خان بھی تھا جس پر اختر کی بہن ثوبیہ کی کشمکش کا ذمہ دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیز خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروبار کی حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منہ کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف محمد ریشل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سننے میں الجھ گیا کہ گڈ زائمنسٹ کی گائیاں آتی شروع ہو گئی تھیں۔ سندھ بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈ زائی آؤ میں نشاٹ کا کاروبار دوتا تھا۔ سندھ کو رخصت کر کے میں بیٹھا تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ کسری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلا دو خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی ہائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور جیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری سے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ حالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ جیم کے ٹھکانے پر مجھے بھگولایا گیا تھا۔ وہ پٹر مارکر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبہ کے قتل میں ملوث عزیز نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھ چکی اور وہاں سے آٹھ یا پھر رانا بھیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے فرک ڈرا نیور کی گھوڑا ساری کرا دی جس کے ٹرک نے ذریعہ کی کار کوہٹ لیا تھا۔ مگر آیا تو کاشف ملے آگیا جو جیمری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی انعام کان کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ سیٹھ ستار کے بیچنے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے جہاں بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر جائے۔ جیمری روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔

### اب آگے پڑھیں

جھڑکا۔ وہ ہنوز قہر آلود نظروں سے لڑکی کو گھورے جا رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے سوال کیا۔ ”تم یہ کیسے اتنے یقین سے کہہ رہی ہو؟ تم خود اس کی ساسھی بلکہ داشتہ لگ رہی ہو۔“

”میں اس شخص کی داشتہ ضرور ہوں مگر ساسھی نہیں۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ میں نے کچھ اور کہنا چاہا تھا کہ کالیا نے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اس بار خود اس لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”رو..... روزی، روزیہ.....“ اس لڑکی نے ہٹکاتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

”وہ نہیں کیسے پتا ہے کہ راجو عاصمہ کی بجائے اپنے مسلح ساتھیوں کو یہاں لارہا ہے؟“

”یہ شخص، تم لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ چالاک اور مکار ہے۔“ وہ لڑکی سیٹھ ستار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”اس نے ایسے نازک مواقعوں کے لیے کچھ کوڈورڈ

میں اس حسین کی بات پر بری طرح ششکا تھا۔ کالیا کی طرف دیکھا تو وہ ہنوت جینچنے اسی لڑکی کی طرف گھورے جا رہا تھا پھر تیزی سے بولا۔ ”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ کھل کر کہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کالیا کی طرف دیکھا۔ ”اس نے عاصمہ نامی اس لڑکی کو گلشن حدید والے مکان میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ پر غمال بنا رکھا ہے اور جو راجو جو نامی شخص یہاں جینچنے والا ہے اس کے ساتھ عاصمہ نہیں بلکہ اس کے مسلح ساتھی ہوں گے۔“

اس لڑکی کے اتنے بڑے انکشاف پر میں بھی نہیں کالیا بھی چونک پڑا تھا۔ پہلی بار میں نے کالیا جیسے جفاوری کو بھی الجھا ہوا پایا۔

”کیا بکواس کر رہی ہے تو؟“ سیٹھ ستار کھا جانے والی نظروں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے بولا۔

”تم اپنا منہ بند رکھو کیل آدی؟“ میں نے سیٹھ ستار کو



رکھتا۔ میں باہر جا رہا ہوں، تم ادھر کے رہو اور میرے فون کا انتظار کرنا۔“ میں نے اس کی بات پر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ جاتے وقت میں نے اسے اپنا ٹی بی پتل نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا جبکہ سیٹھ ستار کا سیاہ پتہ تول میرے پاس تھا۔

اب میں اور روزی تہا خواب گاہ میں موجود تھے۔ روزی نے کپڑے بدل لیے تھے۔ میں نے اس کی طرف قدرے شامی نظروں سے دیکھے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری سیٹھ ستار سے کیا دشمنی ہے؟“ میرے سوال پر اس نے ایک گہری ہنسی خارج کی مٹی اور بولی۔

”میری باجی میرا کا قاتل ہے اور میں اپنی بہن کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے اس کی داشتہ بنی ہوئی تھی۔ اس رذیل شخص سیٹھ ستار نے میری بہن کو شادی کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ ملا اور پھر ایک دن اس کی عزت سے بھی کمیل گیا اور یہ شرمناک کمیل اس نے کافی عرصے تک جاری رکھا تھا یہاں تک کہ میری باجی بن یاہی حائل ہو گئی۔

میری باجی نے جب یہ دیکھا کہ سیٹھ ستار شادی کے نام پر اسے اب تک ٹال چلا آرہا ہے اور نوبت یہاں تک آگئی ہے تو اس نے سیٹھ ستار کو خودکشی کی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی لاش پر ایک پرچہ لکھ کر چھوڑ جائے گی، جس میں سیٹھ ستار کے کرتوتوں کی ساری کہانی لکھ ڈالے گی تو اس ظالم نے میری بہن کو ہی مروادیا۔

باجی میری راز داں تھیں۔ ہم دونوں یتیم و لیسیر تھے اور اپنی ایک بیوہ خالہ کے ساتھ رہتے تھے۔ میرا دنیا میں باجی کے سوا اور کون تھا، میں نے اس کا انتقام لینے کی ٹھانی اور سیٹھ ستار کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا دیا اور اس کے سارے رازوں سے کسی حد تک واقف ہونے لگی مگر یہاں مجھے اور بھی کچھ حقائق کا اندازہ .... ہونے لگا کہ سیٹھ ستار کو کوئی معمولی آدمی نہیں، دولت تو اس کے پاس بے حساب ہے ہی مگر اس کے پاس خطرناک آدمیوں کا ایک پورا نولہ بھی ہے، نیز یہ بہت اثر و رسوخ کا مالک بھی ہے۔

غرض یہ کہ مجھے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل پڑا تھا۔ میں بہت مایوس ہو گئی تھی کہ شاید میں اب اپنی باجی کا انتقام نہ لے سکوں، بالآخر مایوسی اور اکتاہٹ انتقام نے مجھے مجبور کر ڈالا کہ میں خود ہی ایک موقع پا کر اسے اپنے ہاتھوں سے ہی جہنم واصل کر دوں اور ..... آج میں یہی کچھ

رکھے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ فیصلہ اپنے لیے سے بھی اپنے زرخیز ساتھیوں کو خبردار کر دیتا ہے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ تم دونوں خود بھی ذرا اندازہ لگائے کہ کوشش کرو کہ اس وقت سیٹھ ستار خاں کا اپنے آدمی کو فون کر کے یہ کہنا کہ اس لڑکی کو لے کر فوراً اس کے کفنشن والے جنگلے پر پہنچو کیا انہیں چونکا دینے کا باعث نہیں بننا ہوگا اور پھر تم نے اس کے الفاظ پر بھی غور نہیں کیا جب یہ اپنے راجہ نامی ساتھی سے بات کر رہا تھا تو اس نے تمہاری ہدایت کے برعکس پہلا جملہ بھلاتے ہوئے ادا کیا تھا۔ یہی اس کا پہلا کوڈ ورڈ تھا۔“

مجھے اس لڑکی کی بات سمجھ میں آرہی تھی، مکمل تو میں بھی گیا تھا اس بات پھر راجہ نے بھی سوچا ہی ہوگا کہ آخر سیٹھ ستار اس وقت کیوں ایک اغوا شدہ لڑکی کو اپنے ہاں لانے کا حکم دے رہا تھا اسے ..... مگر میں نے دیکھا کہ کالیا کچھ زیادہ اس کی بات پر بھروسہ کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ روزی سے بولا۔ ”ایک بات بتاؤ، تمہیں ہماری مدد کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ ہمیں یہاں آئے تھوڑی ہی دیر گزری ہے اور تم اتنی جلدی ہماری خیر خواہ بھی ہو گئیں؟ کیا تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ اس غدار پر یہ ظالم اور سنگدل شخص تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا؟“

کالیا کی بات پر روزی نے نفرت انگیز نظر سیٹھ ستار پر ڈالی اور جواباً بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے یہ شخص واقعی بہت ظالم اور بے رحم ہے۔ میں اس ظالم اور خونی شخص کے لیے اب تک آستین کا سانپ بنی ہوئی تھی اور اسے ڈنسنے کے لیے موقع کی منتظر تھی۔ آج مجھے اس کا شاید موقع مل رہا ہے۔ وقت کم ہے، باقی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتا دوں گی مگر خدا کے لیے پہلے میری بات کا بھروسہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔“

اس کا اشارہ بھانپ کر کالیا نے بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا، کیونکہ لڑکی کا جھوٹ سچ چھیننے والا نہیں تھا۔ راجہ کی آمد ہی اس کے سچ اور جھوٹ کی گواہی فراہم پاسکتی تھی۔ کالیا نے لڑکی کو لباس پہننے کا حکم دیا اور مجھ سے کہا کہ میں کوئی ری تلاش کر کے سیٹھ ستار کو رسن بسے کر ڈالوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے کمرے سے مجھے نائکون کی ڈوری مل گئی اور میں نے اسی سے سیٹھ ستار کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اسے ہاتھ روم کے اندر اسی حالت میں ہی دھکیل دیا۔

اس کے بعد کالیا مجھ سے بولا۔ ”جگری! اپنا سیل آن



تھا، اس کی مدد کے لیے مجھے بھی جانا چاہیے تھا۔ چونکہ روزینہ کی بات سچ ثابت ہوئی تھی اس لیے میں نے اسے وہیں خواب گاہ میں ہی رکے رہنے کی ہدایت کی اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ کالیا نے اس کٹھنی کے کس حصے کی طرف گھات لگائی ہوگی، تاہم ایک محتاط اندازے سے میں نے گیت کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں پہنچا تو گاڑ سبین سے ایک مسلح شخص باہر نکل رہا تھا، وہ شاید گیت کھولنے کے لیے نکلا تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جگہ دھکا کھڑا رہا اس کے بعد جب گیت کھلا تو میں نے ایک نیوی بلیوٹری کیلٹس کو اندر داخل ہوتے دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے گاڑ کو اپنی طرف بلایا تھا کیونکہ کار اندر داخل ہوتے ہی وہ اس کے اشارے پر فوراً آگے بڑھا تھا اور اب کار کی کھڑکی کے سامنے جھکا اس کی کوئی بات سن رہا تھا۔

میں نے بغور اپنی آنکھیں سیگٹر کار کی طرف دیکھا تو اس کے اندر مجھے دو مزید افراد سوار دکھائی دیے۔ ایک تو ڈرائیونگ سیٹ والے کے برابر ہی بیٹھا تھا جبکہ دوسرا چھٹی نشست پر براجمان تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چبھنے لیے اوروں کو لگا کالیا کہاں ہو سکتا تھا؟

اچانک کار آگے بڑھی اور پورچ سے ذرا پرے ہی رک گئی اس کے اندر سے وہ تینوں باہر نکلے، ان کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں اور گاڑ بھی اپنی کن نکال کر وہیں اپنے سبین کے پاس چوکس کھڑا ہو گیا تھا، اس کی نظریں بار بار بالکونی کی طرف اٹھ رہی تھیں، جس کا صاف مطلب تھا کہ آنے والوں نے اسے بھی اندر کی صورت حال سے ”باخبر“ کر دیا تھا اور وہ محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ تینوں افراد تیزی کے ساتھ مگر آواز پیدا کیے بغیر مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔

میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ کالیا کہاں چھپا کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں پلٹ کر نیچے اترا اور اسی دروازے کی طرف بڑھا جدھر سے وہ تینوں اندر داخل ہونے والے تھے، اطراف میں مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور وہ تینوں اندر داخل ہوئے، میرادل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں ابھی ایک فینسی طرز کے ستون کے پیچھے کھڑا یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک میں نے سب سے آخر میں داخل ہونے والے شخص پر کسی کوچکی کی

کرنے والی تھی کہ تم لوگ یہاں آگئے۔ میں اس کے ہی پتول سے اس کا خون کرنے والی تھی آج.....“

وہ اتنا بتا کر چپ ہو گئی اور ہولے ہولے سکے بھی لگی۔ مجھے اس کی باتیں قابل اعتبار محسوس ہونے لگیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

”کیا تم جانتی ہو کہ میری بہن عاصمہ کو اس خبیث نے کہاں ریغمال بنا رکھا ہے؟“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔ ”کیونکہ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں اس کے قریب رہتے ہوئے اس کے بہت سے رازوں سے واقف حاصل کرنے کی اسی لیے ہی کوشاں رہتی تھی کہ شاید کہیں مجھے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے اسے فون پر اپنے کچھ ساتھیوں کو تحسانہ ہدایت دیتے ہوئے سنا بھی تھا۔ تمہاری بہن کو لیاری کے علاقے میں کسی مکان میں ریغمال بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔“

میں اس کی بات کر چوٹا تھا مگر کالیا کی طرح اتنی جلدی اس کی باتوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا، لہذا بولا۔ ”دیکھو اگر تمہاری کوئی بھی بات جھوٹ ثابت ہوئی تو پھر تم ہمارے ہاتھوں زندہ نہیں بچو گی۔ کیونکہ راجو کی یہاں آمد کے بعد تمہارا جھوٹ بھی کھل ہی جائے گا۔“

وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک کالیا کا فون آگیا۔

میں نے جلدی سے اپنا سیل فون نکالا۔ کال کالیا ہی کی تھی۔ اپنے کان سے لگا کر میں نے کہا۔ ”ہاں، کالیا! کیا خبر ہے؟“

”ابے لے..... جگری! اس لڑکی روزینہ کی بات تو سینٹ پر سینٹ درست ثابت ہوئی۔ راجو کے ساتھ عاصمہ بہن نہیں بلکہ اس کے دو مسلح ساتھی ہیں۔“

اس کی بات پر میرادل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ بولا۔ ”کالیا! تو ان سے مجھڑے بغیر یہاں چلا آ..... سینٹ ستار کو کن پوائنٹ پر لے کر انہیں باآسانی جھکا جا سکتا ہے۔“ ”میں اپنا کام نشتا نا جانتا ہوں، جگری! تو بے غم ہو جا۔ میں گھات میں ہوں اور دشمن مات میں ہیں۔ دیکھتا جا۔“

دوسری طرف سے کالیا نے اپنے مخصوص لیج میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میں فکر مند سا ہو گیا۔ کالیا کا سبھج ستار کے تین خطرناک بد معاشرلوں سے تنہا ٹھنڈا آسان نہیں ہو سکتا

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔  
اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of  
your Favourite Paksociety's  
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**

Like Message

✓ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First  
See new posts at the top of  
News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow

میں تھا جس سے اس نے فائر کیا تو مذکورہ حملہ آور کریمہ ناک چیخ کے ساتھ گرا، اس کے آخری ساتھی نے زمین پر پڑے پڑے لوٹ لگائی اور دروازے کی طرف بھاگا تو کالیا نے چپچپے سے کھڑے کھڑے اس پر گولی چلا دی۔ خاموش پستول کی گولی اسے بھی چاٹ گئی، وہ اپنے حلق سے آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر ہو گیا۔

میں اپنا زخمی شانہ پکڑے فرش پر گر سا گیا تھا۔ شانے سے اب بھل بھل خون بہے چلا جا رہا تھا۔

”اے لے..... جگر کی ایہ کیا کیا تو نے.....“ کالیا ایک دم میری جانب بڑھا اور مجھے ڈکی دیکھ کر کرب انگیز لہجے میں بولا۔ سیٹھ ستار کا پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر لڑھک گیا تھا۔ وہ مجھے سنبھالنے لگا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے حلق پر پڑتے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش چاہی تھی اور دانتوں تلے تکلیف کو سہتے ہوئے میں نے کالیا سے کہا۔

”مم..... میں ٹھیک ہوں..... مم..... مگر آگے کی صورت حال خراب ہے۔“

”دیکھ لیتے ہیں، پہلے تیری پٹی کرنا ضروری ہے۔“ اس نے فکر سے کہا ”بر تو پریشان نہ ہو مولا کا کرم ہے کہ گولی خطرناک جگہ پر نہیں لگی ہے۔“

اس نے سائلنسر لگا پستول اپنی پینٹ کی بیلت میں اڑوسا اور میرا پستول فرش سے اٹھا کر اسے بھی دوسری طرف اپنی بیلت میں اڑوسا لیا اس کے بعد مجھے سہارا دے کر اٹھالیا اور خواب گاہ کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھٹھک کر رکا۔ میں نے بھی اپنی نیم بازی نظروں سے سامنے دیکھا۔ روزی کھڑی تھی۔

”اوہو..... اسے اندر لے چلو، میں تب تک ڈیرنگ کا سامان لاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو بڑھ گئی۔ کالیا مجھے سہارا دیے اندر خواب گاہ میں آگیا جہاں خاصی روشنی تھی۔ اس نے میرے زخم کا جائزہ لیا اور بولا۔

”شکر ہے گولی گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی ہے۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا ہے مگر زخم گہرا ہے۔ خون روکنا ضروری ہے۔“

تب تک روزی فرسٹ ایڈ کا ایک بکس اٹھا لائی۔ وہ جانے کب سے اپنے مقصد کی براہروی کے لیے سیٹھ ستار کی رکھیل بنی ہوئی تھی جو اسے یہاں کی پوری آگاہی تھی۔

”تم ایک طرف ہو جاؤ.....“ اس نے ہاس میرے قریب قائلین پر رکھتے ہوئے کالیا سے کہا۔ ”میں ایک کوالیفائڈ نرس ہوں۔“

سی تیزی سے ٹوٹے بابا۔ کمال مہارت سے ہی اس نے کچھ اس خاموشی اور کسی قسم کی بھی ”کھڑ بڑاہٹ“ پیدا کیے بغیر اس نے اپنے شاہکار کو اس طرح کا قابو کیا تھا بلکہ شاید اسے اتنا غفلت بھی کر ڈالا تھا کہ صرف چند قدم آگے جانے والے اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنے اس تیسرے ساتھی کے حشر کا پتا بھی نہ چلا، اب وہی سایہ دبے پاؤں دوسرے کی جانب لپکا تھا کہ نچانے دوسرے مسلح شخص کو اپنے پیچھے کسی کی موجودی کا احساس ہوا اور اس نے یکدم پلٹ کر دیکھا تو اس کے تعاقب میں آنے والے سائے نے جو بلاشیرہ کالیا ہی تھا، ایک دم اچھل کر اس پر جست لگادی اور اس کی ہوا میں اٹھی ہوئی لات دوسرے کے سینے پر اس زور سے پڑی تھی کہ وہ خاصا اچھل کر آگے جاتے ہوئے اپنے تیسرے ساتھی پر جا پڑا۔ دونوں دھڑام سے فرش پر آ رہے اور اسی وقت کالیا نے ان پر اپنا پستول تان لیا مگر دوسرے والے نے بھی یہ سرعت غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنی لات چلا دی۔ میں نے کالیا کو کڑتے دیکھا اور ان دونوں کو اٹھتے تو میں خود کو نہ روک سکا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک نے اپنا پستول کالیا پر تان لیا تھا، کوئی بعد نہ تھا کہ وہ اس پر فائر بھی کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے پستول پر مجھے ایک لمبی نال اچھڈ دکھائی دی تھی۔ دھینا کالیا بھی پل کے پل اس طرح خود کو موت کے سامنے دیکھ کر رنگ ہو گیا ہوگا۔ میں پلر سے ابھرتے ہی چلایا۔ ”خبردار! گولی مت چلاتا۔“

وہ آدمی ٹھٹھکا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بے شک یہ اس کا ایک غیر ارادی رد عمل ہی رہا ہوگا کہ اس نے اپنے پستول کا زرخ بھی میری جانب موڑ لیا تھا جب کہ میرے پستول کی نال کا رخ بھی اسی کی طرف تھا۔

مجھے پستول چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ بس تانے کھڑا تھا اور یہی میری بے وقوفی تھی، تاہم اس بے وقوفی نے مجھے خطرے میں ڈال کر کالیا کی زندگی بچائی تھی۔ کیونکہ اس شخص نے اپنے پستول سے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ ”چوز“ کی آواز ابھری اور اس کے ”خاموش“ پستول کی گولی میرے دائیں شانے پر لگی، مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کوئی سلاح۔ سلگتے ہوئے انگاروں سے اٹھا کر میرے شانے میں گھونپ دی ہو۔ میرے حلق سے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ ابھری اور آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا، میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے اور اسی دھندلائی آنکھوں سے میں نے کالیا کو اس پر چھپتے دیکھا۔ سائلنسر لگا پستول حملہ آور کی بجائے اب کالیا کے ہاتھ

”آہ..... ظالم! ات..... تو نے مجھے ایک آنکھ سے کانا کر دیا..... آہ..... میں مر گیا۔ میں دل کا مریض ہوں، یہ تکلیف نہیں برداشت کر سکتا۔“ وہ چیخنے لگا۔ ”مم مجھے اسپتال لے چلو۔“

”قبرستان جانے کی تیاری کر بیے رحم اور بے حس آدمی!“  
 کالیا نے ٹپٹپٹ لہجے میں اس سے کہا۔ ”اپنی ایک ذرا سی  
 تکلیف اور ایک آنکھ سے محرومی پر تو یوں بلبل اٹھا ہے اور جو  
 دوسروں کے ساتھ تو نے حرام پائیاں کر رکھی ہیں اسے تو کس  
 کھاتے میں ڈالے گا؟“

سیٹھ ستار کے پاس اس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ رن بستہ حالت میں اور بھی زیادہ اپنی آنکھ کی تکلیف کو محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ اپنے زخم کو چھو نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اپنی زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ پاتا تھا۔ خون اس کی پھوٹی آنکھ سے بہہ جا رہا تھا۔

کالیا نے روزی کو اشارہ کیا جسے سمجھتے ہی اس نے ایڈ باکس سے روٹی کا ایک بڑا سا پھانچا نکال کر کالیا کی طرف بڑھایا جسے اس نے تھوڑا گول کر کے اس کی آنکھ پر رکھ دیا تاکہ جریان خون بند ہو سکے۔

”بس سینھ! اب تیرا کھیل ختم ہوا۔ لیاری کے کون سے مکان میں تو نے ہماری بہن عاصمہ کو رکھا ہوا ہے؟ ہاں یا نہ میں جواب سنوں گا میں، اس سے زیادہ نہیں۔“ کالیا نے جتنی لہجے میں کہا اور اس کے سینے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”مم..... مجھے پپ..... پہلے اسپتال.....“ سیٹھ ستار نے کراہتے ہوئے صرف اسی قدر ہی کہا تھا کہ کالیا کے پاؤں کی ٹھوکرا س کے پہلو میں لگی اور وہ تیل کی طرح ڈکرایا۔

”حاصمہ بہن کے سوا کوئی اور بات نہیں سنوں گا کئے!“

تو اسپتال کی امید کیسے لگا رہا ہے؟ کیا سمجھتا ہے تو ہم تجھے زندہ  
مچھوڑ دیں گے، اب بھی تیرے اندر اتنا گھمنہ ہے؟“ ”کالیانے  
خون خوار لہجے میں کہا تو اس نے تکلیف سے ہانپتے ہوئے کچھ  
کہنے کے لیے منہ کھولا مگر الفاظ بے ربط سے برآمد ہونے  
لگے۔ مجروحہ ترسے لگا۔ جیسے اسے دل کا دورہ پڑنے لگا ہو۔

میری پیشانی پر بیک وقت الجھن اور فکر مندی کی شکلیں نمودار ہو گئیں۔ کالا کمر اس کے جھانے میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے اسے ماؤں کی ایک زوردار ٹھوک اس کے

کالیا ایک طرف ہو گیا۔ روزی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے چند منٹوں میں میری ڈرائیگ کر دی ساتھ ہی چین کلر بھی کھلا دی۔ ایک انجیکشن بھی بھر کر اس نے میری پس میں لگا دی۔ پھر کالیا کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”شکر ہے گولی گوشت چھینتی ہوئی نکل گئی ہے، اب جو کرتا ہے جلدی کر لو، ہمارا بھی تک خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔“

کالیا ایک طرف کھڑا تھا۔ بولا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو عاصمہ کو ریشمال بنا کر کہاں رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے تمہارے ساتھی (مجھے) کو بتایا تھا کہ اس کی بہن عاصمہ کو لیاری کے علاقے میں کسی مکان میں رکھا ہوا ہے مگر اس کا بتا مجھے نہیں معلوم۔“

کالیا کچھ سوچ کر طوفانی بکولے کی مانند پلٹا اور اسٹیج  
باتھ کے دروازے کو ایک لات رسید کر ڈالی۔ اس کے ذرا ہی  
دیر بعد وہ سیٹھ ستار کے بھاری بھر کمرد کو یوں گھسٹا ہوا خواب  
گاہ میں لے آیا جیسے قسائی کے لئے کوری باندھ کر مذبح خانے میں  
کھینچ لاتا ہے۔ کالیانے فرسٹ ایڈ باکس سے وہ خالی سرخ  
اٹھالی جس کے ذریعے مجھے انکیشن لگایا تھا۔ اس میں سوئی  
(نیڈل) لگی ہوئی تھی۔ وہ اٹھالی اور رن بستہ حالت میں فرش  
بوس پڑے سیٹھ ستار کے سینے پر سوار ہو گیا پھر نفرت انگیز انداز  
میں ہونٹ کیلئے سیٹھ ستار کو گھورتے ہوئے غراہٹ سے  
مشابہ آواز میں بولا۔ ”زریل کتے! اس چالاکی کی میں تجھے سزا  
ضرور دوں گا۔“ کہتے ہوئے اس نے سرخ کو اپنے دائیں  
ہاتھ کی مٹھی میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ایک آنکھ کے  
پونے کو کھولا اور سرخ کی سوئی سے اسی آنکھ کو پھونکنے کے  
لئے ہاتھ بڑھا دیا تو سیٹھ ستار مارے دمشت کے گھٹکانے لگا۔

”نن..... نہیں رخ..... خدا کے لیے، یہ مت کرو۔  
 مم..... میری غلطی تھی، میں معافی مانگتا ہوں۔ مم..... میں اب  
 سچ ہی بولوں گا۔“

اب تجھے بولنا ہی پڑے گا۔ وہ بعد کی بات ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے سرخ کی ٹٹل سیٹھ ستار کی بائیں آنکھ میں گھونپ دی۔ خون کی دھاری نے کپکپاتی اور سیٹھ ستار کا وجود کا لیا کہ نیچے ہاتھ لے کر آگ کی طرح ترے لگا۔

خود میں بھی ایک لمحے کے لیے کالی کیا اس بربریت پر دم بخود  
سارہ گھبرا گیا لیکن سیٹھ ستار کے کان لگ کر تو قوتوں کے سامنے یہ کچھ  
بھی نہیں تھا۔ اس غصہ نے جانے کتنے غریبوں کے خور

پہلو میں رسید کر ڈالی اور دوسری پیٹ پر تو سیٹھ ستار نے اپنی اداکاری بند کر دی۔

وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ کالیا جیسے جغادر کو ڈانچ دینے کا مطلب تھا کہ خود کو اس کے زیرِ تشدد رکھتے ہوئے واقعی ایک عدد ہارٹ ایک کو دعوت دینا تھا۔ وہ بولا۔ ”بب..... بتانا ہوں۔“ اس نے لیاری کے اس مکان کا پتا بتا دیا جو کالیا کے ساتھ میں نے بھی ذہن نشین کر لیا۔ اس کے بعد کالیا نے سیٹھ ستار کو تہدید کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس باریہ سب جھوٹ نکلا تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تجھے صرف موت میں ہی پناہ نظر آئے گی اور وہ تجھ سے دور ہوگی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ ہم تیری بات کی تصدیق کیے بغیر تجھے چھوڑ دیں، ابھی صبح کی گہما گہمی ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں۔ تب تک ہم تیرا راج جھوٹ جان لیں گے، بات سچ ہوئی تو ہم یہاں کارخ نہیں کریں گے اور تجھے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ جب کوئی ملازم تجھے دیکھے گا۔ بہ صورت دیگر ہم دوبارہ یہاں آئیں گے اور پھر..... آگے تو جانتا ہے۔“ کالیا نے کہتے ہوئے تہدید کی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور آخر میں بولا۔ ”اب بھی وقت ہے سچ بتادے، سمجھ لے کہ تو برا چنسا ہے۔ سچ بولے بغیر مکتی نہیں ملے گی تجھے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ مم..... مگر مجھے اس حالت میں تو چھوڑ کر مت جاؤ، صبح تک جانے کیا ہو جائے میرے ساتھ، میں شوگر اور دل کا مریض ہوں۔“ اس نے کالیا کی منت کی جسے کالیا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے روزی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟“

میں نے روزی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر گہرا ہمت اور خوف کے ملے جلے تاثرات ہو رہے تھے۔ کالیا کا سوال اس نے جیسے خالی الذہنی کے عالم میں سنا تھا، یہی سب تھا کہ وہ کچھ ”آں..... ہاں.....“ کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مم..... میں کہاں جاسکتی ہوں اب؟ اپنے گھر ہی جاؤں گی مگر.....“ کہتے ہوئے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور فرش پر جکڑ بند پڑے سیٹھ ستار کی طرف دیکھنے لگی۔ کالیا اس کی ابھمن سمجھ گیا۔ فوراً اس سے بولا۔

”تم ہمارے ساتھ آؤ اور یہاں سے اپنی تمام اشیاء بھی اٹھا لو جو یہاں بعد میں تمہاری آمد یا شناخت کی نشانی بن سکتے ہیں۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ کر جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان سیٹھ

ایک لمبی تحقیق میں بتایا گیا کہ ایک ہفتے کے دوران بستر کی چادر ڈسٹ ہائس، فنکشن، فطے کے اجرائی، پولن اور مردہ انسانی خلیات سے بھر جاتی ہے اور اس طرح وہ ٹوائلٹ سے بھی زیادہ جراثیموں سے بھر سکتی ہے۔ دن بھر میں اوسطاً ہر انسان سے 500 ملین خلیات کا اخراج ہوتا ہے جبکہ دیگر اجزاء بھی رات بھر بستر کی چادر پر جمع ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ڈسٹ ہائس انسانی مردہ خلیات کو کھانا پسند کرتے ہیں۔ اگر چادر کو ہر ہفتے نہ دھویا جائے تو آپ خود کو سنگین وائرس اور انجکشن کے خطرے کی زد میں لارہے ہوتے ہیں۔ جن میں جلد یا زخم کا انفیکشن، پیٹیاہب کی نالی کی سوزش، نمونیا اور دوران خون کا انفیکشن قابل ذکر ہے۔ تحقیق میں ہر ہفتے ایک بار چادر کو دھونے کا مشورہ دیا گیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک بار اسے بدل ضرور دیں تاہم ایسا بہت کم افراد کرتے ہیں۔ چادر کو دھونے کے لیے گرم پانی کا استعمال کرنا چاہئے تاہم ایسا کرنے سے پہلے اس پر دینے والے کٹے لیکل پر ہدایات کو بھی ضرور دیکھ لیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ گرم پانی بیشتر جراثیموں کو ختم کرنے کے ساتھ ڈسٹ ہائس کو نکال دیتا ہے۔ یہ تحقیق لمبی جریڈے جرنل آف الرمی اینڈ پبلیکل Immunology میں شائع ہوئی۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

ہیمن یورسٹی کی تحقیق میں بتایا گیا کہ شام ڈھلنے ہی کھانا نہ کھانا جسمانی وزن میں اضافے، فیت مینا پلاز، اور امراض قلب سمیت ذیابیطس کا خطرہ بڑھانے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس تحقیق کے دوران دو ماہ تک صحت مند افراد کے غذائی اوقات کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ جو لوگ رات گئے کھانا کھاتے ہیں، ان میں انسولین کی مزاحمت، کوئیٹروں میں اضافہ اور ڈرائی کلیڈیز کی سطح بڑھ جاتی تھی۔ اسی طرح ہارمونز کے نظام میں بھی منفی اثرات دیکھنے میں آئے اور ہموک کو بڑھانے والے ہارمونز کی سطح میں تاخیر سے اضافہ دیکھا گیا۔ تحقیق کے مطابق نیند میں کمی کے اثرات تو جسمانی وزن اور مٹابولزم پر پڑتے ہی ہیں مگر رات گئے کھانا بھی صحت کے لیے فائدہ مند نہیں۔ محققین کا کہنا تھا کہ شام میں جلد کھانے سے مختلف امراض کا خطرہ کم کیا جاسکتا ہے جبکہ جسمانی توانائی اور ہارمونز کے نظام کو بھی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تاخیر سے کھانا جسم میں گلوکوز اور انسولین کی مقدار بڑھاتا ہے جو کہ ذیابیطس جیسے مرض کا باعث بن سکتا ہے جبکہ کوئیٹروں اور ڈرائی کلیڈیز امراض قلب، فالج اور ہائی بلڈ پریشر جیسے جان لیوا امراض کا خطرہ بڑھانے والے عوامل ہیں۔

مرسلہ: شمیمہ خانم۔ ملتان



پل کے پل میں نے مزید کوئی لمحہ بھی ضائع کیے بغیر روزی سے کہا اور کالیا کے پیچھے بیٹھ گیا۔

جی ٹو او۔ ون ٹو فائیک کا واسا کی (اولڈ ماڈل) کی سیٹ خاصی دراز اور چوڑی تھی۔ کالیا کے پیچھے میرے بیٹھے کے بعد بھی اتنی جگہ خالی تھی کہ روزی بھی پچھن پچھن کر بھی خالص ”تسوانی انداز“ میں یعنی دونوں ٹانگیں ایک ہی سائیڈ پر رکھ کر بیٹھ گئی اور سہارے کے لیے اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے نرم و نازک وجود کا احساس ہوتا رہا مگر مجبوری کا نام ”شکر“ کے مصداق چل سچل۔

میرا خیال تھا کالیا، روزی کو ساتھ لے جانے پر مترشح ہو گا مگر اس نے کچھ کہے بغیر ہی بائیک آگے بڑھا دی۔ بائیک چلانے میں وہ ماسٹر ٹیس تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے بائیک آگے بڑھا دی تھی کہ روزی میرے ساتھ مزید چپک گئی۔

بائیک ذرا ہی دیر میں ویران اور تاریک سڑک پر فرارے بھرنے لگی۔

لیاری میں ان دنوں حالات یوں بھی بہت کشیدہ تھے۔ جہاں مختلف اور بدنام زمانہ مجرم تنظیمیں جو لیاری میں ہی نہیں بلکہ پورے کراچی میں ”لیاری کینگ وار“ کے نام سے جانی جاتی تھیں، اس کی دہشت اسی نام سے پورے کراچی پر طاری تھی۔ بلکہ اب تو اس کی شہرت کراچی سے باہر اور دیگر صوبوں تک میں پھیل چکی تھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔

یہاں ہر ایک نے اپنا علاقہ بانٹا ہوا تھا، جو دوسرے کے لیے ”نو گو ایریا“ کہلاتا تھا۔

دیگر علاقوں کے عام لوگ تو اس علاقے میں جانا تو کجا اس کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے اور ہم رات میں اس طرف جا رہے تھے، جہاں دن میں بھی کوئی جانے سے گھبراتا تھا مگر مجھے تسلی تھی کہ میرے ساتھ کالیا تھا۔ جو بذات خود بھی ایک ”کینگ وار“ ہی تھا۔

رات کے اس پہر ویران سڑکوں پر سناٹا چمک رہا تھا۔ کالیا بائیک کو طوفانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ وہ مانی کولاچی روڈ سے سیماڑی جانے والی سڑک پر آیا اور یہاں سے سیدھے ہاتھ کو ٹاور جانے والی روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھا لنگٹا چلا گیا۔

راستے میں ایک دو پولیس موٹوں نے راستہ روکا تھا ہمارا۔ کالیا نے ان کے کان میں جانے کیا کہا تھا کہ انہوں نے کچھ زیادہ تنگ نہیں کیا اور ہم آگے نکل لیے تھے۔

گلی، جس میں پرس اور ہینڈی بیک اور ہاتھ روم میں جھولنے اس کے پکڑے وغیرہ تھے۔

کالیا پر سوچ انداز میں میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شاید کچھ سمجھتے ہوئے اپنی ایک آنکھ کی پھونڈوں کو اچکایا۔ یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا، جیسے کسی بات کی تہدیک پہنچ گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد ہم کوٹھی سے باہر تھے اور اس سے آگے تقریباً دوڑتے ہوئے اس جگہ پر جا پہنچے جہاں ہم نے اپنی بائیک ایک تاریک گوشہ میں چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی۔

”جگری! تو زخمی ہے۔ پہلے تجھے!“ کالیا نے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”کسی اور جگہ جانے کا وقت نہیں ہمارے پاس، روزی نے میری پی کروی ہے اور فرسٹ ایڈ دے دی ہے۔“ پھر میں قریب فکر مند کھڑی روزی سے بولا۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

ہم بائیک کے پاس ہی کھڑے تھے۔ کالیا گردش نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

”میں گلستان جوہر بلاک فور میں رہتی ہوں لیکن آپ میری فکر نہ کریں اور پلیز اپنی بہنا کو بچانے کی فکر کریں، میں چلی جاؤں گی اپنے گھر۔“ روزی بولی تو میں نے کہا۔ ”تمہیں تو رات کے اس پہر میں کوئی رکشا یا ٹیکسی بھی نہیں ملے گی؟“

”اے! جگری! وقت گزرا چلا جا رہا ہے، جلدی کوئی ایک فیصلہ کر لے میں بائیک اشارت کرنے لگا ہوں۔“ کالیا اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور اس نے اپنی جی ٹو او۔ ون ٹو فائیک اشارت کر لی جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ یہ بائیک بیک وقت تک اور سیلف اشارت تھی۔

کالیا کا صاف مطلب تھا کہ اس نے روزی کی ”سر دردی“ میرے سپرد کر دی تھی لیکن کالیا بھی شاید اس دوران دیشی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا جس کا مجھے ہونے لگا تھا۔

روزی میرے لیے سیٹھ ستار کے خلاف تہدیک کا پتا ثابت ہو سکتی تھی۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ ٹھوٹے سکے سے کھرا ہو سکتی تھی لیکن ایک تلخ حقیقت اور بھی اس کی ذات سے تھی تھی کہ اس کی اپنی جان بھی اب سخت خطرے میں تھی اس نے ہماری بہر حال مدد کی تھی اور اگر ہم آج کے آج عاصمہ بہن کو بازیاں کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو لا محالہ اس کا سہرا روزی کے ہی سر جاتا۔

”بیٹھو بائیک میں میرے پیچھے..... جلدی۔“



”بھجنا ہے۔“  
 ”اوہ!“ میرے ساتھ اس صوفی تہرے میں پیچھے بیٹھی  
 روزی نے بھی ساتھ دیا تھا۔  
 ”اب کیا آگے بھی ایسے ہی لوگ ملتے رہیں گے؟“  
 میں نے پوچھ لیا۔  
 ”ضروری نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ہماری منزل اسی علاقے میں ہے یا.....“ میں نے  
 دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

”ہاں! بس، آگئی منزل!“ اس نے جواب دیتے  
 ہوئے ایک چھوٹی اور تنگ سی بندگی میں داخل ہونے سے پہلے  
 ہی بایک روکے بغیر ہی اس کا انجن آف کر دیا اور بایک  
 خاموش روٹی سے اپنے زور پر چلتی ہوئی مذکورہ گلی میں داخل  
 ہو گئی، پھر ایک کونے میں لے جا کر اس نے روک دی۔

پہلے میں اور روزی نیچے اترے، اس کے بعد کالیا اترتا  
 اور اس نے بایک کو سائڈ اسٹینڈ میں کھڑا کر کے مجھے اور  
 روزی کو ایک طرف کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور پھر بندگی  
 کے سیدھے ہاتھ والے آخری مکان کے دروازے کے قریب  
 پہنچ کر ہلکے سے دستک دی۔ ساتھ ہی اس کی نظریں گلی کے  
 سرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔ میں نے دیکھا  
 مکان کے باہر دو تین اور بھی موٹرسائیکلیں کھڑی تھیں۔

”یہ سالے تاش کی بازی جمار ہے ہیں شاید۔“ کالیا  
 زیر لب بڑبڑایا۔ اس نے دوسری دستک ڈرا زور سے دی تو اس  
 کے چند ہی سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔  
 ایک اچڑھڑی مری کالی اور دہلی پتلی فاقہ زدہ عورت برآمد  
 ہوئی، اس کے ایک ہاتھ میں بیڑی دہلی ہوئی تھی۔ کالیا کو پہچان  
 کر بولی۔

”اڑے چھو کر ایہ تو ہے، کالیا؟“  
 ”ہاں! ماسی میں ہوں، ہٹ پرے اندر آنے دے۔“  
 جینکو اندر ہی ہے ناں؟“ کالیا نے کہتے ہوئے ہمیں بھی آنے  
 کا اشارہ کیا۔ وہ سوچی سڑی عورت ایک تیزی نظر روزی اور مجھ  
 پر ڈالنے کے بعد ایک طرف ہوتے ہوئے جواباً کالیا سے  
 بولی۔

”ہاں! وہ اندر ہی ہے۔ آ جاؤ۔“  
 عورت صاف اردو بول رہی تھی مگر اس کا لب لہجہ سندھی  
 اور بلوچی کا امتزاج محسوس ہوتا تھا۔ کالیا کے ساتھ ہم دونوں  
 اندر داخل ہو گئے۔  
 سامنے مختصر سامن تھا۔ سامنے چھپرا سا برآمدہ اور اس

تھوڑا اور آگے جا کر ہم پھر دائیں جانب مڑے، اب  
 ہمارے اگلے ہاتھ پر لیاری ایکسپریس دسے تھی اور ہم نیچے والی  
 روڈ پر تھے۔ کیونکہ اس ہائی وے پر موٹر بائکس کا داخلہ ممنوعہ  
 تھا۔ یوں بھی ہم نے اس طرف جانا نہیں تھا۔ ہم میرا نا کہ  
 جانے والی سڑک سے دائیں جانب بہار کالونی کی طرف مڑ  
 گئے۔

علاقے میں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ یوں بھی  
 یہاں کے حالات کی وجہ سے سرشام ہی سناٹا طاری ہونے لگا  
 تھا۔

اس کے بعد ایک گلی میں بایک گھمانے لگے تو دو مسلح  
 نوجوانوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس علاقے کا خوف  
 میرے دل میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کالیا نے بایک روک دی۔  
 ”کون ہوتے لوگ؟“ ایک نے تو باقاعدہ اپنی گن کالیا  
 کے سینے کی طرف تان لی تھی۔ میرا منہ خشک ہونے لگا۔ میرے  
 پیچھے بیٹھی روزی بھی میرا کاندھا تھامے کچھ اور دب گئی۔  
 ”ہم مہمان ہیں فیاض جمالی کے، اس کے پاس آئے  
 ہیں۔“ کالیا نے بلا خوف اور سنجیدگی سے کہا۔

”کون فیاض جمالی؟“ دوسرے نے کرخت لہجے میں  
 پوچھا۔ کالیا بولا۔

”لاؤ کاندھ والے..... ساتھ ہی اس نے ایک اور نام بھی  
 بتایا تو ہمیں جاننے کی اجازت مل گئی۔“

”کمال ہے یارا رات کے اس پہر بھی یہ لوگ اس  
 طرح چہرے پر ہیں جیسے یہاں دن پڑا ہوا ہے؟“ بایک ذرا  
 آگے نکلے ہی میں نے ہو لے سے کالیا کے کان میں تبصرہ کیا تو  
 وہ بولا۔

”یہ لوگ صرف اپنے اپنے علاقے تک محدود بلکہ محبوس  
 رہنے پر مجبور ہیں۔“ کالیا نے ایک تنگ سی گلی میں بایک  
 موڑتے ہوئے بتایا۔

”انہیں مطمئن کرنا آسان نہیں ہوتا جگر! اگر ذرا سی  
 غلطی سے بھی ان کے مخالف علاقے کے آدمی کا بھی نام لے  
 لیا تو یہ ہمیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے اور پھر ہماری واٹ لگا  
 کر رکھ دیتے۔ ہمارا ایک آدمی محض اسی ذرا سی غلطی میں مارا  
 گیا تھا اور آج تک اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ اسی لیے یہاں  
 آنے سے پہلے ہر علاقے کے کسی آدمی کا بغیر جانے... صرف  
 نام ہی کافی ہوتا ہے۔ جوان کے علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہو،  
 چاہے وہ نیوٹرل ہی بندہ کیوں نہ ہو۔ اسی لیے اپنے استاد بھابھا  
 کو جب بھی لیاری میں کسی کو بھیجتا ہوتا ہے وہ مجھے ہی یہاں

ہونے کا خدشہ ہوتا ہے..... اور.....“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کالیا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”پھر تو سنے دے پار! میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔“

”اڑے بابا! بیٹھ تو سہی، اتنا غصہ کیوں کرتا ہے۔ میں نے کوئی انکار تو نہیں کیا ہے۔ اپنا ہی پاڑہ ہے ناں، میں بات بنا لوں گا۔ لے جائے آگئی۔“ اس نے آخر میں اس ادھیڑ عمر عورت کو ایک بڑی سی تھالی میں چار چائے کے کپ رکھے ہوئے، تھامے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

کالیا سر جھٹک کر دو بارہ بیٹھ گیا۔ ہم سب نے چائے کا ایک ایک کپ اٹھالیا اور خاموشی سے اس کی چشکیاں لینے لگے۔

”یار جینکو! جو کرنا ہے، صبح کی پہلی کرن پھیلنے سے پہلے ہی کرنا ہے، اس کی مجبوری بتانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے، نہ ہی وقت ہے۔“

کالیا نے چائے کی جلدی جلدی چند بڑی چشکیاں لینے کے بعد اس سے کہا تو جینکو نے کوئی جواب دیے بغیر اپنی سیس کی پہلو والی جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر شیج کرنے لگا۔

رابطہ ہوتے ہی وہ بولو پی میں کسی سے کچھ پوچھنے لگا۔ یہ گفتگو بہ مشکل پانچ، چھ منٹوں تک جاری رہی اس کے بعد وہ ایک نظر میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد بولا۔

”یہ مکان بھوکا ہے۔ ڈاڈا کا خاص آدی ہے اور جو لوگ لڑکی لے کر وہاں آئے ہیں۔ وہ دو افراد ہیں، پرویز اور لالی۔ یہ دونوں مجھ کے دوست ہیں۔ مجھ کو اس وقت وہاں نہیں ہیں اور ان دونوں میں سے بھی صرف ایک ہی وہاں موجود ہے، یعنی لالی۔ موقع اچھا ہے اگر ہم خفیہ کارروائی کریں تو یہ معاملہ رازداری سے ہی ختم جائے گا۔“

”تب پھر، میں تیرے ساتھ ہوں۔“ کالیا اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کالیا مجھ سے بولا۔

”تو ادھر ہی ٹھہر جگر! اڑھی ہے تو۔“

”نہیں میں بھی چلوں گا، ٹھیک ہوں میں۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

جینکو کھڑا ہو گیا۔ کالیا نے اس سے روزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ روزی ہے، ہماری ساتھی سمجھ لو۔ یہ ادھر ہی بیٹھے گی اگر ہمیں صبح ہوگی تو اس کے کمر بھجوانے کا بندوبست کر لیتا۔“

کے ساتھ ساتھ دو کوٹھڑی نما کمرے تھے۔ دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جبکہ ایک میں اندھیرا اور دوسرے میں روشنی تھی۔ سامنے سے ہی اندر فرشی نشست بچھائے چار، پانچ افراد بیٹھے تاش کھیلنے میں مگن تھے۔ اندر سرگرمیت کا دھواں گردش کر رہا تھا۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا تھا، پھر ایک شخص جلدی سے ان کی محفل سے اٹھ کر کوٹھڑی سے باہر نکلا۔

”اڑے کالیا! تو؟ خیریت.....!“ وہ خاصا دراز قامت اور دبلا پتلا مگر جنگجو سا دکھائی دیتا تھا۔ یہی شاید جینکو تھا۔ ”خیریت ہوتی تو اس وقت تیرے پاس کیوں آتے؟“ کالیا نے اس سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے ہوئے کہا اور جینکو نے ایک نظر روزی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد ہمیں ساتھ والی کوٹھڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ جینکو نے اندھیرے میں ہی کوئی سوئچ ٹٹولے بغیر ہی فوراً آن کر دیا اور بلب کی روشنی میں مجھے سائیز میں ایک چار پائی پچھی نظر آئی۔ دوپچھی سی کرسیاں اور ایک شیج نما صوفے سے مشابہ کوئی شے بھی رکھی تھی۔

کالیا نے روزی اور مجھے دو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود جینکو کے ساتھ اسی شیج نما صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ شاید پرانی سی کوئی ”سیٹی“ تھی۔

”ہاسی!“ جینکو نے آواز لگائی۔ تھوڑی دیر میں وہی ادھیڑ عمر سونو عورت بیڑی کے کش لگائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ”دوستوں کے لیے چائے تیار کرنا ہے اور باپ پلے کٹ بھی لے آتا۔“

وہ یہ سن کر دروازے سے ہی پلٹ گئی۔

”یار، جینکو! یہ میرا دوست ہے نونی۔“ کالیا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میری طرف تعارفی اشارہ کیا۔ ”اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے ہم اس کا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں، وہ مکان جہاں اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا تھا، وہاں ہے، وہ اس سے تین گھنٹیاں چھوڑ کر چوٹی گلی میں واقع ہے۔ میں چاہتا تو وہاں اپنے مل بوتے پر بھی کارروائی کر سکتا تھا مگر تو جانتا ہے کہ اس علاقے کا معاملہ اور ہے، پرانی فلم جگے پڑتے دیر نہیں لگتی، اسی لیے سوچا پہلے تیرے سے مشورہ کر لیا جائے۔ بول، کیا کہتا ہے؟“

جینکو بڑے غور سے اس کی بات سنتا رہا تھا پھر ایک نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد کالیا سے بولا۔ ”یہ جتن ڈاڈا کا پاڑہ ہے، بد قسمتی سے یہ ہمارا حلیف ہے، بد قسمتی اس لیے کہ اپنے دوست کے پاڑے میں اس طرح کی کارروائی سے تعلقات خراب

سی بھی گزربڑ سے یہاں گینگ وار چھڑکتی ہے۔ پورا علاقہ میدان جنگ بن جائے گا۔ ہم الگ مارے جائیں گے۔ یہ کراچی کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف علاقہ ہے اور پھر ہم اپنے ہی ایک حلیف پاڑے میں موجود ہیں۔ اصولاً یہی ہوتا ہے کہ اس نازک معاملے کے لیے پہلے ڈاڈا سے بات کرنی چاہیے ہمیں مگر اس میں رسک ہے کہ کام ہوتا ہے نہیں، اسی لیے یہ خطرہ بھی میں نے محض دوستی سے مجبور ہو کر صرف کالیا کی خاطر مول لیا ہے، ڈاڈا کو اگر معلوم ہو گیا کہ اس کے علاقے میں یہ کارروائی میں نے کی تو ہماری یہ دوستی دشمنی میں بدل جائے گی۔“

اس کی بات پر کالیا نے بھی مجھے سمجھایا اور میں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد جینگو نے کالیا سے کچھ کہا اور اپنے چہرے پر آنکھوں کے نیچے رومال باندھ لیا۔ کالیا نے بھی یہی کیا اور پھر وہ اس مکان کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ میری اپنی دھڑکتی نظریں اس منحوس مکان کے بند دروازے پر جم کر رہ گئی تھیں، جس کے اندر میدان طور پر عاصمہ یرغمال بنا کر رکھی گئی تھی، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی آگے بڑھ کر اس مکان کو آگ لگا دوں۔

بڑی عجیب و غریب ذہنی کیفیات سے میرا دل و دماغ دو چار تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی مجھے ہول سے آرہے تھے کہ اس خبیث مردود نے میری معصوم بہن کو کیسے خطرناک علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ اب جانے وہ بے چاری اندر کس حال میں ہوگی۔ میں اس کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ سکتا تھا اور کالیا بھی شکر گزار ہو رہا تھا کہ اس کی مدد سے بالآخر ہم اب عاصمہ کو اس جہنم سے باہر نکالنے ہی والے تھے۔

میں، جینگو کے ساتھی کے ساتھ ہی کھڑا تھا اور دروازے سے زیادہ دور نہیں تھے۔

جینگو کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں نے بھی اپنے چہرے رومال سے ڈھانپ لیے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جینگو نے دروازے پر دستک دی تھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد اندر سے شاید کسی کی آواز ابھری تھی جس کے الفاظ تو میں نہیں سمجھ پایا تھا مگر آہنگ سے اندازہ لگایا تھا کسی نے کچھ پوچھا تھا جس کے جواب میں جینگو نے اپنی آواز بدل کر بوجے کے خوالے سے کچھ کہا تھا، اس کے بعد دروازہ جیسے ہی کھلا میں نے جینگو اور کالیا کو بیک وقت پتو لیں نکال کر اندر گھستے دیکھا اور عقب میں دروازہ بند کر لیا گیا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور متوقع طور پر اپنی

”اس کی فکر نہ کر، سمجھو یہ باخیریت کتنی مٹی اپنے گھر۔“ جینگو روزی کی طرف دیکھ کر بولا۔ پھر کالیا نے ابھی روزی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ہمیں نہیں معلوم کہ اس کام میں ہمیں کتنا وقت لگ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں آئے بغیر ہم آگے نکل جائیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، صبح ہوتے ہی یہ جہیں تمہارے گھر تک پہنچا دیں گے۔“ روزی نے ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ میں نے احتیاطاً روزی کا کونٹیکٹ نمبر لے لیا تھا اور اسے اپنا دے دیا تھا۔

اس کے بعد ہم تینوں صحن میں آگئے۔ جینگو دوسری کھڑکی میں گیا جہاں اس کے دوست تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جب دوبارہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک لمبا بڑا سا لڑکا تھا۔ دونوں سٹل تھے۔ یعنی جینگو کے ہاتھ میں بھی اب ایک پتول نظر آرہا تھا جسے وہ اپنی کھلے گیر والی قمیص کو اٹھا کر نینے میں اڑوس رہا تھا۔

مجھے اب اپنے بازو کے زخم میں تکلیف کم ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم چاروں مکان سے باہر آگئے۔ مکان سے باہر کھڑی دو مین چائنا کی یونیک موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک پر وہ دونوں سوار ہو گئے اور اپنی بائیک کالیا نے سنبھال لی۔

لیاری کا علاقہ تنگ اور بھل بھلیوں پر مشتمل ہے۔ دو گلیوں کے بعد یہ قول جینگو کے، ان کے حلیف کا علاقہ شروع ہو چکا تھا مگر جینگو ہمیں ایسے راستے سے لے کر نکلا تھا جہاں ہم میں سے کوئی بھی ان کے کسی جاسوس کی نظروں میں نہ آسکیں۔ بالآخر ایک گلی میں داخل ہوئے تو اس کے سرے پر ہی ایک مکان کے سامنے ہم نے اپنی بائیکیں روک لیں اور نیچے اتر آئے۔

گلی سنان اور تاریک تھی۔ کالیا نے ہی نہیں بلکہ اس کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق جینگو بھی اس مکان کو پہچان چکا تھا جو کسی جوانی شخص کی ملکیت تھا۔

جینگو نے اپنے آوی اور مجھے ادھر ہی کھڑے رہنے کا کہا اور اپنے چہروں پہ نقاب چڑھانے لگے تو میں نے فوراً کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ اندر چلوں گا۔“ کالیا تو خاموش رہا مگر جینگو مجھے سمجھاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دوست! تمہیں یہاں کی خطرناکی کا اندازہ نہیں ہے، ذرا

بہن کو جلد بازیاب کرانے کی اس کوشش پر میں خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔ تاہم دل کو نامعلوم اور اندیشناک خطرات کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔

دو دونوں اندر داخل ہو چکے تھے اور میں جینکو کے ساتھی کے ساتھ گلی کے اندر ہی ذرا سرے پر ہو کر کھڑے تھے۔ البتہ ان کے جاتے وقت جینکو نے اپنے ساتھی کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ ذرا سی بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو ہمیں سیل پر اطلاع کر کے خود اس جگہ چھوڑ کر کہیں اور کھڑے ہو جانا۔

ایک ایک لمحہ ہماری سیل کی طرح گزرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کچھ گڑبڑ ہونے والی ہو۔

کالیا اور جینکو کو اندر گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ دفعتاً ہمیں کسی گاڑی کی ہیلڈ لائٹس دکھائی دیں، میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ساتھ کھڑے جینکو کے ساتھی کی طرف دیکھا، وہ بھی روٹنی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور جلدی سے قریب ایک پان سگریٹ کے کیمین کی طرف سرک گیا، جو بند پڑا تھا، میں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی اور ہم دونوں اس کی آڑ میں جا کھڑے ہوئے۔

روٹنی قریب آتی گئی اور خیال تھا کہ وہ کسی بھی گاڑی کی ہوگی تو وہ آگے نکل جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا، وہ پرانے ماڈل کی کار تھی اور اندر ہی اس کی طرف مڑ رہی تھی اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی، میں دھک سے رہ گیا اور ساتھی کی طرف دیکھنے لگا، وہ خود پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ اس نے کار کے اندر گلی میں مڑتے ہی اپنا سیل نکال لیا تھا، وہ شاید اندر کالیا کے ساتھ موجود اپنے ساتھی جینکو کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔

رابطہ ہوتے ہی اس نے سرگوشیانہ سے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے ہیں، باہر کار میں موجود ہیں، اس میں تین افراد سوار نظر آ رہے ہیں۔ ایک تو مجھ ہی لگتا ہے، دوسرا اس کا ساتھی بنو یا با ہے۔ تیسرا ابجی ہے کوئی، وہ شاید مکان کے اندر کے موجود لالی نام کے آدمی کا ساتھی پرویز ہی لگتا ہے، او..... ہوشیار رہا شاید یہ تینوں کار سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک دھمٹا نظر آ رہے ہیں لگتا ہے، انہیں کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے، انہوں نے اب پیٹول سٹیج تکال لی ہیں؟ کیا؟ اچھا..... ٹھیک ہے۔“

یہ سب بتانے اور دوسری جانب سے کچھ سن کر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم اپنے ساتھی کی بائیک سنبالو مگر اشارٹ کیے بغیر اس گلی سے باہر لے چلو، جلدی۔“ یہ کہتے ہی

وہ کیمین کی آڑ سے نکلا اور میں بھی۔ ہم نے اپنی اپنی ساتھیوں کی بائیکس سنبالیں اور پیٹول سے تھامے ایسے ہی گلی سے باہر نکلتے ہوئے چل پڑے۔

میں بری طرح تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔ اندر میرے ساتھیوں کی ہی نہیں بلکہ میری معصوم بہن عاصمہ کی زندگی بھی داؤ پر لگ چکی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت کوئی گھمسان کارن پڑنے والا تھا۔ دونوں بائیکس گلی سے باہر لے جا کر ذیلی سڑک کے کنارے کھڑی کرنے کے بعد ہم دوبارہ گلی میں پلٹے تو اس نے اپنا پیٹول نکال کر مجھ سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”تم پھر ادھر ہی ٹھہرو۔“ اس نے مجھے گلی کے کنارے پر کھڑے رہنے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اس کی پیروی میں اس کا رخ مکان کی طرف تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا، اس کا رخ مکان کی طرف تھا۔

اسی وقت گولی چلی۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ مکان کی طرف دیکھا تو اس کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ میرا ساتھی بہت دھیرے دھیرے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسی وقت تلے اوپر دو تین اور فائر ہوئے۔ میری تشویش و پریشانی فزوں تر ہونے لگی۔ میں بھی دھڑکتے دل کے ساتھ گلی کی دیوار سے لگا مکان کی طرف سرکنا چلا گیا۔ میں بالکل نہبتا تھا۔ اندر میری بہن اور کالیا کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

اسی وقت مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی اور میں نے پھر ساری احتیاط اور خوف بھلا کر مکان کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ کوئی مجھ سے ٹکرا کر گرا۔ وہ زخمی اور خون میں لٹ پٹ تھا۔ میری پھللی ہوئی آنکھیں اس پر جم گئیں، وہ مخالف پارٹی کا کوئی شخص تھا۔

ابھی میں اس کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اندر سے مزید دو افراد فائرنگ کرتے ہوئے نکلے میں کیمین کی طرف بھاگا اور اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔

وہ متوقع طور پر مجھ اور اس کا کوئی ساتھی دونوں مکان کے اندر کی طرف فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکلے اور دائیں بائیں پوزیشنیں سنبھال لیں۔

اب انہوں نے اندر کالیا وغیرہ کو گواہ محبوس رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہیں پتا تھا کہ مکان کے اندر قہقی لائٹیں گری

میں نے کالیا کو آواز دی تھی، تاکہ وہ کسی شے کی بناء پر مجھ پر ہی گولی نہ چلا دیں۔

اندر سے کالیا نے بھی مجھے آواز دی اور پھر میں اندر داخل ہو گیا۔ سامنے صحن میں ہی دو لاشیں پڑی نظر آئیں، تیسرا عموٹی زخمی حالت میں بے ہوش تھا۔ جینکو نے اپنے ایک زخمی ساتھی کو سنبھال رہا تھا جبکہ کالیا نے عاصمہ کو تھام رکھا تھا، وہ بری طرح خوف زدہ اور ڈری تھی ہونی نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ”بھائی جان“ کہہ کر میری جانب لپکی۔

”جلدی نکل چلو، اس سے پہلے کہ ان کے ساتھی یہاں پہنچ جائیں،“ جینکو نے کہا۔

میں نے عاصمہ کو اپنے ساتھ لگایا اور پھر ہم باہر آ گئے۔ ہائیک پر کالیا اور میں سوار ہو گئے، عاصمہ کو میں نے اپنے پیچھے بیٹھالیا تھا جبکہ جینکو اپنے زخمی ساتھی کو جو ہوش میں ہی تھا، ہائیک پر بیٹھا کر فوراً روانہ ہوا تو کالیا نے بھی اپنی ہائیک بھاگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس کے مکان میں تھے۔

اب مسئلہ روزی کا تھا۔ جینکو نے اپنی ایک اضافی ہائیک ہمیں دے دی جو کالیا نے سنبھال لی۔

جینکو نے ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکل جانے کی ہدایت کی تھی، کالیا کی ہائیک میں نے سنبھال لی تھی اور عاصمہ کو پیچھے بیٹھالیا تھا۔ جینکو نے کالیا کو یہاں سے نکلنے کا ایک سیدھا اور محفوظ راستہ بتا دیا تھا۔

ہم اسی راستے پر روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر کالیا گلستان جوہری طرف مڑ گیا اور میں نے طیر کار راستہ پکڑا۔ کالیا نے مجھ سے جدا ہوتے وقت کہا تھا کہ وہ روزی کو چھوڑ کر سیدھا وچن پہنچے گا۔

سڑکیں سنسان تھیں اور میں کالیا کی طاقتور ہائیک دوڑاتا ہوا طیر کار پہنچا اور اپنے گھر کے دروازے پر ہی ہائیک لے جا کر دم لیا۔ زخمی باز کے باوجود مجھے ہائیک چلانے میں کوئی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی۔

میں نے جلدی سے عاصمہ کو اترنے کا کہا اور پھر خود اتر کر ہائیک کو سائیڈ اسٹینڈ پر لگایا اور پھر اسے لاک کر کے عاصمہ کو سنبھالے گھر کے دروازے پر لگے تالے کو کھولا۔ پھر دروازہ دھکیل کر عاصمہ کو اندر کیا اور اس کے بعد خود بھی جلدی سے اندر آ گیا۔ دروازہ عقب میں بند کر کے ہم کمرے میں آ گئے اور پھر عاصمہ بے اختیار دھڑبھڑبات تلے میرے سینے میں اپنا سر رکھنے لگا اور قطار رودی۔

ہوں گی جبکہ میں عاصمہ اور کالیا کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ رہا تھا۔

مجو اور اس کا ساتھی لب گلی کے باہر سے فائرنگ کر رہے تھے۔ یہی دھڑکا مجھے بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کی مجھ پر نظر نہ پڑ جائے، مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ بجواہنی جب سے فون نکال کر کسی سے باتیں کرنے لگا، وہ شاید مدد کے لیے اپنے ساتھیوں سے رابطے کی کوشش میں تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی فائرنگ کرتا رہا اور ساتھ ہی وہ اسی جانب سرک آیا جدھر میں اندھیرے میں دبکا ہوا کھڑا تھا۔

مجھ سے اب ہاتھ پر ہاتھ باندھے کھڑا نہیں ہوا جا۔ کا وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور یہی وہ وقت تھا جب میں اس پر حملہ کرنے کا کوئی حربہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ میری جانب گھوما اور اسی وقت میری ایک لات حرکت میں آئی، وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا، سبب یہی تھا کہ میری لات ٹھیک اس کے پیٹ پر اس زوری کی پڑی تھی کہ وہ لڑکھڑا کر گلی کی دیوار سے ٹکرا کر گر اتو اس کا پستول چھوٹ گیا۔

میں اس کے پستول پر چھپنا، اس نے لات چلا دی، جس سے الجھ کر میں اس کے بالکل قریب گر ا۔ وہ کوئی زیادہ ٹکڑا نہیں تھا، تاہم بیدار مغز اور پھر بیٹلا ضرور تھا۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے ہی تڑپ کر مجھ پر چھپنا مارنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے دوسری لات اس کے چہرے پر رسید کر دی اور اسی وقت میرا ہاتھ زمین پر گرے پستول سے ٹکرایا، جو میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اٹھالیا اور اس کی نال کارخ اس کی جانب کرتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔

بلاشبہ یہ میرا اپنے تحفظ کے لیے ایک غیر ارادی رد عمل تھا۔ ٹھانیں کی آواز سے کوئی چلی جو اس کے پہلو میں گئی، وہ کریمہ انگیز چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حوصلہ پاتے ہی میں پستول ہاتھ میں لیے اٹھا تو بجواہنی اس طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔ میں نے اس پر بھی گولی چلا دی۔

وہ چیخ مار کر لڑکھڑا کر گر ا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے تاریکی میں سا گر ا۔ مجھ کو بھی کم ہوشیاری نہ تھا، وہ اٹھ کر پھر دوڑا مگر اس بار وہ فلنڈر اکر دوڑ رہا تھا اور بار بار گردن موڑ کر میری جانب بھی دیکھتا جاتا تھا، میں نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی ہدایت کے مطابق چہرے پر دو مال کا نقاب باندھ رکھا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا مگر سامنے آنے سے پہلے

نے لہڑے بٹلے تھے اور روٹیاں بھی اتاری تھیں، بریڈ بھی تھی اور رات کا بچا ہوا سالن بھی تھا۔

ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کالیا نے جانے کی اجازت چاہی۔ عاصمہ نے ہی نہیں بلکہ میں نے بھی کالیا کا ساتھ دینے پر شکر یہ ادا کیا تو وہ اپنا سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”نہیں مگر! دوستوں میں اس طرح کی شکرے شکایتیں والی مرد میں نہیں چلتیں، بس ایک دوسرے کے کام آتے رہنا ہوتا ہے۔ اور پھر دیکھا جائے تو عین آخر میں جب کام بگڑنے لگا تھا، تم نے ہی اسے سنبھالا تھا اگر تم مجھ کو بروقت زخمی کر کے بھاگے رہ مجبور نہیں کرتے تو صورت حال شاید اس سے مختلف ہوتی۔ خیر! اسی طرح مل جل کر کام چلتا ہے مگر! چلتا ہوں، کل ملوں گا اور بہت سی باتیں کرنا ہیں، میں بھی ذرا جا کر آرام کروں۔“

وہ چلا گیا۔ میں اور عاصمہ کمرے میں آگئے۔ میں نے چائے پتائی تھی، غسل کرنے اور کچھ کھاپی کر اس کی حالت بھی کافی سنبھل گئی تھی مگر تھکن اور پیش آمد حالات نامساعد کے باعث اس پر بری تھکن اور بے آرا می کے آثار کا غلبہ نظر آ رہا تھا، خود میں بھی تھکا ہوا تھا، اب تو صبح بھی ہونے والی تھی۔ اس لیے میں نے عاصمہ کو آرام کرنے کا کہا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی، عاصمہ جاگ گئی تھی۔ وہ میرے لیے ناشتا بنا کر لے آئی۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر رست وایج میں وقت دیکھانے کے بارہ بج رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے پہلے ایک دو فون کیے اور کالیا سے بھی رابطہ کیا اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میری (اس کی) بانیگ لاری اڑے پر ہی لے آئے جبکہ جینکو کی بانیگ وہ خود جا کر اسے دے آیا تھا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے عاصمہ سے کہا۔ ”عاصمہ! یہ سب کچھ بہت اچانک ہی ہوا تھا کہ مجھے کافی دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا کہ تم اس طرح یک دم گھر سے غائب ہو گئی ہو، مجھے یقین تو تھا کہ کسی نے بڑی پلاننگ کے ساتھ تمہیں اغوا کیا ہے مگر۔“

”مگر کھائی جان؟“ وہ جلدی سے بولی۔  
”مگر میرے سمجھانے کے باوجود، جنیم کو اس کا یقین نہیں آیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں بھائی جان کہ وہ کیا سمجھ رہا ہوگا مگر اصل حقیقت وہی ہے جس کا آپ کو اور اک ہوا تھا۔“ عاصمہ

میں اس کا سر پیار و شفقت سے چھٹکا ہوا ہینڈ بریڈٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھا دیا۔ خود میری اپنی آنکھیں بھیگتی ہوئی تھیں اور ہم دونوں بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے سے لگے، غموں اور دکھوں کے خار و خش آنسوؤں میں بہا کر نکلتے رہے، جب دل و دماغ کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے اسے سہارتے ہوئے دھیرے سے الگ کیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا جو چند ہی روز میں کھلا کر رہ گیا تھا۔

بہن کا سا ہوا چہرہ، بکھرے ہوئے پھجڑی سے بال اور اس کی اجڑی اجڑی سی آنکھوں کے میں آباد مگر شدہ سے دیران ممکن کو دیکھ کر میں کچھ سوچ کر اندر سے دہل بھی گیا اور اسی وقت میں نے قسم اٹھالی کہ اگر میری معصوم اور پاکیزہ بہن کی عصمت پر ذرا بھی کسی نے شب خون مارا ہے تو میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر ہلاک کروں گا۔

”بھئی جان! آپ زخمی ہیں؟“ معافی اس کی نگاہ میرے دائیں شانے کے زخم پر بندھی پٹی پر پڑی تو میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔  
”کرو۔“

”بھ بھ..... بھائی جان! وہ..... نف..... جنیم بھائی نظر نہیں آرہے ہیں؟“ وہ پھر متلاشی نگاہوں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے ہلے سے مستفسر ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔  
”عاصمہ! وہ مجھ سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ فون بھی نہیں ریسو کر رہا ہے، شاید اپنے کسی دوست کے ہاں گیا ہوا ہے، تم فکر نہ کرو میں کسی دن جا کر اسے لے آؤں گا۔ تم بتاؤ بہن! تم ٹھیک تو ہونا؟“  
”میں ٹھیک ہوں بھائی جان!“ وہ دھیرے سے اپنا سر جھکا کر بولی تو میں نے کچھ سوچ کر دو بارہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم بہ خیریت گھر پہنچ گئیں۔ تم اب پہلے غسل وغیرہ کر کے کپڑے بدل لو، میں تب تک تمہارے لیے کھانا لگا تاہوں۔“

میں نے ابھی اپنا ہاتھ منہ دھو کر لباس بدلا، کیونکہ میری قمیص میں خون لگا ہوا تھا۔ پٹی اب نئی قمیص کے اندر چھپ گئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد کالیا بھی آگیا۔ اس کے پاس جینکو کی دی ہوئی بانیگ تھی۔

گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود ہی رہتا تھا۔ میں



محکم میں گئی تو دو انسانی سائے بیک وقت مجھ پر چھپے، میں نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نے کسی دوا میں بیگا ہوا رومال میری ناک سے لگا دیا، پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ بس، بھائی جان! اس کے بعد تب سے اب تک میرا وقت خوف و دہشت میں بیتا رہا۔ کتنے ہی عذابوں سے میں گزری لیکن بھائی جان! خدا گواہ ہے میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا، اگر ایسا ہوتا تو، میں خودکشی کریتی۔“

انتانتا کروہ سکنے لگی، میں نے پیار اور حوصلہ آمیز انداز میں اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔

”بھائی جان! انجیم کونوں تو کریں، انہیں بتا دیں کہ میں گھر آچکی ہوں اور میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟“ عاصمہ نے آخر میں ذرا سنبھلے ہوئے مجھ سے کہا تو میں بولا۔ ”میں کئی بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا ہوں، میں اب صرف مسیج کر رہا ہوں اسے کہ تم گھر آچکی ہو۔“

”ٹھیک ہے بھائی جان! جیسا آپ بہتر سمجھیں۔“ عاصمہ نے اترے اترے چہرے سے کہا، میں جب فہیم کو ایس ایم ایس کر چکا تو عاصمہ مغموم سے لہجے میں بولی۔ ”بھائی جان! یہ فہیم بھائی آخر انتا بدل کیوں ہو گئے ہیں؟ پہلے تو ایسے نہیں تھے وہ؟“

میں نے بھی ایک آزر دہی ہرکاری بھر کر کہا۔ ”ہاں! لیکن اس میں بدقسمتی سے قصور کچھ ہمارے حالات کا بھی ہے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہی دنوں محلے میں نئے میاں (خورشید خاں) کی بیٹی ثوبہ کا بھی اسی طرح کا چکرو اور پھر اغوا ہوا تھا، بعد میں وہ ماری گئی یا اس نے خودکشی کر لی۔

واقعہ بہر حال لرزہ خیز ہی تھا، فہیم کا خیال یہی تھا کہ یہ نئے میاں کی بیٹی کے ساتھ سوچی سمجھی اسٹیم کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا اور یہ آوارہ اور اوباش لڑکوں کا کوئی ٹولہ ہے، جن کا کام ہی یہی ہے، ابھی اس واقعے کو ایک ادھ دن ہی گزرا تھا کہ تنہا راتیں اٹھ کھڑا ہوا تو فہیم بری طرح خائف ہو گیا۔“

عاصمہ بولی۔ ”آپ کی بات صحیح لگتی ہے بھائی جان کہ فہیم کا اسی لیے مجھ سے اس قدر دل خراب ہوا۔“

”تم سے ہی نہیں مجھ سے بھی ہوا تھا اور اس قدر کہ اس نے..... اس نے، اس روز صبح جب تم گھر سے اچانک غائب کر دی گئی تھی، اس نے میرے چہرے پر ایک چھڑ بھی رسید کر دیا تھا۔“ میں نے کہتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ بتاتے ہوئے میرا لہجہ بھرا گیا تھا۔ فہیم میرا چھوٹا بھائی تھا، باپ کی چھائی کے بعد میں نے ہی عاصمہ اور فہیم کو سنبھالا دیا تھا

نے دھکی دھکی سے لہجے میں اپنا سر جھکا کر کہا تو میں نے اسے ازراہ تشفی کہا۔

”تم پریشان نہ ہو، اب تو فہیم کو یقین آ جانا چاہیے۔“ پھر..... ذرا ایک توقف کے بعد اس سے مستنصر ہوا۔ ”یہ بتاؤ آخر یہ سب ہوا کیسے تھا؟ مجھے تو حیرت ہے کہ ہمارے گھر میں اس طرح چھپ چھپاتے کس طرح اغوا کاروں نے نقب لگا لی تھی کہ ہم تینوں میں سے کسی کو اس کی کانوں تک خبر نہ ہو سکی؟“

میں نے عاصمہ کو بتا دیا تھا کہ اس کے اغوا کے پیچھے کس شخص کا ہاتھ تھا اور نیز یہ بھی کہ میں نے کس طرح اپنے دوست کالیا کی مدد سے یہ مہم سہی گئی، وغیرہ۔

عاصمہ نے اپنے تئیں کچھ صراحت بتانے سے پہلے دھکی دھکی سے لہجے میں کہا۔ ”بھائی جان! مجھے آپ پر تو یقین تھا کہ آپ وہی سمجھیں گے جو حقیقت تھی مگر فہیم بھائی کی سوچ کا مجھے پہلے ہی ادراک تھا۔ کیونکہ وہ بہت پہلے ہی میری طرف سے اسی غلط فہمی کا شکار رہتے تھے، بالآخر انہوں نے یہی سمجھا جو ان کی سوچ تھی جبکہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، اب میں آپ کو حقیقت بتاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا توقف کیا اور آگے بولی۔ ”یہ اتفاق ہی تھا کہ اسی روز کاشف بھی مجھ سے ملنے آیا تھا مگر یہ کوئی باقاعدہ ملاقات نہ تھی۔ بس! وہ دروازے پر ہی آیا تھا اور یہ خوش خبری دینے کے لیے کہ اس کے والدین اگلے دن شام ہمارے ہاں آنے والے تھے۔ میں خوش تھی۔ اس کے جاتے ہی، ایک اور شخص دروازے پر آیا میں یہی سمجھی کہ شاید کاشف کوئی بات بھول گیا تھا اور دوبارہ کچھ بتانے آیا تھا، اسی لیے میں ہی دروازے پر گئی تھی، وہ انجیم ہی تھا اور مجھ کیسے ہانپتا پوچھا، میں اسے نہیں بتا سکی وہ چلا گیا، اس کے بعد رات کو سونے کے لیے میں اپنے کمرے میں آئی، آپ اور بھائی سو چکے تھے جبکہ میں اپنے کمرے میں رات دیر تک جاگتی رہی، مجھے جانے کیوں اس رات نیند ہی نہیں آ رہی تھی اور دل بھی تنجانے کیوں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ خوشی کا بھی عنصر تھا کہ کل کاشف اپنے والدین بھیجنے والا تھا اور میں اس شخص میں تھی کہ پتا نہیں ان کی بات آپ اور بھائی فہیم قبول کرتے بھی ہیں کہ نہیں، تاہم مجھے اُمید تو تھی کہ تم از کم آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کا شاید وہ آخری پہر تھا جب کسی کھٹکے پر میں چوکی تھی، آواز محسن سے ہی آئی تھی، پہلے تو میں یہی سمجھی کہ کوئی بی وغیرہ کو دی ہے مگر دوبارہ کھٹکے کی آواز پر میں بستر سے اٹھ کر

بتایا۔

”کک..... کاشف آیا تھا یہاں؟“ عاصمہ نے چونک

کر کہا۔

”ہاں! وہ بہت پریشان تھا، تم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس کا اور پھر یہاں گھر پہ بھی تالا لگا رہتا تھا تو بہت فکر مند ہوا اور بالآخر وہ مجبور ہو کر ایک رات یہاں آ گیا، کیونکہ میں صبح کا گیا رات کو ہی گھر آتا تھا، مجھ سے ملا تو میں نے اسے ساری حقیقت بتادی۔ لگتا ہے تمہاری اس سے اچھی انڈرا سٹینڈنگ ہے، وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے وہ ایک اچھا اور شریف لڑکا محسوس ہوا تھا۔“

”جی بھائی جان!“ عاصمہ اپنا سر جھکا کر ہولے سے بولی۔ ”وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔“

”میرا خیال ہے اب تم اسے بتا ہی دو کہ تم بالکل خیریت کے ساتھ گھر آ چکی ہو۔“ میں نے آخر میں اس سے کہا۔

”بھائی جان! میں بتا دوں گی۔ ممکن ہے وہ آپ سے بھی کوئی بات کرنا چاہے۔“ میں اس کا اشارہ مجھ کر بردباری سے بولا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں، وہ بے شک مجھ سے بات کر سکتا ہے، یوں بھی وہ مجھ سے مل چکا ہے۔“

”جی بھائی جان!“

میں نے رسٹ واج میں وقت دیکھا، مجھے اور بھی کام نمٹانا تھے۔ ایڈووکیٹ زہیرہ کی خیریت پوچھنے جانا تھا اور لاری اڈے کے بھی معاملات وغیرہ دیکھنا تھے۔ کالیا نے بھی وہاں آنا تھا مگر اس واقعے کے بعد میرا اب عاصمہ کو اس طرح گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، فہیم ہوتا تو اور بات تھی، اسے عاصمہ بہن کی خیریت واپسی کا سنبھالنے کرنے کے بعد مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ سنبھالنے ہی گھر پہنچ جائے یا مجھ سے رابطہ کر لے مگر اب تک ایسا نہیں ہوا تھا۔

عاصمہ میری فکر بھانپتے ہوئے بولی۔ ”بھائی جان! آپ شاید کہیں جانا چاہ رہے ہیں؟ آپ جائے فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اب محتاط ہوں۔“

میں اب اسے کیا بتاتا کہ ہمارے دشمن کس قدر زیرک اور طاقت ور ہیں، جو گھر میں کس کس کا ایک بار قنب لگا سکتے ہیں وہ دوبارہ بھی یہی حرکت کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”ایسے نازک وقت میں فہیم کی ضرورت بہت محسوس ہو رہی ہے۔ کاش! وہ اب اپنی ناراضگی بھلا کر ہی واپس لوٹ

اور انہیں ایسا کچھ، کبھی بھی محسوس ہونے نہیں دیا تھا کہ انہیں باپ کے نہ ہوتے ہوئے کسی قسم کا عدم تحفظ محسوس کرتے۔

میں نے ہر طرح سے اپنے ان دونوں چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی اور کر رہا تھا۔

”کک..... کیا..... یی..... یی..... آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟“ دفعتاً عاصمہ جیسے ایک دم بڑپ کر بولی۔ ”فہیم بھائی نے آپ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا؟ کیا آپ صبح کہہ رہے ہیں؟ اپنے بڑے بھائی کے منہ پر اس نے تھپڑ مارا؟“

عاصمہ کو جیسے اس بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونک سا گیا، وہ دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات تلے سرخ ہو رہا تھا۔

”آپ نے وہ تھپڑ نہ لیا ہوگا میری خاطر بھائی جان!“ عاصمہ میری طرف دیکھ کر بولی تو میں نے کہا۔

”ہاں! میں اگر لڑتا تو شور چہار دیواری سے باہر جاتا، دو بھائیوں کے درمیان لڑائی یہ راز اچھول دیتی جس کے بعد ہم سب کی عزت داؤ پر لگ جاتی۔ فہیم غصے میں تھا اور میں نے اس وقت بیبی، بہتر سمجھا کہ غصہ لی لیا جائے۔“

”بھائی جان، مجھے فہیم بھائی سے اس بات کی توقع ہرگز نہ تھی، میری ذات سے متعلق انہوں نے جو شک کیا وہ میں بھی سہہ گئی تھی مگر اس نے آپ کو تھپڑ مار کر خود کو اب ساری زندگی کے لیے میری نظروں سے گرا لیا ہے۔“

”نہیں بہنا! ایسا نہیں کہتے۔“ میں نے پیار سے اسے سمجھایا۔ ”کوئی بات نہیں، وہ غلط ہی کا شکار۔“

”نہیں بھائی جان! بھائی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے کسی پر بلا جواز شک کرے اور اپنے سے بڑے بھائی کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دے۔“ عاصمہ نے میری بات کاٹی۔ ”وہ خود غرض ہے، اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ

ایک ہی خاندان کا معاملہ ہے تو اسے بھی اس نازک وقت میں آپ کا ساتھ دینا چاہیے تھا، اصل میں وہ کم ہمت اور بزدل تھا، یہ آپ ہی تو ہیں جنہوں نے مجھے اپنی جان پر کیل کر بچایا۔ خود فہیم تو محض اپنا غصہ دیکھا کر اور ایک طرح سے اپنی جان چھڑا کر نجانے کہاں غائب ہو گیا ہے اگر بہن کی اسے اتنی فکر ہوتی

تو وہ بھی آپ کی طرح اپنی جان داؤ پر لگاتا، مجھے تو بھائی جان! اب فہیم بھائی کو بھائی کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے، میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ کہتے کہتے وہ سسک پڑی۔ میں اسے تسلی دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے عاصمہ کو کاشف کے بارے میں بھی

اس کے چہرے کی زردی مائل رنگت اب کچھ گلابی سی ہونے لگی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے بھی مانند پڑنے لگے تھے۔ ان میں اب مردی کی بجائے حیات بخش چمک پھوٹی محسوس ہونے لگی تھی جو ان کا خاصا رہ چکی تھی۔ گدازلیوں پر نرمی بھی لوٹ آئی تھی۔

”معافی چاہتا ہوں، بغیر دستک کے اندر آنے پر۔“ میں نے ہولے سے ہٹکھڑاتے ہوئے شستہ لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑی۔ اس کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی چھل کی طرح محل اٹھا تھا۔

”ارے تم..... آؤ..... تمہیں بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے، آ جاؤ، پلیز!“

وہ ٹرے کو سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”مجھے تمہارا ہی تو انتظار تھا۔“

میں مسکراتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب دھری ایک چیز پر بیٹھ گیا۔

”کیسے ہو تم؟“ اس نے مترنم سے لہجے میں پوچھا تو میں ہستے ہوئے بولا۔

”مجھے چھوڑو، پہلے تم بتاؤ، کسی طبیعت ہے تمہاری اب؟“

”ظاہر ہے ٹھیک ہی ہوں تو اسپتال والوں نے میری جان چھوڑی!“ وہ ہنسی۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں کی شوخی لوٹ آئی تھی۔ اسے ہنستا اور مطمئن دیکھ کر مجھے بھی تسلی ہوئی تھی۔

جانتا تھا میں کہ یہ ساری تکلیف اس نے میری خاطر ہی بھگتی تھی اور یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنی فیس کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ بس، ایک اچھے دوست کی حیثیت سے وہ میری مدد کے لیے میری ذاتی جنگ میں وہ شامل تھی۔ یہی نہیں وہ آئندہ بھی اسی طرح پوری پامردی کے ساتھ عزم مصمم بھی کیے ہوئے تھی حالانکہ میں اسے پہلے اشاروں کنایوں میں اور بعد میں اس کی جان کو پوری خطرے میں محسوس کر کے اسے واضح لفظوں میں بھی کہہ چکا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مجھے اپنی مولیت سے ہٹا دے۔ مجھ سے اپنا راستہ جدا کر لے۔ مجھے اپنی یہ جنگ خود ہی لڑنے دے مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج میں وہی بات دوبارہ اس سے کرنے والا تھا۔

”زیرہ! مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے تمہیں یوں بھلا چنگاؤ دیکھ کر۔“

”اور مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر!“ وہ اسی شوخی سے بولی تو

آئے۔“

”بھائی جان! اس بے حس انسان کو تو ابھی تک اس بات کا ہی احساس نہ ہو سکا کہ اس نے اپنے بڑے بھائی کے منہ پر چھیر مار کر کتنا بڑا گناہ کیا ہے، اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ہوتی تو وہ میرے بہ خیریت لوٹ آنے سے پہلے ہی گھر آ کر آپ کے قدموں پر گر معافی مانگ چکا ہوتا تو اب کیا آئے گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں بھائی جان! میں ایکی گھر پر رہ لوں گی۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔“

”میرا خیال ہے میں حاجی صاحب سے کہہ جاؤں کہ وہ گھر کا خیال رکھیں۔“ میں نے پرسوج سے لہجے میں کہا تو عاصمہ بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں بھائی جان! جس راز کو آپ نے ابھی تک اپنے سینے سے لگا کر ایک طویل غربت انگیز کھڑیاں گزاریں، اسے اب راز ہی میں رہنے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”بیگلی! میں انہیں اصل حقیقت چھوڑی بتاؤں گا، یہی کہوں گا کہ فیہم اپنے کسی کام سے کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔“

یہ سن کر عاصمہ خاموش ہو رہی، میں باہر آ گیا اور کالیا کی بائیک میں سوار ہو کر سب سے پہلے حاجی صاحب کے ہاں پہنچا وہ بیٹھک میں بیٹھے تھے، وہاں ایک دو اور افراد بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں بیٹھک سے باہر بلا کر وہی کہہ دیا تو وہ بڑے پر شفقت لہجے میں بولے۔ ”ارے میاں! فکر کیوں کرتے ہو۔ بے فکر ہو کر جاؤ، یہ پورا عہد میرا خاندان ہے، ان کی بہو بیٹیوں کی عزت ہماری عزت ہے۔ کسی کی کیا جرأت ہے کہ ان کی طرف کوئی نظر بھی اٹھا کر دیکھے۔ ویسے میں اسلام مو کا کو بھجتا رہوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

ان کی بات سن کر میں اندر ہی اندر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا کہ اب میں حاجی صاحب کو کیا بتاتا کہ چند ہی روز پہلے ہم پر کیا قیامت گزری تھی۔

بہر کیف..... میں حاجی صاحب کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا اور اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایڈووکیٹ زیرہ کو اسپتال سے سچارج کر دیا گیا تھا۔

میں وہاں سے سیدھا اس کی رہائش گاہ پر پہنچا تو خالدہ نجو سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ زیرہ کی حالت اب کافی بہتر تھی اور وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بیڈ پر لحاف اوڑھے ایک بڑے سے نیچے پر نیم دراز بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک ٹرے تھی، وہ سوپ پی رہی تھی۔

”ہاں! زہیرہ! ایسا ہو چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دشمن اب اس غلیظ حرکت کے بعد کوئی اور حرکت بھی کریں گے۔ اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم.....“

”نعمان!“ معافی زہیرہ نے میری بات کاٹی اور میں رک کر مستفسر انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا وہ بولی۔ ”تم اللہ پر یقین رکھتے ہو؟“

”نعمو ذی اللہ..... یہ کیا سوال کیا تم نے؟ بھلا اللہ پر مجھے کیوں نہ یقین ہوگا، جس پاک ذات کے ہاتھوں میری جان ہے اور جس کی مرضی کے بغیر میں دوسری سانس بھی لینے کا مجاز نہیں۔“

”تو پھر اپنی اس حق و انصاف کی جنگ سے کیوں ڈرتے ہو؟ تم نے حق کے لیے باطل کے خلاف علم بلند کیا ہے تو اللہ کی مدد کو کیوں فراموش کر رہے ہو۔ تمہارا یہ ایمان ہوتا چاہیے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ اللہ کا ساتھ حق و راستی پر چلنے والوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔ بے شک اس میں کڑی آزمائشیں بھی آتی ہیں اور.....“

”مجھے انہی آزمائشوں سے ڈر لگتا ہے، زہیرہ!“ میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں شاید اس معاملے میں بزدل اور کمزور انسان ہوں۔“

”وہ ہر کوئی ہوتا ہے۔“ وہ بھی ترمیم بولی۔ ”ثابت قدمی کے لیے ایک ایسے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر لمحہ رب کریم سے اپنی ہی کوششوں کے ساتھ دعا گو بھی رہے اور ہر ساعت اس پاک اور رحیم ذات سے مدد کا طلب گار بھی رہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم بے حوصلہ اور بے عزم ہو لیکن تم ایسی باتیں کر کے خود کو بے حوصلگی کی طرف لے جاؤ گے۔ چلو! مجھے چھوڑو، تمہارے دشمن تو اب تمہارے گھر والوں کے پیچھے بھی پڑ چکے ہیں، جس کا تازہ ثبوت تمہیں حاصدہ کے اغوا کی صورت مل بھی گیا، تو کیا اب تم اپنی بہن سے یہ کہو گے کہ وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے؟“

بڑے عجیب مگر کچھ ایسے انداز میں زہیرہ نے دلیل دی تھی کہ میں لاجواب سا ہو کر رہ گیا تاہم پھر میرے منہ سے نکل گیا۔ ”میرا اس سے ایک رشتہ ہے، جوائنٹ ہے۔“

”اور دوستی کا رشتہ تمہاری نظروں میں اوٹ نہیں ہوتا؟“ وہ یک دم شام کی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور..... تمہارے نزدیک جسے جب جی چاہا تو ذکر پیچیدہ دیا جائے؟“ میں گڑ بڑا سا گیا۔

میں نے نمودار سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”زہیرہ! اگر تمہیں خدا نا خواستہ کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔“

”ارے..... وہ کیوں؟“ اس کی کشادہ اور دلکش آنکھیں شرارتی انداز میں پھیلیں، بڑا پیارا انداز تھا اس کا۔ ”جواکیم سنجیدہ مزاج وکیل کا لگتا ہی نہ تھا مگر وہ ایسی ہی تھی۔ ہر صورت حال میں خود کو ایڈجسٹ کر لیتی تھی۔ کمراندازت میں ہوتی تو اس سے بڑا جفا دار وکیل کوئی اور دکھائی نہیں دیتا تھا اور میرے ساتھ ہوتی تو ایک شوخ اور کھلنڈری ساتھی کے سوا کچھ نہیں لگتی تھی۔“

”مذاق میں مت نا تو میری بات.....“ میں نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا۔ ”میں تمہیں اپنی دکانٹ سے سبکدوش کر رہا ہوں۔“ میں نے جیسے اسے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ بولی۔

”ارے بابا! یہ ظلم مت کرنا مجھے غریب کے ساتھ..... ایک ہی تو کیس ہے میرے پاس، جس سے میری دال روٹی چل ہی رہی ہے، کیا اس سے بھی مجھے محروم کر دو گے، بجو کی مر جاؤں گی میں۔“

میرا اندازے سلام کرنے کو چاہا۔ میری وجہ سے ہی وہ موت کے منہ میں چانے سے بال بال اپنی سچی اور اب اس کی جی داری دیکھنے والی تھی۔

”میں نے کہا ناں زہیرہ! مذاق مت کرو میرے ساتھ، پلیز! میرے دشمنوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔“ میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش چاہی اور آگے بولا۔

”میرے دشمن میرا تو کچھ نہیں بگاڑ پارہے ہیں مگر وہ اب بزدلانہ حرکتوں پر اتر آئے ہیں۔“

وہ اب مجھے جھکانے اور مجھے اپنے زیر دست کرنے کے مذموم ارادوں سے میرے چند قریبی ساتھیوں اور مددگار دہی خواہوں کی جانوں کے دشمن بننے لگے ہیں۔ تم پر قحطانہ حملہ کرنے کے بعد تو وہ اب میرے گھر تک بھی پہنچ گئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے راز داری کی تلقین کرتے ہوئے حاصدہ کے اغوا اور پھر اس کی برآمدگی کے بارے میں بھی بتا دیا۔ جسے سن کر زہیرہ کی ساری شوخی ہوا ہوئی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”کک..... کیا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی تو میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے کہا۔

میری روزی کے پیچھے مت پرو اور ہاں کل مرحلہ وار میری فیس کا ایک حصہ تم پر واجب الادا ہے۔ پلیز، وہ دے دینا۔“  
میں جانتا تھا کہ اسے میرے کیس سے متعلق اپنی فیس سے کوئی وجہ بھی نہیں رہی تھی۔ تاہم میں بھی دیر سویرا اس کی فیس ادا کر دیا کرتا تھا، جسے وہ بڑی درد کدا کے بعد ہی لیا کرتی تھی۔

”تم ابھی تک میرے ساتھ مذاق کر رہی ہو۔“ میں نے بدستور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

”ارے..... مذاق کیسا بھی؟ روزی کے سلسلے میں بھی کوئی مذاق کرتا ہے بھلا؟“

وہ بڑی صفائی سے ہر اس معاملے سے پہلو تہی کیے جا رہی تھی جس کی حساسیت سے میں اسے پوری شدہ کے ساتھ آگاہ کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

”اچھا سنو تو..... کبھی ملاؤ ناں اسے، دیکھوں تو آخر تمہاری پسند کیسی ہے۔“

وہ اسی طرح مسکراہٹ کے پردے میں درد کو چھپاتے ہوئے بولی۔

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ گویا اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ملا دوں گا تمہیں بھی، پہلے تم پوری طرح ٹھیک تو ہو جاؤ۔“

اس نے بھی موضوع سے گویا پہلو تہی کرتے ہوئے کہا۔ ”فرحانہ کے سلسلے میں کیا رہا؟ کوئی نئی بات یا نیا انکشاف سامنے آیا؟“

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے ساری بات بتادی۔ وہ متحیر ہو گئی۔ فرط جوش سے بولی۔ ”پھر تو تجھ کو یہ پرانا کیس حل ہوا چاہتا ہے۔“

”ہاں! ابتداء میں مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔“ میں نے پھیلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”جس شخص کی ٹائی پن ملی ہے وہ اپنے والدین سمیت ملک سے باہر گیا ہوا ہے، یعنی جرنی!“

”مگر رانا بشیر تو انہیں جانتا ہی ہوگا؟ اگر رفعت خانم مرڈر کیس ری اوپن ہوتا ہے تو تفتیش کے لیے ان تینوں کو انٹر پول کے ذریعے جرنی سے یہاں پاکستان بلایا جاسکتا ہے۔“

”مم..... میرا مطلب یہ نہیں تھا زہیرہ!“ میں نے صفائی پیش کرنی چاہی۔ ”دوست تو میرے اور بھی ایسے ہیں جن کا میرے ساتھ رشتہ انوث ہے جیسا کہ چاچا انور شاہ اور شیراز کا لیا اور..... اور.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر زہیرہ نے میرا جملہ اپک لیا۔ ”اور..... اور..... کون؟“

”فوزیہ.....“

”فوزیہ؟..... کون ہے یہ خاتون؟“ اس نے اپنی نگاہیں سیکڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے لیے یہی بہتر موقع تھا کہ میں اسے بتا دوں فوزیہ کے بارے میں آج کیونکہ میں زہیرہ کی اس دوست کو کسی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ میری اور زہیرہ کی دوستی مغربی معاشرے کی دوستی نہیں تھی جہاں ”سب چلتا ہے“ جبکہ مشرقی معاشرے میں یہ سب نہیں چلتا۔ ہمارے

سامع میں اس طرح کی دوستی ان خود مختار تراث لیتی ہے اور مجھے بھی اب تک یہی اندازہ ہوتا رہا تھا کہ کہیں زہیرہ میری اس دوستی کے سلسلے میں ان خود اس جذبہ دوست کو کوئی ایسا سنجیدہ معنی نہ پہناتا اے تو آج میں یہ سچ بھی ختم کر ہی ڈالوں کہ شاید اگر

اس کے دل میں بھی ایسی کوئی بات ہو بھی تو یہ سن کر خود ہی میرے راستے سے ہٹ جائے۔ لہذا بولا۔

”میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں نے زہیرہ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو مجھے ایک ایسی ہی اس کے

چہرے کی گلابی رنگت میں پھیکے پن کا شائبہ سا اثر محسوس ہوا، اس کی کشادہ آنکھوں کے کشکول میں مجھے خالی پن کے کرب کی ایسی جھلک سی نظر آئی، جس میں کسی کھوٹے سکے کی

”چھٹک“ سی کوئی ہو۔

ویران کھنڈروں کی بازگشت دیتی اس کے چہرے کی اس کیفیت کو میں نے بس، پل کے پل ہی محسوس کیا تھا اور پھر جیسے سب کچھ نارمل ہو گیا۔ وہ یک دم ٹھکلا کر بس دی۔ میں

بھونچکا سا ہو کے اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس کی کھٹکتی ہنسی میں ایک خاموش دکھ کی معصوم سی ادا جھلکتی محسوس ہوئی۔

”تو جناب! کسی خاتون سے عشق بھی فرما چکے ہیں۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔ میں نے اس بار پُر غوری نظر اس کے

چہرے پر ڈالی، شوخی کی تہہ میں مجھے بحرِ عم کا ایک طوفان تلاشنے میں ملحق دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔

”اچھا ہی ہے یہ.....! سے بھی سب پتا چل جانا چاہیے کہ شاید اسی طرح ہی یہ مجھ سے خود ہی دور ہو جائے۔“

”بہت خوش ہوئی مجھے نوئی! یہ جان کر..... خیر تم اب

قدر چھن گیا ہوں کہ وہ سارے سوچے گئے ہار یک نقطے میں فراموش کر چکا ہوں، اب ڈائریاں دوبارہ پڑھوں گا تو یاد آجائیں گے اور انہیں اس بار اپنی ایک الگ ڈائری میں رقم بھی کرتا جاؤں گا۔“

”تمہیں پہلی فرصت میں فرمانہ سے وہ دونوں ڈائریاں لے لینی چاہیے ہیں۔“ زئیرہ بولی۔ ”بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوبارہ پڑھنے سے کئی نئے نقطے ذہن میں آجاتے ہیں۔“ ”میری تو کوشش یہ بھی ہے کہ دوسری ڈائری جو ہاتھ لگی ہے فرمانہ کے وہ بھی سب سے زیادہ اہم ہے، میں اس ڈائری کے جو الفاظ مٹے ہوئے ہیں انہیں قابل مطالعہ بنانے کی کوشش کروں گا۔“

”ایگزیکٹو! میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی کہ رفعت خانم مرڈر کیس کھلنے لگا ہے۔ تمہیں اس پر اب جلد فیصلہ لینا چاہیے۔“ ”میں اب ایسا ہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ چائے کا شکر یہ، میں اب چلوں گا۔“

میں وہاں سے چلا آیا اور جب لاری اڑے پہنچا تو وہاں کالیا کو پہلے ہی سے اپنے انتظار میں موجود پایا۔ میں نے اسے زئیرہ کی خبر بت وغیرہ سے آگاہ کیا اور صرف یہی بتایا کہ وہ اسپتال سے ڈسچارج کر دی گئی ہے۔

”سیٹھ ستار کی کوئی خبر؟“ میں نے پوچھا۔ ”ابھی تک تو کوئی خبر نہیں، تاہم میں نے اس کی ریکی اور معمولات کو نظر میں رکھنے کے لیے اپنے دوڑ کے پیچھے لگا دیے ہیں۔ آگے تم بتاؤ، کیا نئی پلاننگ ہے؟“

میں نے اس کی بات پر دھیان دینے کے انداز میں کہا۔

”کالیا میرے اس وقت دو بڑے دشمن گروپ میدان میں اتر آئے ہیں۔ ایک لینڈ مافیا گروپ ہے جو پہلے ہی سے میدان میں میرے خلاف اتر ہوا ہے۔ ان میں سیٹھ ستار اور حامی میران خان ہے۔ دوسرا گروپ جس نے اب تک خود کو سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ اگرچہ وہ اب بھی ظاہر تو نہیں ہوا ہے مگر قاتلانہ طور پر اس نے اپنا تعارف ابھی کچھ ہی روز پہلے کروا دیا تھا۔ جس کا مطلب ہے میرا رانا بشیر اور اس کی بیٹی فرمانہ سے ملنا جلنا اور رفعت خانم مرڈر کیس سے متعلق میری کاوشوں نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ یہ دوسرا دشمن چھپا ہوا

”بتایا تا میں نے ابھی تمہیں کہ یہ رانا بشیر کا بزنس پارٹنر ہے، تمیز الدین اور اس کی بیوی اور ان کا اکلوتا جوان بیٹا خرم! میں نے کہا۔“

”ہاں ٹھیک ہے لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ رفعت خانم کے قتل میں اس نوجوان خرم کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“ ”بہی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا، تاہم ضروری نہیں ہے کہ یہ ٹائی پن خرم ہی لگا تا ہو، یا پھر یہ ٹائی پن اس کے باپ یعنی رانا بشیر کے بزنس پارٹنر تمیز الدین کے بھی استعمال میں رہی ہو؟“

”بہی تو ہو سکتا ہے کہ یہ پوری فیملی ہی اس مرڈر میں شریک ہو لیکن! زئیرہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

”لیکن کیا.....؟“ ”پہلے ایک بات بتاؤ، اس سارے گھن پکر میں کیا تمہیں رانا بشیر پر بھی کوئی شبہ ہوتا ہے؟“ ”بالکل ہوتا رہا ہے اور میں اس کا شاید تمہارے سامنے اظہار بھی کر چکا ہوں۔“ میں نے بلا دیر اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”تب پھر میں تم سے یہ کہنے والی تھی کہ تمہیں رانا بشیر پر بھی نظر رکھنا ہوگی۔“

”اس پر تو اس کی بیٹی فرمانہ ہی نظر رکھ سکتی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگر تمہیں رانا بشیر کے بیرونی معمولات سمیت اس کے دفتری روز و شب پر اور کن سے ملنا جتنا ہے کیا کرتا ہے، یہ سب نگاہ میں رکھنا ہوں گے۔“

”اب میں یہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے اگر تم اس سلسلے میں فرمانہ کو اپنی بگ اڑا رہی شینڈلنگ میں لے لو تو میرا خیال ہے کہ یہ کام اور بھی آسان اور مل طلب ہو جائے گا۔“ زئیرہ نے مشورہ دیا۔

اٹھائے گفتگو خالہ گوجا کے برتن لے آئی اور بیڈ اور میری چیئر کے درمیان میں دھری تپائی پر رکھ دی اور چلی گئی۔ ”میں اس کوشش میں ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں فرمانہ کے ذہن کو بھی اس طرف سوچنے کا قائل کرنے والا ہوں۔ تاہم تمیز الدین کے سلسلے میں بھی میں نے کچھ اقدامات اٹھانے ہیں اور دونوں ملنے والی ڈائریوں کے مندرجات کو ایک بار پھر بڑے غور سے پڑھنا بھی ہے مگر کیا کروں، میں خود اپنے کچھ تازہ ترین نامساعد حالات میں اس



نے مشورہ دیا۔

”نہیں چاچا! یہ رات کی تاریکی میں ہوا تھا اور اسی تاریکی میں یہ معاملہ ہم نے منٹا دیا۔ دشمنوں کے ساتھ اب انہی کے ہتھیاروں اور طریق سے ہی منٹا ہوگا۔“ میں نے گہری ستانت سے کہا تو وہ بولے۔

”تو اس طرح پھر سیٹھ ستار کے گرد قانونی گھیرا کیسے تنگ کیا جائے گا؟“

”اس کے لیے میرے پاس ابھی ایک تروپ کا پتا موجود ہے، میں ابھی کچھ ہی دیر میں وہیں جانے والا ہوں، آپ مجھے ذرا احسان جمائی گڈز کے بارے میں بتائیں۔“

”یہ سپر ہائی وے پر ہے، بڑی منڈی کے پاس۔“ انہوں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں! خیریت ہی ہے، بس ذرا وہاں جانا ہے میں نے۔ آپ کی احسان صاحب سے کوئی دعا سلام ہے؟“ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میری تو نہیں ہے، البتہ عطا صاحب کی ضرورت ان سے بات چیت ہے۔ کیوں خیریت؟“ انہوں نے آخر میں پوچھا اور میں نے انہیں انپکڑ کا مران سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔

اس کے بعد میں نے اسی وقت عطا صاحب کے سیل پر ان سے رابطہ کیا اور انہیں صرف یہی بتایا کہ کاروباری سلسلے میں مجھے احسان جمالی سے ملنا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں ان سے کل مل لوں وہ انہیں فون کر کے میرے بارے میں بتا دیں گے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کالیا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہم دونوں بانیگ پر سپر ہائی وے میں واقع جمالی گڈز پہنچے تو وہاں ایک خاصے ٹیم ٹیم آدمی سے ملاقات ہوئی، جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہی احسان جمالی تھا۔ یہ ایک ساٹھا پانچا شخص تھا۔ عطا صاحب انہیں میرے بارے میں فون کر چکے تھے۔ اس نے بے داغ شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ سر پہ ٹوپی تھی۔ میں اس سے سندھی میں ہی مخاطب ہوا اور اس سے کہا کہ ملوک کی شخصیات میں نے ہی کروائی تھی تو وہ بہت خوش ہوا اور مجھ سے ممنون بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی سائیں! یہ آپ کی خدا ترسی ہے آپ نے ایک غریب اور سادہ لوح انسان پر ترس کھایا، حالانکہ آپ اسے جانتے بھی نہیں تھے مگر آپ کی مردم شناسی کی یہ عمدہ مثال ہے

ہے۔ میں اسے ظاہر کرنا چاہتا ہوں آخر یہ ہے کون؟“

”اے لے..... جگری! تو تو ذیل اوسیون کی طرح کا جاسوس بننا چاہا ہے۔“ کالیا میری بات سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”ذیل اوسیون نہیں، ذیل زیر اوسیون.....“ جواب میں تھک کرتے ہوئے، میں بھی مسکرا دیا تو وہ بولا۔

”میں جیمز بانڈ کی بات نہیں کر رہا، میجر پرمود کی بات کر رہا ہوں، جیمز بانڈ تو سالا خون خرابے پھیلا کر کوئی ماورائی قوت بنی بن جاتا ہے مگر یہ اپنا میجر پرمود بالکل تمہاری طرح چالاکی اور مکاری سے اپنے چھپے ہوئے دشمنوں کے گرد پہلے جال بناتا ہے اور پھر جھپٹ پڑتا ہے۔“

”لگتا ہے تم آج کل ایچ اقبال اور ایس قریشی کی سکرینٹ سرزن زیادہ پڑھنے لگے ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کام تو عملی طور پر تم نے ہی سارا کیا ہے۔“

”لیکن اس کی پلاننگ اور داغ تم نے ہی لڑایا تھا۔ خیر! اب آگے کے کیا ارادے ہیں؟“ اس نے آخر میں پوچھا تو میں نے پروسچ لہجے میں اس سے کہا۔

”میں روزی اور فرحانہ کے ساتھ اپنے راہ و رسم کو بڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں کردار میرے دونوں قسم کے دشمنوں کی شہ رگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ روزی سیٹھ ستار کی بہت سے رازوں سے واقف ہوگی جبکہ فرحانہ کو میں نے ایڈووکیٹ زہیرہ کے مشورے کے مطابق قائل کرنا ہے کہ وہ اپنے باپ رانا بشیر پر بھی نگاہ رکھے۔“

”روزی والی بات تو ٹھیک ہے پر یہ فرحانہ والا معاملہ ایسا نہیں بھلا کہ کس طرح اپنے باپ کے خلاف کوئی کام کر سکتی ہے؟“

”میں بے وقوف ہوں جو اس سے ایسا کہوں گا۔“ میں گہرے انداز میں مسکرا کر بولا۔

”تو پھر کیسے کوئے؟“ وہ حیرانی سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ میرا کام ہے، تم صرف حرکت کرنے کے لیے تیار رہنا، جال میں بنوں گا۔“

”اے لے جگری! اسی لیے تو تجھے میجر پرمود کہتا ہوں۔“ وہ ہنسا۔

اسی دوران چاچا انور شاہ آگئے، میں انہیں عاصمہ سے متعلق بتا چکا تھا وہ فکر مند بھی تھے اور خوش بھی۔

”تمہیں فوراً پولیس کو افہام کرنا چاہیے تھا بیٹا!“ انہوں

”جانتا تو نہیں تھا..... مگر.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور  
الٹا اس نے مجھ پر سوال داغ دیا۔ ”کیا آپ پولیس والے  
ہیں؟“

”نہیں مگر انہی کی طرف سے آئے ہیں۔“ میں نے  
کہا۔ ”اب تم میرے اس سوال کا جواب دو گے جو میں نے  
پوچھا ہے تم؟ تم یا سر کو جانتے تک نہیں تھے اور تم نے اسے  
بغیر کسی کی ضمانت پر نوکری پر رکھ لیا تھا۔“

میرے لہجے میں درستی عود آئی تھی۔ جس نے اس کی  
کرت مزاجی کو ہوا بھی دی تھی، تاہم وہ بھی اس بار پھر وہ  
لہجے میں بولا۔ ”سائیں! یہ کوئی سرکاری ادارہ تو ہے نہیں کہ  
یہاں ان باتوں کا خیال رکھا جائے۔ نہ ہی کوئی برا عہدہ ہوتا  
ہے یہاں۔ وہ ایک غریب اور ضرورت مند آدمی بن کر آیا تھا  
اور مجھے بھی ایک چائے وغیرہ لانے کے لیے ایک نوکر کی  
ضرورت تھی سو میں نے رکھ لیا اسے۔“

”تمہیں پتا ہے اس غریب آدمی نے کتنا بڑا جرم کیا تھا  
بعد میں؟“ میں نے اس کی طرف آنکھیں سکیڑ کر گھورنے کے  
انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”معلوم ہے جی! اس میں سارا قصور ملوک کا تھا۔  
اسے اپنی مصیبت پڑی ہوئی تھی، اس نے اس سے بچنے کے  
لیے اپنا ٹرک اس کے حوالے کیوں کیا تھا پھر؟“ مٹی نواز نے  
جواب دیا۔ میں نے کہا۔

”ملوک نے بھی اس آدمی پر اسی لیے ہی اعتبار کیا تھا کہ  
اسے تم نے نوکری میں رکھا تھا۔ انسان جہاں کام کرتا ہے تو  
وہاں سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔“ میرے اس  
سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ ابھی وہ اس کا کوئی  
جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ملازم ہاتھوں میں چائے کی ایک  
ٹری اٹھائے اندر داخل ہوا۔ میں نے... سرسری نظر اس پر  
ڈالی تھی۔ ہماری طرح یہاں بھی چائے کا ادھر ہی بندوبست کیا  
جاتا تھا، یعنی ہوکل وغیرہ سے نہیں منگوانی پڑتی تھی۔ اس نے  
میز پر ٹرے رکھی اور ہمارے لیے چائے ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی  
میں نے دیکھا کہ مٹی نواز کو بھی کتے جارہا تھا اور ہماری طرف  
بھی۔

”مگر ملوک کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ خود ایک ڈرائیور ہے  
اور اگر اسے اپنا ٹرک کسی مجبور کی بناء پر کسی کے حوالے کرنا  
ہی تھا تو وہ اپنے جیسے کسی ڈرائیور کے ہی حوالے کرتا۔ تاکہ  
ایک چائے والے کے۔“

مٹی نواز نے ایک جواب سوچ کر دیا تو میں نے اس

کہ آپ نے کھرے کھوٹے کی پہچان خوب کی تھی۔“  
”جمالی صاحب! ایسا اوقات اصل مجرم اسی لیے قانون  
کے شکنجے سے بچ جایا کرتے ہیں کہ ان کی جگہ بے گناہ اندر ہو  
جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میری چشم  
نصویر میں اپنے بے گناہ باپ کا چہرہ گردش کرنے لگا۔  
”ایک دم سولہ آنے درست بات کی ہے باپا تم نے۔“  
احسان جمالی بولا۔ ”میں اب آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“  
”یا سر کو آپ جانتے ہیں؟“

”کس نے اسے نوکری پہ یہاں رکھا تھا؟“  
”یہ پھوٹے مونے آدمیوں کو رکھنا ہمارے مٹی نواز کا  
کام ہی ہوتا ہے۔“

”میں مٹی نواز سے ہی ملوادیں۔“ میں نے کہا۔  
احسان جمالی نے اسی وقت ایک آدمی کے ذریعے  
اسے اپنے کمرے میں طلب کروالیا۔ میں نے غور سے اس کی  
طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیں پینتالیس سالہ دلا پتلا شخص تھا،  
اس کی عمر کا اندازہ بھی ہو سکا تھا مجھے۔ اس نے شلوار قمیض پر  
عام سی واسٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع سے مٹی ہی دکھائی  
پڑتا تھا۔ تاہم صورت سے خاصا خراٹ اور اکھڑ مزاج نظر آتا  
تھا۔

”نواز! یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، یہاں بیٹھ جاؤ  
اور ان کے ساتھ پورا تعاون کرنا۔“ احسان جمالی نے اس سے  
کہا پھر محضرت خواہانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر  
بولا۔ ”آپ لوگ چائے پی کر جانا، میں ابھی بھجواتا ہوں مجھے ذرا  
ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔“ اس پر میں نے جمالی  
صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر نواز سے مخاطب ہوا، جواب  
میرے اور کالیا کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔  
”تم مٹی نواز ہو؟“

”جی سائیں؟“ اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلایا۔  
اس کی آنکھوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ جمالی صاحب کی وجہ سے  
وہ طوعا کرہا ہی تھی اپنے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ سمونے  
پر مجبور ہو گیا تھا۔

”نواز! یا سر نامی شخص کو تم نے ہی یہاں نوکری پر لگایا  
تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔  
”جج..... جی ہاں!“

”تم کیا اسے پہلے سے جانتے تھے؟“

کردے تو یہ سب راز میں رکھا جائے گا اور اصل مجرم تک پہنچنا ہمارا کام ہوگا۔ کیا کہتے ہو اب؟“

اب میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا، وہ فوراً تعاون پر رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے صاحب! اگر یہ بات ہے تو میں آپ سے مکمل تعاون کروں گا۔ مگر یہاں نہیں۔“ پھر اس نے کہا ہم باہر جا کر ایک جگہ پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کریں۔ وہ ابھی چند منٹوں میں ہم سے آئے گا۔

میں اور کالیا وہاں سے نکل گئے۔ اس شخص سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس کا نام پوچھا تھا جو اس نے رجم بخش بتایا تھا۔

وہ جلد ہی مطلوبہ مقام پر ہم سے ملنے آگیا اور ہم کھڑے کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یاسر کو نوکری میں رکھنے کے لیے یاسر نے نہیں بلکہ کسی اور شخص نے کئی نواز کو رشوت کے طور پر پیسے دیئے تھے۔

رجم بخش اور اس جیسے اور بھی بھالی گڈز میں کام کرنے والے کچھ ملازم اس سے خوش نہیں تھے۔ رجم نے ہی اس کی اپنے موہاٹل فون پر رشوت لیتے ہوئے تصویر بنا ڈالی تھی جو اس نے بیوٹوٹھ کے ذریعے مجھے اسی وقت سینڈ کر دی۔ میں نے اپنے سیٹ پر جب اس شخص کی تصویر کو اٹراج کر کے دیکھا تو مجھے اس شخص کا چہرہ شناسا محسوس ہوا، یہی سبب تھا کہ میں چند ٹائیپوں کے لیے لنگ سا ہو گیا۔

وہ شخص بے داغ چلتون شرٹ میں ملیں تھا۔ اسے پہچاننے کی ایک بڑی وجہ اس کی جسمانی ساخت تھی جو مجھے نہیں بھولی تھی۔ جسم اس کا چھریا تھا مگر سر اس کی مناسبت سے غیر معمولی بڑا اور چوڑا تھا۔ بال بھی کھنکھتے تھے اور مونچھیں چٹ تھیں۔ میں اپنے ذہن پر زور ہی دیتا رہ گیا تو رجم بخش نے جانے کی اجازت لی، میں نے اس کا نمبر لے لیا اور پھر کالیا کے ساتھ ایک طرف جا کھڑا ہوا۔

”اے لے..... جگری! تجھے تو خفیہ پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ کہاں سے کہاں بال کی کھال نکال لی تو نے۔“ کالیا نے کہا تو اسی وقت میرے سوچنے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور پھر میں معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”ابھی کہاں کالیا! بال کی کھال تو ابھی اور نکلے گی۔ یہ بتاؤ کیسی بھرنے کا سامان ہو سکتا ہے؟“

مجھے یہ مذکورہ شخص یاد آ گیا تھا اسے میں نے سیٹھ ستار کی بلڈر کپٹی ”بیوٹوٹھ ہائینس“ کے دفتر میں دیکھا تھا۔ وہاں یہ

آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے لیے چائے لایا تھا۔ ”اگر اسے ٹک چلانا آتا ہو اور تمہیں کوئی مجبوری ہو اور دوسرا ڈرائیور بھی دستیاب نہ ہو، مال پہنچانا بھی ضروری ٹھہرے تو کیا تم ٹک اس کے حوالے نہیں کر دے گے، فنی نواز؟“

”ہرگز نہیں۔“ فنی نواز نے فوراً فنی میں اپنا سر ہلایا۔ میں نے یوں ہی کن آنکھیں سے چائے والے کی طرف دیکھا جو فنی نواز کو کپڑے نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پہ بھی کچھ ایسی ہی مسکراہٹ تھی۔

ہم چائے پئے لگے۔ فنی نواز نے جانے کی اجازت طلب کی اور کرسی سے کھڑا بھی ہو گیا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چائے والا نواز کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا پھر جب وہ کمرے سے نکل گیا تو وہ مجھ سے بولا۔ ”سائیں! یہ بہت لاچکی آدمی ہے، اس نے پیسے لے کر یاسر کو کھاتھا۔“ میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ فوراً اس سے کہا۔

”یہاں بیٹھو۔“ ”نہیں صاحب! میں بیٹھ نہیں سکتا۔“ وہ انکار کرتے ہوئے بولا تو میں نے جلدی سے اسے پوری بات بتائی تو وہ ایک باہر دروازے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”سائیں! ملوک میرا بھتیجی ہے، آپ نے اس کی ضمانت کروا کر بہت نیک کام کیا ہے۔ وہ بہت سادہ لوح انسان ہے۔ مجھے یاسر نامی اس آدمی پر بہت پہلے شہ تھا کہ وہ نوکری کرنے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔“

”اسی بات کا تو ہم کموج لگانا چاہتے ہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔ مجھے یہ آدمی کام کا لگا تھا مگر وہ میرا بھی رہا تھا، صاف لگتا تھا جیسے وہ فنی نواز سے خوف زدہ بھی ہو۔ یوں بھی جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ ملوک اس کی بہن کا شوہر بھی تھا تو میں نے اسے حیران کرنے کے لیے تھوڑا سا ڈرایا۔

”دیکھو ملوک ابھی صرف ضمانت پر ہی رہا ہوا ہے اس پر ایک سیٹ کا کیس ختم نہیں ہوا ہے اگر اصل مجرم یعنی یاسر نہ ملا تو اس کا گناہ ملوک کے ہی سر جائے گا اور پولیس اسے دوبارہ گرفتار کر سکتی ہے، یعنی جب تک یہ کیس سے بری نہیں ہو جاتا پولیس کی تلوار ملوک کے سر پر لگتی رہے گی، ضمانت منسوخ بھی ہو جایا کرتی ہے کیونکہ ایک سیٹ کسی معمولی شخصیت کا نہیں ہوا ہے بلکہ ہائی کورٹ کی ایک ایڈووکیٹ کا ہوا ہے۔ تم اگر تعاون

”یہ لے ..... جگری! یہ ہمارا ڈریسنگ روم ہے، جو چاہے ہمیں بھر لے۔“  
”تو کہاں چلا؟“ میں نے اس سے کہا۔ ”تو نے بھی ہمیں بدلنا ہے۔“

”میں ابھی آتا ہوں، جب تک تو اپنا کام نمٹا، استاد بھابھا کو میں ڈرا سلام کراؤں ذرا.....“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چلا گیا۔

یہاں مختلف الماریوں میں بھانت بھانت کا سامان موجود تھا۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر آدمی کا بہرہ بھر۔ اتنی دیر میں کالیا بھی آگیا، میں .... اسے دیکھ کر تھوڑا چونک سا گیا۔ وہ کچھ فکر مند سا دکھائی دے رہا تھا مگر مجھے ایک ادھیڑ عمر کے ہمیش میں دیکھ کر اپنی تفکیر چھپاتے ہوئے فوراً ہنس کر بولا۔ ”اے لے ..... جگری! تو ایک دم فاسٹ جا رہا ہے کیا ہمیں بھرا ہے۔“

”کیا بات ہے کالیا؟ تو کچھ فکر مند نظر آ رہا ہے؟“ میں نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

”جن ڈاڈا کا آدمی آیا ہوا ہے اپنے استاد بھابھا کے پاس..... خاصا گرم لگ رہا ہے۔“

”اوہ.....“ کچھ بھانپتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔  
”کیا انہیں ہم پر شب ہوا ہے؟“  
”شہ نہیں، یقین کو۔“

”دلیل..... لیکن کیسے؟ ہم نے تو ایسا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نظر سے کہا تو وہ بولا۔

”گیگ وار سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں کے بڑے زیرک دماغ لوگ ہوتے ہیں یہ ایک دوسرے کا سایہ بھی پہچان لیتے ہیں جو ان کے علاقوں کے قریب سے بھی گزرتا ہے۔“

”اچھا یار! تو ان کی تعریفیں کر کے مجھے ڈرانے کی کوشش مت کر یہ بتا تیرے استاد بھابھا نے جن ڈاڈا کے آدمی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟“

میں نے بظاہر بیزار سی سے کالیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ اگرچہ اندر سے میں خود بھی اس نئی صورت حال سے ڈر رہا تھا۔ کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ پورے کراچی میں لیاری گیگ وار کی دہشت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ یہ بہت سفاک اور

کاؤنٹر ٹیل پر بیٹھا تھا اور کسی پارٹی کو کونٹینس کرنے میں مصروف تھا۔

”گتا ہے تیرے مفکروں والے دماغ میں کوئی کلیو آن اٹکا ہے۔“ کالیا ہنس کر بولا۔

”ہمیں بدلنے کے لیے اڑے پر چلنا ہوگا۔“ اس نے کہا اور ہائیک سنچال لی۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور ہم روانہ ہو گئے، راستے میں ہی میں نے سیل فون پر روزی کے نمبر منجھ کیے اور رابطہ ہوتے ہی میں نے اس کی خبر خیریت پوچھی۔

اس نے بتایا کہ اس نے سیٹھ ستار کے کرائے کے گماشتوں کے خوف سے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا ہے، اب وہ کہاں ہے، اس کے بارے میں اس نے کہا کہ جب میں اس سے ملنے آؤں گا تو تب ہی وہ بتائے گی۔

میں نے کہا۔ ”درحقیقت میں تمہاری حفاظت کا کوئی خفیہ بندوبست کرنے کا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ رات والے واقعے کے بعد تم اب اس بلڈر مافیا کی ہٹ لسٹ میں شامل ہو چکی ہو۔“

وہ بولی۔ ”مجھے اس کا احساس ہے۔ اسی لیے تو میں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ بھانڈا تو میرا بھی پھوٹ ہی چکا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں اس کیسے سیٹھ کے بہت سے اہم رازوں سے واقف ہوں مگر میرے ہاتھ ابھی کمزور ہیں، ڈرنی ہوں کہ وقت سے پہلے ہی نہ نکالت دینے جائیں۔“

”مس روزی! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں، ہمیں سیٹھ ستار کے ان اہم رازوں سے آگاہ کریں، باقی کا کام ہم سنچال لیں گے۔“

”وہ تو ظاہر ہے کہ اب اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”تم لوگوں کی صورت میں مجھے بھی اس خونی شخص سے اپنی بہن کا انتقام لینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اس موقع کو بھلا کیوں کر ضائع جانے دوں گی مگر احتیاط کے ساتھ۔“

”اوکے!“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں رات کو تم سے مل لوں۔“

”آنے سے پہلے مجھے فون کرو دیجئے گا نعمان صاحب!“ وہ آخر میں بولی اور میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ہم استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے۔ وہاں کے لوگ اب مجھے بھی پہچاننے لگے تھے۔ کالیا مجھے اوپری منزل کے ایک کٹھڑی نما کمرے میں لے آیا اور بولا۔

جینکو نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی پھر بتانے لگا۔ ”کل رات والی کارروائی پر جتن ڈاڈا کو ہم پر شبہ ہو چکا ہے۔ آج صبح وہ خود اپنے چند آدمیوں کے ساتھ ہمارے اڈے پر آیا تھا۔ صاف اور سیدھے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے علاقے سے جو دو تین افراد باہر سے آئے تھے (یعنی میں، کالیا اور روزی) انہیں ان کے سپرد کر دیا جائے۔ اس سے کم ہر برگز کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”تم نے انہیں کیا جواب دیا؟“ میں نے فوراً اس کے چہرے پر نظر فرمایا جاتے ہوئے پوچھا۔  
”میں تو خود پریشان ہو گیا تھا کہ انہیں آخر کیسے شبہ ہو گیا تھا ہم پر۔“ جینکو جواباً بولا۔

”حالانکہ ہم نے ہر طرح سے رازداری برتی تھی مگر ان لوگوں نے تو یہاں تک یقین سے کہہ دیا تھا کہ دوسرے دو مرد اور ایک جوان عورت باہر سے علاقے میں داخل ہوئے تھے جبکہ کارروائی کرتے وقت جوان عورت (روزی) کو میرے اڈے پر ہی رکھا گیا اور باقی لوگوں نے ان دونوں نواردوں کے ساتھ مل کر اس کے آدی بوجو کے مکان پر خفیہ دھوا بول کر وہاں پر غل بنی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔“

”تمہیں کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ آخر انہیں کیسے شبہ ہوا ہم پر؟“ کالیا نے اس سے پوچھا۔ استاد بھابھا خاموشی کے ساتھ اپنی مٹھی میں دلی خاص قسم کی بیڑی کے گہرے گہرے سوٹے لگاتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

جواب میں جینکو بولا۔ ”کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے گروپ کے ماہر کھوجی کے ذریعے فوری طور پر ”پیرا“ (قدموں کے نشانات وغیرہ) تلاش کر لیا ہوگا۔“

”ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے اس شے کی۔“ میرے ذہن میں فوری الجھنے والے ایک خدشے نے مجھے بولنے پر اکسایا۔ ”جب میں اور کالیا اور روزی نامی وہ لڑکی لیاری میں داخل ہوئے تھے تو دو مسلح افراد نے ہمارا راستہ روکا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں نے بھی جتن ڈاڈا والوں نے انفارمیشن لی ہو۔“

”یہ بھی ممکن ہے۔“ جینکو نے اثبات میں سر ہلایا تو استاد بھابھانے اپنی مٹھی میں دلی بیڑی کی راکھ کو چٹکی بجا کر چھڑکا اور گھیسر لہجے میں جینکو سے بولا۔ ”یہ بتاؤ تم نے پھر اس مسئلے کا حل کیا نکالا ہے کہ ان کے ایک آدمی کو یہاں میرے اڈے پر آگئے۔ یعنی تم نے خود ہی ان کے شے کی تصدیق کر دی۔“

”میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا لیکن

خالم لوگ تھے۔ ایک بار اپنے کسی دشمن کو نشانے میں لے لیتے تو مرتے دم تک نہیں چھوڑتے تھے۔“

میری بات پر کالیا بولا۔ ”ابھی تو دونوں کے درمیان اس موضوع پر بات چیت ہو رہی ہے مگر جتن ڈاڈا کا آدمی بہت گرم ہے۔ وہ تو اسی وقت پیشی کی ضد کے بیٹھا ہے۔ اس کے ہمراہ جینکو بھی ہے۔ وہ اپنی صفائی چش کر رہا ہے۔“

”تو نے اپنے استاد بھابھا کو اس کارروائی کے بارے میں بتا دیا تھا؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں جگری وہ تو میں نے کل ہی بتا دیا تھا۔“ کالیا جواباً بولا۔ ”اسی لیے تو وہ دفاعی گفتگو کر رہا ہے۔“

”کیا ہمارا نام سچ میں آیا ہے؟“  
”نہیں۔“

”آخر کس برتے پر انہیں یعنی جتن ڈاڈا کو ہم پر شبہ ہوا ہے؟“

”ان کا آدمی بھی تو مارا گیا تھا ہماری اس کارروائی میں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ انہیں کس وجہ سے ہم پر شبہ ہوا۔ ان کے جانے کے بعد ہی استاد بتائے گا ہمیں۔“ پھر تھوڑے وقت کے بعد وہ بولا۔ ”جگری! ہمیں ابھی شاید نیچے استاد کے پاس جانا پڑ جائے، اس لیے ابھی تم اپنی اصل صورت میں ہی آ جاؤ۔“

میں نے اس کی بات پر صاف کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔  
بھیس کیا تھا۔ فقط ایک چھدری سی سفید داڑھی تھی اور اسی طرح کی مٹھی بھونٹیں، جو میں نے اتار لیں۔ چہرے پر کچھ مصنوعی ”وارش“ لگائے تھے، وہ بھی اتار لیے، رنگ چہرے کا تھوڑا سا نولا کر رکھا تھا وہ بھی دھو کر صاف کر لیا۔

کالیا کا خیال درست ثابت ہوا۔  
تھوڑی دیر گزری تو ایک لڑکے نے اوپر آ کر کالیا اور

میری طرف دیکھ کہا۔ ”تم دونوں کو استاد بلارہا ہے نیچے۔“  
کالیا نے میری طرف دیکھ کر شانے اچکا دیئے۔ اس کے بعد ہم نیچے آ گئے۔

استاد بھابھا کے ساتھ جینکو بھی بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ استاد بھابھانے ہمیں سامنے رکھیرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم خاموشی سے بیٹھ گئے تو استاد بھابھانے خود سے پہلے کوئی بات کرنے کی بجائے جینکو سے مخاطب ہو کر گھیسری آواز میں کہا۔ ”تم بتاؤ پہلے انہیں کیا معاملہ ہوا ہے۔“

ڈی آدمیوں سے کروالیا جائے تو کیا برائی ہے؟“

”تم نے میری بات پر غور نہیں کیا کالیا!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ استاد بھابھا اور جینکو اپنی پرتغور نظریں بدستور میرے چہرے پر جمائے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور آگے بولا۔ ”ان کی ریکی بہت شوش اور مضبوط لگتی ہے۔ ابھی اور بھی بہت سی باتوں کا ان لوگوں کو پتا ہوگا جنہیں ان لوگوں نے ابھی اپنے ذہن تک ہی محدود رکھا ہوگا۔ وہ عین وقت پر ہمارا کوئی جھوٹ پکڑنے پر ہی ظاہر کریں گے۔ جس کا جواب ہم ہی دے سکتے ہیں اور اس کا راستہ بھی اسی وقت باتوں کے دوران ہم ہی تلاش کتے ہیں کہ ہمیں اپنی گلوغلا صلی کے لیے اور کیا بولنا ہے وہاں جبکہ ڈی آدمی اپنا دفاع نہیں کر پائیں گے، کیونکہ بہت سی ایسی باتوں کا انہیں علم نہ ہوگا اور یہ بار کھا جائیں گے۔“

”لیکن جگری!“ کالیا نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا تو اچانک استاد بھابھا بولا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس پر جینکو نے بھی تائید کی تو بالآخر میری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور جینکو مطمئن ہو کر استاد بھابھا کے اڈے سے چلا گیا۔ اس نے اب جن ڈاڈا سے ہمارے ملنے کا وقت لے کر ہمیں بتانا تھا۔

اس کے بعد میں اور کالیا اوپر آگئے۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ تاہم ہم دونوں نے ہمیں بھرا اور بایک پر نکل گئے۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ سٹھ ستار کی بلڈر کینی ”بلیو مون ہائٹس“ کے نام سے موسوم تھی جو بوٹ مین کے ایک بڑے مہنگان آباد کرشل علاقے میں تھی۔ یہاں کئی لکڑی اور سپر لکڑی اپارٹمنٹ اور ڈپلیکس بنے ہوئے تھے اور کاشن کا یہ ایک خاصا مشمول علاقہ کہلاتا تھا۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں کم و بیش ایک گھنٹا تو لگ ہی گیا تھا۔ میں نے تو اوجیز عمرخص کا بھیس بھر رکھا تھا جبکہ کالیا نے اپنی ہی طرح کے ایک نو عمر لڑکے کا بہرپوب بدلا ہوا تھا۔

اس عالیشان دفتر کے وسیع و عریض احاطے کے گیٹ پر ایک بارودی جوکیدار کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ بایک کالیا ہی چلا رہا تھا۔ گاڑڈ نے ہمیں روک لیا۔ میں نے بڑے بوزھوں جیسی کھنکھارتی آواز میں اس سے کہا۔ ”سیاں! ہمیں ایک بڑے پروجیکٹ کے سلسلے میں یہاں کسی سے ملنا ہے۔ تم ہی ہماری رہنمائی کر دو کہ کس سے ملیں؟ ہم؟“ میری بات پر اس کھاگ سے دکھائی دینے والے کن بردار گاڑڈ نے کچھ طنزیہ سی نظر ہماری بایک پر ڈالی اور پھر اسی لہجے میں

اس کی بھی ایک وجہ تھی کہ میں انہیں مطمئن کر سکوں۔“ جینکو نے جواب دیا۔

”مجھے یہ تو اعتراف کرنا ہی پڑا تھا کہ میرے پاس واقعی تین افراد باہر (بیرونی علاقے) سے آئے تھے مگر وہ کوئی کارروائی کرنے نہیں بلکہ ہمارے ہی کہنے پر ایک طوائف کو ساتھ لائے تھے جس کے ساتھ ہم نے رات گزار لی اور صبح سویرے انہیں چلا کر دیا۔“

اس کے اس جھوٹے جواز پر میری طبیعت منفص سی ہونے لگی۔ وہ روزی کو طوائف کہہ رہا تھا اگرچہ مجبوراً سہی، تاہم اس نے اپنے تئیں جواز معقول ہی کڑھنے کی کوشش چاہی تھی۔

وہ آگے بتانے لگا۔ ”جہاں تک جن ڈاڈا کے آدمی کو یہاں لانے کا سوال تھا تو وہ میں نے اپنی بات میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کہا تھا کہ وہ دو آدمی یہاں سے تعلق رکھتے تھے۔ اب انہوں نے کہا ہے کہ ان دونوں آدمیوں کو پیش کرو، ہم ان سے خود ہی پوچھ کچھ کریں گے۔ یہ آخری مطالبہ اس نے کیا اور چلا گیا یہاں سے۔ اب بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟“

ہم تینوں استاد بھابھا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنی ٹٹھی میں دلی بیڑی کی راکھ جھڑکتے ہوئے بولا۔ ”ہم دو جلی آدمی بھیج دیں گے ان کے پاس اور ایک لڑکی کا بھی بندوبست کر دیں گے۔ ہم ان تینوں کو سکھا سبھا دیں گے کہ انہوں نے وہاں کیا کہنا ہے۔“

”ہمیں۔“ میں نے اب تک کی ہونے والی گفتگو کی براحت پر تیزی سے غور کرتے ہوئے ذہن سے کہا تو وہ سب قدرے چونک کر میرا چہرہ دیکھنے لگے۔

”اب اس نازک معاملے میں زیادہ جھوٹ نہیں چل سکتا اور حالات ہم سب کے لیے خراب ہو جائیں گے۔“ ”تو پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں، تم ہی اس مسئلے کا کوئی حل

بتاؤ۔“ استاد بھابھا نے کہا۔

”اب تک کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ جن ڈاڈا والوں کا ریکی گروپ بڑی ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اسے ڈی آدمیوں سے نہیں بلکہ اصل آدمیوں کے ذریعے ہی دھوکا دیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں کالیا اور وہ لڑکی روزی، ہم تینوں اسی بایک پر وہاں جائیں گے اور جینکو ہمارے ساتھ ہوگا۔ ہم خود اس کے بیان کی تصدیق کریں گے۔“

”لیکن جگری! استاد کے کہنے کے مطابق اگر یہی کام



*English*

# دانت محفوظ صحت محفوظ



PAKISTAN'S 1<sup>ST</sup> ANTIBACTERIAL TOOTHPASTE



English.toothpaste



@SnScare

چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں کم از کم دو ہزار گز کا پلاٹ درکار ہے۔“ میری بات پر بھگتے کیشن کے لالچ پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

وہ اسی طرح باجھیں پھیلا کر بولا۔ ”بہت عمدہ، پھر تو آپ بالکل صحیح جگہ پر تشریف لائے ہیں۔“

”جی ہاں! میرے دوست نے ہی آپ کے ہاں آنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ آپ سے ایک لکڑی اپارٹمنٹ کی خریداری کے سلسلے میں کامیاب ڈیل کر چکا ہے، آپ شاید ڈاکٹر شاہد اقبال کو جانتے ہوں۔“ میں نے بھی دانستہ جھوٹ بولتے ہوئے ایک عام فہم نام لیا تو میرے اندازے کے مطابق وہ بھی اپنی تعریف پر اسی طرح ہی اثبات میں اپنا سر ملاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل جناب! ہم تو ایسے بہت سے لوگوں کو کامیاب سودا کروا چکے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہمیں یاد کر رکھا ہے۔“

”تو کیا آپ ابھی کوئی ہمارا مطلوبہ پلاٹ دکھا سکتے ہیں ہمیں؟“ میں نے فوراً پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اس ایریے میں تو مشکل ہے، تھوڑا ذرا باہر کی طرف ہوتا جاتا نہیں، دوسرے آپ کی رینج کتنی ہے؟“

”آٹھ سو نو کھوٹے..... ایک دو کھوکھا بڑھ بھی سکتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھوں کی چمک حریف ہوئی۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ ”کھوکھے“ کا مطلب کروڑ ہی تھا۔ لیکن ہماری فرسٹ چوائس یہی علاقہ ہے۔ کیونکہ ایک بڑے پرائیوٹ اسپتال کے لحاظ سے یہی علاقہ قدرے بہتر لگتا ہے۔ ویسے آپ بھی کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔“

میں نے آخر میں گیند اس کے کورٹ میں پھینک دی۔ وہ مزید خوش ہو گیا۔ اسی لمحے میں بولا۔ ”ارے جناب! یہی تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اس سے زیادہ اچھی لوکیشن میں پلاٹ دلوادوں گا۔ آپ بس مجھے ہوم ورک کے لیے صرف ایک دن عنایت کر دیں۔“

”نو پرابلم!“ میں نے کہا۔ ”ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے لیکن ذرا جلدی ہو جائے تو اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ اس پر ہم نے اسپتال بھی تعمیر کروانا ہے اپنی مرضی سے اس کے لیے بھی کسی کنسٹرکشن کمپنی سے رجوع کرنا پڑے گا اور آرکٹیکچر سے رابطہ بھی نہیں ہو سکا ہے ابھی تک ہمارا۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروفیشنل آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

بولا۔ ”بڑا پروڈیجٹ اور اس سواری میں!“

”میاں! عجیب نامعتول آدمی ہوتم۔“ میں نے خرائٹ بوڑھوں کی طرح اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے صاحب یہاں آکر بات کر چکے ہیں، اس وقت میں بھی ساتھ تھا، ان کے ہم تو بس ان کے ملازم ہیں اور عوامی نوعیت کی باتیں کرنے آتے ہیں، جو آخری مراحل میں ہیں۔ وہ کون صاحب ہیں جو اندر دائیں جانب ایک کاسٹریٹبل پر بیٹھتے ہیں، بڑے سرور بڑے بالوں والے مگر دلے پٹکے سے۔“ میں نے اسی آدمی کا حلیہ بتا دیا جو احسان جمالی گڈز کے ملازم اور ملوک کے سالے رچم پنشن نے بتایا تھا۔

”اچھا..... اچھا! آپ شاید ثاقب صاحب کی بات کر رہے ہیں۔“ گاڑی یک دم بولا۔ ”جانیے..... جانیے، وہ موجود ہیں اپنی سیٹ پر۔“ کہتے ہوئے اس نے ہمیں راستہ دیا۔

میری چال سے نہ صرف مطلوبہ آدمی کا نام معلوم ہو گیا تھا، ہمیں بلکہ اس کی اندر موجودگی کی تسلی بھی ہو گئی تھی۔

اندرا بائیک سے اترتے وقت کالیانے میرے کان میں تو صغی سرگوشی کی تھی۔ ”ابے..... جگری! تو تو ایک دم فاسٹ جا رہا ہے۔“

ہم دونوں شیشے کے بڑے سے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئے اور میری متلاشی نظروں نے دائیں جانب میز پر اسی ثاقب نامی شخص کو بیٹھ دیکھ لیا۔ وہ اکیلا بیٹھا کسی فائل پر جھکا ہوا تھا، پھر یکدم فائل بند کر کے اپنی کرسی سے اٹھنے لگا تو میں نے فوراً اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر ٹھہر گیا اور چہرے پر کاروباری سکراہٹ سونے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”فرمائیے جناب! کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟“

”ایک پروڈیجٹ، کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا تھی۔“

”جی جی! تشریف رکھیے۔“ کہتے ہوئے وہ بھی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی اور کالیانے میرے برابر والی کرسی پر براہمان ہو گیا۔

”جی فرمائیے! کس قسم کے پروڈیجٹ کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟ رہائی یا کنکریشن۔“

”کنکریشن ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ دراصل ہم چند ڈاکٹر زل کر ایک میڈیکل سینٹر قائم کرنا



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



ہوئے پاسر کو نوکری پر رکھواتے دیکھا تھا۔“  
 ”گڈ!“ میں نے کہا۔ ”اب تم اپنے اس بیان پر قائم رہنا۔“  
 ”میں قائم رہوں گا جی! آخر کو یہ میری بہن کے شوہر کی زندگی کا معاملہ ہے۔“ وہ جوش سے بولا تو میں نے مطمئن ہو کر اس کا کاندھا چھو تپا دیا۔

اس کے بعد ہم استاد بھایا کے اڈے پر پہنچے اور اپنا حلیہ درست کر کے اصل حلیے میں آگئے اور پھر وہاں سے سیدھا طبر کے متعلقہ ٹیکشن پہنچے جہاں انچارج انسپٹر کا مرن تھا۔

## قارئین متوجہ ہوں

پرچا  
 نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات پر یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ اینجنوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچا ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاؤ دستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

راہے اور مزید معلومات کے لیے

**ٹمر عباس 0301-2454188**

**جاسوس ڈائجسٹ پبلس کیشنز**

**سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت**

63-C فی 63-کے سیشن پبلس کیشنز، اسلام آباد، پاکستان

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ستمبر 2017ء

”لو بھئی! اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، پھر تو آپ نے ادھر بیٹھے بیٹھائے ہمارے سارے مسائل حل کر ڈالے اور کیا چاہیے ہمیں بھلا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر میری طرف بڑی گرم جوش سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش خطنی سے بولا۔  
 ”اُس مائی پٹیوورٹو! ہمیں فخر ہوگا آپ جیسے معزز افراد کے کام آتے ہوئے۔“

”سونا کس آف یو! میں پھر کل آ جاؤں گا بلکہ ہو سکتا ہے میرے ساتھی بھی آئیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”شیوور! انہیں بھی ضرور لائیں۔ مجھے خوش ہوگی مگر یہ کیا آپ تشریف تو نہیں کوئی ٹھنڈا وغیرہ منگواتے آپ کے لیے؟“  
 ”آپ پر ادھار رہی، کل ہی یہ سب ہو جائے گا۔ آپ ذرا اپنا کارڈ عنایت کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔“

”شیوور، شیوور، وائے ٹاٹ سرا!“ اس نے کہتے ہوئے اپنا وزینگ کارڈ مجھے تھا دیا اس کے بعد میں اور کالیا نکل آئے۔ بائیک پر سوار ہونے سے پہلے میں نے دھیان رکھا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ نہ پائے۔ ورنہ اسے شبہ ہو سکتا تھا کہ اتنا بڑا سودا کرنے والا ایک ڈاکٹر بائیک پر یہاں آیا تھا۔ چونکہ وہ پہلے ہی اپنی کرسی سے اٹھ کر کسی اور طرف جا رہا تھا اسی لیے نکلنے وقت میں نے کن آنکھوں سے اسے دوسرے کمرے کی طرف لپکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور پھر جلدی سے بائیک نکال کر میں گیٹ سے باہر آ گیا۔ کالیا پیچھے سوار ہو گیا تھا۔  
 ”ابے لے! جگری یہ تو ہاتھ آ گیا سمجھو۔“ کالیا نے میرے پیچھے سے کان میں کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تسلی تھی کہ جس کام سے آیا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میری جیب میں اٹکے ہوئے اسپاکی قلم نے ثاقب کی مختلف زاویوں سے تصاویر بنا ڈالی تھیں۔

ہم احسان جمالی گڈز پہنچے مگر اس سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر میں نے بائیک روک کر رجم بخش سے رابطہ کیا اور اس نے تھوڑی دیر میں پہنچنے کا کہا تو میں نے تب تک اپنے اسپاکی پین سے ثاقب کی تصاویر نکال کر اپنے اسارٹ فون میں منتقل کر لیں تاکہ اس کی اسکرین میں رجم بخش کو تصاویر آسانی سے دکھا سکوں۔

جب تک وہ ہمارے پاس پہنچا میں اپنا یہ کام بھی کر چکا تھا۔

”بالکل یہی شخص ہے صاحب!“ رجم بخش تصویر کو پہچانتے ہی بولا۔

”اسی آدمی کو ہی میں نے فشی نواز کو رشوت دیتے

ماہنامہ سرگزشت

195



گئے۔

”چل پھر سو پر رکھ لے کاٹھا۔“ کالیانے کہا اور میں نے بایک کی رفتار بڑھادی۔

لیاری پہنچ کر ہم نے سیدھا پہلے جینکو کے اڈے کا رخ کیا۔ وہ وہیں موجود تھا۔ اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ جن ڈاڈا کے پاس جانے سے پہلے ایک بار پھر میں اچھی طرح سوچ لوں، میں نے اسے بھی وہی جواب دیا جو کالیانہ کو دے چکا تھا۔

جینکو نے اسی وقت جن ڈاڈا کا نمبر ملایا اور اس سے بات کی۔ اس نے فوراً ہمیں بلوالیا مگر اس شرط کے ساتھ جینکو ہمارے ساتھ نہیں ہوگا نہ ہی اس کا کوئی ساگھی۔ اس پر جینکو کو اعتراض ہوا مگر میں نے کہا کہ میں اور کالیانہ ہی جائیں گے۔

جن ڈاڈا نے ہمیں جگہ بتادی اور ہم وہاں پہنچے۔ یہ لیاری کا مشہور چورہا ”جیل چوک“ تھا، یہاں پہنچے تو دوڑ کے ایک بایک پر ہمیں لینے آن پہنچے۔ ہم ان کے اشارے پر ان کے پیچھے بایک لگا کر روانہ ہو گئے۔

مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے، بابو با میرے دل و دماغ میں یہ خیال آتا رہا کہ کہیں میں کوئی بھیا تک غلطی تو نہیں کر رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جن ڈاڈا کو مطمئن نہ کر سکیں اور اس کے اڈے پر ہی بے موت مارے جائیں۔

بلاشبہ یہ میرا بہت خطرناک فیصلہ تھا اور علاقہ بھی اس سے زیادہ خطرناک۔ کون ہمارے جھوٹ کو تسلیم کرتا لیکن مجھے دماغی خرچ پر یقین بھی تھا کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا، کیونکہ میرا اس طرح رضامندی سے ان کے پاس آنا بھی مجھے بے قصور بناتا تھا۔

جلد ہی ہم ایک بڑے سے چوٹی گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ گیٹ فوراً بند کر دیا گیا۔

اس کے عقب میں مجھے دو مسلح افراد نظر آئے تھے۔ سامنے بڑا سانا پختہ احاطہ تھا اور ایک بیٹھک سی بنی ہوئی تھی۔ اس کے آگے بڑا سا چمپر نما سانا بن تھا جس سے تین چار کرسیاں اور ایک لکڑی کی بیچ دھری ہوئی تھی، بیچ پر دو افراد براجمان تھے اور کرسی پر صرف ایک ہی شخص بیٹھا تھا۔

ہمیں بیٹھنے کا کہا گیا اور ایک ہمارے ساتھ والی کرسی پر جبکہ دوسرا اندر بیٹھک میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر گزری مگر کسی کرایک لمبا تڑکا بلوچ ٹائپ شخص کھلے گھیر اور پانچوں والی شلوار اور اسی طرح کی قمیص میں نمودار ہوا۔ اس کے سر پریشیوں کے کام والی زرد بلوچی ٹوپی تھی۔

اس سے مل کر میں نے اسے ساری بات بتادی۔ وہ حیران ہو گیا اور تو صوفی لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے واہ نعمان صاحب! آپ نے تو ہمارا کام آسان کر دیا۔ اصولاً یہ کام تو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔“

میں نے جواب میں مسکرا کر کہا۔ ”ایک اچھے شہری کے ناطے ہمیں بھی پولیس سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔ آپ اپنی کارروائی جلد منسوخ، گواہ تیار ہے، بلکہ جمالی گڈز کے ٹنگی نواز کو بھی بلا کر چابی کھمائیے گا۔ ایک گواہ اور مل جائے گا آپ کو۔“

”ہم.....“ انسپکٹر کامران نے ہرکاری بھری۔ ”اسے وعدہ معاف گواہ بننے کا لایا دیا جائے گا، تب مزید ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”لیٹن انسپکٹر صاحب! یاد رہے کہ اس شخص عاقب کی ضمانت بالکل نہیں ہونا چاہیے یہ بہت اہم کیس ہے اور ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ مس زبیرہ کے ساتھ یہ واضح ہوا ہے۔ ذہن میں رہے جس کا کیس عدالت میں چل رہا ہے۔“

”بے فکر رہیں آپ! میں ابھی پولیس پارٹی تیار کرتا ہوں، آپ نے اپنا کام کر دیا اب ہمارے کرنے کی باری ہے۔“

میں نے عاقب کا وزیٹنگ کارڈ اور اس کی تصاویر انسپکٹر کامران کو دے دی تھیں۔ جنہیں اس نے وہیں موجود اپنے پرنٹر سے نکلوا لی تھیں۔

اس کے بعد میں اور کالیانہ واپس آ گئے۔

”اب کہہ رکھنا ارادہ ہے جگری؟“ کالیانہ بولا۔

”لیاری جا رہے ہیں ہم جن ڈاڈا سے ملنے۔“

”جگری! تو نے ویسے اچھی طرح سوچ لیا ہے ناں!

کیونکہ ہم بھیڑیوں کے بحث میں جا رہے ہیں۔“ کالیانہ نے کہا۔

”کالیانہ! میرے پارا یہ مسئلہ ہمارے گلے آن پڑا ہے،

اس کے حل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم اسے فیس کریں، اس سے بھاگیں گے تو یہ گلے ہی پڑا رہے گا، پہلے ہی ہم اتنے مسائل کا شکار ہیں۔“

”بات تو تیری بھی صحیح ہی ہے، جگری! پر روزی سے تو بات کر لے ناں، اسے بھی تو ساتھ لے جانا ہوگا۔“

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا ہی سچ کھل

جائے (یعنی ہم دونوں ہی اصل میں وہاں تھے) تو یہی بہت ہے، ہم سے مطمئن نہیں ہوئے تو پھر روزی کو بھی لے آئیں

دلی کے ایک ہندو پاک مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل سنار ہے تھے کہ فراق گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ ”واہ حفیظ پیارے! کیا گھلا پایا ہے۔ یار میرا سارا کلام لے لو اور اپنی آواز مجھے دے دو۔“ حفیظ فی الفور شعر اور صراحت چھوڑ کر فراق سے کہنے لگے۔ ”جناب فراق صاحب! میں آپ کا نیا زامند ہوں۔ میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجئے۔ لیکن خدا کے لیے مجھے اپنا کلام نہ دیجئے۔“

ہماری اطراف دیکھتے ہوئے، جن ڈاڈا کی طرف دیکھ کر بولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں نے اندر ہی اندر سکون کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ یہاں تک ہم سچ ثابت ہوئے تھے۔ بات گہری تھی مگر نفسیاتی مار کی تھی، مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ جو لوگ اتنے زیرک و ماہر تھے کہ انہیں ہمارا پتا چل گیا تھا، وہ ڈی افرو کو فوراً بھانپ لیتے اور ہمارا جھوٹ پکڑا جاتا۔ اسی سبب میرے ذہن طباح میں یہی خیال آیا تھا کہ جھوٹ کو حقیقت کے پردے سے ہی چھپانا ممکن تھا اور وہ میں کر رہا تھا۔

جن ڈاڈا نے اس بوڑھے سندھی کھوٹی کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر ایک گہری سانس خارج کر کے مجھ سے بولا۔ ”دیکھو! ہم دوست اور دشمن کی بود و بوی سے سو گھٹ لیا کرتے ہیں۔ تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ ہی جینکو سے، ہم محض ایک غلط فہمی کی بنیاد پر اپنے تعلقات نہ خراب کرنا چاہتے ہیں نہ ہی دوستی کو دشمنی میں بدلنا ہمارا شیوارہ ہے۔ اس لیے میں صرف سچ ہی سنوں گا۔ کیا کل رات تم نے ہمارے آدمی جو کہ ایک مکان پر پہلے بولا تھا اور ایک ریغالی لڑکی کو چھڑا کر لے گئے تھے؟“

”یہ غلط ہے۔“ میں نے فوراً کہا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس گینگ وار لیڈر کی ”پروپج“ بس ادھر ہی تک تھی۔ اس سے آگے کچھ نہیں اور جہاں تک می وہاں تک میں نے اسے اپنی عقل سلیم اور ذہنی فراست تلے چل ڈالا تھا لہذا پہلے سے زیادہ اعتماد سے بولنا جاری رکھا۔

”آپ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ کو کبھی اتنی مردم شناسی تو ہو گی ہی کہ آپ جنگجو اور عام آدمی کی پہچان کر سکیں۔ ہم ”مال“ سپلائی کرتے ہیں۔ (یہ کہتے ہوئے میں نے اشارتاً اپنی ناک پر دستک دی تھی اور یہاں بھی میری

چہرہ لبوتر اور رنگ گندمی تھا۔ آنکھوں سے کرنشلی اور چہرے پر کسی کو بھی خاطر میں نہ لانے والی رعوت اٹھتی نظر آتی تھی۔ مجھے یہی جن ڈاڈا لگا تھا۔

”سلام سائیں!“ میں نے اٹھ کر اسے سلام کیا اور کالیا نے بھی یہی کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دے گا نہ ہی ہم سے ہاتھ بھی ملائے گا مگر باوجود ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کی کرنشلی سوا ہونے کی اس نے ہم سے ہاتھ بھی ملایا اور سلام کا جواب بھی دیا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر اس نے ہمیں سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی اشارہ کر دیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

چند ثانیے تک یہ گینگ وار لیڈر مجھے اور کالیا کو گھورتا رہا اس کے بعد اس نے اپنے اریب قریب کھڑے ساتھیوں میں سے ایک سے بلوچی میں کچھ کہا۔ وہ سر کو ہٹکے سے تم کر کے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا گیٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس کے بعد جن ڈاڈا نے اپنے حلق سے ایک طویل بہکاری خارج کی اور میرے چہرے کی طرف گھور کر بولا۔ ”جینکو کو کب سے جانتے ہو؟“

”کل رات سے۔“ میں نے پہلے سے سوچے سمجھے اس کے متوقع سوالات کے جواب میں کہا۔

”اور تم؟“ اس نے کالیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی سائیں! کل رات سے ہی۔“  
”وہ چھوڑی کدھر ہے، جو کل رات تمہارے ساتھ تھی؟“ جن ڈاڈا نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے جواب میں اسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دھندے پر گئی ہوئی تھی۔“  
”کیا نام تھا اس کا؟“

”روزی۔“  
”تمہارا کیا نام ہے؟“

”احمد نعمان۔“ میں نے دانستہ اپنا الٹا نام بتایا۔  
”اور تمہارا؟“  
”شیرازی!“

اسی وقت وہ آدمی دوبارہ نمودار ہوا جسے جن ڈاڈا نے کہیں بھیجا تھا۔ اب اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ جن ڈاڈا نے اسے بار سندھی میں اس سے جو کہا وہ میں سمجھ گیا۔ اسے ”ہیرا“ لینے کو کہا گیا تھا۔ وہ سندھی بوڑھا ایک دم جھک گیا اور پھر جہاں ہم بیٹھے تھے، وہاں سے زمین کو جھک جھک کر دیکھتا ہوا گیٹ تک گیا اور اسی طرح دوبارہ لوٹا تو اس نے



یوں بھی ہم کسی مستند ڈاکٹر کے پاس ایسا زخم دکھانے سے کتر  
بھی رہے تھے، کیونکہ وہ اسے دیکھتے ہی بھانپ لیتا کہ یہ زخم  
گن شات و ونڈ ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے روزی کا نمبر  
ملایا اور اس سے ملاقات کرنے کا پوچھا تو اس نے اپنا موجودہ  
پتایا دیا جو یونیورسٹی روڈ، موسمیات کے علاقے میں تھا۔

میں اور کالیسا اس کی طرف روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر ہم  
یونیورسٹی روڈ پہنچے اور سیدھا نکلتے چلے گئے۔ اس کے دس پندرہ  
منٹ بعد ہم موسمیات کے علاقے میں تھے۔ یہاں ایک  
بلڈنگ تھی، جس میں بہت سے فلیٹ تھے۔ یہ خاصی برائی مگر  
مضبوط کنسٹرکشن تھی۔ ایسے ہی ایک ڈی سینٹ اپارٹمنٹس  
والے پروجیکٹ کے سامنے ہم رکے اور گیٹ سے اندر داخل  
ہوئے۔ گلے تو وہاں موجود چوکیدار نے ہم سے پوچھا کس سے  
ملنا ہے؟ روزی نے ہمیں بتا دیا تھا کہ ہم نے کیا کہنا ہے۔ لہذا  
میں نے کہا۔

”کریبی بھائی کے فلیٹ میں جانا ہے۔“ اس نے ہمیں  
اندرا نے کی اجازت دے دی۔

کالیسا نے بانیگ اندر گھمائی۔ اندر وسیع کار پارکنگ  
تھی۔ ایک طرف بانیگ کھڑی کرنے کی بھی خاصی کشادہ جگہ  
تھی۔ لان سے بائیس کھڑی تھیں۔ کالیسا نے بھی اپنی بانیگ  
اس میں گھسا کر کھڑی کر دی۔ اس کے بعد جب وہ اسے سائیڈ  
اسٹینڈ کر رہا تھا تو میری عقب میں گیٹ پر نظر پڑی تو ایک سفید  
رنگ کی کلکس کار کو چوکیدار نے روک رکھا تھا۔ اس کے  
ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے برابر میں ایک شخص براجمان تھا۔  
ڈرائیور تو چوکیدار سے باتیں کرنے میں مصروف تھا جبکہ اس  
کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو میں نے اپنی طرف  
گھورتے پایا۔ اس کی صورت خاصی کریہ تھی۔ ناک موٹی اور  
چہرہ بھاری تھا۔ اس کی جسمانی ساخت کا بھی میں نے کچھ اسی  
طرح کا ہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور کو چوکیدار  
نے اندر نہیں آنے دیا تھا اور وہ کار کو واپس موڑ رہا تھا۔

”آگے چل جگری! کیا دیکھ رہا ہے؟“ اتنے میں کالیسا  
نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ میں اسی طرف ہی متوجہ  
تھا۔ کلکس اب گیٹ کے باہر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی مگر اس  
کے اندر سے وہ دونوں برآمد ہو رہے تھے۔

چوکیدار نے انہیں کار سمیت اندر آنے کی اجازت نہیں  
دی، البتہ وہ دونوں اندر آچکے تھے۔ تب تک میں اور کالیسا۔  
بلڈنگ اسے ٹوکی طرف بڑھ گئے۔ وہاں فرسٹ فلور پر مطلوبہ

طبیعت منضی سی ہوئی تھی مگر کیا کرتے مجبوری تھی اور جان پہ  
بھی بنی ہوئی تھی، سوخو کو کھورتوں کا پلازہ رکھتا پڑا تھا! اگر یقین  
نہیں آتا تو آپ بھی حکم کریں اور میرا فون نمبر نوٹ کر لیں،  
آپ کے بھی کام آکر خوشی ہوگی، ہمیں لیکن..... دام کھرے  
ہونے چاہیں۔“ میں نے آخر میں دانستہ حیرانہ لہجے میں کہا تو  
میرے سامنے بیٹھا جن ڈاڈا ایک دم گم سم سا ہو کر مجھ سے دیکھا  
گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ  
ہماری طرف بڑھا۔ ہم بدک سے گئے۔

”چلو، اٹھو اپنا راستہ چڑو..... شکر کرو سامین نے تمہیں  
چھوڑ دیا۔“

کالیسا اور میں نے جن ڈاڈا کا شکریہ ادا کیا اور پھر ہم  
واپس بانیگ پر بیٹھ کر جینکو کے پاس آ گئے۔

وہ اول تو ہمیں اتنی جلدی اور صحیح سلامت دیکھ کر حیرت  
زدہ ہوا، اس کے بعد خوش ہو کر بولا۔ ”لگتا ہے تم لوگ جن ڈاڈا  
کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکے ہو۔“

”ہاں!“ کالیسا نے سر جھٹک کر کہا۔ ”یہ اپنے اس  
جگری! نعمان کا کمال ہے، بڑی ذریک دماغی سے اس نے  
اس جفا کو پچھلایا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس نے ہمیں صحیح مشورہ دیا تھا۔“  
جینکو میری طرف خفیف سی مسکراہٹ سے نکلتے ہوئے  
بولا۔ ”کیونکہ اس بات پر تو میں نے بھی غور کیا تھا کہ اگر تم  
دونوں کی بجائے ڈی آدی بھیجے تو معاملہ اور بھی بگڑ جاتا۔“  
”ہاں! اس نے تو ہم سے کوئی بات کرنے سے پہلے  
اپنے اسی کجی کو بلوا کر ہمارا امیر اچیک کر دیا تھا۔“ میں نے  
کہا۔

پھر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم دونوں جینکو کا شکریہ ادا  
کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

”اب کدھر کا ارادہ ہے جگری؟“ کالیسا نے مجھ سے  
پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ بانیگ وہی چلا رہا تھا۔  
بولا۔ ”لیکن ابھی میں تجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا  
ہوں۔ تیری مرہم پٹی ضروری ہے۔“

وہ مجھے اپنے کسی جاننے والے ڈاکٹر کے کلینک میں  
لے گیا، جو اسی کے علاقے میں ہی تھا لیکن اس ”ڈاکٹر“ اور  
اس کی ”کلینک“ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ”کونکلس“  
یعنی عطائی ڈاکٹر تھا۔ تاہم بعد میں کالیسا نے مجھے بتایا کہ یہ خاصا  
تجربہ کار تھا اور اس نے میڈیکل ٹینیشن کا کورس بھی کر رکھا تھا۔

### شعراء

ہندوستان کے مشہور شاعر روشن صدیقی پست قامت انسان ہیں۔ ایک روز مجاز سے کسی بات میں الجھ پڑے۔ ذم میں آکر بولے۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ہندوستان کا شاعر اعظم ہوں۔“ مجاز نے برجستہ جواب دیا۔ ”جی! مگر پہلے آپ بد آدم تو ہو جائیے۔“

\*\*\*

ایک بوڑھے، سفید ریش شاعر، جرأت و دماغ کے رنگ میں بڑے شوخ قسم کے اشعار کہتے تھے۔ کسی کالج کے مشاعرے میں غزل سنانے کے لیے اسٹیج پر تشریف لائے۔ جونہی مطلع کا پہلا مصرع پڑھا: ”نکلنے کو ترسرت وصل کی اے نازنین نکل!“ طلبہ نے ایک زبان ہو کر دہرایا ”نازنین نکل!“ انہوں نے مصرع ثانی پڑھا: ”مگر جیسے نکلنی چاہیے ویسی نہیں نکل!“ کالج کے ایک ذہین اور زندہ دل طالب علم نے برجستہ کہا: ”لیکن قبلہ! اس میں نازنین کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

\*\*\*

کسی مشاعرے کی ایک مخصوص نشست میں کوئی صاحب ذوق شعرا کے ہر اچھے شعر پر برحلی اور برجستہ داد دے رہے تھے۔ ان کے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جو اپنی تن شناسی کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ صاحب ذوق کی شعر پر یوں داد دیتے۔ ”واہ! اشعر میں لفظوں کا دروبست کیا خوب۔“ تو وہ دھرا دیتا۔ ”سبحان اللہ، کیا لفظوں کا دروبست ہے۔“

جب وہ کہتے۔ ”بہت خوب کیا معنی ہیں آفرینی ہے۔“ وہ کہتے۔ ”تشبیہ کی جدت قابل داد ہے۔“ یہ کہنے لگا۔ ”بالکل نئی تشبیہ ہے۔ لا جواب تشبیہ ہے۔“ جب شاعر نے غزل کا مقطع پڑھا تو ان صاحب کو شوخی سوچی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”واہ کیا ایطاء جلی ہے۔“ اب اس کی باری تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاٹ دار آواز میں داد دی۔ ”اے سبحان اللہ! کیا خوب ایطاء جلی ہے۔“ (واضح ہو کہ ایطاء جلی اصطلاح میں قافیے کے ایک نمایاں عیب کو کہتے ہیں)

قلیت تھا۔

میں میڑھیاں چڑھتے ہوئے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، نہانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کے احساس تلے بے چین سا کر دیا تھا۔

”کیا بات ہے جگری! تو کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا ہے۔“

”خطرہ۔“ میں نے ہولے سے مگر سراسر اتے لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑا اور اسی لہجے میں بولا۔

”خطرہ.....! کیسا خطرہ؟“

”چلتے رہو مگر اپنے مطلوبہ قلیت کے سامنے ابھی مت

رکنا اور اوپر نکلنے جانا۔“

ہم دونوں آگے پیچھے میڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اپنے مطلوبہ قلیت کے فلور پر میں ٹھوڑا سا اور عقب میں پیچھے جانے والے ذہنی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں افراد ابھی اوپر آ رہے تھے۔ میں فرسٹ فلور چھوڑ کر سینکڑ پر آ گیا اور دانستہ کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت وہ دونوں محلوک افراد نمودار ہوئے۔ وہ

دونوں اسی فلور پر آ کر رکے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک

رہا تھا۔ وہ دونوں ہمیں گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے

اوپر نکل گئے۔ میں نے اپنی سانسیں جیسے سینے میں روک لی

تھیں۔

”کوئی ملاقاتی ہوں گے۔ چل نیچے۔“ کا لیا نے کہا۔

میں نے ایک نگاہ اوپر جاتے ذہنی پر ڈالی تو انہیں بدستور اوپر

جاتے دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر پلٹا۔ اب ہم دوبارہ نیچے

ذہنی اترتے ہوئے فرسٹ فلور والے اپنے مطلوبہ قلیت کے

سامنے پہنچ کر رک گئے اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

”کون ہے؟“ ذرا ہی دیر بعد اندر سے ایک نسوانی

آواز ابھری۔

اس شناسا آواز کو میں ہی نہیں بلکہ کا لیا بھی پہچان گیا۔

”دروازہ کھولیں مس روزی! ہم آگئے ہیں۔ نعمان

اور کا لیا۔“

یہ سنتے ہی روزی نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ ہم

دونوں اندر داخل ہو گئے۔ روزی نے فوراً ہمارے عقب میں

دروازہ بند کر دیا۔ مجھے وہ کچھ ہراساں دیکھائی دی تھی، ڈری

ہوئی تو وہ پہلے ہی سے تھی۔ اس کی وجہ بھی ہمیں معلوم تھی۔ وہ

سیٹھ ستارے ہی خوف زدہ تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے

سے خوف اس طرح جھلک رہا تھا جیسے ابھی اس کی قضاء آنے

والی ہو۔

ایک بہادر، باہمت اور پر عزم لڑکی ہو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب کبھی ہوگی وہ اس وقت آکر رہے گی۔ چاہے انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں نکل جائے، سیٹھ ستار جیسے جلاوطن کی رسی اللہ نے دروازہ ضرور کی ہوتی ہے مگر وہ جلد اپنے انجام کو پہنچ کر ہی رہتے ہیں۔ ضرورت بس پامردی کی ہوتی ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے، سیٹھ ستار جیسے ایک بڑے بلڈ رافیا اور مجرم ذہین رکھنے والے کے سامنے میری کیا حیثیت ہے؟ لیکن مجھے اپنے خدا پر یقین ہے کہ وہ ایک راہ پر چلنے والوں کی ضرورت درکرتا ہے، بس ابھی میرا ایمان ہے اور میں نے سیٹھ ستار جیسے مگر مجھ سے ہیر لے رکھا ہے۔ تم فکر نہ کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

تھوڑے توقف کے بعد میں نے اس سے دوبارہ کہا۔ ”تم بھینا اس آدمی کے کئی اہم رازوں سے واقف ہو۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے جس میں کاتبِ تقدیر کا دخل تھا کہ ہماری اس رات اچانک یوں ملاقات ہوئی، اس طرح تمہیں ہماری صورت میں اور ہمیں تمہاری صورت میں ایسا راستہ بھائی دیا کہ ہم مل کر سیٹھ ستار جیسے سماجی ناسوروں کا خاتمہ کر سکیں۔“

میں نے دیکھا میری باتوں سے روزی کا تھوڑی دیر پہلے ہراس سے ستا ہوا چہرہ کچھ طمانیت اور ایک عزمِ میم کی جھلک پیش کرنے لگا تھا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی نعمان صاحب کہ مجھے آپ جیسے باہمت انسان کا سہارا ملے تو میں سیٹھ ستار جیسے مگر مجھ کی فیر کھود سکوں جس نے میری باجی کی زندگی برباد کی اور میری نجانے کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگی اس شیطان نے تباہ کی ہوں گی۔“

وہ ذرا گھبرائی پھر آگے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

ہم سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں نے مستفرازانہ نظروں سے روزی کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

”یہ میری ایک سبیل کا فلیٹ ہے۔ شاید وہی آئی ہو، آپ پریشان نہ ہوں۔“

وہ یہ کہہ کر دروازہ کھولنے کے لیے بڑھی۔ نجانے کیوں میرا دل بے چینی سی محسوس کرنے لگا، جیسے کچھ ہونے والا ہو..... پھر کچھ گھجھ سے بھی بیٹھا نہ گیا، میں بھی کسی احتیاط کے پیش نظر اس کے پیچھے دروازے کی طرف لپکا تو کالیانہ بھی میرے حتماً انداز کو بھانپتے ہوئے اپنا پتوٹل نکال لیا۔

(جاری ہے)

یہ دو بچہ روم اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل فلیٹ تھا۔ چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ ہم صوفے پر براجمان ہو گئے جو ایک ٹیبل اور دو کرسیوں پر مشتمل تھا، سامنے ہی چار کرسیوں والا ڈرائنگ ٹیبل تھا۔ چکن بھی اسی سے ہی ملتا تھا۔

”خیریت تو ہے مگر روزی! آپ کچھ زیادہ ہی پریشان اور گھبراہٹی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں؟“ میں نے اس کے چہرے کو بہ غور دیکھا۔

”مجھے سیٹھ ستار کے کسی کتے کا دھمکی آمیز فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں یہ شہر چھوڑ جاؤں۔“

”تو پھر آپ نے کیا سوچا جس روزی؟“ مجھ سے پہلے کالیانہ اس کا عندیہ جاننے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ جواب اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

”میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور رابطہ ہی منقطع کر دیا تھا۔“

”یہ تم نے ٹھیک کیا۔“ میں نے کہا اور اس کے سراپہ سے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”آپ کیا چاہتی ہیں؟ میرا مطلب ہے اگر آپ سیٹھ ستار سے خوف زدہ ہیں تو ہم آپ کو بحفاظت اور انتہائی رازداری کے ساتھ کسی دوسرے شہر بھجوانے کا بندوبست کر سکتے ہیں؟“ میری بات پر روزی کو تو نہیں البتہ کالیانہ کو ضرور جرت ہوئی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں تپ کے اس پتے سے کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے اسے ”چلتا“ کیوں کرنا چاہ رہا تھا مگر میں دراصل یہ بات کہہ کر روزی کی اپنی مرضی جاننا چاہتا تھا۔ وہ اگر جان کے خوف سے یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو کم از کم ہم ضرور آگاہ ہو سکتیں، کیونکہ ایک تو اگر وہ خود سے یوں فرار ہونے کی کوشش کرتی تو ممکن تھا، سیٹھ ستار کے گرگے اسے جان سے مار ڈالتے، ہم اگر اسے روانہ کرتے تو اس سے کسی نہ کسی طرح رابطے میں ضرور رہتے اور یوں یہ تپ کا پتا ہمارے ہی ہاتھ میں رہتا اور اس کی جان بھی محفوظ رہتی۔

”میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی۔“ چند سیکنڈوں بعد اس نے جواب دیا۔ ”میں بس یہ چاہتی ہوں کہ بے موت نہ مار دی جاؤں، مروں تو کم از کم سیٹھ ستار کو کوئی ہماری نقصان پہنچا کر ہی مروں۔“

مجھے اس کا جواب بے حد پسند آیا تھا، جو میرے لیے حوصلہ افزاء بھی تھا، لہذا میں نے اس سے توسیعی لہجے میں کہا۔ ”تم نے بہت اچھی بات کہی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے تم

# ہیت بازی

## قارئین

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ارضی ملک..... لاہور

مشاہد کے قلم سے لکھا گیا ہے مجھے  
میں ایسا لفظ ہوں جس کو کوئی مٹا نہ سکے  
منشی عزیز مئے..... لندن

میں اسے مانگ تو لوں رب سے جا کر  
پتا نہیں فیصلے قدرت کے کیا ہوں گے  
(سید احمد چاند کراچی کا جواب)

مرزا جہان بیگ..... حیدر آباد

روشنی شہر کی خاطر یوں جنوں زار نہ بن  
میں اس شہر کے پہلو میں ہوا گرد و غبار  
عندلیب مظہر..... ملتان

رسم دنیا ہے کسی طرح بھاتے رہے  
دل نہ ملتا ہے مگر ہاتھ ملاتے رہے  
(نازیلہ منصور کوئٹہ کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہ ایمان..... فورٹ عباس  
یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا  
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا  
(نزاہت افشار فتح جنگ کا جواب)

اختر شاہ عارف..... جہلم  
میں اب جیت بھی جاؤں تو دل خوش نہیں ہوتا  
جس شخص کو ہمارا ہے وہ اموں بہت تھا  
سدا ہونا گوری..... کراچی

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوار کوئے جاناں  
وہ یہیں سے لوٹ جائیں جنہیں زندگی ہے پیاری  
(نجمہ توفیق کراچی کا جواب)

نزاہت افشار..... فتح جنگ  
ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد کرے  
ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد رہے

سید احمد چاند..... کراچی

قص قص میں رونق یہ چمن ہے اجڑا اجڑا  
غم دوست یہ بتا دے کہاں تو نے ہم کو چھوڑا  
(ماہ نور تبسم ملتان کا جواب)

رفیق احمد ناز..... ڈی جی خاں  
ایسا بکھرا ہوں کہ اب سٹ سٹ نہیں  
کر چیاں وجود سے پٹ کر رہ گئیں

(ماہین فاطمہ شاہین لیہ کا جواب)  
عبدالبارودی انصاری..... لاہور

اک حسن زندگی ہی تو شہکار ہے  
قدرت کی مصوری میں عجب طلاطم کے ساتھ  
شہناز فرحت..... لاہور

آپ کے اس التفات بر ملا کا شکریہ  
یہ گزارش ہے مگر دیکھیں نہ یوں دل کی طرف  
نیاز احمد..... کراچی

آمد فصل بہاراں کا نظارہ تو یہ  
کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریبان کوئی  
(زاہد رفیق لاڑکانہ کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری..... سرگودھا  
وہ کون ہے جو تمہارا نہیں تمنائی  
ہر ایک دل میں چھپا داغ آرزو دیکھا  
(ملک فیصل لاہور کا جواب)

شبیر شاہ..... کشمور  
یہ تیری جدائی کی یادگار ہے در نہ  
اک زخم کو بھرنے میں تفتی دیر لگتی ہے  
(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

فیروز احمد..... ڈی آئی خان  
یہ ندی پار کرو گے تو نظر آئے گا  
اک چٹا اور سلگتی ہے مرے تن کی طرح

(وحید جہاں کراچی کا جواب)

رضا احمد اعوان..... دریا خان  
ہم نہ ہوں گے تو بھلا کون منائے گا تمہیں  
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روشا نہ کرو  
(قمر جہاں کراچی کا جواب)

مریم بنت کاشف..... حیدر آباد  
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شہستان وجود  
ہوتی ہے بندہ مومن کی ازاں سے پیدا  
اظہر الدین..... کراچی  
اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں  
جن پہ مند بچھائے بیٹھے ہو  
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

اکبر حیات..... لاہور  
یہ سوچ کر پکلوں میں چھپا لیتا ہوں آنسو  
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں  
(مریم بنت کاشف حیدر آباد کا جواب)

احمد علی..... پشاور  
یہ ریت سی مرے ہونٹوں پہ جم گئی کیسی  
مجھے گماں تھا کہ دریا ہوں میں تو پیاسی ہے تو  
(اختر علی لاہور کا جواب)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی..... ملتان  
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا  
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا  
ناعمہ تحریم..... کراچی  
کہاں سے سیکھ لی تم نے یہ بے رخی کی ادا  
کبھی تو ہم سے ملو تم بھی دوستوں کی طرح

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی  
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین  
اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف  
کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر  
ارسال کریں۔

حکفۃ یاسین..... کراچی

یقین نہ آئے تو اک بات پوچھ کر دیکھو  
جو نہیں رہا ہے وہ زخموں سے چور نکلے گا  
بے بی تکلفۃ..... جہلم

یاد مانی کی وہ افسانے بھلا ڈالوں گی  
تیری تصویر ترے خط کو جلا ڈالوں گی  
الیاس حسن..... روہڑی

پہ آن بان لے پڑی سرمایہ حیات  
انسان کھو گیا اسی رویدل کے بیچ  
عبدالسلام..... جدہ سعودی عرب  
یوں تو دنیا ہی ایک جنت ہے  
دوست یہ مے کدہ قیمت ہے  
(عبدالکبیر شمر کراچی کا جواب)

اشفاق احمد..... کراچی  
نظر آتی ہے جس میں زندگی کی موٹی صورت  
کسی قیمت پر ہم اے دوست وہ درپن نہ بچیں گے  
(ناصر احمد دینہ کا جواب)

نیو فر شاہین..... اسلام آباد  
مل جائے تجھے کوئی جب وفا شعار  
لے سر اٹھا رہے ہیں تیرے آستان سے ہم  
(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

ناہیدہ فروغ..... کراچی  
ادھر تو تیرا دم دل پہ کھا رہی ہوں میں  
ادھر خبر بھی نہیں کس پہ ہے یہ مشق عتاب  
(عبدالستار ساہیوال کا جواب)

نسیم اختر..... حیدر آباد  
یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر  
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں  
(مرزا جہان بیگ لطیف آباد کا جواب)

انس فاروقی..... لیہ  
یہ اور بات کی دل کی اجاڑ بستی میں  
ترا خیال گل تر دکھائی دیتا ہے  
(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

احمد علی..... ساکھڑ  
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے  
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوا دیا جائے  
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ پتے جملات مورخہ 30 ستمبر 2017، تک علی آزمائش 141 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

## اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

### شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 ٹریڈ ایسوسی ایشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں دورگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

## مقالہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! محترمہ!..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعرا لگ کاغذ پر ہے) 102

## مقالہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200



# علمی آزمائش - 141

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب کیجئے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپینس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صبحی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو جاننے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوین پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجئے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

24 نومبر 1952ء میں پیدا ہوئی۔ اسلامیہ کیمرج اسکول بھراڑنگ بن اسکول سے اکتساب کیا اور رضویہ گزرا اسکول سے میٹرک۔ سریدکان سے جامعہ کراچی تکمیل۔ سرکاری ملازمت حاصل کی۔ شاعر و شاعری میں نام پیدا کیا

علمی آزمائش 139 کا جواب

استیاز احمد 5 جنوری 1928ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے اندرون بھائی گیٹ میں بچپن گزارا۔ عبدالغنیظ کاردار کے پڑوسی تھے۔ مشتاق احمد اور افتخار احمد کے بھائی تھے۔ دنیا کے کرکٹ میں بہت نام کمایا۔

انعام یافتگان

- 1- حسن کاظمی، حیدرآباد
- 2- ندین محمد، سیالکوٹ
- 3- ناصر عباس، بہاولنگر
- 4- ظفر منگل، اسلام آباد
- 5- عبدالجبار، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نامہ تحریم، خادم حسین، نوید سراج، محمد فرمان، شاہد اقبال شاہد، امیر مظاہر، نبیل اختر، عنایت گجر، فرحت عباس نقوی، عنایت ساج، سبطین سید، الیاس محمد خارج، غلام حسن، طفیل احمد، باسط فاروقی، نذر حسین، انعام گل، صاحب مرزا، محمد احمد، یاسین خان، منظر حسن، قیام الدین انصاری، وردہ بول، اکبر علی ریسانی، ارشد علی، معتبرین اختر، اسرار احمد، مولیٰ بخش بیٹ، تنویر حسین، ہارون محمد، فتح یاب خان اچکزئی، انیس بھٹو، نعیم بیٹ، سعید الدین مروت، صوبی تبسم، محمد فیضان، خواجہ نیر محمد، نواز سلیم کھوکھر، مہوش علی خان، فرحمن بشیر، فیروز رحمانی، اسلام آباد سے فریدہ افتخار، نبیل احمد، انور یوسف زئی، فرمان حسن، محمد ذیشان، خالد عثمانی، نشاط بانو، ماہ جنین قاضی، نعیم اختر، عزیز الحسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، توصیف حسین، طارق ظفر، مسعود اعظم، محسن انور، افتخار حسن خان،

کاظم زیدی، حضور خان، عتیق الرحمن خان، برہمیں مرزا، ڈی سید، نقی عباس نقی، قادر علی قادری، نوید حسن خان، کاظم جعفری، مہدی علی خان، صابر علی، محمد اسلام الدین انصاری۔ لڈن واہڑی سے منشی محمد عزیز مئے۔ حضور گدو بیراج سے شبیر شان۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خشک، محمد فیض، عتیق احمد، ذیشان مرزا۔ ملتان سے محمد معین چشتی، محمد یحییٰ معین، محمد افتخار، فرحین گل، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، رخسانہ یاسمین، خالد حسن توصیف، نسیم احمد، نصیر احمد، فوزیہ اختر، نسیم الطاف گوہر، ذکیہ احسن کمال، نفسہ جمال انصاری، گل باز خان، خالد حسن، ارشد آفاق، ممنون الحسن، پیام احسن، مظہر قادری۔ لاہور سے نیاز چوہان، کائنات مرزا، فہدیٰ خان، عباس رضا سید، اقبال اصغر، عبدالحق، احمد علی بٹ، توصیف باری، آل پنجین نقوی، امجد علی اصغر، نواز کبیر، یاسمین فرحت، مصباح الرضا، کاظم حسین رضوی، نوید احسن، نسیم عباس، علی نواز کارگل، صابر علی خان، سلمان احمد، تاثیر احسن، سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، بادشاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمیٰ اکمل، ڈانہ، غلطی الزماں، خضر حیات، شجاع آباد سے حسن علی زیدی، نبیہ اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ایشام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، دھارہ رابر۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس بی۔ کھاناں سے سلیم کارمیز۔ پاک پٹن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرسرازمک۔ مظفر آباد سے علی کے ڈو الفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ چکوال سے رمضان ڈو، ارشد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خشک۔ منڈی بہاؤ الدین سے غلام جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالحق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (سلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، نقی چنگیزی، ٹکڑ، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ رحیم یار خان سے عتیق الرحمن، اسرار احمد، نسیم الدین، بخش حسین، شام مرزا، ملک یاسین، حبیب علی، ڈی حسن، ابرار بھٹ ڈرائیور، ارباز حسن زئی۔ ساہیوال سے صوفی مقبول احمد نقشبندی، صفی مبارک علی نقشبندی، نسیم اللہ، کاظم علی، مختار قاضی، نسیم عباس، نعمت اللہ۔ کوہاٹ سے ابرار اچکڑی، فدا حسین طوری، نصیر عباسی، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ شیخوپورہ سے پروفیسر عبدالوحید خان، ثریا فاطمہ، قتیل احمد، معین بٹ، ناصر حسن، عرفان قاضی۔ پشاور سے خاقان خان، قیام احمد، مہناز عرفان، ظہیر الدین، محمد شاہ، اصغر شاہ، زاہد حسین طوری، بخش، فدا حسین زیدی، ارباب خان۔ جہلم سے کنیز کبریٰ، فہدیٰ علی خان، حکیم صدر الدین، ناصر کوکب خان۔ بہاولپور سے مسرت اسلم ملک، مہوش خان، فطرت عباس، نور علی، اقبال احمد، نقی حسن، جاوید نقی عثمان، اکرام ملک، نواز کوکھر، امتیاز حسن، محمد نسیم، نوشین ملک، صفی اللہ خان۔ بہاولنگر سے صفری نسیم، انتخاب احسن، انضال محمد، ذکیہ امتیاز، ملک امتیاز، فصاحت اللہ، ظہیر شاہ، آفتاب احمد، عثمان مظفر، یاد علی سید۔ مظفر گڑھ سے ارباب رضا، نعمان ملک، چودھری فیض اللہ، ساجد علی، عثمان فاطمہ، نیاز حسین، فاروق نیازی، ارباز خانزادہ، فصیح الدین، جاوید حسن خان، کھاناں سے سلیم کارمیز۔ جامشورو سے راشد مغل، حیدر علی بھٹو، بدعت لاشاری، ایاز سومرو۔ حیدر آباد سے محمد یاسین اندوری، عباس علی، ماہ رخ، امجد بٹ، محمد می الدین خان، احمد لون، فضل شیخ۔ سکس سے شیخ یاسر، نجم الدین ثاقب، عباس گل، اقبال انصاری۔ جیکب آباد سے امین عباسی، ذوالفقار خان، فہدیٰ، کائنات یاسمین، میرپور خاص سے سدرہ ناصر علی، پروفیسر طارق حبیب، سلطان جوکھو، نصیر بابائی۔ میرپور قادیان سے فہم سومرو، عباس حسن، سلیم شانی۔ میرپور آزاد کشمیر سے جمیل اختر، یوسف خان، اطہر عباس، نیما بٹ۔ خیرپور سے احمد علی زیدی، عباس نامی۔ مہرات سے انیس طاہر ناگی۔ شادی پور سے لطیف الرحمن۔ خانیوال سے ناہید عباسی۔ ڈی آئی خان سے سید نسیم، منشی ایاز، محمد شاد خان، خالد یوسف۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز، یوسف شاہ، کنول، طاہر خان۔ جھنگ سے عطاء المصطفیٰ، ناصر قاضی، التماس عباس، طاہر شاہ، فہامہ احسن، عظیم الدین۔ شجاع آباد سے غلام جیلانی، وزیر محمد، غلام التقلین، خالد یاسر۔ چنیوٹ سے سہیل آفندی، خورشید رضوی۔ جلد مگ سے شاہ زیب، وصی الحق۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑا لوی، ہارون محمد، انیس احمد، فیض محمد، نگار سلطانہ، رشید نسیم، حکیب آفاقی، فرخندہ یاسمین، آذر لودھی۔ راجن پور سے علی احمد، ملک محمد ظفر اللہ۔ بیرون پاکستان سے عمیرین عظمت، اشرف زیدی (شارجہ)۔ آصف علی (عمان سعودیہ)۔ غار حسن، انصار ملک (امین)۔ محمد جنید انصاری ہندی، صادق خان (دبئی)۔ امتیاز علی (فریکٹ)۔ ایاز سومرو (بیڈ فورڈ)۔

## ٹھکرائی ہوئی لڑکی

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

میں نے اپنی حالات زندگی لکھ تو لی ہے اب پتا نہیں یہ سرگزشت کے معیار کی ہے یا نہیں لیکن ایک بات بتا دوں کہ اس سچ بیانی کو ہر ایک پسند کرے گا۔ اس لیے کہ میری حالات زندگی سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس سے بہتوں کو سبق حاصل ہوگا، بلکہ یہ سمجھ لیں کہ ہر ایک کے لیے یہ سبق ہے۔

سیما

(فیصل آباد)

مجھے بابا کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا۔ وہ ابھی بچاں کے بھی نہیں ہوئے تھے لیکن دیکھنے میں ستر سے زیادہ کے لگتے تھے۔ بیماری اور پریشانیوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ ان کے کندھے ڈھلک گئے تھے اور سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ وہ کئی کئی دن شیونہ بناتے جس کی وجہ سے چہرے پر دورانی برقی رہتی تھی۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے رنگ ساز تھے اور یہ فن انہیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ اسی بتاتی ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کے نام کی بڑی دھوم تھی۔ لوگ دور دور سے رحمت علی کا پتا پوچھتے ہوئے آتے اور انہیں اپنے ساتھ کام کے لیے لے جاتے مگر اس وقت بھی ہمارے گھر میں بہت زیادہ خوش حالی نہیں تھی لیکن پھر بھی بابا مینے میں پندرہ بیس دن مصروف رہتے تھے۔ ان کے کام میں بڑی نفاست تھی۔ ایک بار جو ان سے کام کرواتا وہ دوبارہ بھی انہیں ہی بلایا کرتا تھا بلکہ اپنے جانے والوں کو بھی ان سے کام کروانے کے لیے کہا کرتا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بابا کا کام رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی بیماری تھی اور دوسرے بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ انہیں سانس کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ ماسک لگا کر کام کیا کریں کیونکہ ڈسٹ اور اینٹ کی ٹوان کے لیے نقصان دہ ہے لیکن انہوں نے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ماسک لگا کر ان سے کام نہیں ہوتا اور ان کی رفتارست ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیماری بڑھتی گئی۔ وہ دو دن کام پر جاتے اور چار دن گھر میں پڑے رہتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے باقاعدگی سے علاج بھی نہیں کروایا۔ جب تکلیف زیادہ بڑھتی تو ڈاکٹر

اس روز بابا گھر واپس آئے تو ان کا اترا ہوا چہرہ اور مری ہوئی چال دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ خالی ہاتھ آئے ہیں۔ آج بھی انہیں کام نہیں ملا۔ انہوں نے ایک نظری پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر کمرے میں چلے گئے۔ میں اس وقت برآمدہ میں بیٹھی چھوٹے بھائیوں کو پڑھا رہی تھی۔ امی نے پہلے بابا اور پھر مجھے دیکھا اور بولیں۔ ”بہٹی جانے کا پانی رکھ دو۔ میں یہ ترپائی مکمل کر لوں پھر روٹی ڈالتی ہوں۔ نہ جانے انہوں نے دن میں کچھ کھایا بھی ہے یا یونہی بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔“

مجھے امی کی سادگی پر ہی آگئی۔ جب کام ہی نہیں ملا تو کھانا کہاں سے کھاتے؟ آج کل دال روٹی بھی ساتھ ستر سے کم میں نہیں آتی۔ حالانکہ امی کئی بار بابا سے کہہ چکی تھیں کہ وہ صبح کھانا ساتھ لے جا یا کریں۔ بازار کا کھانا مہنگا ہوتا ہے اور صحت کے لیے بھی ٹھیک نہیں لیکن بابا ہمیشہ یہ کہہ کر نال دیتے کہ ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ دن میں کئی بار جگہ بدلنا پڑتی ہے۔ وہ کھانے کی پوٹی لیے کہاں پھریں گے۔ ویسے بھی عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں ایک وقت کھانا پکا جس سے دونوں وقت بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ بابا کے لیے کہاں سے پچتا۔ اتنی منجائش نہیں تھی کہ انہیں روٹی کے ساتھ انڈوں کا آلیٹ یا سینڈویچ بنا کر دیے جاتے۔ اس لیے وہ ایک چائے کی پیالی پی کر گھر سے چلے جاتے اور دن بھر بھوکے پیاسے رہ کر شام کو خالی ہاتھ واپس آ جاتے۔ اگر کبھی چھوٹا موٹا کام مل جاتا تو ہمارے گھر دو چار دن چولہا جل جاتا ورنہ مینے کے باقی ایام جس طرح گزرتے تھے۔ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔



سے بابا کو کمیشن ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اس کے قائل تھے۔ وہ ہمیشہ گا بک کا فائدہ دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکان داروں نے انہیں منہ لگانا چھوڑ دیا۔ کچھ رنگ سازوں نے مکان بنانے والے ٹھیکے داروں سے کٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ ان لوگوں کی اپنی ٹیم ہوتی ہے جس میں مین، پلپر، الیکٹریشن، ٹائل فکسر اور رنگ ساز وغیرہ شامل ہیں۔ ٹھیکے دار انہی لوگوں سے کام لیتا ہے اور ان سے اپنا کمیشن وصول کر لیتا ہے۔ امی نے بابا کو بھی مشورہ دیا کہ وہ کسی ٹھیکے دار کے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کسی کو اپنی حق حلال کی کمائی میں سے حصہ نہیں دے سکتے۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے انہیں اپنا معاوضہ بڑھانا پڑے گا جو گا بک کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

بہت سے کارنر اپنے کام کو وسعت دینے کے لیے دور جدید کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان میں سے

کے پاس چلے جاتے در نہ گھریلو ٹونکوں سے ہی بیماری بھگانے کی کوشش کرتے۔

اس بیماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی جگہ دوسرے کارنروں نے لے لی جو ان کے مقابلے میں کم تجربہ کار تھے لیکن انہیں کام پکڑنے کا ہنر آتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر نے رنگ کی دکان والوں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ صبح سیدھے دکان پر آ کر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی گا بک رنگ سازی کی تلاش میں دکان پر آتا تو دکان دار انہی میں سے کسی ایک کو آگے کر دیتا۔ اس میں دونوں کا فائدہ ہوتا۔ دکان دار گھٹیا کو الٹی کارنگ فروخت کر کے اپنا منافع کھا کر لیتا اور اس میں سے رنگ ساز کو بھی کمیشن دیتا۔ بابا کے بھی کئی دکان داروں سے تعلقات تھے لیکن وہ بھی اس ٹھیل کا حصہ نہیں بنے۔ وہ ہمیشہ گا بک کو اس دکان پر لے کر جاتے جہاں اچھی کو الٹی کا مال ملتا پھر وہ دکاندار سے بھادوتاؤ کر کے قیمت بھی کم کر دیتے۔ اس طرح اس کا منافع کم ہو جاتا۔ اس میں

گے۔  
”کب آئے گا وہ وقت؟“ وہ جھنجھلاتے ہوئے بولے۔

”بہت جلد۔“ میں نے کہا۔ ”بس آپ حوصلہ کریں۔ اپنے اوپر یابوسی طاری نہ ہونے دیں۔“

”یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“ انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو جب میں شام کو گھر خالی ہاتھ لوٹا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ کسی بس کے نیچے آ جاؤں یا سنڈر میں چھلانگ لگا دوں۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔“

”نہیں بیٹی، اس ناکارہ وجود کے ساتھ یہ زندگی ایک بوجھ لگنے لگی ہے۔“

”کس نے کہا کہ آپ کا وجود ناکارہ ہے۔“ میں نے انہیں چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آج بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں سے بہتر ہیں۔ زندگی میں اونچ نیچ تو آتی رہتی ہے۔ آج ہمارے حالات خراب ہیں تو کل بہتر بھی ہو سکتے ہیں۔“

”تم جھوٹی تسلی دے رہی ہو۔ مجھے تو بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔“

”اس میں تھوڑا سا قصور آپ کا بھی ہے۔ آپ اپنی صحت پر توجہ نہیں دیتے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنا علاج کروائیں۔ صحت ٹھیک ہوگی تو کام بھی کر سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ آپ بھی زمانے کے ساتھ چنا سکیں۔ نا تجربہ کار اور اناڑی کار میگر آپ سے زیادہ کم رہے ہیں۔ فٹ پاٹوں اور چوراہوں پر بیٹھنے کی بجائے کسی ٹھیکے دار کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اگر وہ کمیشن مانگتا ہے تو دے دیں۔ کچھ نہ کچھ تو اچھا آئے گا۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”شاید یہی کرنا پڑے گا۔“

میں خوش ہو گئی۔ کم از کم میری باتوں سے ان میں اتنی ہمت تو آئی۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھنے کا سوچا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔ ”بابا اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔“

”کہوں، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

”بات یہ ہے کہ میرے امتحانات ختم ہو گئے ہیں۔

زیادہ تر کے پاس اپنی موٹر سائیکل اور موبائل فون ہے۔ انہوں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ چھپوا رکھے ہیں وہ روزانہ شام کو زیر تعمیر مکانوں کا چکر لگاتے ہیں اور مالک یا ٹھیکے دار سے مل کر کام پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بابا ان سب تکلفات سے بے نیاز ہیں۔ وہ ابھی تک اسی زعم میں ہیں کہ لوگ رحمت علی کو ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے اور انہیں اپنے ساتھ کام کروانے لے جائیں گے۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی بھی بابا کے کام پر بری طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ پہلے لوگ سال دو سال بعد اپنے مکان پر رنگ و روغن کروا لیا کرتے تھے لیکن اب پانچ دس سال تک کوئی نام نہیں لیتا۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور لوگوں کی قوت خرید دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ بمشکل تمام گھر کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ رنگ کروانے کی عیاشی کون کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بابا دن بھر مصروف چوراہوں اور فٹ پاٹوں پر بیٹھنے کے بعد شام کو منہ لٹکائے خالی ہاتھ گھر آ جاتے۔

اس صورت حال میں بھی امی نے ہمت نہ ہاری اور سلائی کی مشین لے کر بیٹھ گئیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے کچن سنبھال لیا تاکہ امی یکسوئی سے اپنا کام کر سکیں حالانکہ میری بڑی خواہش تھی کہ آگے پڑھوں لیکن گھر کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لہذا میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ موقع ملا تو انٹر کا امتحان پرائیویٹ دے دوں گی۔ ابتداء میں تو امی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی اور لاکڑ کاٹکا مور تیس ہی ان کے پاس پکڑے سلوانے کے لیے آئیں کیونکہ آج کل درزی سے کپڑے سلوانے کا رواج بڑھ گیا ہے اور معمولی گھرانوں کی لڑکیاں بھی ٹیلر کو ہی ترجیح دیتی ہیں۔ ہمارے محلے میں زیادہ تر غریب لوگ رہتے تھے اور ان کی استطاعت نہیں تھی کہ وہ درزی سے کپڑے سلواسکیں۔ لہذا بڑی عمر کی خواتین اور انتہائی غریب لڑکیاں امی کے پاس کپڑے سلوانے کے لیے آنے لگیں۔ اس طرح ہمارے حالات کچھ بہتر ہو گئے۔

میں چائے لے کر کمرے میں گئی تو بابا اوندھے منہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئے ان کا چہرہ بیگناہ ہوا تھا۔ شاید وہ رو رہے تھے۔ میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔ ”بابا! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے حالات جلد بہتر ہو جائیں

علاوہ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ بچانے بچپن میں ہی مجھے طاہر کے لیے مانگ لیا تھا۔ اس لیے میں بھی اسے اپنا سب کچھ مجھے لگی تھی اور اسے ہر کام کے لیے اسی کی طرف دیکھتی۔

وہ شام کو کوچنی کے بعد میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”ابھی تم اٹھارہ سال کی نہیں ہوئیں۔ تمہیں ملازمت نہیں مل سکتی۔“

میں نے جل کر کہا۔ ”اور یہ جو درکشاپوں اور گیراجوں میں بارہ بارہ سال کے لڑکے کام کرتے ہیں۔ ان پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔“

”بالکل ہوتا ہے لیکن یہ درکشاپ اور گیراج لیبر ڈیپارٹمنٹ میں رجسٹرڈ نہیں ہوتے۔“

”تم مجھے کسی غیر رجسٹرڈ ادارے کا پتا دو۔ میں وہاں چلی جاتی ہوں۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو سہا۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم صرف میٹرک پاس ہو۔ تمہیں کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ اگر پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتیں تو کوئی کورس کرو۔“

”آج کل کمپیوٹر کی بہت مانگ ہے اگر تم نے چھ مہینے کا بھی کورس کر لیا تو چانس میں مل سکتا ہے۔“

”لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ یہاں فیسیں بھی علاقوں کے حساب سے مقرر ہیں۔ اگر ڈینس میں ہے فیس دس ہزار ہے تو لیبر میں زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہوگی۔ میرے ایک دوست کا انٹی ٹیوٹ ہے اس سے بات کرنا ہوں۔ شاید وہ کچھ رعایت کر دے۔“

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اگر اس کے دوست نے رعایت کر بھی دی تو میں وہ فیس کہاں سے دوں گی۔ میرے پاس تو سو روپے بھی نہیں تھے۔ بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ دوسرے دن میں اس اسکول میں لگی جہاں میں نے میٹرک تک پڑھا تھا۔ وہاں سب نمبرز مجھے جانتی تھیں بلکہ ہیڈ مسٹر ایس کی تو میں چینی تھی۔ میں نے انہیں مختصر اپنے حالات بتائے اور کہا کہ میں کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔

انہیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگیں۔ ”تم جیسی ذہین اور باصلاحیت لڑکی کی تعلیم ختم ہونا ایک المیہ ہے۔“

سارا دن فارغ رہتی ہوں۔ بہت پوریت ہوتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کوئی جاب کروں۔“

ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جیسے انہیں میری بات سے شدید دکھ پہنچا ہو۔ وہ بھرائی آواز میں بولے۔ ”تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے جتنے جی یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تمہاری پڑھائی باقی ہے۔ کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کرو۔“

”بابا کیا ملے گا آگے پڑھ کر۔ میں چاہے ڈاکٹر انجینئر بن جاؤں، ماسٹر ز کروں۔ شادی کے بعد تو چلوں ہی جموں گنا ہے پھر میں اپنا وقت اور آپ کا پیسہ کیوں ضائع کروں۔ ویسے بھی ہمارے حالات ایسے نہیں کہ کالج کی پڑھائی کا خرچ برداشت کر سکیں۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تیز لہجے میں بولے۔

میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”بابا آپ جذباتی نہ ہوں۔ یہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ میں بچی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں۔ اولاد ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے۔ آپ نے ساری عمر ہمارے لیے کام کیا۔ اب ہماری باری ہے۔ آپ مجھے کام کرنے سے نہ روکیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جیسے ہی حالات بہتر ہوں میں پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں گی۔“

وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔ ”لیکن تم نے ابھی صرف میٹرک کیا ہے۔ تمہیں کہاں نوکری ملے گی۔“

”آپ مجھے کوشش تو کرنے دیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے۔ میں دوسرے دن سودا لینے کے بہانے قریبی پٹی سی او پر گئی اور طاہر کو فون کر کے کہا کہ وہ فوری طور پر مجھ سے ملے۔ وہ میرا چچا زاد بھائی تھا اور ٹیکنیکل کالج سے ڈپلوما کرنے کے بعد لائسنس کی کسی فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ چچا کے مالی حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے لیکن وہ ہمارے مقابلے میں بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی لیکن چچی اپنے آپ کو سیٹھانی سمجھتی تھیں اور طاہر کی ملازمت کے بعد تو ان کا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا تھا۔ وہ بے حد فضول خرچ تھیں اور چچا کی آمدنی کے علاوہ طاہر انہیں جو کچھ دیتا اسے بھی وہ بے دردی سے اڑا دیتیں۔ طاہر کے



چتا۔ مجھ پر بہت فٹے داریاں ہیں۔ بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے اور امی ابو کو حج کروانا ہے۔ تم ہی بتاؤ یہاں رہ کر میں یہ سب کر سکتا ہوں؟“

اس کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں اس پلان میں کہیں نہیں مٹی، جی چاہا کہ پوچھوں میرے بارے میں کیا سوچا ہے لیکن خودداری آڑے آگئی۔ اسے صرف اپنے گھر والوں کی فکر تھی۔ میرا کوئی خیال نہیں تھا۔ لہذا منہ پھیر کر بولی۔ ”جاؤ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“

ظاہر کے جانے کے بعد زندگی بے کیف لگنے لگی۔ گو کہ وہ کئی کئی دن بعد آیا کرتا تھا لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنک اتر آتی تھی۔ میں اسے جتنا بھلانے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ یاد آنے لگتا۔ میں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ صبح اسکول جاتی۔ شام کو انٹرنیٹ ٹیوٹ اور رات کو پڑھائی کرتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ میں نے انٹر کالرس کے ساتھ کمپیوٹر کا ایڈوانس کورس کر لیا اور شدت سے بہتر ملازمت تلاش کرنے لگی۔

ظاہر اس دوران ایک دفعہ چھٹیوں پر گھر آیا تو اس نے کچھ دیر کے لیے ہمارے یہاں آنے کی زحمت بھی ادا کر لی۔ اس نے رسماً باپ کی خیریت دریافت کی۔ امی سے کچھ باتیں کیں اور پھر میرے پاس چلا آیا۔ وہ خاصا کمزور اور دلا لگ رہا تھا۔ اس نے کھانے انداز میں کہا۔ ”کیسی ہو سیم؟“

”میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ لگتا ہے بہت زیادہ کام کر رہے ہو یا کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتے۔“

”دونوں ہی باتیں ہیں۔“ وہ ہنسی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ کھانے کے لیے زیادہ محنت کرتا ہوں ہے اور وہاں کون ہے جو میرے کھانے پینے کا خیال رکھے۔ بس جوں جوں کھانا لیتا ہوں۔“

”پھر بھی تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ صحت سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے کہا اور کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن وہ کچھ مضطرب لگ رہا تھا جسے کچھ کہنا چاہا ہو لیکن ہمت نہ پڑ رہی ہو۔

دیکھو میں اسکول کے مالک سے بات کر کے تمہارے لیے کوئی جگہ نکالتی ہوں۔ تم دو دن بعد آنا۔“

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھے مددگار ٹیچر کی جاب دے دی۔ تنخواہ تو کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا اور میں کم از کم کمپیوٹر کورس کی فیس یا آسانی دے سکتی تھی۔ میرے ذمہ مختلف نوعیت کے کام تھے۔ مثلاً طالب علموں سے فیس وصول کرنا، اہم کاغذات کی فائلیں بنانا اور کسی ٹیچر کی غیر موجودگی میں اس کی کلاس لینا۔ میں صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اسکول میں رہتی اور شام کو کمپیوٹر انٹرنیٹ ٹیوٹ چلی جاتی۔ اسکول کے دفتر میں بھی کمپیوٹر تھا اور میں فارغ وقت میں اس پر پریکٹس کرتی رہتی۔

پہلی تنخواہ ملنے پر میں بابا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس مٹی اور ان کا مکمل چیک اپ کروایا۔ اس نے باقاعدگی سے دوا استعمال کرنے کی ہدایت کی اور ماسک لگا کر کام کرنے کے لیے کہا۔ میں نے بابا سے ان دونوں باتوں پر عمل کرنے کا وعدہ لیا۔ میرے نزدیک ان کا صحت مند ہونا زیادہ اہم تھا۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ کام کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ میرا کمپیوٹر کورس مکمل ہو گیا تو میں نے مختلف کمپنیوں میں ملازمت کے لیے درخواستیں دینا شروع کر دیں۔ ظاہر کا خیال تھا کہ مجھے ایڈوانس کورس بھی کر لینا چاہیے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ ہی فرسٹ ایئر کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی۔ میں ہر اتوار کو اخبار میں اشتہار دیکھ کر دو چار جگہ ملازمت کے لیے درخواست بھیجی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ آتا۔ البتہ میڈم میرے کام سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے دفتر کا سارا کام مجھے سونپ دیا۔ میری تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور اب میں نسبتاً پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔

اس روز ظاہر آیا تو اس کا منہ اتر ا ہوا تھا۔ اس نے بھڑائی ہوئی آواز میں بتایا کہ اسے دہی میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ ایک ہفتہ بعد جا رہا ہے۔

یہ سن کر میں صدمے کی کیفیت میں آگئی اور بولی۔ ”یہاں بھی تو اچھی خاصی ملازمت تھی۔ پھر دربر کی ٹھوکریں کھانے کیوں جا رہے ہو؟“

”یہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”جو کماتا ہوں۔ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں کچھ نہیں ہے۔ ہر مہینے پوری تنخواہ نکال لیتا ہوں اور کچھ نہیں

کی شادی سراسر گھائے کا سودا ہے۔ جس گھر میں دودھ کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہوں وہاں سے بھاری بھر کم جہیز کی توقع کیے کی جاسکتی ہے۔“

اب امی کے بولنے کی باری تھی۔ انہوں نے چچی کو کڑی نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ”نتی آسانی سے تم نے کہہ دیا کہ رشتہ ختم کر دو۔ پورے خاندان کو معلوم ہے کہ یہاں اور ظاہر ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ انہیں کیا وجہ بتائی جائے گی؟“

”کچھ بھی کہہ دینا۔“ چچی بے نیازی سے بولیں۔ ”کئی کئی سال پرانی مشکلیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہاں تو صرف بات ہی طے ہوئی تھی۔“

بابا نے پُر امید نظروں سے چچی کی طرف دیکھا تو وہ نظرس چراتے ہوئے بولے۔ ”سیما مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بلا وجہ ہی انتہا کی سولی پر لٹکتی رہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دو۔“

”تمہارے مشورے کا شکریہ۔“ بابا نے تخی سے کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کا برا بھلا خود سمجھ سکتا ہوں۔“

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ پیسے کے سامنے خونی رشتے بھی بچتے ہیں۔ چچا کے گھر میں چار پیسے کیا آئے کہ انہوں نے سگے بھائی کے اربانوں کا بھی خون گردیا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک ہو گیا کہ آج کے دور میں پیسا ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور لوگ پیسے والوں کی چوٹ پر ہی سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے ظاہر کا نام اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک دیا اور فیصلہ کر لیا کہ پیسے کو ہی اپنی طاقت بناؤں گی تاکہ کل کوئی اور نو دو لتیا میرے گھر آ کر مجھے یا میرے باپ کو ذلیل نہ کر سکے۔

پیسہ کمانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ جائز اور ناجائز۔ میری رگوں میں شریف باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس لیے ناجائز کمائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جائز طریقے سے پیسے حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس تعلیم یا کوئی ہنر ہو بہت سوچنے کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا ہنر ہے جس کے ذریعے میں زیادہ سے زیادہ پیسے کماسوں۔ چنانچہ میں نے اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں دوسری ملازمت کا خیال دل سے نکال دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اسکول کی جاب پر اکتفا کرتے ہوئے بی کام میں داخلہ لے لیا پھر

کچھ دنوں بعد اس کی بے چینی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ وہ ایک مہینہ راہ کر دئی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے ایک ہفتہ بعد چچی اور چچی ہمارے گھر آئے۔ چچی نے بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور گلے میں لاکٹ جھنگار رہا تھا۔ ان کی ج ج دج دج کر لگ رہا تھا جیسے بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی ہیں۔ وہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹی لگ رہی تھیں۔ چچانے بھی بہت مہنگا کرتہ شلوار کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور بابا ان کے سامنے کم حقیقت لگ رہے تھے۔ مجھے چچی اپنی چھچھوری طبعیت کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں لگیں۔ اس لیے میں چائے دے کر وہاں سے ہٹ گئی البتہ یہ جانتی تھی کہ ان کی آمد بے مقصد نہیں۔ اس لیے دروازہ کی اوٹ سے ان کی باتیں سننے لگیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چچی اپنے مطلب کی بات پرائیں اور گلا صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ”بھائی صاحب! میں تو چاہ رہی تھی کہ اس بار کوئی رسم ادا کر دیجی لیکن آج کل کے لڑکے ہماری کہاں سنتے ہیں۔ اس نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ بابا بولے۔ ”اگلی بار آیا تو دیکھ لیں گے۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔“

”مجھے تو اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ چچی بولیں۔ ”جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ بولا کہ وہ فی الحال اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ ابھی اس پر بہت ذمے داریاں ہیں بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔“

”اجت ہے وہ۔“ چچا غصے سے بولے۔ ”یہ تو دس سال کا پروگرام لگتا ہے۔ کیا اتنا عرصہ سیما اس کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔“

”بہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہے تو ہمیں یہ رشتہ ختم کر دینا چاہیے۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے اور وہ کیا چاہ رہا ہے۔“

میرے اندر کوئی چیز چمن سے ٹوٹ گئی۔ یوں لگا جیسے مجھ پر آسمان آن گرا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ ظاہر نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا۔ یہ سب چچی اپنی طرف سے کہہ رہی تھیں۔ دراصل پیسا آنے کے بعد ان کی نگاہیں بدل گئی تھیں اور وہ ہم لوگوں کو بہت حقیر و کمتر سمجھنے لگی تھیں۔ لاچ نے ان کی آنکھوں پر پٹی ڈال دی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میری اور ظاہر

رہا ہوں اگر وقت پر اسے قبضہ نہ دے سکا تو میری بات خراب ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم رنگ و روغن کا کام شروع کر دو۔“

”جو حکم آپ کا۔“ بابا دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولے۔

”دو لے تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے کام میں صفائی اور نفاست ہوگی لیکن اپنے اطمینان کے لیے میں پہلے تم سے ایک کمرہ کرادوں گا۔ اگر مالک کو پسند آگیا تو پھر پورے بیٹکے کا کام تم ہی کو کرنا ہوگا۔ تم کل صبح سے ہی کام شروع کر دو۔ رنگ کے ڈبے میں نے منگوا لیے ہیں۔ باقی جو سامان چاہیے وہ تم میرے پردانز کو بتا دینا وہ بھی آجائے گا۔“

اس وقت غالباً دو بج رہے ہوں گے جب بابا گھر آئے۔ میں اور امی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں کیونکہ وہ شام سے پہلے گھر نہیں آتے تھے۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی لیکن بابا کا چہرہ خوشی سے تہمتار ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے ایک گلاس پانی مانگا اور پھر پورا قصہ سنا دیا۔ ہاشمی صاحب شہر کے بہت بڑے بلڈر تھے۔ ان کے کئی پروجیکٹ مکمل ہو چکے تھے اور اس وقت بھی ان کا ایک پلازہ زیر تعمیر تھا۔ اگر انہیں کام پسند آجاتا تو بابا کی پریشانی دور ہو جاتی کیونکہ ہاشمی صاحب کا کوئی نہ کوئی پروجیکٹ چلتا رہتا تھا۔

دوسرے دن بابا نے اپنے ایک پرانے شاگرد کو ساتھ لیا اور بیٹکے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے سپردانز کو سامان لکھوایا اور کام شروع کر دیا۔ شام تک کمرہ تیار ہو گیا۔ ہاشمی صاحب شام کو مالک کے ساتھ آئے اور دونوں کو کام پسند آگیا۔ ہاشمی صاحب نے بابا سے معاوضہ کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ وہ جو معاوضہ دوسرے کارمیکروں کو دیتے ہیں وہی دے دیں۔ انہوں نے جو معاوضہ بتایا۔ وہ بابا کی توقع سے زیادہ تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ٹھیکہ دار بیچ میں اچھا خاصہ کمیشن بنا رہا تھا۔ غرض یہ کہ بابا سے معاملات طے ہو گئے اور بابا نے دوسرے دن سے کام شروع کر دیا۔

ہاشمی صاحب کی خواہش تھی کہ رنگ و روغن کا کام جلد از جلد مکمل ہو جائے تاکہ وہ اپنے دوست کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ اس لیے بابا نے اپنے ساتھ ایک کی بجائے دو شاگرد لگائے تاکہ کام جلدی نمٹ جائے۔ اتفاق سے تیسرے روز ٹھیکہ دار اور اس کی پارٹی بھی واپس آگئی لیکن

میں گھر کے قریب واقع ایک کوچنگ سینٹر میں گئی۔ انہوں نے مجھے نوٹس اور دسویں جماعت کی کلاسیں دے دیں۔ اس طرح مجھے وہاں سے بھی آمدنی ہونے لگی۔

بابا کے حالات ویسے ہی تھے۔ بھی کام مل جاتا اور کبھی خالی ہاتھ واپس آ جاتے۔ پھر بھی امی کی سلائی اور میری ملازمت سے کچھ سہارا ہو گیا تھا۔ اب میں پوری لگن اور محنت کے ساتھ بی کام کی تیاری کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گریجویشن کرنے کے بعد مجھے کسی بینک یا پرائیویٹ فرم میں اچھی جاب مل جائے گی۔ پھر اچانک ہی بابا کی روشنی ہوئی قسمت ان پر مہر پان ہو گئی۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق منورا چورنگی پر انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کار ان کے پاس آ کر رکی اور اس میں سے ایک خوش پوش آدمی اتر کر ان کے پاس آیا۔ بابا اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

اس آدمی نے کہا۔ ”رنگ کا کام کرتے ہو؟“  
”جی جنتاب۔“ بابا نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“

اس آدمی نے انہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اپنے ساتھ گلستان جوہر کے ایک بیٹکے پر لے گیا۔ وہ چار سو گز پر دو منزلہ بنا ہوا تھا اور ابھی اس کی فٹنگ باقی تھی۔ اس نے بابا کو وہ بیگلا دکھانے کے بعد کہا۔ ”کب سے یہ کام کر رہے ہو؟“

”صاحب! تیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔ میرے باپ دادا ابھی یہی کام کرتے تھے۔“

”تعب ہے۔ اتنے تجربہ کار ہونے کے باوجود تم فٹ پاتھ پر بیٹھے جاگ کا انتظار کر رہے تھے۔ تمہارے پاس تو کام کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔“

”بس جی قسمت کی بات ہے۔“ بابا نے کہا۔  
”دراصل مجھے وہ جھکنڈے نہیں آتے جو کام پکڑنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں اور نہ ہی میں دکان داروں اور ٹھیکہ داروں کی کمیشن دیتا ہوں۔“

”تم مجھے ایمان دار اور کھرے آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”دراصل میرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرا ٹھیکہ دار دارکار مگر عید کی چٹیوں میں پنجاب گئے تھے لیکن ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے کام رک گیا ہے۔ یہ مکان اپنے ایک دوست کے لیے بنا

لی تھی اور کارگر کی بجائے ٹھیکے دار بن گئے تھے۔

میرا بی کام مکمل ہوا تو مجھے ایک بینک میں جاب مل گئی۔ بابا نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ ملازمت کروں۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن میری نظر اپنے مستقبل پر تھی۔ بی کام کی ڈگری میری منزل نہیں تھی چنانچہ میں نے بابا کو مجبور کیا کہ وہ مجھے ملازمت کرنے سے نہ روکیں۔ میری ضد کرنے پر وہ راضی ہو گئے لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ میں اپنی خواہ کا ایک پیسا بھی گھر پر خرچ نہیں کروں گی بلکہ اپنے اخراجات کے بعد جو بچے گا وہ سب میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ میں نے ان کی شرط مان لی اور بینک جانا شروع کر دیا۔

کچھ دن بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آگے بڑھنے کے لیے بی کام کی ڈگری کافی نہیں۔ برائے میں بڑی پوسٹوں پر سب بی بی اے یا ایم بی اے تھے چنانچہ میں نے بھی اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کے بارے میں سوچا اور انگریزیکٹونی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اس کی کلاس صرف اتوار کو ہوتی تھی۔ باقی بڑھائی میں گھر پر ہی کرتی۔

طاہر کو دینی گئے چار سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اس کی کسی بہن کی شادی ہوئی، مکان بنا اور نہ ہی گاڑی آئی۔ سب کچھ ویسے ہی تھا۔ وہ جو کچھ کاتا۔ سب اس کے گھر والے اللوں تللوں میں اڑا دیتے۔ اس کے برعکس ہمارے گھر کے حالات کافی بہتر ہو گئے تھے۔ بابا نے نئے سرے سے گھر کی تزئین و آرائش کروائی۔ نیا فرنیچر، پردے، کراڑی، فرنیچر، ٹی وی، واشنگ مشین، ادون غرض ضرورت کی ہر چیز ہمارے گھر میں تھی۔ میں نے ضد کر کے ان کے کمرے میں اے سی بھی لگوا دیا تھا۔ میرے دونوں بھائی کالج میں پہنچ چکے تھے اور میری خواہش تھی کہ وہ بھی ایم بی اے کریں۔

ایک دن غیر متوقع طور پر چچا چچا لگے ان کی ایک بیٹی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور اس کی شادی کا بلاوا دیئے آئے تھے۔ وہ ہماری کاپیالٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عین اسی وقت میں بھی گھر میں داخل ہوئی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں بینک میں ملازمت کر رہی ہوں تو ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر اچانک ہی چچی کی محبت جوش میں آ گئی۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور میرا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔ ”شباباش بیٹی۔ تم نے خاندان کا نام روشن

ہاشی صاحب نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ ان کے پاس آدمیوں کو کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کی سائٹ پر درجنوں لوگ کام کر رہے ہوتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت ان کے پاس کوئی دوسرا رنگ ساز نہیں تھا۔ اس طرح بابا کا کام بن گیا۔

بابا نے اپنا کام وقت پر مکمل کیا تو ہاشی صاحب بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے معاوضہ کے علاوہ بابا کو ایک موبائل فون بھی تحفے میں دیا تھا اور وعدہ کیا کہ جیسے ہی ان کے زیر تعمیر قلیٹوں میں رنگ کا مرحلہ آئے گا وہ انہیں بلا لیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس دوران اگر ان کے کسی جاننے والے لوگ رنگ سازی کی ضرورت پیش آئی تو وہ بابا کا نام ہی تجویز کریں گے۔ اس کام میں انہیں اتنے پھیل گئے کہ وہ دو مہینے تک گھر بیٹھ کر کھا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا اور اگلے کام کی تلاش میں لگ گئے۔ میرے کہنے پر انہوں نے اپنے وزینٹنگ کارڈ بھجوائے اور مارکیٹ میں تمام رنگ کی دکانوں پر دے دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے دونوں شاگردوں کی بھی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ جہاں کہیں کوئی زیر تعمیر عمارت دیکھیں، اس کے چوکیدار کو ان کا کارڈ دے دیں۔

ایک ہفتہ بعد ہی ہاشی صاحب کا فون آ گیا۔ اس بار انہیں اپنے ایک دوست کے لیے رنگ سازی کی ضرورت تھی جس کی ایک ہزار گز کی کوشی ڈھنسی میں زیر تعمیر تھی۔ ہاشی صاحب نے بابا کے کام کی اتنی تعریف کی کہ وہ دوست انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے پر تیار ہو گیا۔ یہ بھی بہت بڑا کام تھا اور اس میں بابا کو اچھی خاصی آمدنی ہوئی۔ اس کے بعد ہاشی صاحب نے بابا سے کہا کہ وہ گھر پر آرام کریں کیونکہ چند روز بعد ان کی قلیٹ سائٹ پر کام شروع ہونے والا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ اس وقت وہ کسی دوسری جگہ پھنسنے ہوئے ہوں۔

بابا کی تو لائری نکل آئی۔ اس پروجیکٹ میں سو سے زیادہ قلیٹ تھے۔ اگر بابا چار آدمیوں کے ساتھ کام کرتے تب بھی تین چار مہینے لگ جاتے۔ یہ سب اوپر والے کا کرم تھا۔ بابا اب پوری طرح فارم میں آچکے تھے۔ ان کی صحت بھی بحال ہو چکی تھی۔ ہاشی صاحب کا ساتھ انہیں خوب راس آیا تھا۔ ان کا ایک کام ختم نہ ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا۔ درمیان میں ان کے دوستوں اور جاننے والوں کے کام بھی نکلے رہتے تھے۔ اب انہوں نے ایک موٹر سائیکل بھی لے

”یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم تو خوش ہوتا؟“

”ہاں بہت۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جتنا سیکھ لیا ہے۔“

ایک دن میں نے اخبار میں ہاشمی صاحب کے نئے پروجیکٹ کا اشتہار دیکھا اور بابا کے سر ہو گئی کہ وہ مجھے ہاشمی صاحب کے پاس لے چلیں۔ میں ایک اپارٹمنٹ بک کروانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ میں اتنے مہنگے فلیٹ کی فیس نہیں دے پاؤں گی لیکن میں نے پہلے ہی حساب لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بابا کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ اس بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ ضرورت پڑی تو میں بینک سے بھی لون لے سکتی ہوں۔ میرے بعد اصرار پر وہ مان گئے۔

ہاشمی صاحب کا دفتر ایک شاندار عمارت میں واقع تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں ان کے نئے پروجیکٹ میں اپارٹمنٹ بک کرانا چاہتی ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے میرے سامنے تین پلان رکھے کہ ان میں سے جو منتخب کروں گی وہ اسی کا پے منٹ شیڈول بنوا دیں گے۔ میں نے ورمانے سائز کا فلیٹ منتخب کیا۔ اس میں تین بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ، ٹی وی لائونگ، امریکن کچن اور دیگر تمام سہولیات تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ویسٹ اوپن اور کارنر فلیٹ کی بھی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ راحت ملی کی بیٹی میرے پاس سے خالی ہاتھ واپس جائے۔ میں تمہیں قیمت میں تین لاکھ کی رعایت دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مینٹ شیڈول بھی تم اپنی مرضی سے بناؤ گی۔ تمہیں یہ قیمت تین سال میں ادا کرنی ہے۔ اس کے بعد یہ فلیٹ تمہارا۔ فی الحال تم کچھ پیسے ٹوکن منی کے طور پر جمع کروا دو تا کہ تمہاری فائل بن جائے۔“

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک لاکھ کا چیک کاٹ کر ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے منیجر کو بلا کر وہ چیک اسے دے دیا اور میری فائل بنانے کی ہدایت کی۔ اس نے چند منٹ بعد فائل میرے حوالے کر دی اور اس طرح وہ فلیٹ میرے نام ہو گیا۔ بابا حیرت سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کیا بتانی کہ جس دن مجھے اسکول سے پہلی

کردیا۔ ایک ہماری بیٹیاں ہیں۔ انہیں بنے سنور نے یہ فرصت نہیں۔ بھائی کے پیسے پر عیش کر رہی ہیں۔“

امی نے مجھے اشارہ کیا اور میں ان کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنے کچن میں چلی گئی لیکن میرے کان وہیں گئے ہوئے تھے۔ چچی نے راز دارانہ انداز میں امی سے پوچھا۔

”اس کی کہیں بات چلی؟“

”نہیں ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔“ امی نے جواب

دیا۔

”اے سے اور کتنا پڑھے گی۔ بس ایک ڈگری کافی ہے۔ ویسے بھی لڑکیوں کی شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ امی نے تنک کر کہا۔

”ابھی تو وہ پڑھیں گی ہے۔ اچھا ہے اپنی پڑھائی مکمل کر لے شادی دو چار سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔ تم بتاؤ ظاہر کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھی؟“

عین اسی وقت میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئی۔ انہوں نے حسرت سے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ ”وہ شادی کے لیے تیار تو ہو، اس نے تو ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ ذمے داریوں سے فارغ ہونے کے بعد شادی کرے گا۔ دیکھو اس مرتبہ آئے گا تو اسے پھر سمجھانے کی کوشش کرنی ہوں۔“

ظاہر بہن کی شادی میں آیا تو وہ پہلے سے بھی کمزور اور دبلا لگ رہا تھا۔ گال ہلکے ہوئے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ شادی کے ہنگاموں میں تو اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملا لیکن جب وہ جانے سے پہلے بابا سے ملنے آیا تو میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ظاہر؟“

”تم تو جانتی ہو سیما کہ پیسے درختوں پر نہیں گئے ہوتے کہ ہاتھ بڑھا کر توڑ لو۔ اس کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں لیکن کسی طرح پورا نہیں پڑتا اگر میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح نارمل ڈیوٹی کرتا تو شاید میرا یہ حال نہ ہوتا لیکن مجھے تو اور ٹائم کے لیے سپرا انزری خوشامدیں کرنا پڑتی ہیں۔“

”دیکھو ظاہر پیسا محنت سے بڑھ کر نہیں ہوتا، تم اتنا ہی کام کرو جتنا کر سکتے ہو۔ تمہارے گھروالوں کو بھی اپنے اخراجات کم کرنا چاہئیں۔“

ظاہر پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور لاغر نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ دو بہنوں کی شادی اور اس کے گھر والوں کے شاہانہ اخراجات نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے چھکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ”کامیابی کا سفر مبارک ہو سیسا۔ ماشاء اللہ خوب ترقی کی ہے۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ اس کامیابی کا کریڈٹ بھی تمہیں ہی جاتا ہے۔ اگر تم مجھے نہ ٹھکراتے تو میں بھی آگے بڑھنے کے بارے میں نہ سوچتی لیکن وہ موقع ایسی باتوں کا نہیں تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ”لگتا ہے کہ تم نے میرے مشورے پر دھیان نہ دیا۔ اس لیے پہلے سے زیادہ کمزور نظر آ رہے ہو؟“

”میں کیا کروں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”اتنا کام کرنے کے باوجود بھی پورا نہیں پڑتا۔ ابھی بہنوں کی شادی سے فارغ ہوا ہوں تو مزید ڈیماٹڈ سامنے آگئی ہے۔“

”تم تو جانتی ہو کہ امی میں حرص کا مادہ بہت ہے۔ تمہاری گاڑی دیکھ کر ان کے دل میں بھی یہ خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ اس کے ساتھ انہیں اپنے ذاتی مکان میں رہنے کی بھی آرزو ہے۔“

میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”وہ گاڑی مجھے بینک سے ملی ہے۔“ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”خواتین انسان کے دل میں خود روپوں کی طرح اٹکتی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری اور یہ سلسلہ بھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر تم انہیں پورا کرتے رہے تو ساری عمر کہو کے تیل کی طرح چکر کھاتے رہو گے۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”اپنے کان بند اور ہاتھ روک لو۔ صرف اتنے پیسے بھی بچو جن سے گھر کا خرچ چلتا رہے۔ میرے خیال میں گاڑی سے پہلے مکان کا بندوبست ہونا چاہیے۔ جب تم اگلی بار آؤ گے تو اس کا صلہ بھی بتاؤں گی۔“

میں یہ سب باتیں اس کی ہمدردی میں کر رہی تھی۔ بہر حال وہ میرا کزن اور بچپن کا دوست تھا۔ اس نے یا ان کے گھر والوں نے جو کچھ کہا وہ ان کا فعل تھا لیکن میرے دل میں اس کے لیے کوئی بغض نہیں تھا۔ ہر انسان کی اپنی مجبوریوں اور مصیبتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے کوئی

تنخواہ ملی۔ تب سے ہی کچھ نہ کچھ پس انداز کر رہی تھی۔ گھر آ کر بھی بابا بڑ بڑاتے رہے۔ انہیں بھی فکر ستائے جا رہی تھی کہ اگر میں تین سال میں قسطیں ادا نہ کر سکی تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اول تو ایسا ہو گا نہیں چھ مہینے بعد میری پردوشن ہونے والی تھی۔ اس کے بعد تنخواہ بھی بڑھ جاتی اور اگر بالفرض محال میں قسطیں ادا نہ کر سکی تب بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہی ہاشمی صاحب مارکیٹ ریٹ پر میرا فلیٹ لے لیں گے اور مجھے کچھ فائدہ ہی ہو جائے گا۔

میرا کوئی خاص خرچ تو تھا نہیں سوائے ٹرانسپورٹ کے، کپڑے بنانے کا بھی شوق نہیں تھا۔ اس لیے تقریباً پوری تنخواہ ہی بچ جاتی۔ البتہ یونیورسٹی کی سیمسٹر فیس دینا پڑتی تھی۔ میں نے بی بی اے کیا تو مجھے آفیسر گریڈ ٹو بنادیا گیا۔ تنخواہ میں خاصا معقول اضافہ ہوا اور مجھے بینک سے گاڑی بھی مل گئی۔ میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی اور وہ دونوں برسرِ روزگار تھے۔ اب مجھے گھر کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی اور میری پوری توجہ ایم بی اے پر تھی۔

ظاہر کی دوسری بہن کی بھی شادی ہو گئی۔ ایک بار پھر اس سے میرا سامنا ہوا۔ جب میں مہندی کی تقریب میں شرکت کرنے گاڑی چلاتی ہوئی اس کے گھر پہنچی تو سب کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس میزک پاس لڑکی کو انہوں نے غریب ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اس مقام تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ چچی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے سر پر بٹھا لیں۔ سب مہمانوں سے فخریہ انداز میں میرا تعارف کرواتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”یہ میری بیٹی ہے۔ بینک میں افسر کی ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ بہت ترقی کی ہے اس نے۔“

چچا بھی پھولے پھولے پھر رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے مجھے اس مقام تک پہنچانے میں انہی کا ہاتھ ہو۔ مجھے ان لوگوں کی منافقت پر غصے کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جب ہم کچھ نہیں تھے تو یہ ہمیں ٹھکرا کر چلے آئے اور اب یہ ہمارے ٹوکے چائے پر تیار نظر آ رہے تھے۔ یہ پیسے کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ واقعی یہ دنیا چڑھتے سورج کی پجاری ہے۔ رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ ہنسنے والے کا ساتھ سب دیتے ہیں لیکن ابھی میرا سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور بھی منزلیں سر کرنا تھیں۔ میں ان لوگوں کو دکھانا چاہ رہی تھی کہ ایک بے بس اور مجبور لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے۔



سے غیر مطمئن تھے۔ اب انہیں میری شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ میں سنا کیس کی ہونے والی تھی اور امی کا خیال تھا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیے، میں خود بھی گھر بسانا چاہ رہی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ خاندان برادری میں کوئی لڑکا میرے ہم پلہ نہ تھا۔ سب ہی کم تعلیم یافتہ، ہنرمند اور چھوٹی موٹی ملازمتیں کر رہے تھے اگر کسی کو میرا خیال آیا بھی تو میری تعلیم اور انشیس دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ہو۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ ایک کلائنٹ مجھ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ بہت چنڈم اور ڈشنگ بندہ تھا اور امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے وابستہ تھا۔ وہ اکثر اپنے کاموں کے سلسلے میں بینک آتا تو کچھ دیر میرے پاس بھی ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ ایک بڑی آسانی تھا اور براچ مینیجر کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ اس کی ہر ممکن مدد کروں۔ ایک دو معاملات میں، میں نے اسے فور بھی دیا جس کے بعد وہ میرے اور قریب آ گیا۔

عورت کو قدرت نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مرد کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیتی ہے۔ شارق نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میں اس کی نگاہوں کا پیغام پڑھ چکی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اس کی شوخی بڑھتی گئی۔ کبھی بھی تو وہ کھٹشوں بیٹھا رہ جاتا لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا لیکن اس دن وہ مطلب کی بات پر آئی گیا۔ اس دن وہ کسی کام کے سلسلے میں بینک آیا تھا۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ بولا۔

”آپ کی شام میں کیا مصروفیت ہوتی ہے؟“

”کچھ نہیں، یہاں سے سیدھی گھر جاتی ہوں اور فمیلی کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دن آپ میرے ساتھ ڈنر پر چلیں؟“

”سوری، اس کے لیے مجھے اپنے گھر والوں سے اجازت لینا ہوگی۔ ان سے کیا کہوں گی۔“

”کچھ بھی کہیں۔ کسی کیپلی کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے یا بینک والوں نے پارٹی دی ہے۔“

”میں جھوٹ نہیں بولتی۔ کم از کم گھر والوں سے تو بالکل نہیں۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا پھر بولا۔ ”یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی والدہ کو آپ کے گھر بھیجوں۔“ اس نے دھماکا سا کیا۔

میں چونک گئی۔ شرم سے پلکیں جھک گئیں۔ میں نے

شکایت نہیں تھی بلکہ میں تو ایک طرح سے ان کی احسان مند تھی۔ اس ایک شوکر نے مجھے کرکریں پہلے اور آگے بڑھنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔

دو سال تک جھپکتے گزر گئے۔ میں نے ایم بی اے کر لیا تو مجھے براچ مینیجر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی بینک نے مجھے زیرو میٹر ہنڈ آئی بھی دے دی۔ میں نے پرانی گاڑی بک ویلیو پر بینک سے خرید لی اور ایک ڈرائیور رکھ لیا تاکہ بابا کو کہیں آنے جانے کا مسئلہ نہ ہو۔ میں چاہ رہی تھی کہ وہ اب آرام کریں لیکن بابا اس پر تیار نہ ہوئے انہیں روزانہ گھر سے نکلنے اور کام پر جانے کی عادت تھی۔ البتہ اب وہ صرف رنگ کا ٹھیکہ لیتے تھے اور اپنی نگرانی میں کارٹیکروں سے کام کرواتے۔ ہاشمی صاحب نے انہیں اجازت دے رکھی تھی کہ وہ فارغ وقت میں دوسری کمپنیوں کے لیے بھی کام کر سکتے ہیں۔

میں باقاعدگی سے اپارٹمنٹ کی قسطیں ادا کر رہی تھی اور بالآخر ایک دن مجھے اس کا قبضہ مل گیا۔ وہ ایک یادگار دن تھا۔ مجھے بینک سے ہاؤس فرسٹڈ الاؤنس ملتا تھا۔ اس سے میں نے فلیٹ کی سترے سے ترین و آرائش کروائی۔ امریکن کچن ہاشمی صاحب نے بنوا کر دیا تھا۔ میں نے سنے فرنیچر، قیمتی پردوں اور ڈیمرائزڈ اشیاء سے اسے آراستہ کیا اور گھر والوں کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی۔ اس دن میں بہت خوش تھی میں نے چھپس سال کی عمر میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کی لوگ برسوں تنا کرتے ہیں۔

چچا اور چچی مبارک باد دینے آئے تو اپارٹمنٹ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی گئیں۔ چچی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ صرف دس سال کے عرصہ میں کر لیا ہے۔ یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا تھا لیکن یہ مالک کا کرم تھا جس نے مجھے اتنی ہمت اور حوصلہ دیا۔ اس وقت مجھے ظاہر کا خیال آیا۔ اسے بھی دعائی گئے ہوئے اتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا لیکن وہ زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ چچی بار بار پُر امید نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ شاید ان کے دل میں پرانا رشتہ جوڑنے کی خواہش سر اٹھارہ تھی جسے وہ دس سال پہلے بڑے نخوت سے ٹھکرا چکی تھیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر انہوں نے ایسی کوئی بات منہ سے نکالی تو وہ جواب دوں گی کہ ساری عمر یاد رکھیں گی۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی امی اور بابا میری طرف

کریں۔ ہمارے کاروباری تعلقات پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں آئندہ بھی ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔“ اس واقعے کے بعد میں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو گئی۔ یہ تعلیم اور انشیں میرے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا۔ خاندان برادری کے لوگ میرے قریب آنے سے ڈرتے تھے اور غیروں کو ایک محنت کش کی بیٹی سے رشتہ جوڑنا گوارہ نہیں تھا۔ میں نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں میٹرک کے بعد ہی گھر بیٹھ جاتی اور سال دو سال بعد اپنے ہم پلہ کسی لڑکے سے بیاہ دی جاتی اور میرے بھی نصف درجن بچے گلیوں میں آوارہ گردی کر رہے ہوتے لیکن یہ خود غرضانہ سوچ تھی۔ اگر میں شادی کر لیتی تو میرے پیار اور بے روزگار باپ کا سہارا کون بنتا۔ میں نے صرف اپنا مستقبل ہی نہیں سنوارا بلکہ انہیں بھی ایک پُر آسائش زندگی دی۔ شادی کا کیا ہے وہ بھی ہو جائے گی۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی نہ کوئی بندہ تو ہوگا جو مجھے میرے بیک گراؤنڈ کے ساتھ قبول کر سکے۔

اگلی بار طاہر چٹھیوں میں آیا تو اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنا ہاتھ روک لیا ہے اور بے جا فرمائشیں پوری کرنے کی بجائے صرف گھر کے اخراجات کے لیے میسج بھیجتا ہے۔ اس طرح وہ کچھ رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ اب اسے اور نوٹام بھی نہیں کرنا پڑتا۔ وہ میرا پارٹنر دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ ”سیما تم دس سال میں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں اور میں ابھی تک وہیں ہوں۔“

”اس میں کچھ قصور تمہارا بھی ہے۔ تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جس برتن کے پینے میں سوراخ ہو، وہ کبھی نہیں بھر سکتا۔ میں نے ڈیرو سے اپنا سفر شروع کیا تھا لیکن پیسے کو دانتوں سے پکڑ کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ تم بھی اگر شروع سے کچھ پس انداز کرتے تو تمہارا بھی ایسا ہی ایک فلیٹ ہوتا۔“

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم ایڈوائس دینے کی پوزیشن میں ہو تو میں آج ہی تمہارے لیے فلیٹ بک کروا دیتی ہوں۔“

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”اتنا تو کر سکتا ہوں لیکن اس کی بجگ میرے گھر والوں کو نہ پڑے۔ امی کو گاڑی

سرگوشی کے اعزاز میں کہا۔ ”آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”میں نے آپ ایک پڑھی لکھی اور ویل اسٹیشنڈ خاتون ہیں۔“

”لیکن آپ میرے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”وہ بھی بتا دیں۔“

”کیا میں امید کروں کہ جو کچھ بتانے جا رہی ہوں۔ وہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گا؟“

”بالکل آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔“

”تو سنئے شارق صاحب۔“ میں نے جی کڑا کر کہا۔ ”میرے والد ایک رنگ ساز ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”رنگ ساز ہی ہیں چور ڈاکو تو نہیں۔ وہ مزدوری کر کے حق حلال کی روزی کماتے ہیں۔“

”پھر بھی رشتہ طے کرتے وقت یہ سب باتیں دیکھی جاتی ہیں۔“

”اس طرح تو میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے دادا پر دانا کیا کام کرتے تھے۔ میری نظر میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”پھر بھی آپ اپنی والدہ کو یہ بات بتا دیں۔ یہ جاننے کے بعد بھی وہ میرے گھر آنا چاہیں تو موٹ و ٹیکم۔“

”اگر انہیں میری خوشی عزیز ہے تو وہ ضرور آئیں گی۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور چلا گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ خود آیا اور نہ ہی اس نے فون کیا۔ آٹھویں دن آیا تو اس کے چہرے پر شرمندگی کی چھاپ واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ آہستہ سے بولا۔ ”مس سیما! آپ کا اندیشہ درست نکلا۔ امی کسی طرح راضی نہیں ہو رہی ہیں اور میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”نو پرابلم۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”ایک سعادت مند بٹے کو یہی کرنا چاہیے۔“

”یقیناً جاییے سیما میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”آپ کو شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم لڑکیوں کو ٹھکرانے جانے کی عادت ہوتی ہے۔ بہر حال آپ فکرنہ

خریدنے کی دھن سوار ہے۔“

”تم اپنے کان بند کر لو اور وہی کرو جو تمہارا دل کہتا ہے۔“

میں نے دوسرے دن ہاشمی صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا ان کے کسی پروجیکٹ میں فلیٹ بک ہونے کی گنجائش ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ یہ فلیٹ مجھے اپنے چچا زاد بھائی کے لیے چاہیے۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن کا وقت دیا اور کہا کہ میں اپنے کزن کو ساتھ لے کر آؤں۔

ہاشمی صاحب کا نیا پروجیکٹ شروع ہو چکا تھا لیکن اس میں چند فلیٹ باقی تھے۔ ہاشمی صاحب سے معاملات طے کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ البتہ ایڈوانس کچھ زیادہ تھا۔ کیونکہ فلیٹوں کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور دوسرے الاٹیز نے کچھ قسطیں ادا بھی کر دی تھیں۔ میں نے طاہر سے کہا کہ وہ پیسوں کی فکر نہ کرے اگر ضرورت پڑی تو میں دے دوں گی۔ وہ بعد میں مجھے اپنی سہولت کے مطابق واپس کر دے۔

فلیٹ بک ہو جانے پر وہ بہت خوش تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ شیڈول کے مطابق ادا کیلی کرتا رہے تاکہ وقت پر قبضہ مل جائے۔

”تم فکر ہی نہ کرو۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔  
”میں پوری کوشش کروں گا۔ چاہے اس کے لیے اور ٹائم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

میں نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں چچا اور چچی کو بھی بتا دینا چاہیے۔ وہ خوش ہو جائیں گے اور جب انہیں معلوم ہو گا کہ تمہیں اس کی قسطیں ادا کرنی ہیں تو پھر وہ کسی اور چیز کی فرمائش نہیں کریں گے۔“

”تم کہتی ہو تو بتا دیتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

طاہر کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جب اس نے مگر والوں کو بتایا تو چچی بولیں۔ ”اس وقت ہمیں گاڑی کی زیادہ ضرورت ہے۔ فلیٹ کا کیا ہے وہ تو بعد میں بھی ہو جاتا۔“

”یہ کام زیادہ ضروری تھا۔“ طاہر نے جواب دیا۔  
”پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔ پراپرٹی کی قیمتیں آسمان سے پائیں کر رہی ہیں دو چار سال بعد تو یہ ہماری پہنچ سے دور ہو

جائیں گی۔“

دینی واپس جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنے آیا۔ امی اور بابا کہیں گئے ہوئے تھے اور اتفاق سے میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی اور ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اچانک ہی اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بس! تم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور میں بھی ذمے دار یوں کے بوجھ سے آزاد ہو چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہماری شادی ہو جانی چاہیے۔“

میرے ہاتھ میں چائے کا کپ لرز کر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ سکے گا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”کیوں؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”بھئی میں اپنی اور تمہاری شادی کی بات کر رہا ہوں۔“

میں نے غصے سے کہا۔ ”کیا تم نے مجھے کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ جب چاہا کھیل لیا جب چاہا بھینک دیا۔“

وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کبسی باتیں کر رہی ہو؟“

”طاہر شاید تمہیں یاد نہیں رہا لیکن میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جب تمہارے جانے کے بعد چچی جان نے یہ کہہ کر رشہ ختم کر دیا تھا کہ تم شادی کے لیے تیار نہیں ہو کیونکہ تمہیں بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے بابا کو مشورہ دیا کہ یہ ایک لمبا پروگرام ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ میری شادی نہیں اور خردیں۔ میں سمجھ گئی کہ امیر اور غریب کے فرق سے وہ رشہ ختم کر رہی ہیں۔ میں نے اسی وقت تجہ کر لیا کہ اس فرق کو ختم کر کے ہی دم لوں گی۔ آج میرے پاس تعلیم، دولت اور مرتبہ ہے تو تمہیں بھی شادی کا خیال آ گیا۔ بھول گئے کہ میں وہی ٹھکرانی ہوئی لڑکی ہوں۔“

وہ بھولا کر صوفے سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔  
”خدا کی قسم میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ دینی جاتے وقت ہی امی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ پہلے مجھے اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ہیں، اس کے بعد میں اپنی شادی کے بارے میں سوچوں۔ میرا خیال تھا کہ پانچ چھ سال میں

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آجائے۔ ہم لچ ایک ساتھ کریں گے۔ اس کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ میں نے پوری سجدگی سے صورت حال پر غور کیا تو بہت کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔ میری عمر سترائیس سال ہو چکی تھی اور ابھی تک میرا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ امی بابا کب تک میرا ساتھ دیتے۔ ایک نہ ایک دن انہیں بھی اس دنیا سے چلے جانا تھا۔ دونوں بھائی باہر جانے کے لیے پرتول رہے تھے۔ اس کے بعد میں بالکل تنہا ہو جاتی۔ میرے پاس سب کچھ تھا لیکن اس کے باوجود عورت کو اپنے تحفظ کے لیے مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔ ایسے میں مجھے طاہر کا دم غنیمت معلوم ہوا۔ میری نظر میں اس کی پوزیشن صاف ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔

سارا مسئلہ چچی کا تھا۔ میں انہیں کسی صورت بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اچانک میرے دماغ نے پلٹا کھایا اور میں نے دوسرے انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ دس سال پہلے انہوں نے یہ رشتہ ختم کر کے مجھے میسے کی اہمیت کا احساس دلایا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ پیسے کو اپنی طاقت بناؤں گی۔ اسی جذبے کے تحت میں نے سولہ سال کی عمر میں عملی زندگی کا آغاز کیا اور تین ہزار روپے مہینہ پر اسکول میں ملازمت کر لی جہاں میں دیگر متفرق کاموں کے علاوہ ہیڈ مسٹر لیس اور اسکول کی ٹیچرز کے لیے چائے بھی بنایا کرتی تھی۔ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں چچی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگر وہ مجھے نہ ٹھکراتیں تو میں بھی غربت کی گود میں پڑی سسک رہی ہوتی۔ اس لحاظ سے وہ میری محسن تھیں۔ بہت بڑی محسن انہی کی وجہ سے میں اس مقام تک پہنچی۔ تھیک یو چچی۔

میرے مذہب نے بھی بھول جانے اور معاف کر دینے کی تعلیم دی ہے۔ لہذا میں نے ماضی کو بھلا کر چچی کو صدق دل سے معاف کر دیا۔ دوسرے دن طاہر بیک آیا تو میں اسے لے کر قریبی ریسٹوران میں لچ کے لیے چلی گئی۔ پیرا کھانے کا آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے پوچھا۔ ”تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“  
”وہ کیا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

ان ذمے داریوں سے فارغ ہو جاؤں گا لیکن یہ عرصہ طویل ہوتا گیا۔ اس دوران جب بھی میری شادی کا تذکرہ ہوا۔ امی مجھے ڈتے داریاں یا دلدانی رہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ وہ میرے کندھے پر رکھ کر بدنوق چلا چکی ہیں اور انہوں نے یہ کہہ کر رشتہ ختم کر دیا ہے کہ میں شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ چچی کی چال تھی۔ انہیں اپنے کمادینے کے لیے کسی امیر لڑکی کی ضرورت تھی جو ان کا گھر جہیز سے بھر دے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ میری شادی ہو جائے تو وہ ہم لوگوں پر کوئی جھوٹا سچا الزام لگا کر طاہر کی شادی کسی امیر لڑکی سے کر دیں گی۔ لیکن ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہوا۔ ذمے داریاں پوری کرنے کے چکر میں بیٹا ٹھن چکر بن گیا۔ دوسری طرف میں ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے ایسے مقام تک پہنچ گئی کہ چچی کے دل میں ایک بار پھر مجھے بہو بنانے کی خواہش جنم لینے لگی لیکن وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے ڈر رہی تھیں کیونکہ میں ہر لحاظ سے طاہر کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔

حقیقت کا علم ہونے کے بعد میرا دل طاہر کی طرف سے صاف ہو گیا۔ وہ بے قصور تھا۔ ساری آگ چچی نے لگائی تھی۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے جو زخم لگایا تھا۔ دس سال گزرنے کے بعد بھی اس کی کک باتی تھی۔ یہ احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا کہ میں ایک ٹھکرائی ہوئی لڑکی ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں بھی وہی سلوک کروں جو وہ میرے ساتھ کر چکی تھیں۔ میں بھی طاہر کو یہ کہہ کر ٹھکرا دوں کہ وہ میرے ہم پلہ نہیں لیکن کیا میں ایسا کر سکتی ہوں۔ یہ سوچنے کے لیے مجھے مہلت درکار تھی۔

”میرا خیال ہے کہ حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد تمہیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ طاہر پُر امید لہجے میں بولا۔

”مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”کتنا وقت، میں تو کل چلا جاؤں گا۔“

”میں کل صبح تمہیں فون کر کے بتا دوں گی۔“

”فون پر نہیں میں خود آ جاؤں گا۔“

میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ دوپہر میں بینک

ختم کر دیا تھا۔ اب کس منہ سے سوال کر رہی ہو؟“  
چچی بیٹھا گئیں اور انہوں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”خدا گواہ ہے کہ میری ایسی کوئی نیت نہیں تھی۔ میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ طاہر شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہا۔ لڑکی کب تک اس کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس کی شادی کہیں اور کر دو۔“

سچ تو یہ ہے کہ امی اور بابا دونوں ہی میری وجہ سے پریشان تھے لیکن انہوں نے چچی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بولے۔ ”میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سب سے پوچھ کر جواب دوں گا۔“

”ہاں ہاں ضرور پوچھو۔“ چچی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اس کا حق تو مذہب نے بھی دیا ہے۔ وہ بڑھی لمبی سمجھ دار لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرے گی۔“

ان کے جانے کے بعد بابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے اس پر رضا مندی ظاہر کر دی، وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہوئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ چچی کے کزشتہ رویے کے پیش نظر میں انکار کر دینا اس کی اور خوشی اس بات کی تھی کہ میں اپنے گھر کی ہو جاؤں گی۔ پھر سب کچھ میرے اور طاہر کے پلان کے مطابق ہوا۔ ایک سال بعد وہ چھٹیوں میں پاکستان آیا تو ہماری شادی ہو گئی۔ وہ ایک مہینہ میرے پاس رہا پھر میں تین مہینے کی چھٹی لے کر دہشتی چلی گئی۔

طاہر کو جیسے ہی فلیٹ کا قبضہ ملا وہ ملازمت چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ پہلے تو اس نے جاب کرنے کی کوشش کی لیکن پیسے بہت کم مل رہے تھے چنانچہ اس نے آٹو پارٹس کی دکان کھول لی۔ چند ہی مہینوں میں کاروبار چل نکلا اور وہ دہشتی سے زیادہ کمائے لگا۔ دونوں بھائی ملک سے باہر چائیکے ہیں لیکن میں نے امی اور بابا کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ روزانہ شام کو ان سے ملنے جاتی اور چھٹی کا پورا دن ان کے ساتھ گزارتی ہوں۔ میں نے طاہر سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنے والدین کا خیال رکھو اور مجھے اپنے ماں باپ کی خبر گیری کرنے دو۔ طاہر میرے کسی معاملے میں نہیں بولتا بلکہ احسان مند ہے کہ میری وجہ سے اسے دہشتی کی مشقت سے نجات مل گئی اور وہ ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہے۔

☆☆☆

”تم پاکستان آ جاؤ۔ میں اپنی جاب چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“  
”تمہیں وہاں اس سے اچھی جاب مل سکتی ہے۔“  
”نہیں میں اپنے ماں باپ سے دور نہیں جاسکتی۔ اس عمر میں انہیں میری ضرورت ہے۔“  
”ان کی دیکھ بھال کے لیے عدنان اور عثمان بھی تو ہیں۔“

”وہ دونوں باہر جانے کے لیے پرتول رہے ہیں۔ بس تم واپس آ جاؤ۔“

”یہاں آ کر کیا کروں گا؟“  
”تمہیں کوئی نہ کوئی ملازمت مل ہی جائے گی۔ بے شک پیسے وہاں سے کم ملیں گے لیکن تم بھوکے نہیں مروت گے ورنہ کوئی کاروبار کر لیتا۔“

”مجھے کم از کم دو سال تو وہاں رہنا ہوگا۔ جب تک فلیٹ کی قسطیں ادا نہیں ہو جاتیں۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ میں دے دوں گی۔“  
”نہیں میں تم پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”وہ میری ذمہ داری ہے۔“

”پھر شادی بھی دو سال بعد ہی ہوگی۔“ میں نے شوق لہجے میں جواب دیا۔

”ہمیں جلد شادی کر لینی چاہیے ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔“

”یہ تو وہی بات ہوگئی ہم یہاں تم وہاں۔“  
”میں آتا جاتا رہوں گا۔ تم بھی بیچ میں ایک دو پکڑ لگالیتا۔ دو سال تو یوں پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے۔“  
”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے دو مہینے بعد ایک دن چچی اور چچا ہمارے گھر آئے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں دوبارہ یہ بات زبان پر لانے میں تھوڑی بہت جھجکاہٹ محسوس ہوگی لیکن وہ تو بہت ہی ذہین تھیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر کہا تھا چو ما اور امی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اللہ نے میری سن لی۔ طاہر شادی کے لیے تیار ہے۔ بس تم جلدی سے شادی کی تاریخ دے دو۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

امی نے حیرت سے بابا کو دیکھا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے تو رشتہ



## فرشتہ انگل

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں کبھی بدنام زمانہ چور تھا۔ رہزنی، ڈکیتی وغیرہ میرے آمدنی کے ذرائع تھے لیکن ایک چھوٹے سے بچے نے مجھے اس راستے پر آگ بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے میرے اندر ایک انقلابی تبدیلی لادی اور آج میں ایک دین دار شخصیت کے طور پر پہچانا جا رہا ہوں۔ اس بچے نے کس طرح مجھے ایک شریف آدمی کی طرح زندگی گزارنے پر اکسایا، یہی میں بتانا چاہ رہا ہوں۔ یہ واقعہ میں ایک فرضی نام سے لکھ رہا ہوں۔ امید ہے قارئین کو بھی یہ واقعہ پسند آئے گا۔

شرچیل

(پشاور)



”میں نے پوری معلومات کر لی ہیں۔ بہت مال ہے اس گھر میں۔ اور سوائے ایک بچے کے اور کوئی نہیں رہتا۔“  
 ”کیا مطلب؟ صرف ایک بچہ؟“  
 ”ہاں یار۔ یہی تو مزے کی بات ہے۔“ اس نے  
 ”نہ جانے کیوں میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس مکان میں کارروائی کی جائے۔ لیکن میرے ساتھی بالوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔“  
 ”اے ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔“ اس نے کہا۔

ایسے کام بھی کر سکتے ہیں۔ بالو اور میں، بس ہمارا یہی گروپ تھا۔ ہم نے بہت کھوج لگایا تھا کہ آخر یہ ڈاکو پکڑے کیوں جاتے ہیں۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اپنا بھید کسی پر ظاہر کر دینا، خاص طور پر کسی عورت کو بتا دینا یا کسی عورت کو اپنے کام میں شامل کر لینا۔

ہم ان دو اصولوں پر سختی سے عمل کرتے رہے تھے۔ ہاں، ایک اور بات بھی تھی۔ ہمارے پاس اسلحہ تو ہوتا تھا لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ صرف دو بار ہمیں استعمال کرنا پڑا تھا۔ ایک بار بالو کو اور دوسری بار مجھے اور دونوں سے دو جانیں چلی گئیں۔ ہم نے خود کو بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ بہت مجبور ہو کر گولیاں چلائی پڑی تھیں۔ تب جا کر ہم خود کو بچا سکے تھے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک ہم نے پھر کوئی واردات نہیں کی تھی۔ ہر دم پکڑے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم صاف بچ نکلے تھے۔ پولیس نامعلوم کوڈھونڈتی رہ گئی تھی۔

وہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ اس پاس والوں کو ادھر ادھر کی کوئی خبر نہیں تھی۔

ہم نے اس مکان کا جائزہ لیا۔ بالو کی بات درست تھی۔ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ اندر داخل ہونا ہی مشکل تھا۔ دروازہ بہت مطلوبی سے بند تھا۔ دیوار بھی ایسی نہیں تھی کہ کوڈ کر اندر جایا جاسکے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ کسی طرح اس بچے کو اس بات پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ خود ہی دروازہ کھول دے۔

بالو نے دروازے کی کھنٹی بجا دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے بچے کی آواز آئی۔ ”کون؟“

”بیٹا ہم سرورے کرنے آئے ہیں۔“ بالو نے کہا۔

”گورنمنٹ کی طرف سے۔ مکان کا جائزہ لینا ہے۔“

”سوری اکل۔ میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ ڈیڑی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آجائیں تو پھر آئیے گا۔“

اس کے بعد میں نے بھی وہی بات کی۔ لیکن اس بچے نے دروازہ نہیں کھولا۔ اسے بہت اچھی طرح سکھا دیا گیا تھا کہ کسی بھی حال میں دروازہ نہیں کھولے گا۔ یہ ترکیب ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ پھر بالو ہی کے ذہن میں ایک بات آگئی۔ ہم وہاں سے ہٹ کر ایک طرف آگئے تھے۔

”یار۔ اس گھر میں کوئی کام والی تو آتی ہوگی۔ کوئی تو

کہا۔“ صرف ایک بچہ۔ میں ایک مہینا تک جھک مارتا رہا ہوں تب جا کر پتا چلا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آیا۔ گھر میں صرف ایک ہی بچہ رہتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یار سمجھا کر۔“ اس نے برا سا منہ بنایا۔ ”اس کا ایک باپ بھی ہے، وہ صبح آفس جاتا ہے۔ اس دوران بچہ قریب کے اسکول چلا جاتا ہے۔ بہت ہی مجتہد اور بچہ ہے۔ دوپہر میں اسکول سے واپس آ کر بچہ اس وقت تک اکیلا رہتا ہے جب تک باپ کی واپسی نہ ہو۔“

”اور اس بچے کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوتا ہے؟“ مجھے اس بچے سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اس کا باپ کھانا فریج میں رکھ کر جاتا ہوگا۔“ بالو نے کہا۔ ”خود ہی نکال کر کھا لیتا ہوگا۔ شام کے وقت دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہی معمول ہے۔ بچے کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔“

”اگر ایسا ہے پھر تو اوروں نے بھی ثرائی کی ہوگی کہ اس گھر میں کھس جائیں۔“

”یہی تو پراہم ہے کہ اس گھر میں کھس نہیں سکتے۔“ بالو نے کہا۔ ”دروازہ اندر سے لاک ہوتا ہے۔ اور لاک سسٹم بھی بہت پے پیچہ ہے۔ آسانی سے کھل نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بچہ اندر سے آنے والوں کو دیکھتا بھی رہتا ہے۔ اسی لیے گھر میں گھسنا مشکل ہے۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ مال بہت ہے اس گھر میں۔ بس کسی طرح ایک بار اندر داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد عیش ہوں گے۔“

”دیکھ لے یار۔ اپنا تو دل نہیں چاہ رہا کہ کسی بچے کو لوٹا جائے۔“ میں نے کہا۔

”کیا پاگل پن ہے۔ ہم بچے کو کہاں لوٹ رہے ہیں، اس کے باپ کو لوٹ رہے ہیں۔“

کچھ دیر بحث کے بعد میں نے بھی ہامی بھری۔ ویسے بھی ان دنوں ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا بے کار پھر رہے تھے۔

ہم نے اس کام کی ابتدا دو سال پہلے کی تھی۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ جس پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ اصول یہ تھا کہ سال میں بس ایک دو وارداتوں سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے بعد آرام کیا جائے۔ یا دوسرے کام کئے جائیں۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو سکے کہ ہم

ایسی ہوگی جو آکر گھر کا کام کر جاتی ہو۔“

”تو پھر؟“

”پھر یہ کہ کیا ہم اس کو برغمال بنا کر دروازہ نہیں کھلوا سکتے؟“ میں نے کہا۔ ”بچہ اس کی آواز سن کر دروازہ ضرور کھول دیتا ہوگا۔“

آئینہ یا اچھا تھا۔ ہم ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہیں۔

ہم بہت دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن کوئی نہیں آئی۔ اور نہ ہی وہ دروازہ کھلا۔ پھر بہت دیر بعد ایک عورت دروازے کی طرف جانی دکھائی دی۔

وہ کام کرنے والی ہی معلوم ہوتی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ہم دونوں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

بالونے نے فی ٹی نکال کر اس کی کمر سے لگا دی۔ وہ ان معاملات میں مجھ سے زیادہ تیز تھا۔ اس نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ بے چاری عورت کو کھلا کر رہ گئی تھی۔

”کون ہوتا لوگ؟“  
”چل دروازہ کھلو۔“ میں نے کہا۔ ”کون ہے اندر آواز دے اس کو۔“

”اندر صاحب ہیں۔ ان کے دو بھائی ہیں اور.....“  
”بکو اس مت کر۔“ بالوغریا۔ ”ہم جانتے ہیں اندر صرف ایک بچہ ہے۔ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کر ورنہ.....“

بالونے اس کی کمر پر پتول کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ ہم سبھی تھی۔ اس نے دروازے کی گنجائی بھجادی۔ ہم دونوں دائیں بائیں ہو گئے۔ تاکہ اگر وہ بچہ اندر سے شیشے کے ذریعے دیکھے بھی تو ہم دکھائی نہ دیں۔

وہی ہوا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ ہم اس عورت کے ساتھ ہی اندر چلے گئے۔ وہ بچہ ہم کو ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ ”آپ لوگ کون ہیں انکل؟“

”خبردار۔“ بالوغریا۔ ”شور مت کر ایک طرف بیٹھ جا۔“ پھر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ ”تو بھی چپ کر کے بیٹھ۔ اور یہ بتا کہ تیرا صاحب اپنا مال کہاں رکھتا ہے۔“

میں اتنی دیر میں گھر کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس گھر کی حالت کوئی خاص نہیں تھی۔ بہت عام سا فرنیچر تھا۔ ایک فی دی پڑا ہوا تھا۔ وہ بھی پرانا سا تھا۔ نہ جانے بالوکیا سوچ کر اس گھر میں داخل ہوا تھا اور مجھے بھی لے آیا تھا۔

مگر دنیا کے کئی ممالک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو ایک صدی سے بھی زیادہ زندگی جیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ماضی میں تو انسان کی زندگی ایک ہزار برس تک بھی ہوتی تھی، مگر آج کل کے زمانے میں اوسط زندگی کم ہو کر 60 سے 80 سال تک محدود ہو گئی ہے لیکن چند ممالک ایسے بھی ہیں، جہاں لوگوں کی زندگی 115 برس تک بھی جاتی ہے۔ اور ماہرین صحت یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ اگر کسی شخص میں جینیاتی طور پر زیادہ عمر کے جینز موجود ہوں اور وہ شفاف ماحول کے حامل ملک میں رہائش پذیر ہو تو اس کی زندگی 115 برس تک بھی جاسکتی ہے۔ مگر حال ہی میں ماہرین صحت کی جانب کیے جانے والے طبی سروے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس بات کی کوئی بھی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہو سکتی ہے؟ پہلے کی جانے والی تحقیق کے مطابق انسان 115 سال تک جی سکتا ہے۔ کینیڈا کی مک گیل یونیورسٹی آف مونٹریال کے ماہرین کی جانب سے انٹرنیشنل ڈیٹا بیس آف لائونگی اور دنیا کے ماحولاتی آلودگی کے ڈیٹا کا جائزہ لیا گیا۔ سائنس جرنل نیچر میں شائع رپورٹ کے مطابق ڈیٹا کے جائزے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ آج کے جدید دور میں اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ کس شخص کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے ماہرین صحت نے بہتر شفاف ماحول کی وجہ سے طویل اوسط عمر کا درجہ رکھنے والے ممالک کے شہریوں کے لیے کہا تھا کہ وہ 115 برس کی عمر تک جاسکتے ہیں۔ تاہم مونٹریال کی مک گیل یونیورسٹی کے ماہرین نے ان دعوؤں کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی زندگی کتنی طویل ہو سکتی ہے۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں بہتر شفاف ماحول رکھنے والے ممالک کے شہریوں کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ زندگی کا تعین بھی نہیں کیا، جس وجہ سے ان کی رپورٹ کو نامکمل قرار دیا جا رہا ہے۔ مک گیل یونیورسٹی کے ماہرین کے مطابق انسان کی طویل زندگی کا 25 فیصد تعلق ان کی جینز سے ہوتا ہے، جو اسے خاندان سے ورثے میں ملتی ہے، جب کہ لمبی عمر کا 75 فیصد تعلق موسمی ماحول، صحت اور دیگر عوامل سے ہوتا ہے۔ ماہرین نے بتایا کہ تاہم اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اچھے موسمی ماحول کے حامل ممالک اور بہتر صحت رکھنے والے افراد کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہوگی؟

مرسلہ: شمیمہ خانم۔ ملتان

کچھ دیر کی تلاش کے بعد ایک چھوٹا سا بکس مل گیا۔  
 ”ہاں۔ یہ بات ہوئی نا۔“ بالو خوش ہو گیا تھا۔ ”اس  
 میں کچھ ہو سکتا ہے۔“  
 ”نہیں۔ اس کو مت دیکھیں۔“ بچہ اچانک چیخ اٹھا۔  
 ”اس میں میری امی ہیں۔“  
 ”ارے واہ۔ اس میں تیری امی کیسے بند ہو گئیں؟“  
 بالو ہنس پڑا تھا۔

”میں بتاؤں گی۔“ ملازمہ نے کہا۔ ”اس میں مالکن  
 کی تصویریں ہیں۔“  
 ”اور خود مالکن کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ان کا تو پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔“ ملازمہ  
 نے بتایا۔

بالو نے بھی یہی اطلاع دی تھی۔ اس دوران بچے نے  
 رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ ”نہیں۔  
 نہیں۔ میری امی کو کچھ مت کہو۔“

وہ بکس بھی کھلا ہوا تھا۔ بالو نے تلاشی لینی شروع کر  
 دی۔ اس میں واقعی تصویریں تھیں۔ بالو نے ایک ایک تصویر  
 کو باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ میں نے ایک تصویر اٹھالی۔ عام  
 سی گھر کی تصویر یہ تھیں۔ اس بچے کی تھیں۔ اس کے ساتھ  
 اس کے باپ کی تھیں اور ماں کی تھیں۔ جو ایک خوبصورت  
 عورت تھی۔

وہ بچہ سسک رہا تھا۔ اب وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا  
 تھا۔ ملازمہ اس کو بچ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا دل  
 لپچا جا رہا تھا جبکہ بالوخت جھلایا ہوا تھا۔ ”لعلت ہے اس گھر  
 میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ اتنے بڑے بڑے فرنیچر ہیں۔  
 ان کو تو اٹھانے سے رہے۔“

اسی دوران دروازے کی کھنٹی بج اٹھی۔ ہم سب  
 چوکنے ہو گئے تھے۔ ”کون آیا ہوگا؟“ بالو نے ملازمہ سے  
 پوچھا۔

”صاحب آئے ہوں گے۔“ ملازمہ نے بتایا۔  
 ”آج ان کو جلدی آتا تھا۔ نوئی کوڈ اکثر کے پاس لے جاتا تھا۔“

”نوی کون؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”یہ۔“ ملازمہ نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کا  
 نام نوی ہے۔“

”پاپا آئے ہیں۔“ بچہ اچانک اکیٹو ہو گیا تھا۔  
 ”کھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار کچھ دیر تک بجتی رہی تھی۔“

بالو نے سوال دہرایا۔ اس عورت نے گھبرا کر جواب  
 دیا۔ ”کچھ نہیں معلوم جی۔ میں تو گھر میں کام کرنے والی  
 ہوں۔ مجھے کون بتاتا ہے۔“

”تیرا صاحب کیا کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”پتا نہیں جی۔ کسی دفتر میں کام کرتا ہے۔“  
 ”گھر میں الماریاں تو ہوں گی؟“ بالو نے پوچھا۔  
 ”صرف ایک الماری ہے جی۔ وہ اس کمرے میں  
 ہے۔“ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس گھر میں شاید تین ہی کمرے تھے۔ ایک تو وہی  
 ڈرائنگ روم جس میں ہم دونوں کھسے تھے۔ اس کے علاوہ دو  
 کمرے اور تھے۔ اگر کوئی نال ہوگا تو وہ الماری ہی میں ہو  
 سکتا تھا۔

”چلو۔ کمرے میں چلو۔“ بالو نے اشارہ کیا۔  
 ”انکل آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟“ اس بچے نے  
 پوچھا۔

”ہو شیامت بن۔“ بالو نے گھر کی دی۔  
 بچے کا چہرہ بن گیا تھا۔ خوف نے اس کے اعصاب  
 باختہ کر دیے تھے۔ اس عورت کا بھی اب یہی حال ہو رہا  
 تھا۔ ہم ان دونوں کو لے کر اس دوسرے کمرے میں آگئے  
 جہاں ایک الماری تھی۔ ایک ممبری تھی جس پر بستر پڑا ہوا  
 تھا۔

اس کمرے کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ یہ کہا جاسکے  
 کہ اس گھر میں دولت نام کو کوئی چیز ہو سکتی ہے۔  
 میں نے دیکھا کہ خود بالو بھی کچھ مایوس نظر آ رہا تھا۔  
 شاید الماری میں کچھ ہو۔

”اس الماری میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”انکل اس میں میرے کھلونے ہیں۔“ بچے نے کہا  
 ”میں دکھاؤں آپ کو۔ بہت اچھے ہیں۔“

”جپ رہ۔“ بالو نے اس کو جھڑک دیا۔ یہ بتاتیرے  
 باپ نے پیسے کہاں رکھے ہیں؟

”مجھے نہیں معلوم انکل۔“ بچے نے رونا شروع کر دیا  
 تھا۔ بہت کوفت سی ہو رہی تھی۔ ہم گیا سوچ کر اس گھر میں  
 داخل ہوئے تھے۔ اور ابھی تک کچھ نہیں ملا تھا۔

بالو نے اتنی دیر میں الماری کی تلاشی لینی شروع کر دی  
 تھی۔ اس نے کپڑے نکال نکال کر ایک طرف پھیکنے شروع  
 کر دیے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی خاص چیز نہیں ملی تھی۔ وہ  
 سخت جھلایا ہوا تھا۔ گالیاں دیتا جا رہا تھا۔

پڑا۔ ”میرے بابا کو کچھ مت کہو۔ میں پیسے لا کر دیتا ہوں۔“  
 بالو کے ہونٹوں پہ ایک بے رحمانہ سی مسکراہٹ نمودار  
 ہو گئی۔ ”یہ بات ہوئی نا۔ جا جلدی سے لے کر آ۔ ورنہ  
 تیرے بابا کو گولی مار دوں گا۔“

اس کا باپ بھی یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے  
 پوچھا۔ ”بیٹے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟“  
 ”ہیں بابا۔“ بچے نے کہا۔ ”میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“  
 کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ میرے پاس  
 رک گیا۔ ”انکل اگر میں پیسے لا کر دوں تو میرے بابا کو چھوڑ  
 دیں گے نا؟“

اس بچے کا دالہا نہ پن اور اس کی معصومیت دیکھ کر  
 میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس  
 سے کچھ کہتا۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔  
 کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بڑا سا  
 گلک تھا۔

وہ گلک لے کر میرے پاس آ گیا تھا۔ ”یہ لیں انکل۔  
 اس میں بہت سے پیسے ہیں۔ سب میں نے جمع کیے ہیں۔  
 سب لے لیں۔ لیکن میرے بابا کو کچھ نہ کہیں۔“

میں نے دیکھا کہ اس کے باپ کی آنکھوں میں بھی  
 آنسو تھے اور وہ ملازم بھی رو رہی تھی۔ حد یہ کہ بالو نے بھی  
 پستول جبب میں رکھ لیا تھا۔

”بیٹے یہ بتاؤ تم نے کتنے پیسے جمع کئے ہیں؟ میں  
 نے پوچھا۔ اس وقت میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”پورے تین سو ہیں انکل۔“ اس نے بتایا۔  
 ”میں نے پرسوں ہی گنتے تھے۔“

”بالو۔ اب کیا خیال ہے تیرا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں یار۔“ بالو نے ایک گہری سانس لی۔  
 ”چل یہاں سے چلتے ہیں۔ اس بچے نے تو رلا دیا ہے۔“

جب ہم وہاں سے جانے لگے تو اس بچے نے  
 ہمارے پاس آ کر کہا۔ ”ایک بات بتاؤں انکل۔ آپ  
 دونوں فرشتے انکل ہیں۔“

میں نے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور ہم وہاں  
 سے نکل آئے۔

اس دن کی واردات کا ایک قاعدہ یہ ہوا کہ ہم نے  
 اب یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ شاید خدا ہم پر مہربان ہو گیا ہے۔  
 مجھے اور بالو دونوں کو ابھی جا بل گئی ہے۔

”جاؤ۔ دروازہ کھولو۔“ بالو نے ملازمہ سے کہا۔  
 ”میں تمہارے پیچھے رہوں گا۔ اور کوئی اشارہ وغیرہ کرنے کی  
 کوشش مت کرنا۔ ورنہ سب کو آڑا دوں گا۔“  
 ”اچھا جی۔“ سہی ہوئی ملازمہ نے گردن ہلا دی۔

دونوں دروازے پر گئے۔ بالو ایک سائیڈ میں ہو گیا  
 تھا۔ ملازمہ نے دروازہ کھول دیا۔ گھر کا مالک اندر داخل  
 ہوا۔ ”کیا بات ہے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا  
 دی؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کو میں نے کہا تھا۔“ بالو اچانک سامنے آ گیا تھا۔  
 ”کون ہوتا؟“ وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔  
 ”اوہ۔ ابھی مجھی نہیں سمجھے کہ میں کون ہوں۔“

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنے بیٹے  
 کی طرف دیکھا۔ اس دوران وہ بچہ دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا  
 تھا۔ ”ابو۔ یہ لوگ گھر میں آ گئے تھے۔“

”کون ہوتا؟“ کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پریشان  
 ہو کر پوچھا۔ اس کا بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا۔  
 ملازمہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی حالت  
 بری ہو رہی تھی۔

”واہ میرے بھولے بابو۔“ بالو ہنسا۔ ”ابھی تک  
 نہیں سمجھے کہ ہم کون ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں؟“  
 وہ خاموش رہا۔ لیکن اس کی حالت بھی غیر ہو رہی  
 تھی۔ شاید اس کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہوگا۔ اس نے

اپنے بچے کو سنبھال رکھا تھا۔ اسے دلاسہ دے رہا تھا۔  
 ”چلو جلدی کرو۔“ بالو نے کہا۔ ”ہمارے پاس اتنا

وقت نہیں ہوتا کہ باپ بیٹے کی محبت دیکھتے رہیں۔“  
 ”دیکھو۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ میں ایک غریب

آدی ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں باپ  
 بیٹے کس طرح زندگی گزار رہے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں۔  
 تھوڑے بہت پیسے گھر میں رکھے ہیں۔ اگر وہ چاہے تو لے

جاؤ۔ بچے کی فیس کے پیسے ہیں۔ اس کے علاوہ تھوڑا بہت  
 فریجنر ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ اگر اس کی ضرورت ہو تو یہ بھی  
 لے جاؤ۔“

”زیادہ ہوشیار مت بن۔“ بالو جھٹکا گیا تھا۔ ”پیسے  
 چھپا کر رکھے ہوں گے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین کرو۔“  
 بالو نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔  
 شاید وہ گولی چلا ہی دیتا۔ لیکن اسی وقت وہ بچہ بول

## سیلانی

مکرمی مدیر سرگزشت

سلام مسنون

یہ کہانی میری نہیں، میرے ایک دوست کی ہے جس نے عشق کیا اور عشق نہ پایا بھی۔ اُمید ہے پسند بھی آئے گی۔

سید محمود حسین  
(کراچی)

آخر اس درد کی دوا کیا ہے  
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار  
یا اپنی یہ ماجرا کیا ہے  
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں  
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے  
نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی واہ وا! ماحول کو اور بھی گرما  
رہی تھی، اور فیروز غزل اپنی دل کو بھاتی آواز میں گارہا تھا۔  
میں بھی انہی اسٹوڈنٹس کی طرح اس کا مداح تھا لیکن اس کا  
دوست بھی تھا اور میری اس سے دوستی کی وجہ اس کی سادہ  
طبیعت تھی، اس میں کسی قسم کی چالاک اور آج کل کے لوگوں کی  
طرح موقع پرستی نہیں تھی۔

اسی طرح موسم کے حوالے سے مرزا غالب کی پوری  
غزلیں فیروز کو یاد تھیں، اور ہر موسم اور موقع کی مناسبت سے وہ  
غزل سنایا کرتا تھا۔

آج بھی موسم خوشگوار تھا، آسمان پر بادل چھائے  
ہوئے تھے، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، اور فیروز یونیورسٹی کے  
پارک میں گھاس پر بیٹھا، مرزا غالب کی غزل گا رہا تھا،  
اسٹوڈنٹس اس کے ارد گرد بیٹھے تھے، واہ واہ، کیا آواز  
پائی ہے، تمام طلباء ہی اس کی غزل سرائی کو پسند کر رہے تھے۔

بنا کر فقیروں کا ہم ہمیں غالب،  
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں  
جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں  
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ہائی وے پر چلتے چلتے بس بند ہوئی تھی۔ رات کے  
وقت کسی ویرانے میں بس بند ہو جائے تو خوفزدہ ہونا ضروری  
ہے۔ تقریباً تمام مسافر ہم گئے تھے کہ کنڈیکٹر نے کہا۔ ”آپ  
لوگ ٹکرمندہ ہوں۔ وہ سامنے جو روشنی دیکھ رہے ہیں وہاں  
سیلانی کا ہوٹل ہے۔ سیلانی سائیں بہت اچھا بندہ ہے۔ آپ کو  
کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

ہم سب اس ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ ہوٹل ابھی دور  
تھا کہ مرزا غالب کی غزل سنائی دی۔ کوئی بڑی درد بھری آواز  
میں گارہا تھا۔ میں نے قدم تیز کر دیے کیونکہ مجھے یونیورسٹی کا  
زمانہ یاد آ گیا تھا۔ یونیورسٹی کا زمانہ اس لیے بھی یادگار ہے کہ  
اس دوران اچھے اچھے دوست ملے، جن کے ساتھ گزارے  
گئے حسین لمحات آج تک روح کو تازگی بخشتے ہیں، وہ شاعری  
کی محفلیں، وہ کیسے میر یا میں چائے کی ٹیبل پر گرما گرم مباحثے  
اور سموے، چائے، اور برگر، یونیورسٹی لائف کو شاندار بناتے  
ہیں۔ ویسے تو تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں بھی فکر معاش میں  
لگ گیا، اور دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے مستقبل بنانے لگی  
زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔

لیکن میں خاص طور پر فیروز کو نہیں بھول سکتا جو کہ  
شاعری کا شوقین تھا، خصوصاً مرزا غالب کی تو شاعری کا بے حد  
دیوانہ تھا، غالب کی ہر غزل اسے یاد تھی اور پھر اس کی جادو بھری  
آواز جس میں جب بھی وہ کوئی غزل گاتا، تو بھی مدہوش ہو  
کر سنا کرتے تھے۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے





تھا، البتہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی غزل سرائی کی صلاحیت اور دلوں کو چھو لینے والی آواز تھی۔ مرزا غالب کی شاعری سے تو جیسے اسے عشق تھا۔

یہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے جو کہ مفاد پرستوں اور موقع پرستوں سے بھری ہوئی ہے، لوگ دوٹھٹھے بیٹھے بول، بول کر اپنا کام نکالتے ہیں، اور آگے بڑھ جاتے ہیں، میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتا کہ یار تو فلاسفر ہے، میرا ذہن تیرے جیسا کہاں۔ یہ دنیا صرف پیسے کی ہے۔

اور میں اسے اکثر سمجھاتا کہ یہ بڑی مجھے بے وفالگتی ہے، اس کی بھوری آنکھیں بتاتی ہیں کہ یہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے گی۔ لیکن وہ کہتا ابے پاگل، انسان کو خود بخود جانا ہے، سب اچھے ہوتے ہیں، مگر میں اس کی یہ منطق تسلیم نہیں کرتا۔ پروہ میری باتوں پر ہنس دیتا۔

”کل میری برتھ ڈے ہے، آپ مجھے کیا گفٹ دیں گے، مجھے تو ڈائمنڈ کی انگوٹھی پسند ہے۔“ منل نے کہا۔

فیروز نے اپنی ہنسی کا بیج کرستی کار خرید لی اور اسے ڈائمنڈ کی انگوٹھی گفٹ کر دی۔

فیروز آہستہ آہستہ اپنی دولت لٹاتا گیا، کمال ہوتا گیا،

میں بنیادی طور پر شاعر تو نہیں، البتہ یہ غزل، مجھے ذاتی طور پر بڑی پسند تھی، اور شاید اسی لیے مجھے یاد بھی ہے، اور میں بھی اکثر اس غزل کو گنگنا تا رہتا ہوں۔ اس دن میں بھی اس غزل کے حسن میں کم ہو گیا تھا لیکن فیروز عرف غالب تو تھا ہی جیسے مرزا غالب کا دیوانہ اور اسے شاعری سے بڑا لگاؤ تھا، اور اس پر اس کی جادو بھری آواز۔

شاعری کا دیوانہ کسی نہ کسی سے متاثر تو ہوتا ہی ہے، ایسا ہی کچھ فیروز کے ساتھ ہوا، منل بھی ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی، فیروز اس کا دیوانہ تھا، وہ اس سے پتا نہیں سیریس تھی پا صرف دل لگی اور ٹائم پاس کا ذریعہ سمجھتی تھی اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ منل کو میں ذاتی طور پر سچ نہیں سمجھتا تھا، کیوں کہ وہ کسی بھی کے ساتھ نظر آتی اور کسی بھی کے ساتھ، خاص طور پر شہزاد نامی ایک دیہہ نو جوان کے ساتھ بھی دیکھی جاتی تھی۔

میں چونکہ فیروز کا بہت گہرا دوست تھا، اس لیے وہ اپنی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتا تھا۔ منل بھی شاید یہ بات جانتی تھی، اس لیے میں بھی کبھی کبھار ان کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا، اگرچہ فیروز کوئی خوش خیال یا گوری رنگت والا نو جوان تو نہیں

لگیں، اور پھر ایک دن اسے کمپنی کے ڈائریکٹر نے اپنے کمرے میں طلب کیا اور سخت لہجے میں کہا، مسٹر فیروز، بہت ہو گیا، ہم آپ کو ایک لمبے عرصے سے برداشت کر رہے ہیں، آپ کی غلطیوں کی وجہ سے ہماری کمپنی کو نقصان پہنچ رہا ہے مجھے لگتا ہے کہ آپ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ ہوں اور اس کے بعد کوئی جاب کریں، اس لیے ہم آپ کو اس جاب سے Terminate کرتے ہیں۔

فیروز نے اپنی صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود ہی رہا اور اسے کمپنی سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے گھر آ گیا، گھر والوں نے اس کا کوئی خاص خیر مقدم نہیں کیا، اور اسے اپنے اوپر بوجھ بھٹتا شروع کر دیا، ایک تو پہلے ہی اس کے دل پر نکل کی بے وفائی کا غم تھا، اُس پر اسے اس کی نوکری چلی گئی تھی اور پھر اس کے گھر والوں کی جلی جلی باتیں، اس نے ایک رات ایک بیک میں کچھ اپنا ضروری سامان رکھا، اور گھر کو الوداع کہہ کر باہر نکل گیا۔

میں نے اس کے فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا فون بند ملا، جب اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے، گھر والوں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملا۔ صرف ایک پرچہ رکھا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ دل تو میرا اب ٹوٹ گیا ہے، رشتوں پر سے اور محبتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

وہ بستی بستی قریہ گھومتا رہا، کبھی اس شہر، کبھی اُس شہر، کبھی یہاں، کبھی وہاں، شاید اس امید پر کہ اسے کہیں سے خلوص و محبت اور سچا پیار مل جائے، لیکن اُسے تو ہر ایک بے وفا ہی نظر آیا۔ سب مفاد پرست ہیں، برے وقتوں کے لیے اس نے اپنے اکاؤنٹ میں کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی، اسے فی ایم کارڈ اس کے پاس موجود تھا، وہ اپنے پیٹ بھر کے کا سامان اس کے ذریعے لے کر ہی لیتا تھا۔

کسی نے اسے فقیر سمجھا تو کسی نے کچھ، کہیں وہ مزدوروں کے ساتھ کام کرتا، تو کبھی بڑی منڈی میں مزدوری کرتا۔

وہ سردا ہیں بھرتا اپنی گم گشتہ محبت کو یاد کرتا کرتا مجھوں ٹائپ ہو گیا تھا، وہ سیلابی کے نام سے مشہور ہو گیا، اس کی آواز اور مرزا غالب کی غزل اس کی پہچان تھی، اور وہ اسے اکثر گاتا رہتا تھا اور جہاں جگہ ملتی سو جاتا، کسی نے کچھ دے دیا تو کھا

لیکن اس معاشرے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی تو ضروری ہے، اس لیے سب کے سامنے وہ یہی ظاہر کرتا کہ ایک امیر کبیر گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ اس کو جو کچھ ورثہ میں اپنے باپ سے ملا تھا، وہ اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اس کے والدین اب حیات تو نہیں تھے۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا جو کہ اس کی تعلیم کے اخراجات اٹھاتے تھے اور اسے محدود جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایسا ہی ہوا، وہ آئی اور فیروز کی زندگی کو طوفان میں مبتلا کر کے چلی گئی۔

”سیری Engagement ہے، شائق کے ساتھ اور ایک مہینے بعد ہم شادی کر رہے ہیں اور آسٹریلیا جا رہے ہیں، اس کا بزنس وہیں ہے۔ مجھے اس نے میرے گھر والوں سے مانگ لیا ہے۔“ نمل نے دونوں اسٹائل میں کہا۔ فیروز پر جیسے بجلی کی گرجی ہو، وہ سن ہو کر رہ گیا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”لیکن تم نے تو میرے ساتھ، جیسے اور مرنے کی قسمیں کھائی ہیں، وعدہ کیا ہے۔“ فیروز نے بمشکل کہا۔

”لیکن میں اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“ نمل نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ اسے ایک خوش شکل، پینڈم آدمی جوں گیا تھا۔ پھر وہ اس کا لے شیدی کو اپنی زندگی کا حصہ کیوں بناتی، یہی تو زندگی ہے اور یونیورسٹی لائف ہے، لوگ ملتے ہی رہتے ہیں، فیروز ایک اچھا دوست ضرور ہے، پر چونکہ ساری باتیں ہو سکتی ہیں، میرا ہم سفر میری ہی طرح حسین و جمیل ہونا چاہیے، نمل کی فیروز کو اپنا چہونہ سامی نہ بنانے کی وجہ مجھ تک بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئی تھی۔ ظاہر ہے یونیورسٹی میں سب کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا اور کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

فیروز جیسے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا، اس کی شاعری اور غزلیں، سب خاموش ہو گئیں وہ ہر وقت کم کم بیٹھا رہتا، ہم سب اسے سمجھاتے لیکن اس کو کسی پل چین نہ آتا تھا۔ پھر ہمارے فائل ٹرم بھی ہو گئے، جیسے تیسے فیروز نے بھی اکتانکس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے گھر والے چاہتے تھے کہ اب وہ جاب کرے، اس مہنگائی کے دور میں ان کا زور بازو بنے۔

اسے اس کے بھائیوں کی کوشش سے ایک جاب تو مل گئی لیکن جاب میں بھی اس کا دل نہ لگا، یہاں تک کہ اس سے اپنے دیے گئے assignment میں غلطیاں ہونے

## کمال احمد رضوی

کمال احمد رضوی ایک ایسے نگار ہیں جو 45 سال سے قلمی زندگی بسر رہے ہیں۔ یہ پاکستانی قلمی زندگی کے ابتدائی لوگوں میں شامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی رویوں کا عکس جھلکتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کردار معاشرے کے عام آدمی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پی ٹی وی سے نشر ہونے والا مشہور ڈراما ”الف لون“ آج بھی لوگوں کے ذہن میں نقش ہے۔ کمال احمد رضوی نے انتقال سے کچھ پہلے کہا تھا کہ اب وہ لوگ نہیں رہے جو اس کام کی سمجھ رکھتے تھے۔ اس لیے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کچھ تحریر نہیں کر رہا، میں نے کچھ نئے ڈرامے لکھے ہیں، مستقبل میں کام آئیں گے۔ ان کے خیال میں معاشرہ مادیت پرستی کا شکار ہے۔ کمال احمد رضوی کا کہنا ہے کہ ”مزدور پیشہ ادیب، نگار یا اداکار جو بھی کچھ ہوں، اپنی محنت سے بنا ہوں جب کہ بیوروکریٹس فنکاروں کو ایسے مواقع چاہئیں۔ بھٹو کے دور میں طائفے بیرون ممالک بھیجنے کے لیے کئی فنکاروں کو رکھا گیا، اسی طرح پھر جرنل مشرف کے دور میں بھی کئی لوگ منتخب کئے گئے جو فنون لطیفہ سے متعلق شعبہ جات کی نمائندگی کر سکیں اور جس پر ان کی نظر پڑ جائے اس کی توثیق بن گئی، چاہے شجاعت حسین ہوں یا پرویز الہی یا ضیاء الحق الدین ہوں۔ یہ لوگ میری طرح محنت نہیں کر سکتے، میں نے محنت کر کے ایک پروگرام پیش کیا ساہا سال وہ پروگرام ٹی وی پر چلتا رہا، اس پروگرام نے دوسروں کے لیے کامیابی کے دروازے کھول دیے۔ وہ اس وقت ٹی وی کی ضرورت تھی لہذا میں نے ”الف لون“ جیسا پروگرام کیا اگر میں نہ کرتا تو کوئی دوسرا کرتا کیونکہ وہ وقت کی ضرورت تھی۔

انتخاب: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے از غم خیمیل

لیا۔

یہ سندھ کا ہائی وے پر واقع ایک ہوٹل تھا جہاں پر میری بس خراب ہو گئی تھی۔ ہمیں رات اس ہوٹل میں گزارنا پڑی۔ میں بس سے اتر کر اس ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ کنڈیکٹر چیخ کر کہہ رہا تھا۔ بابا سائیں لوگو، بس میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے، ابھی ایک بس پیچھے آرہی ہے، اس میں فیملی والے افراد کو سوار کرادوں گا، ہائی جو افراد ہیں، سٹنکل ہیں، انہیں رات یہیں گزارنا ہوگی، صبح سات بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہیں آئے گی۔“

ہم سب ڈرائیور اور کوچ سروس والوں کو برا بھلا کہتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ ٹیئری کے قریب ٹیئری ہائی وے پر موجود اس ہوٹل میں ہم رات گزارنے پر مجبور تھے۔ ہوٹل کا مالک ایک صوفی ٹائپ آدمی لگ رہا تھا، بڑے بڑے بال، داڑھی پھنسی ٹائپ، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں گٹار، پھر اس نے گانا شروع کیا۔ بہت سے لوگ چار پائپوں پر اس کے ارد گرد بیٹھے تھے، واہ سائیں واہ، کیا آواز پائی ہے، اور کیا شاعری ہے، لوگ لہک لہک کر داد دے رہے تھے۔ میں بھی ایک چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اور غزل سننے لگا، اور یہ آواز مجھے کچھ شناسائی تھی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یا رہتا اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا یہ آواز تو میں نے ماضی میں کہیں سنی ہے، پھر مجھے فیروز اپنا یونیورسٹی والا پرانا دوست یاد آ گیا، جو کہ غالب کا شیدائی تھا، اس کی غزل سرائی یاد آ گئی، یہ تو فیروز کی آواز ہے، خیر میں نے پوری غزل سنی، اور دوسری غزلیں بھی۔ پھر میں اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”تم فیروز ہونا؟“

اس نے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ ”ہاں ہاں، لیکن تم کون ہو..... نہیں۔“ وہ اچانک چونک کر بولا۔ ”میں فیروز نہیں ہوں۔“

”یار چپا پوٹیس، میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ یہ تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے۔“

پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”یار حسن، تم۔۔۔ چونکہ میرے جگر کی دوست ہو، آؤ کرے میں چلیں، وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا، اور بتل بجا کر ویر کو چائے کا آرڈر دیا۔

”تمہیں کتنا ڈھونڈا مگر تم مل کر نہ دیے۔ میرا دل ٹھل نے ایسا توڑا کہ میں پاگل سا ہو گیا تھا۔ کسی کام میں دل نہ لگا تو کرسی سے بھی نکال دیا گیا۔ دروازے کھٹکھٹا رہا، سیلانیوں کی

مرد کرنے لگا۔

حفظ بھائی میری شاعری اور غزل سرائی کے دلدادہ تھے، وہ مرزا غالب کی غزل ضرور سنتے اور یہ غزل تو میں روز ان کی فرمائش پر گایا کرتا تھا۔ میری غزل سرائی سن کر بھی لوگ یہاں آتے ہیں۔

ایک سال بعد سردی کے موسم میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے، میں نے ان کی بہت خدمت کی، ان کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا، ہاتھ منہ دھلاتا، اور مرزا غالب کی غزلیں سناتا، انہوں نے ایک دن وکیل کو بلوا کر وصیت نامہ تیار کروایا اور اپنا سب کچھ میرے نام کر گئے، جو ہوٹل جس میں ہم بیٹھے ہیں ان ہی کا دیا ہوا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کا انتقال ہوا ہے، مجھے ایسا لگا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا، میں ایک مرتبہ پھر اکیلا ہو گیا لیکن پیٹ کا جنم بھرنے کے لیے تو روزگار کی فکر ضروری ہے نہ میرے دوست؟“ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں؟“ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”اس لیے میں نے یہ ہوٹل مکمل طور پر سنبھال لیا ہے لیکن غزل سرائی میری فطرت سے نگنی اور آج بھی روزانہ رات کو غزل سرائی کرتا ہوں۔ اور لوگ بھی شادی اس لئے یہاں آتے ہیں۔“

”سندھ کے گاؤں، اور دیہاتوں میں آج بھی لوگ شام کو کچہری کرتے ہیں، یعنی ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اپنے دکھ دردوں کو share کرتے ہیں، اس لیے مجھے یہ ماحول بہت پسند ہے، میں بھی لوگوں کی باتیں اور ان کے واقعات سنتا ہوں، اور رات گئے یہ لوگ مجھ سے غزل سرائی کی فرمائش کرتے ہیں، جو کہ میں پوری کرتا ہوں۔ میرے ہوٹل پر اسی لیے زیادہ تعداد میں لوگ آتے ہیں، میں سیلانی کے نام سے یہاں پر مشہور ہوں۔ اب یہی میری زندگی ہے۔“

”تم نے شادی نہیں کی؟“

”ہاں یار میں نے گاؤں کی ہی ایک سادہ اور اچھے گھر لے کر عورت سے شادی کر لی ہے، جس سے میرے دو بچے بھی ہیں۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ اس ماحول میں اپنے آپ کو نہایت پرسکون محسوس کرتا ہوں۔“

میں فیروز کی داستان سن کر بہت خوش تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایک خوشحال اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

طرح شہر ہر قریہ قریہ گھومتا رہا۔ میری ماں تو تھی ہی نہیں، بچپن میں ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی، باپ بھی کچھ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا۔ صرف بھائی تھے انہوں نے مجھے کہا کہ میراں کچھ کرو گے تو ہمارے ساتھ رہ سکو گے، ان عاشقی معشوقی کے چکر سے نکلنا اور کچھ کام کاج کرو، ہم ویسے بھی ایک اونچی سوسائٹی کے فرد ہیں۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا اور جب روز بروز گھر میں تنہائیاں بڑھنے لگیں تو ایک رات گھر سے کچھ پیسے لیے جو کہ میں نے بڑے وقتوں کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ ایک پیسہ لیا اور گھر سے نکل پڑا قریہ قریہ، بستی بستی، سیلانی کی طرح گھومتا رہا۔

پھر ایک دن میرا اکاؤنٹ بھی خالی ہو گیا، میرا ابھوک کے مارے برا حال تھا، میں نے خودکشی کرنے کی شفا لی، وہیں قریب دریا نظر آیا تو سوچا کہ اپنی جان اس پانی کے حوالے کر دوں، دنیا کے دکھوں سے دور چلا جاؤں، اس مقصد کے لیے میں نے دریا کے سندھ کے پل پر پہنچا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا دریا میں چھلانگ لگا دی۔

لیکن میری قسمت میں تو شاید کچھ اور ہی لکھا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک کمرے میں لیٹا ہوا تھا، یہ حفظ بھائی کا گھر تھا۔ حفظ بھائی ایک انسان دوست آدمی تھے۔ وہاں ایک کشتی میں حفظ بھائی جن کی دیوار پر تصویر دیکھ رہے ہو، بیٹھے ہوئے تھے، وہ پھلی کے شکار کے شوقین تھے اور ایک ماہر تیراک بھی تھے، انہوں نے مجھے دریا میں گرتے ہوئے دیکھ لیا اور شور مچا دیا، خود بھی دریا میں چھلانگ لگا دی اور میری جان بچائی۔

پھر کسی نہ کسی طرح مجھے کشتی میں ڈال لیا اور پیٹ کو دیا یا تو مجھے ابکائیاں آئیں اور تھوڑی ہی دیر میں میری طبیعت بحال ہو گئی مجھے ہوش آ گیا۔

”او بھائی زندگی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے، کیوں اسے ضائع کر رہے تھے۔“ حفظ بھائی نے کہا۔

”میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ہر ایک نے میرے ساتھ بے وفائی کی، اور گھر والے بھی مٹیلی نکلے۔“

”تم تو یار مجھے اپنی طرح کے آزاد منش لگتے ہو، چلو میرے ساتھ، میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اکیلا ہوں، ہائی وے کے کنارے ایک ہوٹل ہے، وہ چلاتا ہوں اور آرام سے زندگی گزارتا ہوں۔“

پھر میں حفظ بھائی کے ساتھ رہنے لگا اور ہوٹل پر ان کی

## سمندر

محترم معراج رسول  
السلام علیکم

اس سچ بیانی میں سب کچھ سچ ہے صرف نام اور مقام بدلا ہوا ہے۔  
امید ہے کہ یہ سچ بیانی آپ کے معیار پر پوری اترے گی اس یقین کی  
وجہ میرے ساتھ پیش آئے واقعات ہیں جو ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

ذوالفقار  
(لاہور)

جیسے جذبات ہوتے ہیں۔ وہ ان کی ہر خوشی میں خوش اور ہر  
تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن طوٹی سے میری محبت ان کے  
مقابلے بالکل منفرد اور مختلف ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ  
ہماری اکلوتی اولاد ہے اور دوسرے یہ کہ شادی کے دس سال

طوٹی میری اکلوتی بیٹی ہے اور میں اس سے بے پناہ  
محبت کرتا ہوں۔ ویسے یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے۔ سچی  
والدین اپنی اولاد سے اسی طرح محبت کرتے ہیں اگر ان کے  
دس بچے ہوں تب بھی ان کے دل میں ہر ایک کے لیے ایک



میں من و عن اسے تسلیم کر لوں۔ بعض اوقات دل چاہتا کہ صاف انکار کر دوں لیکن پھر اس کی ناراضی کے ڈر سے سر تسلیم خم کر لیتا۔ میری تعلیم ملل ہونے والی تھی کہ اچانک میں اسے پسند کرنے لگا اور میرے دل میں اسے اپنانے کی خواہش جاگ اٹھی لیکن اس کا اظہار کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر اسے منانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ کبھی اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرے گی۔ چنانچہ میں نے دوسرے طریقے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچا۔

اتفاق سے انہی دنوں میری بڑی بہن نہت کی شادی ہوئی تو ای کو گھر میں ایک فرد کی کمی محسوس ہونے لگی۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بولیں۔ ”نوکری لگ جائے تو سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں۔ نہت کے جانے سے گھر بہت سونا لگ رہا ہے۔“

”ارے امی، یہ تو میرے کیلئے کوٹنے کے دن ہیں۔ ابھی سے آپ پر میری شادی کی فکر کیوں سوار ہو گئی؟“

”فضول باتیں مت کرو۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اچھا ہے۔ جلدی شادی ہو جائے گی تو بچوں کے فرائض سے بھی جلد ہی سبکدوش ہو جاؤ گے اور بڑھاپا آرام سے گزرے گا۔“

”میری نوکری تو لگ جانے دیں۔“ میں نے مصنوعی احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی لگ جائے گی۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔

”اور ابھی کون سا شادی کر رہی ہوں۔ پہلے بات تو یہی ہو جائے۔ پھر سال دو سال بعد شادی بھی ہو جائے گی اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو۔“

میں نے بوکھلائے ہوئے کہا۔ ”میں..... میں..... میں.....“

”کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے کیا پتا؟“

”دیکھو بیٹا میری نظر میں یوں تو کئی لڑکیاں ہیں لیکن میں تم پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے تم سے پوچھ رہی ہوں کہ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو۔ اس میں شرمناک یا جھجکنے والی کوئی بات نہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے سر جھکا کر ہوتے کہا۔ ”آپ چچا کے گھر چلی جائیں۔“

”کیا؟“ وہ چپکے ہوئے بولیں۔ ”تم فوزیہ کی بات کر رہے ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ ان کی ایک ہی لڑکی ہے فوزیہ۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

بعد ہمارے گھر آئی۔ اسی لیے وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین ہے۔ اس کے آنے سے میرے آنگن کا سونا پن دور ہو گیا۔ ورنہ ہم دونوں میاں بیوی ساری زندگی اولاد کے لیے ترستے رہتے۔

فوزیہ میری بچپن کی محبت تھی۔ وہ میری چچا زاد تھی اور شروع سے ہی ہمارے درمیان ایک خاص تعلق قائم ہو گیا تھا۔ ابو اور چچا جان میں بہت محبت تھی۔ اس لیے دونوں گھروں میں آنا جانا لگا رہتا۔ ایک اتوار ہم لوگ ان کے گھر آتے اور ایک اتوار چچا کی فیملی ہمارے گھر آ جاتی۔ خوب رونق رہتی۔ اچھے اچھے کھانے پکاتے وی سی آر پر فلمیں دیکھی جاتیں یا پھر کیرم اور لوڈو کی محفل جیتی۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے میں پہلے ہی ویڈیو شاپ سے فلمیں لے آتا لیکن فوزیہ کو فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں جب بھی وی سی آر پر فلم لگاتا وہ دھچکا کر کہتی۔ ”سچ! ہم یہاں فلمیں دیکھنے نہیں آتے۔ اگر تمہیں فلم دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے کوئی رسالہ دے دو۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر پڑھ لوں گی۔“

میں اسے ناراض نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی وی سی آر بند کر دیتا۔ پھر میں نے فلمیں لانا بند کر دیں۔ وہ مجھ سے رسالے مانگ کر لے جاتی اور پڑھنے کے بعد واپس کر دیتی۔ اس طرح ہمارے درمیان ادنیٰ فتنگو ہونے لگی۔ مجھے فلموں کے علاوہ کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہم دونوں ہی کرکٹ کے شوقین تھے۔ جب ٹیلی وژن پر بیچ آرہا ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر بیچ دیکھتے اور اس پر تیرہ بھی کرتے جاتے۔

بچپن سے نکل کر جوانی کی حدود میں داخل ہوئے تب بھی ویسی ہی انسیت اور بے تکلفی برقرار رہی۔ حالانکہ اس کے دوسرے کزن بھی تھے۔ ماموں زاد، خالہ زاد لیکن وہ کسی کو متنبہ نہ لگاتی اور پڑھائی کا بہانہ کر کے کمرے میں گھسی رہتی۔ وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی۔ اس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کر سکتی تھی۔ ادب، فلم، ٹیلی ویژن، کھیل اور سیاست جب کہ مجھے کھونسنے پھرنے اور کھیلنے کودنے کے علاوہ کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں اس کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ بحث یا اختلاف کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ میرے پاس اتنا علم ہی نہیں تھا کہ اسے قائل کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔

وہ اپنی ہر بات مجھ پر مسلط کرتی اور مجھے مجبور کرتی کہ



”ورنہ آپ کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔“  
 ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے لوگوں کی  
 پریم کہانی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔“  
 ”یعنی آپ شادی کے بعد مجھ سے محبت کریں گے۔“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“  
 ”اور اس وقت تک میں کیا کروں گی؟“  
 ”اس محبت کا انتظار۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔  
 ”باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس  
 دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”اچھا ہوا کہ آپ نے تانی  
 جان والا روٹ استعمال کیا اگر براہ راست مجھے پروپوز کرتے  
 تو شاید میں انکار کر دیتی۔“

میں اس کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنی  
 جلدی وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کے بعد اس نے  
 جو کچھ کہا وہ میرے لیے پریشان کن تھا۔ میں نے بے چین ہو  
 کر پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟“  
 ”نہیں یہ بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”شاید  
 آپ کو یقین نہ آئے کہ میں اپنے ماں باپ کے بعد سب سے  
 زیادہ آپ کو ہی پسند کرتی ہوں۔ آپ ایک اچھے دوست اور  
 کزن ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا اور کبھی اس نظر سے  
 نہیں دیکھا۔“

”اوہ! میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر  
 ادا کیا کہ اس کے حکمہ انکار کی کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جو میں  
 پریشان ہو جاتا۔ میں نے کہا۔ ”جس کام کی اجازت مذہب  
 اور معاشرہ دیتا ہے۔ اس پر ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔  
 ویسے میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ شادی کے بعد بھی دوست  
 اور کزن کا کردار نبھاتا رہوں گا۔“

”اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ وہ ایک بار پھر آپ  
 سے تم پر آگئی۔ ”اگر شوہر بن کر حکم چلانے کی کوشش کی تو  
 نقصان میں رہو گے۔ میں کسی کے رعب میں آنے والی نہیں  
 ہوں۔“

فوزیہ سے رشتہ ہو جانے کے بعد میں نے چچا کے گھر  
 جانا کم کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ  
 پہلے کی طرح میرے پاس بیٹھ کر گفتگوں باتیں نہیں کرتی تھی۔  
 بس لحو بھر کے لیے میرے سامنے آتی اور سلام کر کے چلی  
 جاتی۔ امی بھی اشاروں اشاروں میں کہہ چکی تھیں کہ اب میرا  
 چچا کے گھر زیادہ جانا ٹھیک نہیں۔ اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ  
 رات کو فون پر باتیں کرنے لگے۔ وہ انتہائی غیر رومانی لڑکی

”یا اللہ تیرا شکر۔“ وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولیں۔  
 ”سچ پوچھو تو میری بھی یہی خواہش تھی۔ تم نے میرا کام آسان  
 کر دیا۔“

مجھے یقین تھا کہ چچا کو یہ رشتہ قبول کرنے میں کوئی  
 جھجک نہ ہوگی اور فوزیہ بھی والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا  
 دے گی۔ اس کے پاس بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن  
 اگر میں اس سے براہ راست بات کرتا تو اس سے کوئی بعید  
 نہیں تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق فلسفہ جھاڑنے بیٹھ  
 جاتی۔ مثلاً یہی کہ ہم اچھے دوست ہیں اور میں نے بھی  
 تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا وغیرہ وغیرہ  
 لیکن اگر امی رشتہ لے کر جاتیں تو وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتی  
 تھی۔

نتیجہ میری توقع کے عین مطابق آیا اور چچا جان نے  
 میرا رشتہ قبول کر لیا۔ فوزیہ خالصتاً مشرقی لڑکی تھی۔ اس نے  
 بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور والدین کے فیصلے پر راضی ہو گئی  
 لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر ریج و تاب کھا رہی ہوگی۔  
 رات کو اس کا فون آیا تو وہ خامے غصے میں لگ رہی تھی۔  
 ”آپ کو اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم مجھ سے  
 تو بات کرنی چاہیے تھی۔“

وہ ایک دم ہی تم سے آپ پر آگئی تھی۔ اس پر مجھے  
 تھوڑی سی حیرت اور خوشی بھی ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس  
 نے مجھے اپنے منگیت اور ہونے والے مجازی خدا کے طور پر  
 قبول کر لیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”دراصل سب کچھ اتنی جلدی  
 میں ہوا کہ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نڈل سکا۔“  
 ”ایسی کیا جلدی تھی۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”دراصل بات یہ ہے کہ امی کو اچانک ہی میری شادی  
 کی فکر ستانے لگی۔ میں نے انہیں ٹانے کی بہت کوشش کی لیکن  
 وہ یہی کہتی رہیں کہ نہ بہت کے جانے کے بعد گھر سونا سونا لگ  
 رہا ہے۔ اس لیے وہ میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس کے  
 ساتھ ہی انہوں نے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ تمہیں اپنی بہو  
 بنانا چاہ رہی ہیں۔“

”انہوں نے آپ کی مرضی معلوم نہیں کی؟“  
 ”نہیں بس رسماً پوچھا کہ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔  
 اس پر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اعتراض تو اس وقت کرتا  
 جب تم میں کوئی غامی ہوتی۔“  
 ”گو یا اب اس رشتے پر اس لیے تیار ہو گئے کہ مجھ میں  
 کوئی غامی نہیں ہے۔“ وہ حسب عادت بحث پر اتر آئی۔

ہوئی مہنگائی کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ ابھی تو ہم دو ہیں۔ مگر بھی اپنا ہے۔ کل کو بیچے ہوں گے تو اخراجات بھی بڑھیں گے پھر اس محدود تنخواہ میں گزارہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔“

”بات تو ٹھیک ہے لیکن کاروبار کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟“

”ضروری نہیں کہ آپ کوئی لمبا چوڑا کاروبار کریں۔ کم سرمایہ سے بھی کام شروع کیا جاسکتا ہے۔“

”پھر بھی چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے لاکھوں چاہئیں۔“

”سب ہو جائے گا۔ آپ ایک بار ہائی تو بھریں۔“

”کیسے ہو جائے گا۔“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”میرے اکاؤنٹ میں تو دو چار لاکھ ہی ہوں گے۔“

”چلیں اچھا ہوا کہ آپ نے بتا دیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ میرا پلان بھی سن لیں۔ میرے پاس جو زیور ہے۔ اس کی مالیت کم از کم دس لاکھ تو ہوگی۔ وہ ہم بینک میں گروی رکھ دیں گے۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت ہوئی تو میں ابو سے مانگ لوں گی۔ آخر ان کی دولت میں میرا بھی تو حصہ ہے۔“

میں قرض ادھار کے سخت خلاف ہوں لیکن فوزیہ کی بات بھی صحیح تھی۔ چند سالوں بعد تنخواہ میں گزارہ مشکل ہو جاتا۔ اس لیے میں نے اس کے منصوبے سے اتفاق کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا کام شروع کیا جائے۔ فوزیہ نے گارمنٹس کا کاروبار تجویز کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کام سارا سال چلتا ہے اور عید بقرعید پر تو ان لوگوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ مجھے

کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کام کی ابتداء کیسے کی جائے۔ فوزیہ نے بتایا کہ اس کی ایک کپیلی کا شوہر یہ کام کرتا ہے۔ ہم اس سے ملتے ہیں۔ وہی ہمیں گائیڈ کرے گا۔

سمیل بہت مخلص اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ اس نے کہا کہ کسی مناسب جگہ پر ایک دکان کا بندوبست کر لوں۔ وہ اپنے کارخانہ میں تیار کردہ ملبوسات وہاں رکھا دے گا اور اگر میں اپنے طور پر ملبوسات بنواتا چوں تو وہ تن میں سے کر بیٹ پر ٹھوک مار کیٹ سے کپڑا دلوا سکتا ہے اور ٹھیکے پر سلائی کا کام کرنے والے کارکنوں کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں خود اپنے ملبوسات بنوا کر بیچوں تو زیادہ فائدہ ہوگا اور اگر ایکسپورٹ کی طرف آ جاؤں تو دارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں اتنے لمبے چوڑے جھیلے

تھی اور فون پر بھی کوئی بحث چھیڑ کر بیٹھ جاتی جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ میری پیار بھری باتوں پر شرمائے۔ لچائے، غرے دکھائے وغیرہ لیکن لگتا تھا کہ رومانویت اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزری۔ بعض اوقات تو میرا بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی جب آپ کی کو اپنا بتاتا ہے تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا ہوتا ہے۔

تھوڑی سی تنگ دود کے بعد مجھے ملازمت مل گئی اور امی نے زور و شور سے شادی کی تیاری شروع کر دی اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب فوزیہ دہن بن کر ہمارے گھر آگئی۔ پہلی رات ہی اس نے انکشاف کیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی مجھے چاہتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ زندگی کا سفر ہم مل کر طے کریں۔ میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ”پھر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ مجھے صرف ایک دوست اور کزن سمجھتی ہو۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”وہ تو میں نے آپ کو چھیڑنے کے لیے کہا تھا اگر فوراً اقرار کر لیتی تو آپ بھول کر کہتا ہو جاتے۔“

میں جواب میں کچھ کہتا تو ایک لمبی بحث شروع ہو جاتی اور میں اس یادگار رات کو اس کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”آج سے ہم اپنی محبت کی انکشاف شروع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ صبح کے اختتام پر دونوں ہی ناٹ آؤٹ واپس جائیں گے۔“

”بشرطیکہ کوئی فاول پلے نہ ہو۔“ وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھتے ہوئے بولی۔

فوزیہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے زندگی کا ہر کھدیا۔ شادی کے فوراً بعد اس نے پورا گھر سنہال لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب گھر والے اپنے ہر کام کے لیے اس کے محتاج ہو گئے۔ وہ نہ صرف گھر کا پورا کام کرتی بلکہ باہر کے مسئلے بھی نمٹاتی۔ بلوں کی ادائیگی، مینے کا سودا سلف لانا، گوشت سبزی اور ناشتے کا سامان لانا اور گھر کے کاموں کے لیے پلمبر الیکٹریشن کے پیچھے بھاگنا۔ یہ سارے کام اس نے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ وہ ایک گھڑ بیوی ہی نہیں بلکہ ہوشیار نظم اور میری مشیر بھی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں اس نے مشورہ دیا کہ مجھے ملازمت چھوڑ کر کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ میں اس کا منہ دیکھنے لگا تو وہ بولی۔ ”دیکھیں نا، ملازمت میں تو لگی ہندی تنخواہ ملتی ہے اور اگر سال بعد تھوڑا بہت اضافہ ہو تو وہ بڑھتی

آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“  
وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔ ”برخوردار تم ابھی اس میدان میں نئے ہو اور تمہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ میرا... فرض بنتا ہے کہ تمہیں دو چار بنیادی باتیں سمجھا دوں۔“

”جی فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔“  
”دیکھو میاں یہ جو تم نے سستے داموں مال بیچنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے وقتی طور پر تو تمہاری تھوڑی بہت سیل بڑھ جائے گی لیکن آگے چل کر یہ چیز تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔“  
”وہ کس طرح؟“

”میرا خیال ہے کہ دکان کے اخراجات پر تمہاری نظر نہیں ہے۔ تم صرف یہ دیکھ رہے ہو کہ کتنے میں مال خریدا اور کتنے میں بیچا۔ دیگر اخراجات کا تم نے کوئی حساب نہیں لگایا جن میں دکان کا کرایہ، بجلی اور ٹیلی فون کے بل، انکم ٹیکس، سٹیز ٹیکس، ایسوسی ایشن کا چنہ، ٹرانسپورٹ کے اخراجات وغیرہ شامل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری وجہ سے ہماری مارکیٹ خراب ہو رہی ہے۔“

”تو آپ بھی اپنی چیزوں کی قیمتیں کم کر دیں۔“ میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا۔

”اس میں دو مسئلے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم یہ فورڈ نہیں کر سکتے۔ میری دکان پر دس سٹیز مین ہیں۔ قیمتیں کم کیں تو انہیں بخوار کہاں سے دوں گا۔ اس کے علاوہ اور بھی اخراجات ہیں۔ وہ سب دکان کی آمدنی سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ گاؤں کی نفسیات کو نہیں سمجھتے۔ وہ سستی چیز کو غیر معیاری اور ہتھی چیز خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہے اور وہ فخر یہ انداز میں اپنے ملنے جلنے والوں کو اس کی قیمت بتاتے ہیں آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“  
”یہی کہ آپ یہ لوٹ سیل بند کریں اور قیمتوں کو مناسب سطح پر لے کر آئیں تاکہ دوسرے دکانداروں کا کاروبار متاثر نہ ہو۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ میں نے حیکمے لہجے میں کہا۔

”تو اس کے نتائج بہت سنگین ہوں گے۔ پہلے مرحلے

میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا کہ فی الحال وہ اپنے کارخانے کا تیار کردہ مال ہمیں دیتا رہے۔ باقی کام بعد میں دیکھے جائیں گے۔“

تھوڑی سی تک وہ دو کے بعد ہمیں حیدری کے علاقے میں ایک مناسب دکان مل گئی۔ اس کے ایڈوائس اور ترین و آرکس پر کافی پیسے لگ گئے لیکن سہیل کے تعاون کی وجہ سے ہمیں سامان کی خریداری پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ اس نے کافی مقدار میں شلوار قمیض کے سوٹ، مردانہ قمیض، چٹوٹیں اور جینز وغیرہ میری دکان میں رکھوا دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میں کسی دوسرے کارخانے کا مال بھی اپنی دکان پر رکھتا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سوچنے لگا کہ فی الحال یہی مال نکل جائے تو بہت ہے کیونکہ اس علاقے میں پہلے سے ہی مردانہ گارمنٹس کی کئی چھوٹی بڑی دکانیں موجود تھیں۔ جہاں گاہکوں کا تازہ ہندوستان تھا۔ ان کے مقابلے میں میری دکان بہت چھوٹی اور گلی کے اندر تھی جہاں کوئی بھولنا چکا گاؤں ہی آ سکتا تھا۔ پہلے تین دن کوئی نہیں آیا تو میرا دل ڈرنے لگا اور مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں سٹیز مینوں کو بخوار بھی اپنے پاس سے نہ دینی پڑ جائے۔ میں نے فوریہ کو یہ پریشانی بتائی تو وہ بولی۔

”کاروبار میں مبرا اور انتظار کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ مارکیٹ میں بیٹھے ہیں کسی جنگل میں نہیں۔ گاؤں آئیں گے اور اتنے آئیں گے کہ آپ سے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

اس کی بات درست نکلی۔ اگلے روز دوسوٹ فروخت ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آہستہ آہستہ گاہکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں نے سیل بڑھانے کے لیے قیمتیں کم کر دیں اور معمولی منافع پر مال بیچنے لگا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کا کچھ اور ہی نتیجہ نکلے گا۔ دکان شروع ہوئے اسی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے کہ ایک پارٹیش صاحب میرے پاس آئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام حاجی منظور ہے اور میں روڈ پر بوٹی گارمنٹس میری ہی ہے۔“

میں نے وہ دکان دیکھ رکھی تھی۔ وہ بہت بڑی تھی اور وہاں آٹھ دس سٹیز مین کام کرتے تھے۔ میں حاجی صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں انہیں دکان کے عقبی حصے میں لے گیا جہاں بیٹھ کر میں حساب کتاب کیا کرتا تھا۔ میں نے ان کے لیے کولڈر تک منگوائی اور پوچھا۔ ”فرمائیے میں

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود زندگی میں ایک کی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ ہماری شادی کو چھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ امی ابو بڑے کولھانے کی حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ فوزیہ کے میکے میں بھی کوئی نہیں رہا۔ چچا چچی کا انتقال ہو چکا تھا اور بہن بھائی اپنی دنیا میں گن تھے۔ شروع کے دو تین سال تو ہم نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ ہم دونوں نے اپنا طبی معائنہ کروایا لیکن کسی میں کوئی نقص نہیں تھا اور ہم اولاد پیدا کرنے کے قابل تھے بس اوپر سے ہی دیر ہو رہی تھی۔

میں تو اپنی قسمت پر صابر بنا کر تھا لیکن فوزیہ سے یہ کمی برداشت نہیں ہو رہی تھی اور کبھی کبھی تو اس کا یہ احساس جنون کی حد کو چھوئے لگتا۔ وہ بات بات پر مجھ سے لڑتی اور کہتی۔ ”مجھے بچہ چاہیے، ہر قیمت پر۔ نہیں سے بھی لے کر آؤ۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بچہ چاہیے۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بچے بازار میں ملے ہیں اور میں بخوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچلانے سے گریز کر رہا ہوں۔

میں جب بھی اسے کوئی نیا آرڈر ملنے کی خبر سنا تا یا مجھے کسی سودے میں منافع ہوتا تو وہ خوش ہونے کی بجائے مجھے طعنے دینے لگتی۔ ”کس کے لیے جمع کر رہے ہو۔ اپنی دولت تمہارا کون سا وارث بیٹھا ہوا ہے۔ سب ٹرسٹ کو چلا جائے گا۔“ اس کی یہ باتیں سن کر میں بھی سوچنے لگ جاتا کہ واقعی میں یہ سب کس کے لیے کر رہا ہوں۔ محنت میں کروں اور میرے بعد دوسرے لوگ عیش کریں۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ سارا کاروبار بند کر کے گھر بیٹھ جاؤں۔ بینک سے ملنے والا منافع اتنا ہوتا کہ ہم دونوں کا آرام سے گزارہ ہو سکتا تھا لیکن میری نظر میں چلتے ہوئے کاروبار کو بند کرنا کفران نعمت تھا۔ میں نے ابھی تک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر ہماری ضرورت سنی جائے گی۔

جب فوزیہ کا جنون حد سے بڑھ گیا تو میں نے تجویز پیش کی کہ ہم یتیم خانہ سے کوئی بچہ گود لے لیتے ہیں لیکن وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئی اور کہنے لگی۔ ”بہر ایسا بچہ کبھی اپنا نہیں ہو سکتا۔ میں کبھی اسے سگی اولاد جیسی محبت نہیں دے سکوں گی اور ہر وقت یہی سوچتی رہوں گی کہ کسی غیر کے بچے کو پال رہی ہوں۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ آپ اسے اپنا نام دے سکیں گے نہ جایداد میں سے کوئی حصہ۔ پھر ہم کیوں بلاوجہ اپنے گلے میں ڈھول ڈالیں۔“

میں آپ کا سوشل بائیکاٹ کیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ آپ سے دکان بھی خالی کر دالی جائے۔“ ان کی دھمکی سن کر میں سہم گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے حاجی صاحب کو شش کروں گا کہ آپ کی توقعات پوری کر سکوں۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے سہیل کو فون کر کے ساری بات بتائی تو وہ بولا۔ ”وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ”کیا مطلب؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”ان کی دونوں باتیں صحیح ہیں۔ اس لوٹ سیل کی وجہ سے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے پاس سے کچھ دینا پڑ جائے اور وہ یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ گاہک سستی چیزوں کو غیر معیاری سمجھتے ہیں۔ اگر تم اسی طرح کم منافع پر چیزیں بیچتے رہے تو گاہک تمہاری دکان پر آنا چھوڑ دیں گے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ ”اسی قیمت پر مال فروخت کرو جس پر دوسرے دکاندار بیچ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دو چار گاہک ٹوٹ جائیں لیکن مجموعی طور پر فائدہ میں رہو گے۔ ویسے بھی دریا میں رہ کر گھر مجھ سے پیر رکھنا کوئی عقل مند کی نہیں۔“

”کیا مطلب۔“ میں نے پوچھا۔ ”حاجی صاحب مارکیٹ یونین کے صدر بھی ہیں۔ ان کی مخالفت مول لینا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان کے مشورہ پر عمل کرو۔“

میں نے وہی کیا جو حاجی صاحب چاہتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس سے میری سیل متاثر ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ پہلے لوگ چیزیں خریدتے وقت بھاؤ تاؤ کیا کرتے تھے لیکن اب وہ منہ مانگی قیمت دے کر اپنی پسند کی چیز لے جاتے۔ میری دکان دن بے دن ترقی کر رہی تھی۔

ایک سال بعد میں نے سہیل کے مشورہ پر اپنا مال تیار کروانا شروع کر دیا۔ اب میں اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ مجھے مارکیٹ سے ادھار کپڑا خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سہیل نے چند کاریگروں کا انتظام کر دیا تھا جو ٹیکے پر سلائی کا کام کرتے تھے۔ میں نے ایک سپروائزر رکھ لیا تھا جو مارکیٹ سے کپڑا اٹھا کر کاریگروں کے اڈے تک پہنچاتا اور وہاں سے تیار مال لے کر دکان پر آ جاتا۔ اس کام میں مجھے بہت فائدہ ہوا اور صرف پانچ سال کے عرصے میں ایک چھوٹی سی گارمنٹ فیکٹری کا مالک بن گیا۔

رپورٹیں کہاں رکھ دی تھیں۔

فوزیہ نے دوسری شادی کا ذکر چھیڑ کر مجھے ایک نئی کنکشن سے دوچار کر دیا۔ اس سے تو میں نے کہہ دیا کہ دفنی طور پر دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کافی دنوں سے اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے شدت سے اولاد کی آرزو تھی جو میری دولت اور جاہیاد کی وارث بن سکے لیکن یہ خواہش فوزیہ پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے دوسری شادی کرنا ضروری تھا۔ میں کسی غریب اور بے سہارا لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا جو بھی فوزیہ کے مقابلے پر نہ آئے اور ہمیشہ اس سے دب کر رہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ادھر میں نے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور ادھر وہ لڑکی مجھے مل گئی۔

زیرینہ میری فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ ویسے تو وہاں اور بھی کئی عورتیں تھیں جن میں سے زیادہ تر کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ ان کا واسطہ اپنے سپروائزر یا فیکٹری مینیجر سے پڑتا تھا لیکن زیرینہ سے میری ملاقات بڑے ہی عجیب انداز میں ہوئی۔ میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ سیکریٹری نے انٹرکام پر کہا۔ ”سرایک درکر آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“ میں چونک گیا۔ اس سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی درکر براہ راست مجھ سے ملنے آئی ہو۔ وہ اپنے معاملات کے سلسلے میں سپروائزر یا مینیجر سے رجوع کرتی تھیں۔ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوگی۔ میں نے سیکریٹری سے کہا کہ وہ اسے اندر بھیج دے۔

چند سیکنڈ بعد وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ جمیل جیسی گہری آنکھیں، ستواں ناک، ریلے ہونٹ، سیاہ کھنکھال اور بھرا بھرا جسم لیکن غربت نے اس کی خوب صورتی کو گھٹا دیا تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور اس نے پورے جسم کو ایک چادر سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جھنجھکی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی زیرینہ، زیرینہ ذوالفقار۔“

”کیا مسئلہ ہے؟“

”جی میں لون کے سلسلے میں حاضر ہوئی تھی۔“

”اس کے لیے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت

پھر ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں دوسری شادی کر لوں شاید اس دوسری عورت کے بطن سے ہمارے گھر میں بھارا آجائے۔ میں نے کہا۔ ”اگر اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو کیا تم مجھے تیسری شادی کا مشورہ دو گی؟“

وہ بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ دوسری شادی کر کے آپ ضرور صاحب اولاد ہو جائیں گے۔ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ چلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی لیکن دوسری بیوی سے بچوں کی لائن لگ گئی۔“

”کیا تم اپنے سہاگ میں شراکت برداشت کر لو گی؟“

”ہے تو بہت مشکل لیکن آپ کی خوشی کی خاطر یہ بھی کر لوں گی۔“

”میری خوشی اسی میں ہے کہ آئندہ تم یہ بات نہ کرنا۔ میں دفنی طور پر دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

اس کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ منہ پھیر کر لیٹ گئی لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ فوزیہ نے دوسری شادی کی بات کیوں کی۔ کہیں اسے اصل حقیقت تو معلوم نہیں ہوگئی۔ وہ بات جو میں نے اس سے اب تک چھپائی ہوئی تھی۔ یعنی یہ کہ وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم تھی لیکن میں نے لیڈی ڈائریکٹر کی منت سماجت کر کے اسے راضی کر لیا تھا کہ وہ فوزیہ کو یہ خوفناک حقیقت نہ بتائے۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے پرواہ عورت ہے اور کبھی رپورٹ دیکھنے کی زحمت کو ادا نہیں کرے گی بلکہ میرے بتائے ہوئے پر یقین کر لے گی اور ایسا ہی ہوا جب میں رپورٹیں لے کر گھر آیا تو اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دونوں رپورٹیں ٹھیک ہیں۔“

وہ مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگ گئی۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً وہ رپورٹیں ایسی جگہ چھپا دیں جہاں اس کی نظر نہ پڑے۔ بالآخر محال اگر وہ رپورٹ دیکھ بھی لیتی تو اس کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس حقیقت کا علم ہو۔ وہ پہلے ہی اولاد نہ ہونے کے غم میں پاگل ہو رہی تھی۔ یہ خبر سن کر بالکل ہی ٹوٹ جاتی اور کچھ بعید نہیں کہ جذبات میں آکر کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتی اسی لیے اس خبر کو اس سے چھپانا بہت ضروری تھا۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے وہ

ہر وقت میرے مرحوم والدین کو کوٹھنے اور بعد انکس دیتی رہتی ہیں۔ یقیناً جیسے سرکہ اگر خود کشی حرام نہ ہوتی تو میں اب تک اپنی جان دے چکی ہوتی۔“

”تمہارا کوئی اور عزیز یا رشتے دار ایسا نہیں جس کے پاس تم چلی جاؤ۔“

”جی نہیں، اگر ہوں گے تو بھی میں نہیں جانتی۔ ہم سوات کے رہنے والے ہیں۔ میں بہت چھوٹی تھی جب ابا ہمیں لے کر مزدوری کی تلاش میں کراچی آئے تھے۔ اس کے بعد یہیں کے ہو کر رہ گئے۔“

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ شکل و صورت کی اچھی ہو۔ تم سے شادی کرنے کے لیے تو بہت لوگ تیار ہو جائیں گے۔“

اس نے ایک سر آدھ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ میری شادی کے بارے میں سوچتے۔ ماموں ممانی کو میری کیا فکر، انہیں تو ایک مفت کی نوکرائی ملی ہوئی ہے۔“

”اچھا، اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال تم کیشیئر سے دس ہزار روپے لے لو۔ میں مینجر سے کہہ دیتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو مجھے فوراً بتا دیتا۔ تم کسی بھی وقت میرے پاس آ سکتی ہو۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ نے مجھے رسوا ہونے سے بچالیا۔ میرا ماموں اتنا ذلیل انسان ہے کہ دس ہزار کی خاطر مجھے کسی کے ہاتھ چھ بھی سکتا ہے۔“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے ہی تمہارا کوئی بندوبست کر دوں گا۔“

اس پہلی ملاقات کے بعد ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہی لڑکی میرے لیے بہترین انتخاب ہو سکتی ہے۔ وہ در اعتبار سے میری دوسری بیوی بننے کے لائق تھی۔ وہ لاوارث اور غریب تھی۔ اس کے آگے مجھے کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ دب کر رہتی اور کسی اونچے بچے کی صورت میں مجھے اس کے رشتے داروں کا سامنا کرنے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ جن حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی اس کے پیش نظر اسے میری پیشکش قبول کرنے میں کوئی تاثر نہ ہوتا۔ جب میں اسے ایک محفوظ پناہ گاہ اور ایک پُر آسائش زندگی فراہم کرنے کا وعدہ کرتا تو وہ میری ہر شرط ماننے پر تیار ہو جاتی۔

”جی نہیں۔ تم مینجر سے کہتیں۔“

”جی کہا تھا بلکہ درخواست بھی دی تھی لیکن انہوں نے منع کر دیا۔“

”کیوں منع کر دیا۔ کوئی وجہ تو بتائی ہوگی۔“

”جی وہ کہتے ہیں کہ کپنی کی پالیسی نہیں ہے۔“

”جی وہ کہتے ہیں کہ بہت غصہ آیا۔ جی میں آیا کہ اسی وقت مینجر کو بلا کر پوچھوں کہ یہ پالیسی کب بنی۔ کس نے بنائی اور یہ میرے علم میں کیوں نہیں لیکن اس معاملہ کو میں نے کسی اور وقت کے لیے رکھ دیا۔ پہلے اس لڑکی کا مسئلہ حل کرنا ضروری تھا۔“

”کتنے پیسے چاہئیں۔“

”جی دس ہزار۔“

”کیا کرو گی؟“

”نہ سہ تھی وہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیسے چپ کر اؤں پھر میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”دیکھو بی بی تم میرا وقت ضائع کر رہی ہو اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ تاکہ میں کچھ سوچ سکوں۔“

”سربا بات یہ ہے۔“ وہ چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”ابھی چند ماہ قبل میری ماں کا انتقال ہوا ہے۔ اب میں ماموں کے پاس رہ رہی ہوں۔ یہ پیسہ انہی کو دینا ہیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا تمہارے ماموں کی اتنی استطاعت بھی نہیں کہ وہ تمہیں دو وقت کی روٹی کھلا سکے۔“

”وہ تو میں ہر ماہ اپنی خواہ میں سے دیتی ہوں۔ یہ وہ پیسے ہیں جو انہوں نے میری ماں کی جھینٹ و تکلیفیں پر خرچ کیے تھے۔ اس وقت تو انہوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے یہ خرچا کر دیا۔ اب مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔ کیا تمہاری ماں ان کی سگی بہن نہیں تھیں؟“

”جی نہیں وہ میرے سوتیلے ماموں ہیں۔“

”اوہ آئی سی، اب میں سمجھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تو وہ تمہیں تنگ نہیں کرتے۔“

”سر کیا بتاؤں۔ ماموں اور ممانی نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد گھر کا سارا کام کرنی ہوں۔ چھٹی والے دن پورے گھر کے کپڑے دھوئی ہوں۔ اس کے باوجود ممانی کی زبان فچی کی طرح چلتی رہتی ہے۔“



سرسبز سرشت  
کراچی  
ماہنامہ

# مرگِ ناگہان نمبر

بے وقت موت نمبرئے عنوان  
اور نئی تحریروں کے ساتھ

وہ جو بے وقت موت کا شکار ہوئے، جوانی میں  
ملکِ عدم کے راہی بنے۔ نامور لوگوں کی روداد اور  
کہانیاں، جو اپنی مختصر سی زندگی میں یادگار کام کر گئے۔

وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے  
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

نا قابلِ فراموش خاص نمبر جسے مجلد کرا کر آپ رکھیں گے۔

بہت جلد قارئین کی خدمت میں

”میں نے جو کچھ سوچا ہے اس میں میری غرض بھی شامل ہے۔“ پھر میں نے اسے مختصر اپنے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں اگر وہ چاہے تو میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔ اس طرح ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن یہ شادی خفیہ رہے گی جب تک میں جاہلوں گا۔ میں اسے ایک الگ گھر میں رکھوں گا اور اسے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کروں گا۔“

اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے اور جانتی ہوں کہ آپ سے شادی کر کے کم از کم مجھے اس جہنم سے نجات مل جائے گی۔“

”تھک ہے۔ تم مجھے دو دن کا وقت دو تا کہ میں تمہارے رہنے کے لیے گھر کا بندوبست کر سکوں۔ فی الحال تمہیں اپنے آپ کو سب سے چھپا کر رکھنا ہو گا۔ کیونکہ ماموں تمہاری تلاش میں شہر کا کونا کونا حمان مارے گا۔ تم یہ ملازمت چھوڑ دو گی اور نقاب کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔ اگر تم نے اپنے آپ یا اس شادی کو خفیہ نہ رکھا تو میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔“

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔“

اس کے بعد سب کچھ اسی طرح ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ میں نے اس کے لیے شہر کے دور دراز علاقے میں ایک قلیت کا بندوبست کیا۔ اسے ضروری ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ جمہرات کے دن میں نے فوزیہ سے کہا کہ دو تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے زیادہ دن لگ جائیں۔ اس نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا کیونکہ میں کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر بلکہ بیرون ملک بھی جاتا رہتا تھا۔

بچ کے وقتے میں، میں نے زریہ کو بلایا اور کہا کہ وہ سپروائزر سے چھٹی لے کر چلی جائے اور اگلے چوک پر میرا انتظار کرے۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی فیکٹری سے باہر آ گیا۔ وہ مقررہ جگہ پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اسے لے کر بازار گیا۔ اس کے لیے کپڑے، جوتے، جیولری اور میک اپ کا سامان خریدا پھر اسے لے کر اسی قلیت پر پہنچ گیا۔ میں نے پہلے ہی ایک اذیتناک عورت کا بندوبست کر لیا تھا جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتی۔ پھر میں نے ایک دوست کو فون کر کے قاضی اور گواہوں کا انتظام کرنے کے

اصل مسئلہ تو مجھے اپنے گھر میں تھا۔ گو کہ فوزیہ نے دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر سوکن کو قبول نہیں کرے گی۔ اس نے محض وقتی جوش میں آ کر ایسا کہہ دیا تھا۔ جو عورت عام گفتگو میں اپنی بات اور برکھنا چاہتی ہو وہ اپنے سہاگ میں شراکت کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لہذا میں نے سوچ لیا کہ فی الحال اس شادی کو خفیہ رکھنا ہی بہتر ہو گا اگر دوسری بیوی سے بچہ ہو گیا تو میں کسی مناسب موقع پر اسے بتا دوں گا۔ اس وقت وہ دفاعی پوزیشن میں ہو گی اور بچے کی خاطر اسے سوکن کو قبول کرنا پڑے گا۔

زریہ نے جو کچھ مجھے اپنے ماموں کے بارے میں بتایا اس کے پیش نظر مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ برطانیہ انسان پیسوں کی خاطر اپنی بھانجی کا سودا نہ کر دے، اگر وہ کسی ہوس زدہ بوڑھے یا پردہ فروش کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ اس لیے اسے جلد از جلد ماموں کے چنگل سے آزاد کرنا ضروری تھا۔ میں اس سے اس سلسلے میں بات کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی مجھ سے ملنے چلی آئی۔ سیکرٹری نے انٹرکام پر اس کے آنے کی اطلاع دی تو میں نے فوراً ہی اسے بلالیا۔ وہ خاموشی سے میرے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

میں اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا اور بولا۔ ”کیا ہوا زریہ پھر کوئی بات ہو گئی؟“

اس نے جواب دینے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اسے چپ کر لیا تو وہ بولی۔ ”اب میں اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ خبیث ماموں میرا سودا کر رہا ہے۔ اگلے جمعہ کو ایک ستر سالہ بوڑھے سے میرا نکاح ہے۔ آپ مجھے دارالامان یا کسی ہوسٹل میں جگہ دلوا دیں۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔“

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی میرے خدشات حقیقت بن کر سامنے آ جائیں گے۔ میں نے زریہ کو تسلی دی اور کہا۔ ”ہر مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور میں نے بھی یہ حل سوچ لیا ہے۔ بشرطیکہ تم راضی ہو جاؤ۔“

”میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا۔“

”تھیک یو ڈاکٹر“ میں نے خوشی سے جھوٹے

ہوئے کہا۔ ”زیرینہ تو تھیک ہے؟“

”سوری سر۔ ہم آپ کی سزوں نہیں بچا سکتے۔“

مجھے یوں لگا جیسے آسمان میرے سر پر آن کر اہو۔ لمحہ بھر پہلے ملنے والی خوشی غم کی دیر تہہ میں چھپ گئی۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ زیرینہ تو چلی گئی۔ اب اس بچی کو کس کے حوالے کر دوں۔ اگر گھر لے کر جاتا ہوں تو فوزیہ کو کیا بتاؤں گا۔ کیا وہ اس بچی کو قبول کر لے گی یا اسے یتیم خانے میں داخل کرادوں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا میرے جیتے جی یہ بچی یتیم خانے میں نہیں جائے گی۔ میں اسے ہر قیمت پر گھر لے کر جاؤں گا۔ فوزیہ سے کچھ بھی کہہ دوں گا۔ اگر وہ مان گئی تو تھیک ورنہ اس کے لیے ایک ایسا رکھ لوں گا۔ بہر حال اس بچی کی پرورش میری ذمے داری تھی۔

میں بچی کو لے کر گھر پہنچا تو فوزیہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ ”بالا آخر آپ نے اپنی خواہش پوری کر لی۔ اگر کوئی بچہ چھو لینا تھا تو لڑکا لے کر آتے جو بڑا چپے میں ہمارا سہارا بنتا۔“

”جو تم سمجھ رہی ہو ایسا نہیں ہے۔“ میں نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ جس میں اسپتال کے کاغذات اور بچی کا برتھ سٹیکٹ تھا۔ ”اے میں اسپتال سے لایا ہوں۔ یہ میری ایک ورکر کی بیٹی ہے۔ فیکٹری میں ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی چنانچہ ہم نے اسے اسپتال بھیج دیا۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ چکا ہے اور ہمارے پاس اس کے کسی قریبی عزیز یا رشتے دار کا پتا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسپتال سے سپروائزر نے فون کر کے بتایا کہ اس عورت کا آپریشن ہو گا چنانچہ میں اسپتال چلا گیا۔ اس عورت کا آپریشن ہوا اور وہ اس بچی کو جنم دے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب یہ بچی لاوارث ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم اس کی پرورش کریں گے۔ اللہ میاں نے اس ننھی بچی کی صورت میں ہمیں تحفہ دیا ہے لیکن اگر تم نہیں چاہیں تو میں اسے صبح یتیم خانے میں داخل کرادوں گا۔“

فوزیہ نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ اس کہانی میں کتنا جج ہے اور کتنا جھوٹ پھر بچی کو گود میں لیتے ہوئے بولی۔ ”اے اللہ کتنی پیاری ہے۔ یہ یتیم خانہ نہیں جائے گی۔ میں اسے پالوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی سوئی

لیے کہا اور عصر کے بعد ہمارا نکاح ہو گیا۔

میں تین دن اس کے پاس گزارنے کے بعد گھر واپس آ گیا۔ میں نے ملازم کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ پڑوسیوں یا محلے کے لوگوں سے زیادہ میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی پھر بھی میں اسے دن میں دو تین مرتبہ ضرور فون کرتا اور شام میں اس سے ملنے بھی جاتا۔ کبھی بھی اسے شاپنگ کرانے یا کھانا کھلانے بھی لے جاتا۔

دو ماہ بعد ہی اس نے مجھے وہ خوش خبری سنائی جس کا میں عرصہ دراز سے منتظر تھا۔ یہ خبر سننے ہی میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ جی چاہا کہ شریک پر نکل جاؤں اور چلا چلا کر کہوں۔ ”لوگوں میں باپ بننے والا ہوں۔ میں باپ بننے والا ہوں، اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اس خوشی میں فوزیہ کو بھی شریک کر لوں لیکن یہ قبل از وقت ہوتا۔ میں نے سوچا کہ بچہ خیریت سے اس دنیا میں آجائے تو اسے بھی بتا دوں گا۔

اس کے بعد زیرینہ میرے لیے اور اہم ہو گئی۔ میں اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔ باقاعدگی سے اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس کی ڈواؤں اور غذا پر بہت زیادہ توجہ دیتا کیونکہ ڈاکٹر نے بہت زیادہ احتیاط کرنے کے لیے کہا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی سے اس کی پانچھ کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاؤں کہ اس کی پانچھ سے لگ کر بیٹھ جاتا لیکن ایسا عملاً ممکن نہیں تھا۔

بالا آخر وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ زیرینہ کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میں نے فوزیہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ فیکٹری میں کام زیادہ ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ مجھے گھر آنے میں دیر ہو جائے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ معمول کی بات تھی۔ زیرینہ کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ نارل ڈیلیوریس کیس نہیں ہے۔ اس کے لیے آپریشن کرنا ہو گا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذات پر دستخط کر دیے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک طویل صبر آزما انتظار کے بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کا چہرہ دیکھتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”مبارک ہو بیٹی پیدا ہوئی ہے۔“

”لیکن یہ جھوٹ ہے۔ دنیا میں تو آپ نے جھوٹ بول لیا لیکن نکاح نامہ ایک شرعی دستاویز ہے۔ اس میں جھوٹ نہیں چلے گا۔“

”یہ سچ ہے۔“ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کیا مطلب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں فوزیہ یہی سچ ہے۔ میں ہی طوطی کا باپ ہوں۔“

پھر میں نے اسے الف سے لے کر ی تک پوری کہانی سنا دی۔ وہ دم سادھے سنی رہی پھر بولی۔ ”اور آپ نے اتنے برسوں تک یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی۔“

”ہاں فوزیہ مجھے ڈر تھا کہ تم اس طرح حقیقت کو قبول نہیں کرو گی۔“

”اس حقیقت کو تو میں نے اسی وقت قبول کر لیا تھا جب آپ اسے لے کر گھر آئے تھے۔ میں جان گئی تھی کہ یہ آپ ہی کی اولاد ہے۔ اس کا پتا مجھے اس فائل سے چلا جو آپ بے دھیانی میں میز پر چھوڑ کر بازار چلے گئے تھے۔ اسپتال کے کاغذات اور برتھ شٹلکٹ سے مجھے حقیقت کا پتا چل گیا تھا اور اسی لیے میں نے اس بچی کو آپ کی اولاد سمجھ کر قبول کر لیا اور اسے سگی بیٹی کی طرح پالنے لگی لیکن میں آپ کی زبان سے سنتا چاہتی تھی اور آپ نے اس حقیقت کو بتانے میں اتنے برس لگا دیئے۔“

”مجھے تمہاری ناراضی کا خوف تھا۔“

”کیوں؟ میں نے تو خود آپ کو دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔“

”کہنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہے فوزیہ۔ میں جانتا تھا کہ تم سکون کا وجود برداشت نہیں کر سکو گی۔“

”مجھے اسی بات کا افسوس ہے کہ آپ نے میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کیا۔ آپ یہ کیوں بھول گئے کہ عورت کا دل ایک سمندر کی مانند ہوتا ہے اور وہ بہت کچھ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر میں کم طرف ہوتی تو بھی طوطی کو سگی بیٹی کی طرح نہ چاہتی۔ قانون بھی یہی کہتا ہے کہ میاں بیوی کی جاہد، اعانتے سب مشترکہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس لیے طوطی صرف آپ ہی کی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ کیا ہوا، اگر میں نے اسے اپنی لکھ سے جنم نہیں دیا۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی عورت کا دل واقعی سمندر کی مانند ہوتا ہے جسے سمجھنے میں مجھے اتنے برس لگے۔

ہوئی مست جاگ گئی تھی۔ وہ بچی کو دیوانہ وار چوم رہی تھی پھر اس نے بچی کے لیے دودھ کا انتظام کیا اور بولی۔ ”آپ کو بازار جانا ہوگا۔ اس کے لیے کچھ چیزیں لانی ہیں۔“

پھر اس نے ایک فہرست بنائی اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہ سامان لے کر آئیں۔ میں اس کے لیے کسی آیا کا بندوبست کرتی ہوں۔“

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ فوزیہ نے نہ صرف اس بچی کو قبول کر لیا تھا بلکہ جی جان سے اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی جیسے وہ اسی کی بیٹی ہو۔ میں نے باہر آ کر سپروائزر کو فون کیا کہ وہ زریں کی ڈیڈ باڈی ایڈیٹس ہوم میں رکھوا دے۔ صبح اس کی تدفین کر دی جائے گی۔

ہم نے اس بچی کا نام طوطی رکھا۔ میرا تو خیر وہ خون تھی لیکن فوزیہ بھی اسے سگی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح۔ جب وہ بڑی ہوئی تو میں نے ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوا دیا۔ فوزیہ نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”مجھے اس کے باپ کا نام معلوم نہیں۔ اس خانے میں کسی نہ کسی کا نام تو لکھنا ہوگا۔“

”آپ جانتے ہیں کہ یہ غیر شرعی اور غیر قانونی ہے۔“

”مجبوری میں سب جائز ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

طوطی بہت ذہین تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے تعلیمی مدارج طے کیے اور یونیورسٹی میں پہنچ گئی۔ سب لوگ اسے ہماری سگی اولاد ہی سمجھتے تھے لیکن جب اس کے لیے ایک رشتہ آیا تو فوزیہ نے مجھ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ لڑکے والوں کو بتا دیں کہ طوطی ہماری سگی بیٹی نہیں ہے بلکہ ہم نے اسے پالا ہے۔“

”اگر انہیں یہ بات بتا دی گئی تو وہ پلٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ جاننے کے بعد شاید طوطی کو کوئی بھی قبول نہ کرے۔“

”ان سے چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا اگر بعد میں انہیں یہ بات معلوم ہوئی تو طوطی کے لیے بریثانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور نکاح نامہ میں آپ کیا لکھوائیں گے؟“

”وہی جو ہر جگہ لکھوایا ہے۔ ب فارم، شناختی کارڈ، اسکول کے رجسٹر میں ہر جگہ ولدیت کے خانے میں میرا نام ہی لکھا ہے۔“



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناؤ لزاور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of  
your Favourite Paksociety's  
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**

Like Message

✓ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First  
See new posts at the top of  
News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow



جذبہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت  
سلام تہنیت

ہم جنت نظیر ملک میں آزادی سے رہ رہے ہیں، اس لیے ہمیں آزادی کی قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس بارے میں غلامی کی زنجیروں سے جکڑے مقبوضہ کشمیر کے کسی فرد سے پوچھیے۔ جب مجھے زبانی کے بارے میں بتایا گیا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ سچ بیانی اسی زبانی کی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔

افتخار حسین اعوان  
(مظفر آباد آزاد کشمیر)

سکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ٹھاٹھیں مارتے دریا کے آ پار مرد، عورتوں، جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کا ایک بہت وسیع جھوم ہوتا تھا۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ دریا کے ایک طرف گفت اور ابلے چہرے اپنی چھب دکھلاتے تھے تو دوسری طرف

یہ مینے کی آخری جمعرات تھی۔ ہر دوسری اور آخری جمعرات کو یہاں میلے جیسا ساں ہوتا تھا۔ جی ہاں!! لوگ اسے میلہ ہی کہتے ہیں۔ اور میلہ کسی قسم کی خرید و فروخت یا موج سستی کا نہیں ہوتا تھا اس میلے میں صرف آہیں اور



جوان تھے۔ انھوں نے وہیں شادی کر لی اور ان کے ہاں دو بیٹوں کی ولادت ہوئی۔ زہبی کے والد اور اس کے تایا تایا نے شادی نہیں کی تھی۔ انہوں نے نوعمری میں ہی قسم کھا لی تھی کہ وہ اپنی سر زمین کو آزاد کرادیں گے اسی لیے وہ بچپن ہی میں ایک جہادی تنظیم سے منسلک ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے کئی ایسے معرکے سر کیے کہ تنظیم کی کمانڈ انہیں دے دی گئی۔ کمانڈر بن کر انہوں نے بھارتیوں کو خوب ناکوں چنے چبوائے اور بالآخر جام شہادت نوش کر گئے۔

☆☆☆

یہ ایک بڑا سا ہال نما کمر تھا۔ دیوار کے ساتھ بڑی سی میز کی چھ کرسیاں اور چار آدمی بیٹھا تھا۔ یہ انڈین آرمی کا کرنل مہتا تھا۔ اس کے سامنے کرسی پر براجمان شخص قدرے جوان سال تھا۔ اس کے چہرے پر مہرے سے بھی خیانت ثبت تھی۔ آنکھوں میں شاطرانہ چمک لیے جسم خفیت وہ شخص کرنل کے سامنے بہت ادب سے بیٹھا تھا۔ میجر راون نامی اس خون آشام بلا کی تعیناتی آج ہی پرموشن کے بعد مقبوضہ کشمیر میں ہوئی تھی۔ راون کا سابقہ ریکارڈ اس کی بد خصلتی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ اپنے شکار کو بھگا بھگا کر اور تڑپا تڑپا کر مارنے کا عادی تھا۔ اس کا خمیر جبر، کینکری اور ظلم سے گندھا تھا۔ جوان لڑکیاں اس کی مرغوب غذا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس کے انھی اوصاف کے پیش نظر اس کی تعیناتی مقبوضہ کشمیر میں کی گئی تھی۔

اس وقت میجر راون اپنے سینئر کرنل مہتا سے بریفنگ لے رہا تھا۔

☆☆☆

اس رات زہبی سو نہیں سکا تھا۔ کراسنگ پوائنٹ پر اس کی آنکھوں نے جو مناظر دیکھے تھے، وہ اس کے اندر حد درجہ بے چینی جگا کر اس کی فینڈ غائب کر چکے تھے۔ رہ رہ کر اس کے پردہ بصارت پر وہی مناظر گردش کر رہے تھے۔ رونا دھونا تو دریا کے شور میں دبا گیا تھا لیکن ایک بجے کے لگ بھگ چند بھارتی فوجی جانے کہاں سے وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر پیچھے دھکیلا شروع کر دیا تھا۔ مردود پر لالچیاں برساتی گئیں تو عورتوں اور بچوں کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچا جانے لگا۔ زہبی ان لوگوں کی بے بسی پر تڑپ کر رہ گیا۔ اس پار کے لوگوں کی آنکھوں میں لہراتے حسرت، غلامی اور بے بسی کے مہیب سائے وہ بھول نہیں پارہا تھا۔ ان سب میں اس کا اپنا خاندان بھی تو موجود تھا۔

پریشانی سے اس نے مرجھائے ہوئے غمگین چہرے نظر آتے تھے۔ ہاں البتہ ایک قدردوئوں طرف مشترک تھی کہ سبھی آہ و زاری کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سبھی روتے بلکتے ایک دوسرے کو صدمہ دیتے بلکانے ہوتے تھے۔

یہ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا کراسنگ پوائنٹ تھا۔ جس کے آ رہا ہر دوسری اور چوٹی جمرات جمع ہونے والے لوگ اپنے رشتہ داروں کو دور سے دیکھتے ہوئے تیر بھاتے تھے۔ شاہ زیب عرف زہبی بھی اپنے والدین اور بہن کے ساتھ اس پار کے رشتہ داروں کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔

جب برصغیر کی جغرافیائی حدود کے پوارے کا اعلان ہوا تو کشمیر پر اس وقت ڈوگر راجا کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کے ہاتھوں کھ پچی بنے انگریزوں نے کشمیر کے عوام کو حق خود ارادیت کا اختیار دینے کا اعلان تو کر دیا لیکن ابھی بہت سی تباہی بردہ غیب سے نمودار ہوئی تھی۔ کشمیر کی 80 فیصد مسلم آبادی کا فیصلہ تین ہی طور پر پاکستان کے حق میں ہوتا۔ ہندو بیٹے کو یہ بات قطعی گوارا نہ تھی۔ راجا ڈوگر نے بھارتی فوج کو کشمیر میں داخل کر دیا۔ پاکستانی فوج کی جوبلی کاروائی اب لازم تھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی غیور پاکستانی عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرحد (کے پی کے) سے قبائلی معمولی ہتھیار لے کر اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کو اپنے اور دوسری نگر تک جا پہنچے۔

ہندو قوم فطری طور پر بزدل اور سازشی واقع ہوئی ہے جب بازی ہلنے دیکھی تو مظلومیت کا لبادہ اوڑھے عالمی اس کے ٹھیکیدار اقوام متحدہ کے در پر جا بیٹھے۔ جہاں ایک متفقہ قرارداد کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں ریفرنڈم کروایا جائے گا۔ اقوام متحدہ نے فوری جنگ بندی کرواتے ہوئے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں حد بندی کر دی۔ یہ اچانک ہونے والا فیصلہ دونوں اطراف کے عوام کے لیے ناگہانی آفت ثابت ہوا۔ اور خاندان ورشتے حد بندی کی نا دیدہ تلوار نے دو حصوں میں تقسیم کر دیے۔ جو جہاں تھا، واپس اپنوں سے جا کر نہ ل سکا۔ شوہر ایک طرف تو اس کی یاد میں تڑپتے بیوی بچے دوسری طرف رہ گئے۔ بلکتے والدین اور دیگر بہن بھائی کشمیر کے ایک حصے میں تو ان کا جگر گوشہ، دوسری طرف غرض جو جدھر تھا وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ حد بندی کی اس لائن کو "لائن آف کنٹرول" کا نام دیا گیا۔

زہبی کے دادا بھی یونہی آزاد ہونے والے خطے میں رہ گئے تھے جبکہ ان کا تمام تر خاندان مقبوضہ کشمیر میں تھا۔ تب وہ

## آریاؤں کی آمد

1750ء اور 1200ء قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں آریائی وادی سندھ میں نقل مکانی کر کے آئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس خطی اعلیٰ تہذیب یافتہ شہری ثقافتیں ختم ہو چکی تھیں کیونکہ انہیں آریاؤں نے یہ آسانی فتح کر کے اپنی ثقافت میں جذب کر لیا تھا۔ ابتدائی آریاؤں کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ ویدی ادب میں بکھرے ہوئے حوالہ جات اشارہ کرتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر آوارہ خانہ بدوش تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے ریوڑ کے پیچھے جاتے تھے۔ بظاہر ان کی کوئی مستقل بنیادیں یا شہر نہیں تھے۔ اس عرصے کے آریا قبیلوں کی صورت میں رہتے جن کی سربراہی سردار کرتے تھے جنہیں راجا کہا جاتا تھا۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا الیوس مور  
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

## وید

ہندومت کا بنیادی مقدس صحیفہ وید ہیں۔ یہ کتابیں ہندو نظریہ کائنات کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔ وید بنیادی طور پر چار ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم رگ وید ہے (وید لفظ کا اصل مطلب ”علم“ ہے) یہ آریائی دیوتاؤں کے لیے ایک ہزار سے زائد مناجاتی گیتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں کئی دوسرے مواد بھی موجود ہیں۔ یہ دیوتاؤں کی بنیادی اساطیر پر مشتمل ہے۔ دوسری ویدی کتب زیادہ تر اسی مواد پر مشتمل ہیں جو اصل میں رگ وید میں موجود ہے۔ دوسری کتاب یج وید (رسومات کا علم) ہے۔ یہ دیوتاؤں کے حضور قربانی کے دوران گائے جانے والے مواد کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب سام وید بنیادی مناجاتی گیتوں میں سے اشعار کا مجموعہ ہے جو پرہتوں کی طرف سے قربانی پر پڑھے جاتے تھے۔ چوتھی کتاب جورگ وید کے بعد دوسری اہم کتاب ہے۔ اتھرو وید ہے (رشی اتھرو کی طرف سے دیا جانے والا علم) یہ دیوتاؤں کے لیے کی جانے والی مقبول عبادتوں میں استعمال کی جانے والی رسومات پر مشتمل ہے اس کے ساتھ ہی برائی کو بھگانے کے لیے سحر اور جادو کا طریقہ کار بھی ہے۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا الیوس مور  
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

بے چینی اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اپنی سوچوں سے نبرد آزما اس کے ذہن میں بارہا ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ جانے کب تک وہ سب اس غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے۔ آزادی کا خواب آنکھوں میں سجائے جانے کب تک وہ اس ظلم کی چکی میں پیسے رہیں گے۔ بھیڑیہ کی دل میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند لپکا۔ اس نے اپنے تایا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مجاہد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی طرح وہ کشمیری بھائیوں کے مصائب ختم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتا تھا۔ اس سوچ اور فیصلے نے اس کے رگ و پے میں سکون اور طمانیت کی لہریں دوڑا دیں اور دھیرے دھیرے نیند نے اسے اپنی مہربان آغوش میں بھر لیا۔

☆☆☆

مہجر راؤن اسم با مسی ثابت ہوا تھا۔ مسلمانوں سے نفرت اس کی فطرت میں شامل تھی۔ چارچ سنبھالتے ہی اس نے اپنی خواہش دکھائی شروع کر دی تھی۔ آغاز اس نے اسکولوں سے کیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے کسی بھی اسکول میں جا گھٹا اور نئے نئے معصوم بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیتا۔ بچوں کی ہراساں، وحشت زدہ نظریں اس کے حیوانی جذبے کو تسکین دیتی تھیں، آسودہ کرتی تھیں۔ کالجوں میں جا کر مسلمان طالبات کو علیحدہ کر لیتا اور ان سے بے سرو پا سوالات کرتا بھانے بھانے سے اس کے ناپاک ہاتھ جبارت کرتے۔ اس نے وادی کے کئی مسلم گھروں میں پوچھنا چھ کے بھانے جا کر کئی خواتین کی آبروریزی کی تھی۔ اس کے شکار میں بعد ازاں اس کے ہر کارے بھی اپنا حصہ ڈالتے۔ قانون اندھا بھی تھا اور بہرا بھی قانون کے لمبے ہاتھ مہجر راؤن جیسے لوگوں کی حمایت کرتے تھے کئی دہائیاں پہلے ہی رہن رکھوا چکے تھے۔ اجتماعی آبروریزی کے بعد کئی خواتین کو گاؤں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ ان کے گھروں میں موجود معمولی مالیت کے سامان سے لے کر ان کے دھور و ٹنگر تک لوٹ لیے تھے۔ مسلم عوام کا جینا دو بھر ہو چکا تھا۔ مہجر راؤن ایک عذاب کی مانند ان پر مسلط تھا۔ اس کے شکار سے خدا کا واسطہ دیتے رحم مانگتے تو وہ ذہریلے انداز میں کہتا

”تم مسلمانوں کا خدا بھی تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکتا۔ ایک ایک کو روند کے رکھ دوں گا۔ ابھی تو تمہاری مسجدوں میں جگرے کرواؤں گا تم لوگوں سے۔“

عوام کے پاس صرف ایک اللہ کا ہی آسرا تھا جس کے

کشمیر جنت نظیر نے بہت ظلم سہے ہیں۔ سولہ سو سیوی سے لے کر اگلی اڑھائی صدیوں تک ظلم کا وہ کون سا پہاڑ تھا جو میری دھرتی پر توڑا نہ گیا۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے ستر لاکھ میں تجھے فروخت کیا۔ کیا تیرا مول بس اتنا تھا؟ ہزارے کے بعد یہاں کے عوام کو حق خود ارادیت کا ڈھکوسلا دیا گیا۔ تیری سہائی فضاؤں میں بارودی ذرات اڑائے گئے۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی افواج یہاں بھیج کر تیرا تقدس پامال کیا۔ ہر طرح کا گھناؤنا جرم سرزد ہوا یہاں۔ بارودہ خواتین گولیوں میں برہنہ گھٹیا گیا۔ ہزاروں نوجوان جیلوں میں قید ہیں نہتے افراد پر گولیاں چلائی گئیں۔ میں کس کس المیہ کا نوحہ پرہوں۔ 84000 مربع میل میں صرف 4000 مربع میل پاکستان کے حصے میں آیا۔ کشمیر کس کس نکلے میں ہونے والے مظالم بیان کرنے لگوں تو دل پھٹ جائے گا۔ مگر میرے لہورنگ کشمیر کے آزار ان کہے رہیں گے۔ اس دھرتی پر ایک لاکھ سے زائد افراد کا لہو بہایا جا چکا ہے۔ اگر مزید قربانیاں درکار ہیں تو ہم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ جسم کے آخری قطرہ خون تک تیری حرمت کے بچاؤ کے لیے لڑیں گے۔“

زہبی کے جذبے نے تنظیم کے اراکین کو بہت متاثر کیا۔ تقریب کے بعد کالج کے خفیہ خانے میں انہوں نے زہبی سے ملاقات کی۔ ایک سرکردہ لیڈر کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔

زہبی بڑے اعتماد سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لیڈر کا رعب چہرہ اور آہنی عزم کی آئینہ دار آنکھیں زہبی کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ انہوں نے چند ثانیے بعد سوال کیا۔ ”جہاد کا عزم رکھتے ہو؟“

زہبی مضبوط لہجہ میں بولا۔ ”جی ہاں۔“

”یہ راہ بہت پرخطر ہے اور تم ابھی نوجوان ہو۔“

”جہاد میرا جنون ہے۔ اور بھارتیوں کو نیست و نابود کرنا میرا مقصد۔ جتنی بھی دشواریاں آئیں سہ لوں گا۔ زندگی کی بھی پروا نہیں۔“

”جان دی، دی، ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا“

لیڈر کے چہرے پر پہلی مرتبہ ہلکا سا تبسم نظر آیا اور انہوں نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

زہبی کے والد سے تنظیم کے افراد نے خود رابطہ کیا اور انہیں واضح کر دیا کہ زہبی اب بہت دور نکل چکا ہے۔ لہذا

آگے وہ گڑگڑا کر اپنی عافیت کی بھیک مانگ سکتے تھے۔ مظلوم کی آپن ہمیشہ عرش بلا دیا کرتی ہیں۔ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کیا جاتا ہے۔ راون کو کھسم کرنے کا فیصلہ لوح تقدیر پر لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

”اباجی! میں مجاہد بننا چاہتا ہوں۔“

یہ الفاظ اسٹیم بم کی طرح زہبی کے والد کی سماعت پر گرے تھے۔ وہ ایک درد مند دل رکھنے والے انسان تھے۔ لیکن ان کی پدرانہ شفقت ان پر حاوی ہو کر ان کے ملی جذبے کو کمزور کر دیتی تھی۔ زہبی ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی بھاپر ان کی آنے والی نسل منحصر تھی۔ بیٹی تو پرایا دھن تھی اور اکلوتا بھائی پہلے ہی جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ ان کے بشری تقاضے ان کو اپنے بیٹے کی بھاپر اکسارے تھے۔ ”میں تمہارے جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں زہبی! لیکن تمہیں اس فیصلہ کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”لیکن کیوں اباجی! میرا وطن بھولہاں ہے۔ اس کی بھاپر مجھے بے چین رکھتی ہے۔ میں اس پاک دھرتی پر دشمنوں کے ناپاک قدموں کا قلعہ قمع کرنا چاہتا ہوں۔“

”وطن کا حق اپنی جگہ مسلم! لیکن بوڑھے والدین کے بھی تو کچھ حقوق ہیں ناں۔“

ان کی ہزار ہا منتوں واسطوں اور جذباتی استھصال کے باعث زہبی نے وقتی خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن اس کا جذبہ جہاد کسی اتنی چٹان کی طرح اب بھی قائم و دائم تھا۔

اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا جو ہر ظلم کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس کا جذبہ صادق ہے تو اسے ضرور کوئی نہ کوئی وسیلہ مل جائے گا۔ بالآخر اس کی دعا ٹیں رگ لائیں۔

کالج کی سالانہ تقریب انعامات میں اسے تقریر کرنے کا موقع ملا۔ اس تقریب میں کشمیر کی جہادی تنظیم کے کئی مجاہدین بھی شامل تھے۔ اس کی تقریر کا موضوع بھی آزادہ۔۔۔ کشمیر تھا۔ جب وہ اسٹیج پر آیا تو اس کا جنون سرچڑھ کر بولنے لگا۔

”اے میرے پیارے کشمیر!! میں کہاں سے شروع کروں جو یہ بتا سکوں کہ تو نے کتنے سیاہ باب دیکھے۔ 700 سے شروع کروں جب یہاں مسلم حکومت تھی یا اس وقت کا نوحہ پرہوں جب ڈوگرہوں نے تجھ پر تسلط جمایا اور اس پاک دھرتی پہ اپنے ناپاک قدم رکھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ میرے

1987ء سے خدمت میں مصروف

**LEUCODERMA-VITILIGO**

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلجھری  
قابل علاج مرض ہے

**STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT**

اجمل زیدی کے لیے دنیا بھر کے لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں

ملتان  
ایوارڈ  
بولڈر



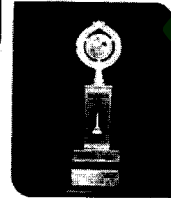
ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF  
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

9-اپریل 30 تا مئی  
9-اگست 30 تا ستمبر  
9-دسمبر 30 تا جنوری  
مکان نمبر 62، سرحد نمبر 20، ٹیکس G-8/1  
سربراہ (کلینک) اسلام آباد  
فون: 2854595 - 2255880 (061)  
موبائل: 0300-8566188  
فکس: 2261636



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گلف سینٹر

14-فروری تا 27 فروری

آفس نمبر 16  
فیروز چار روڈ، حرکت چوکی  
نزد سیمکس (آرٹیف ایکس)

موبائل: 0300-8566188

14-جون تا 27 جون

14-اکتوبر تا 27 اکتوبر

پیش لیج

یکم فروری تا 11 فروری

ذاتی روڈ نزد بھٹری چوک چار روڈ  
فون: 2218215-9 (0521)

موبائل: 0300-8566188

یکم جون تا 11 جون

یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر

ملتان

کراچی

پیش لیج سینٹر

28 مارچ تا 6 اپریل

ریٹس روڈ نزد چوک نزد بھٹری چوک  
فون: 4518061-62 (061)

4582803 (0300-8566188)

28 جولائی تا 6 اگست

28 نومبر تا دسمبر

پیش لیج سینٹر

13 مارچ تا 27 مارچ

آفس نمبر 706، 7 ٹھکانہ ٹاور، فیصل  
نہری، ملتان، ملتان K.F.C. کراچی

فون: 021-7012068-9

موبائل: 0300-8566188

13 جولائی تا 27 جولائی

13 نومبر تا 27 نومبر

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

ٹوٹے پڑے تھے۔  
 زمینی نے اپنی راقش سیدی کر کے انھیں سنبھلنے کا موقع  
 دیے بغیر برست کھول دیا۔ آن کی آن میں وہاں خون کا ایک  
 تالاب سا بن گیا۔  
 فائرنگ کی آواز سن کر باہر سے چند افسران نے  
 اندر آنا چاہا لیکن زمینی کے دونوں ساتھیوں نے ایسا کرنے کا  
 موقع ہی نہ دیا۔

میجر راؤن کا یوم حساب آچکا تھا۔ اس نے بھاگنے کی  
 کوشش کی لیکن زمینی نے اس کی دونوں ٹانگیں چھلنی کر  
 دیں۔ اس کے اندر غصہ و غضب کا ایک آتش فشاں دھک رہا  
 تھا۔ اپنے ساتھ موجود مجاہد کو اس نے لڑکیوں کو لے کر عقبی  
 سائڈ سے بھاگنے کا حکم دیا اور خود میجر راؤن کے سر پر بندوق  
 تان کر کھڑا ہو گیا۔ یعنی موت سامنے دیکھ کر راؤن بھری کی  
 طرح منہ ربا تھا۔ ”مجھے چھوڑ دو مورو کہ! میں تمہیں کالا مال  
 کر دوں گا۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پر راؤن! میرا جذبہ  
 ہی میرے لیے سب سے بڑی متاع ہے۔“ زمینی نے پھینکار  
 کر کہا۔

”تم مسئلے کبھی کامیاب نہیں ہو پاؤ گے۔ ہماری طاقت  
 تمہیں مل کر رکھ دے گی۔“ راؤن ہڈیاں کپٹنے لگا۔  
 ”یہ خواب تم اور تمہاری عاصب قوم جانے کب سے  
 دیکھ رہی ہے۔ مسلمان تو ہم ایک چٹان ہے راؤن! ہمارا جذبہ بہتی  
 ہوا ہے جسے کبھی قید نہیں کیا جاسکتا۔“ زمینی نے بلند آواز سے  
 نعرہ بحیثیت ادا کرتے ہوئے میجر کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔  
 اس کے بعد وہ باہر چھپے اپنے ساتھیوں کے پاس آیا  
 اور جیب میں سوار ہو رہا تھا ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور  
 زمینی کے گلے کو پھاڑ کر نکل گئی۔ کوئی بد بخت شاید زندہ بچ گیا  
 تھا اور موقع پا کر چھت سے اس نے وار کر دیا۔ گولی چلنے کے  
 فوری بعد دقتی بم جیب پر گر اور باقی دو مجاہدین کے بھی پرچے  
 اڑ گئے۔

زمینی کے جذبہ صادق نے اس کی دلی تمنا پوری کر دی۔  
 اسے شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز کر دیا اور گاؤں والوں کو  
 شیطان ابن شیطان میجر راؤن کے چنگل سے بھی آزادی دلا  
 دی گئی۔

آج بھی آزاد کشمیر کے اس گاؤں میں لوگ زمینی کے  
 قصے بچوں کو سناتے ہیں۔

اسے بخوشی اس کا خیر کی اجازت دے دیں۔  
 اس کے والد نے تم آنکھوں سے ڈھیروں دعاؤں کے  
 سائے میں اسے رخصت کر دیا۔ پہلے چند ماہ زمینی کو اسلحہ  
 چلانے کے ساتھ ساتھ سخت جسمانی تربیت بھی دی گئی، کئی بار  
 وہ مشقت سے چور ہو کر گرتا لیکن ایک الوتی جذبہ بھر سے  
 دامن گیر ہو کر اسے ایک نئی توانائی عطا کر دیتا تھا۔  
 ٹریننگ کے بعد زمینی اور اس جیسے دیگر ٹیم ممبران کو  
 خاموشی سے بارڈر پار کروادیا گیا۔ ان لوگوں کو جس گاؤں میں  
 پہنچایا گیا یہ وہی گاؤں تھا جہاں میجر راؤن نے انت چار گھی  
 تھی۔

☆☆☆

زمینی کے دل و دماغ میں ایک آگ روشن تھی۔  
 اس کے سامنے دو ہی منزلیں تھیں۔ غازی یا  
 شہید۔ پہلا دن ایک جنگل میں روپوش رہ کر گذارا جہاں  
 سے ایک گاؤں انہیں اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ اسی گاؤں  
 نے انہیں میجر راؤن کے بارے میں بھی تفصیلی سے  
 بتایا۔ زمینی سے ظلم کی یہ داستان برداشت کرنی محال تھی اس  
 نے فوری فیصلہ کیا کہ ان کا پہلا ٹارگٹ راؤن ہی ہوگا۔  
 اس نے اپنے مشن کے تمام تر پہلوؤں پر نظر رکھتے  
 ہوئے ایک پلان مرتب کیا۔ اگلے چند دن وہ میجر کی ریکی  
 کرواتے رہے تاکہ اس پر مکمل ہاتھ ڈالا جاسکے۔ خبر سے  
 انہیں معلوم ہوا کہ رواں ہفتے میں انڈین آرمی کے چیدہ  
 افسران نے عیش سرور کی ایک محفل منانے کا منصوبہ بنا رکھا  
 ہے۔ شراب کباب کا دور دورہ ہوگا اور کئی مسلمان گھرانوں کی  
 مغوی لڑکیاں وہاں لائی جائیں گی۔

زمینی کے خون میں جیسے انگارے بھر گئے تھے۔ اس  
 نے اپنی ٹیم ممبرز کے ساتھ ایک مکمل منصوبہ بنایا اور اسی دن  
 آرمی چوکی پر حملہ کر دیا۔ چند سپاہی باہر موجود تھے لیکن وہ بھی  
 مکمل طور پر الارٹ نہ تھے زمینی کے ساتھیوں نے پوری قوت  
 سے ان پر حملہ کیا اور انہیں سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ انھیں جہنم  
 واصل کر کے اچھی کے یو فیگارم میں وہ آرمی جیب میں کچھ  
 آگے واقع ہیڈ کوارٹر کی طرف آندھی طوفان کی طرح روانہ  
 ہوئے۔

زمینی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اندر چلا گیا جبکہ باقی  
 دو کو باہر رکھنے کا حکم دیا گیا۔ آرمی یو فیگارم کی وجہ سے انھیں کسی  
 قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اندر عیش و نشاط کا ماحول  
 تھا۔ افسران بدست ہاتھیوں کی طرح سہمی ہوئی لڑکیوں پر

## گناہ گار

مکرمی

السلام علیکم

ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی اریشہ کی ہے۔ اریشہ جو ایک عام سی گھریلو عورت ہے۔ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس کے فیصلے کو سراہنا ضروری ہے۔

عاطر شاہین

(ملتان)

کال بیل کی آواز سن کر کچن میں کرسی پر بیٹھی آلوکا مٹی اریشہ نے چھری میز پر رکھی اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بچے اسکول سے آئے ہوں گے کیونکہ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا اور اس کے بچے ایک بجے ہی اسکول سے آتے تھے۔ اریشہ نے دروازہ کھولا تو باہر اس کے بچے نہیں بلکہ اس کا چھوٹا بھائی ارسلان کھڑا تھا۔ ارسلان کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اریشہ بے اختیار چونک پڑی کیونکہ ارسلان خالی ہاتھ تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بیگ تھا اور نہ ہی کوئی سوٹ کیس۔ وہ کافی عرصے کے بعد اس کے گھر آیا تھا۔

”السلام علیکم بائی۔“ ارسلان نے سلام کرتے ہوئے

کہا۔





ایک بار پھر جن ابھی تو اریشہ سمجھ کر اب منیب اور مہک آگئے ہوں گے۔ چنانچہ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو منیب اور مہک تھے۔ انہوں نے اسی کو سلام کیا اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ انہوں نے جب اپنے ماموں ارسلان کو دیکھا تو بے حد خوش ہوئے۔ پھر ارسلان ان کے ساتھ مکمل مل گیا۔ شام کو اریشہ کے شوہر ریحان گھر آئے تو وہ بھی ارسلان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اریشہ نے ارسلان کے لیے ایک کمر صاف کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسری صبح اریشہ کے شوہر جاب پر اور بچے اسکول چلے گئے تو وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوئی جبکہ ارسلان ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ تقریباً صبح کے نو بجے تھے کہ اس کی امی کی کال آگئی۔ سلام دعا کے بعد امی نے پوچھا۔ ”اریشہ! کیا ارسلان تمہارے گھر ہے؟“

”ہاں۔“ اریشہ نے جواب دیا۔ ”کیا وہ آپ کو بتا کر نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ امی کی آواز سنائی دی۔ ”ہم نے اس کے بارے میں کہاں کہاں معلوم نہیں کیا۔ ساری رات ہم پریشان رہے۔ اس کے دوست بھی غائب ہیں۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا تو فون کر دیا۔“

”وہ آپ کو بتا کر کیوں نہیں آیا؟“

”پتا نہیں بنی۔“ اریشہ کی امی نے کہا۔ ”اب وہ کہاں ہے؟ میری بات کراؤ اس سے۔“

”وہ سو رہا ہے۔“

”اس نے تمہیں کیا بتایا ہے کہ وہ لاہور کیوں آیا ہے؟“

”امی! ارسلان بتا رہا تھا کہ وہ اپنے دوست عامر کے ساتھ لاہور آیا ہے۔ لاہور میں عامر کی خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ ارسلان کا بیک بھی ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔“ اریشہ نے بتایا۔

”اس کا بیک تو گھر میں ہے۔“

”کیا۔“ اریشہ ہنسی۔ ”پھر اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔“

”پتا نہیں۔“ امی کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ”اچھا وہ جاگ جائے تو اس سے میری بات کرا دیتا۔“

”ٹھیک ہے امی۔“

رابطہ منقطع ہو گیا تو اریشہ نے اپنا سیل فون میز پر رکھ دیا

”علیکم السلام۔“ اریشہ نے خوشگوار حیرت سے جواب دیا۔

ارسلان اندر آگیا تو اریشہ نے دروازہ بند کر دیا اور پھر اسے لیے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ارسلان، اریشہ سے چار سال چھوٹا تھا اور بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ اریشہ کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس کا شوہر ریلوے میں جاب کرتا تھا اس لیے جب اس کا ملتان سے لاہور تبادلہ ہوا تو اریشہ اپنے شوہر کے ساتھ لاہور شفٹ ہو گئی۔ اب وہ چار کمروں پر مشتمل چھ مہرے کے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ اریشہ کے دو بچے تھے چھ سالہ منیب اور چار سالہ مہک۔ اریشہ کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن بھائیوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا جبکہ ارسلان چوتھے نمبر پر تھا۔ ان کا بڑا بھائی شادی شدہ اور علیحدہ رہتا تھا جبکہ اس کے والد ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ اریشہ سے چھوٹا بھائی حسام پرائیویٹ ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جبکہ ارسلان، اس سے چھوٹی بہن پلوشہ اور سب سے چھوٹا بھائی حبیب ابھی پڑھ رہے تھے۔

ارسلان کی اچانک آمد پر وہ حیران ہوئی تھی کیونکہ ارسلان جب بھی لاہور آتا تھا تو اریشہ کو کال کر کے اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کر دیتا تھا اور وہ اس کے لیے ایک کمر صاف کر دیتی تھی۔ آج سے دو ماہ قبل ہی ارسلان لاہور آتا تھا تو وہ ان کے ہاں ایک ہفتہ رہا تھا۔

”بھئیو۔“ ڈرائنگ میں پہنچنے کے بعد اریشہ نے کہا تو ارسلان طویل سانس لیتے ہوئے یوں صوفے پر بیٹھ گیا جیسے بے حد تھکا ہوا ہو۔

”باجی۔“ بچے نہیں آئے؟“ ارسلان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ آنے والے ہیں۔“ اریشہ نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج کیسے اچانک آگئے۔“

”بس باجی، میں نے سوچا آج آپ کو سر پرانز دوں گا۔“ ارسلان نے کہا۔ ”میں کچھ دن یہاں رہنے آیا ہوں۔“

دراصل میرا دوست عامر بھی میرے ساتھ آیا ہے۔ وہ اپنی خالہ کی بیٹی کی شادی میں آیا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے آیا ہے۔“

”تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟“

”میرا بیک ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔ شکر ہے اس میں قیمتی سامان نہیں تھا۔“

اریشہ نے ارسلان کے لہجے سے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے تاہم اس نے کوئی بات نہ کی۔ اسی لمحے کال بیل

گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اریشہ!“  
 ”کیا ہوا امی؟“ اریشہ چونکی۔  
 ”ارسلان کہاں ہے؟“  
 ”ڈرائنگ روم میں بچوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ کیوں کیا ہو گیا ہے۔“  
 ”پولیس اس کی تلاش میں ہے؟“  
 ”کیوں؟“ اریشہ حیران رہ گئی۔ ”کیا کیا ہے اس نے؟“

اس کی امی جواب دینے کی بجائے ہچکیاں لینے لگیں۔  
 ماں کی ہچکیاں سن کر اریشہ بے چین ہو گئی۔ ”امی! آپ کیوں رورہی ہیں۔“

”روڈ نہ تو اور کیا کروں۔“  
 ”آخر ہوا کیا ہے امی۔“  
 ”اس پرائرام ہے کہ اس نے.....“ اریشہ کی امی اتنا ہی کہہ سکیں۔ وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔  
 ”بتائیے امی۔“

”ارسلان نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک لڑکی کی عزت پامال کی ہے۔“  
 ”کیا؟“ اریشہ لو اپنے بیروں کے بچے سے زمین کھسکی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی ساعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔  
 ”اسی لیے وہ لاہور تمہارے پاس آیا ہے۔ اس کا دوست بھی روپوش ہے۔“ اریشہ کو امی کی آواز سنائی دی۔  
 ”پولیس ان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ تم ارسلاں کو کہیں چھپا دو تاکہ اگر پولیس تمہارے گھر آئے تو وہ ارسلاں کو نہ پکڑ سکے۔“

”امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اریشہ نے جلدی سے کہا۔ ”ارسلان نے اگر جرم کیا ہے تو اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ امی نے کہا۔ ”لیکن جانتی ہو ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔“  
 ”امی۔ جس لڑکی کی زندگی ارسلاں اور اس کے دوستوں نے برباد کی ہے۔ اس کا کیا قصور ہے۔ کیا اس کی بدنامی نہیں ہوئی۔“ اریشہ نے کہا۔

”ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیں گے۔“ امی نے کہا۔ ”فی الحال تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔“  
 امی نے اتنا کہہ کر کال منقطع کر دی تو اریشہ نے غصے سے سیل فون میز پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ساری

اور سوچنے لگی کہ ارسلاں نے اس سے جھوٹ کیوں بولا، جب ارسلاں جاگے گا تو وہ اس سے پوچھے گی۔ پھر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ دن کے گیارہ بجے ارسلاں جاگا تھا۔ اس نے جب اریشہ سے ناشتے کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ”تم منہ ہاتھ دھو لو میں ناشتا بنا دیتی ہوں۔“  
 ارسلاں منہ ہاتھ دھو کر کچن میں ہی آ گیا تھا۔ اریشہ اسے ناشتا دینے کے بعد اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔  
 ”ارسلان۔ امی کا فون آیا تھا۔“

اریشہ کی بات سن کر ارسلاں ناشتا کرتے کرتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر یکثرت پریشانی کے تاثرات ابھرا آئے تھے۔

”کیا کہہ رہی تھیں امی؟“  
 ”تم انہیں بتا کر کیوں نہیں آئے تھے۔“ اریشہ نے کہا۔  
 ”باجی! جب میں لاہور آنے کی تیاری کر رہا تھا تو امی گھر پر موجود نہیں تھیں اس لیے میں انہیں بتائے بغیر ہی آ گیا۔“ ارسلاں نے جواب دیا۔

”امی تو یہ بھی بتا رہی تھیں کہ تمہارا بیک گھر پر ہے جبکہ تم نے کہا کہ تمہارا بیک ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔“ اریشہ نے اپنی بات جاری رکھی جیسے وہ تفتیش کر رہی ہو۔ اس کی بات سن کر ارسلاں کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا:

”باجی۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جو بیک ٹرین میں چوری ہوا ہے وہ عامر کا تھا اور اسی میں میرے اور عامر کے کپڑے تھے۔“

اریشہ کو لگا کہ ارسلاں اب بھی اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے جس کے بارے میں اس کی امی بھی لاعلم ہیں۔

”ناشتا کر کے امی سے بات کر لو۔“  
 ”جی اچھا۔“

اریشہ وہاں سے اٹھ گئی تو ارسلاں ناشتا کرنے میں مصروف ہو گیا لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات بدستور موجود تھے۔

☆.....☆.....☆  
 دوپہر کو اریشہ کے بچے اسکول سے گھر آئے تو ارسلاں ان میں مل کر گیا جبکہ اریشہ دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کا سیل فون کچن میں ہی پڑا ہوا تھا کہ اس کی امی کی پھر کال آ گئی۔ جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی تو اس کی امی کی

کر کچن کے دروازے پر کھڑے ارسلان کی طرف دیکھا جس کا چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے بہن سے کہا کہ وہ انکار کر دے کہ ارسلان یہاں نہیں ہے۔ لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسا فیصلہ جس سے اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھائی نے اگر گناہ کیا ہے تو اسے اس کی سزا بھی ملنی چاہیے۔ گواہی کی بات بھی یاد تھی کہ اگر پولیس وہاں آئے تو وہ ارسلان کی موجودگی سے صاف انکار کر دے۔ اریشہ چاہتی تو بھائی کو گھر کے پچھلے دروازے سے بھی بھگاسکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

”بی بی۔ میں نے کچھ پوچھا ہے۔“ اسی لمحے پولیس والے نے دوبارہ پوچھا۔

”جی۔ میرا بھائی یہیں ہے۔ آپ اسے گرفتار کر لیں۔“ اریشہ نے جیسے نہج میں کہا اور دروازہ کھل دیا پولیس نے گھر میں داخل ہو کر ارسلان کو گرفتار کر لیا۔ ارسلان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بہن اسے گرفتار کر دے گی۔ پولیس اس کے دوست عامر کو پہلے ہی گرفتار کر چکی تھی اور اسی کی نشاندہی پر پولیس نے ارسلان کو اریشہ کے گھر سے گرفتار کیا تھا۔ پولیس ارسلان کو لے کر ملتان روانہ ہوئی۔

☆.....☆.....☆

عائلت میں کیسی چلا تو ارسلان اور اس کے دوست عامر پر... الزام ثابت ہو گیا ان دونوں کو سزا ہو گئی۔ متاثرہ لڑکی، جس کا نام راشدہ تھا کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی اور تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ عامر اسے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن راشدہ اسے پسند نہیں کرتی تھی اس لیے اس نے عامر کو صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر عامر نے ارسلان سے مل کر راشدہ کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا۔ ارسلان پہلے تو راضی نہیں ہوا مگر بعد میں مان گیا اور یوں دونوں نے راشدہ کو اغوا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنایا لیکن انہیں اپنی ہوس کا صلہ قید کی صورت میں ملا۔ ارسلان بہت بچھتا رہا تھا کہ کاش وہ عامر کا ساتھ نہ دیتا تو آج وہ جیل میں نہ ہوتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چبک گئیں کھیت کے مصداق پچھتائے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اریشہ کے فیصلے سے اس کی امی تو ناراض ہو گئی تھیں کہ اس نے خون کا رشتہ پس پشت ڈال دیا تھا لیکن اس کے والد مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اریشہ نے ارسلان کو گرفتار کرنا اچھا اقدام کیا ہے تاکہ اسے اس کے گناہ کی سزا ملتی چاہیے۔

بات واضح ہو گئی تھی کہ ارسلان اچانک اس کے گھر کیوں آیا تھا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے بچن سے نکل کر ارسلان کو آواز دی۔ ”ارسلان۔ ارسلان۔“

”جی باجی۔“ ارسلان نے دروازہ کھول کر جواب دیا۔

”ادھر آؤ۔“

ارسلان کچن میں آ گیا۔ اریشہ اپنے بچوں کے سامنے اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے کچن میں بلا لیا تھا۔

”مجھے امی نے بتا دیا ہے کہ تم کیا کارنامہ انجام دے کر آئے ہو۔“ اریشہ کا لہجہ سخت تھا۔ ارسلان یوں چونک پڑا جیسے اس کے سر پر بم بھاڑ دیا گیا ہو۔

”بچ۔ بچ۔ جی۔“ ارسلان کا لہجہ کھوکھلا ہو رہا تھا۔

”تمہیں شرم نہیں آئی تھی کسی لڑکی کی زندگی برباد کرتے ہوئے۔“

ارسلان کا شرم سے سر جھک گیا۔

”وغلطی ہو گئی ہے باجی۔“

”وغلطی۔“ اریشہ نے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔ ”ایک لڑکی کی زندگی برباد ہو گئی اور تم اسے غلطی کہتے ہو۔“

ارسلان اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اریشہ نے اپنی بات جاری رکھی۔

”سوچو۔ اگر کوئی تمہاری بہن کی زندگی برباد کر دے تو تم کیسا محسوس کرو گے۔ کیا تم سراٹھا کر معاشرے میں جی سکو گے؟ جس لڑکی کی تم نے زندگی برباد کی ہے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔“

ارسلان کے پاس کوئی جواب ہوتا تو وہ دیتا۔ اسی لمحے کال بیل بجی تو اریشہ کا دھیان بیل کی طرف چلا گیا۔ وہ کچن سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر چار نو جوان موجود تھے۔

”جی فرمائیے۔“ اریشہ نے دروازے کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کہا۔

”بی بی۔ کیا آپ کا نام اریشہ ہے؟“ ایک نو جوان نے پوچھا۔

”جی۔“

”ہم پولیس والے ہیں۔“ اسی نو جوان نے کہا۔

”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کا بھائی ارسلان آپ کے گھر میں موجود ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔“

پولیس کا سن کر اریشہ نے ہونٹ بھیج لیے۔ اس نے مڑ



## سچی ہے

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں سرگزشت کا پرانا قاری ہوں لیکن اب تک کوئی تخلیق بھیجی نہیں، پہلی بار ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ کہانی میرے دوست کی ہے۔ مجھے اتنی سبق آموز لگی کہ اسے شائع کرانا ضروری سمجھا تاکہ دوسرے لوگ بھی سبق حاصل کر سکیں۔

خورشید شاہ

(کراچی)

یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کو پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد بہت سوں کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ بگڑتے ہوئے گھر پھرے اپنی بنیاد پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

یہ کہانی میرے ایک کزن سلیم اور اس کی بیوی اسماء کی ہے۔ سیدھے سادے لوگ تھے۔ میرے سامنے شادی ہوئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا جس طرح نارمل گھروں میں ہوا کرتا ہے۔

سلیم اور ان کی بیوی دونوں ایک ہی جیسے تھے۔

ہر حال میں گزارا کرنا جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ کیا بتاؤں۔“

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کیسی بات کر دی تھی۔ میں اساء کو بھی جانتا تھا۔ بہت مہذب اور خوش اخلاق عورت تھی۔

لیکن سلیم نے جو الزام لگایا تھا وہ تو بہت حیرت انگیز تھا۔

”جہیں کیسے پتا چلا کہ وہ تم سے بے وفائی کر رہی ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس کو کسی کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔“

”نہیں کسی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن اس کی حرکتیں ایسی ہیں۔“

”خدا کے بندے یہی تو پوچھ رہا ہوں۔ کیسی حرکتیں؟“

”اس کے پاس کسی کا فون آیا کرتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھ سے چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے۔ میری یہ عادت نہیں ہے کہ میں اس کے موبائل پر آنے والی کال کا نمبر چیک کروں۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ کس کا نمبر ہے، کون ہے؟“

”چلو یہ تو ایک بات ہوگئی۔ اس کے علاوہ۔“

”اس کے علاوہ یہ کہ وہ اکثر کسی سے ملنے جایا کرتی ہے۔“ سلیم نے بتایا۔ ”یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس کے پاس اور کہاں گئی ہے۔ جب پوچھتا ہوں تو ادھر ادھر کا بہانہ کر دیتی ہے۔ خاص طور پر اپنی ایک سہیلی نمرہ کا نام لے دیتی ہے کہ نمرہ کے پاس جا رہی ہوں۔ نمرہ کو میں بھی جانتا ہوں۔ اچھی لڑکی ہے۔ سوشل کاموں میں مصروف رہتی ہے تو اسامی یہی کہتی ہے کہ وہ نمرہ کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔“

”تو کیا ایسا نہیں ہوتا؟“

”پہلے سنو تو پچھلے ہفتے یہ ایک دن نمرہ کے پاس گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میری بہن اور بہنوئی آگئے۔ وہ چونکہ بہت دنوں کے بعد آئے تھے اس لیے میں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس کو بلا لوں۔ اس کے موبائل پر فون کیا تو اس کا موبائل بند ملا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود نمرہ کے گھر جا کر اس کو لے آؤں۔ نمرہ کے گھر پہنچا تو نمرہ نے بتایا کہ میں تو پچھلے ایک مہینے سے اس سے نہیں ملی۔ وہ اس کے پاس آئی ہی نہیں ہے اب بتاؤ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“

”ہاں یہ ذرا توشیح کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم

میرا مطلب ہے کہ دونوں عام سی صورت کے تھے۔ دونوں کے رنگ بہت زیادہ دبے ہوئے تھے۔ یعنی کالے ہی تھے۔

سلیم کے ابو یعنی میرے خالو خود بھی اسی قسم کے تھے۔ اس لیے سلیم بھی ایسا ہی ہوا تھا اور دوسری طرف اس کا گھرانہ بھی ایسا ہی تھا۔

میں اس کے تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی سب کی سب معمولی شکل و صورت کی تھیں۔ شاید اس قسم کا گنڈ جینز میں ہوا کرتا ہے یا اس قسم کی کوئی اور بات ہوگی۔

سلیم میرا کزن بھی تھا اور دوست بھی۔ ہم تقریباً ہم عمر تھے۔ اس لیے ہمارے درمیان خاصی بے تکلفی تھی۔ ہم دونوں اپنے مسائل ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے۔

ایک دن وہ میرے پاس بہت الجھا ہوا آیا۔ اس کی الجھن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”خیر تو ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔“

”یار خورشید! تم کو تو معلوم ہے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں جانتا ہوں میں لیکن بات کیا ہے۔“

”بات ایسی ہے کہ میں کسی اور سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”سوائے تمہارے کیونکہ کسی اور سے بات کی تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو تو موقع چاہیے۔“

”بتاؤ تو سہی کیا مسئلہ ہے۔“

”اس شرط پر کہ تم کسی سے نہیں کہو گے کیونکہ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔“

”چلو اب بتا دیجیے دو۔“

”یار اس کی حرکتیں مشکوک ہو گئی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”میں سمجھا نہیں کہسی مشکوک حرکتیں۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔“ اس نے بالآخر بتا ہی دیا۔ ”اس کے تعلقات کسی اور سے بھی ہیں۔“

”خدا کا خوف کرو۔ تم بھابی پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو۔“

”بہت مجبور اور پریشان ہو کر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اس مزاح کا آدمی نہیں ہوں۔“

”میں فوراً پہنچ کر اس کا تعاقب کروں گا۔“ میں نے بتایا۔ ”دیکھو تو سہی۔ وہ کہاں جاتی ہے۔ پھر جب ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو اس سے کھل کر بات کر لوں گا ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی چھپ جائے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ میں نہیں بتا دوں گا۔“

یہ بالکل ایک نئے انداز کا کیس سامنے آیا تھا۔ میرے خاندان میں ابھی تک ایسی کوئی کہانی نہیں ہوئی تھی اور ہوئی بھی تو بے چارے سلیم کے ساتھ۔ جو ایک سیدھا سادا آدمی تھا اور اپنے انداز کی زندگی گزار رہا تھا۔

کئی دنوں کے بعد سلیم کا فون آگیا۔ ”خوشید آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہ نمبرہ کے یہاں جانے والی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ارے یہ نمبرہ رہتی کہاں ہے؟“

”پاپوش مگر میں۔“ اس نے بتایا۔ ”تم آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔“

”میں تمہارے گھر نہیں آؤں گا۔ بلکہ باینک پر تمہارے گھر کے سامنے چھپ کر کھڑا ہوں گا اور جب اسماء نکلے گی تو اس کا تعقب شروع کر دوں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ بس تم آ جاؤ۔“

میں پندرہ منٹ کے اندر اندر باینک لے کر سلیم کے مکان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اسماء گھر سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

اس نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر آ کر اس نے رکشہ کر لیا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ باینک کی وجہ سے ایسے کاموں میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔

سلیم نے بتایا تھا کہ نمبرہ پاپوش مگر میں رہتی ہے جب کہ رکشے کا رخ بالکل مخالف سمت میں تھا۔ یعنی نیوکراچی کی طرف۔ رکشہ چلتا رہا اور میری باینک اس کے ساتھ لگی رہی۔ نیوکراچی سے آگے سر جانی ٹاؤن ہے۔ وہ رکشہ سر جانی ٹاؤن کے بھی آخری سرے پر جا کر رکھا تھا۔ اسماء نے رکشے کا کرایہ ادا کیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئی۔

یہ ایک خستہ حال سا مکان تھا۔ دو کمروں کا۔ سلیم کے اندیشے صحیح ہو رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر سے جھوٹ بول کر کہیں اور آتی تھی۔ کسی اور کے پاس۔

مجھے اس سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ ایسی عورت تو نہیں

نے اسماء سے پوچھا نہیں۔“

”پوچھا تھا۔ لیکن اس نے بڑی ڈھٹائی سے نمبرہ ہی کا نام لیا۔ میں نے اسے جھوٹا کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ خواہ وہ اس کی عزت نفس مجروح ہو جاتی۔“

”یار سلیم۔“ میں اب پھٹ پڑا۔ ”تم کس مزاج کے آدمی ہو۔ کتنی قوت برداشت ہے تم میں۔“

”کیا کروں یار۔“ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

”اور خود سوچ سوچ کر نفسیاتی مریض بن جاؤ گے۔“

”میں لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے تو میں اسے زبردستی اپنی بیوی بنائے رکھوں لیکن میں پورے ثبوت کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک ثبوت تو کوئی نہیں ملا ہے۔ صرف اندازے ہیں۔“

”پاکل ہو تم۔“ مجھے اس پر افسوس ہونے لگا تھا۔ ”اب اور کیا ثبوت جاوے۔“

”یار! کوئی محسوس ثبوت مل جائے گا تو پھر کوئی اسٹیپ اٹھالوں۔“

”اور یہ محسوس ثبوت کہاں سے آئے گا۔“

”یار اس لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

”کیا مطلب ہے۔ میں کہاں سے ثبوت لاؤں گا۔“

”دیکھو وہ تم پر بہت بھروسہ کرتی ہے۔ تمہاری ہر بات مان لیتی ہے۔ تم کو اپنا دوست سمجھتی ہے۔ تم کھلے دل سے اس سے بات کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے کچھ نہیں چھپائے گی اور تم کو سب کچھ بتا دے گی۔“

”فرض کرو، اگر ایسی کوئی بات ہے تو پھر تم کیا کرو گے۔“

”کرنا کیا ہے یار۔ میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ اگر اس نے اپنے دل میں کسی اور کو بسا رکھا ہے تو خوش دلی کے ساتھ الگ ہو جائیں گے۔“

”یہ تو تم نے بہت بڑی بات کہہ دی۔“

”ہاں یار! اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔“

”اوکے! میں اس سے بات کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”بلکہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب وہ گھر سے نمبرہ کے پاس جانے کا کہہ کر نکلے تو تم مجھے فون کر دو۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“



### جبل الطارق Gibraltar

اسپین کے جنوب میں بحیرہ روم کے ساحل پر ایک چھوٹی سی برطانوی نوآبادی اور اہم بحری اور ہوائی اڈا۔ رقبہ 205 مربع میل یا 505 مربع کلومیٹر، آبادی 2000ء میں 35000 سطح سمندر پر بڑھی ہوئی ایک پہاڑی پرواقع ہے۔ ڈیڑھ میل لمبا ریگستانی قطعہ پہاڑی کو اسپین سے ملاتا ہے۔ اس کے قریب ہی آبنائے جبل الطارق ہے، جو یورپ کو افریقہ سے جدا کرتی ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ برطانوی حکومت کا ملازم ہے۔ مقامی ضروریات کے لیے چند صنعتیں بھی ہیں۔ زراعت نہ ہونے کے برابر ہے تقریباً تمام غذائی اشیاء درآمد کی جاتی ہیں۔ زمانہ قدیم سے یہ پہاڑی اسپین کا حصہ رہی ہے اس لیے اسپین اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ 711ء میں شمالی افریقہ کے عرب مسلمانوں نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین پر حملہ کیا تو سب سے پہلے یہی پہاڑی ان کے قبضے میں آئی اور طارق کے نام پر اس کا نام جبل الطارق رکھا گیا۔ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد اس پر اسپین نے قبضہ کر لیا لیکن 1333ء میں یہ پھر شاہ مراکش کے زیرِ نگیں آگئی اور 1462ء تک سلطنت مراکش کا حصہ رہی بعد ازاں اس پر پھر اسپین کا قبضہ ہو گیا اور اس دفعہ

اسماء نے چند لمحے سوچنے کے بعد گردن ہلا دی۔  
میں اسے اپنی بانیک پر نیو کر پچی سے آگے ایک فیملی  
ہوٹل میں لے آیا۔ دیکھنا اور سننا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کہتی  
ہے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔  
”ہاں تو اب بتائیں یہ کیا سلسلہ ہے۔“ میں نے  
پوچھا۔

”سلسلہ یہ ہے کہ میں اپنے آئیڈیل اپنے محبوب کے  
پاس آیا کرتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔  
”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تو بے  
چارے سلیم کے ساتھ آپ بے وفائی کر رہی ہیں۔“  
”ہرگز نہیں۔ میں ایک وفادار بیوی ہوں۔ سلیم  
میرے شوہر ہیں۔ میں ان سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر  
سکتی۔“

”تو پھر محبوب اور آئیڈیل میں کیا فرق ہے۔“ میں  
نے پوچھا۔

”خوشید! کیا تم نے کبھی محمود شیروانی کا نام سنا ہے؟“  
”کیوں نہیں اس ملک کا ہر بچہ لکھا آدی محمود  
شیروانی کے نام سے واقف ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ہر  
حال میں حق کا پرچار کیا۔ جمرانوں کے تعاقب میں رہا۔ اپنی  
شاعری سے آگ لگا دی تھی۔ وہ ایسا شخص ہے جو ہزاروں  
لاکھوں کا محبوب اور آئیڈیل رہا ہے۔ لیکن آپ کے کیس سے  
محمود شیروانی کا کیا تعلق ہے۔“

”وہی میرے محبوب اور آئیڈیل ہیں۔“ اسماء نے

تھی لیکن انسان کا کیا بھروسہ ہوتا ہے لیکن دکھ اس بات کا تھا  
کہ وہ سلیم جیسے آدمی کو دھوکا دے رہی تھی۔

میں اس کو ارڈر سے کچھ فاصلے پر بانیک کھڑی کر کے  
اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اس کو باہر آنے کے بعد پکڑنا چاہتا  
تھا کیونکہ اب ایک مکمل ثبوت میرے پاس آگیا تھا۔

کم از کم اس سے بات کر کے میں اسے شرمندہ تو کر  
بی سکتا تھا۔ یا کچھ نہیں تو احساس دلا سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہی  
ہے۔ کن راہوں پر چل پڑی ہے۔

وہ اس گھر سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد باہر آئی تھی۔  
وہ رستے کے انتظار میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ میں اپنی  
بانیک لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

”بیٹھ جاؤ اسماء بھابی۔ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔“  
میں نے کہا۔

اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بکڑی گئی تھی۔  
”خوشید تم!“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم

یہاں کیوں آ گئے۔“

”میں آپ کی تلاش میں۔ سلیم آپ کی سہیلی مرہ کے  
یہاں گیا تھا۔ وہاں سے پتا چلا کہ آپ یہاں آئی ہیں۔ تو میں  
یہاں آ گیا۔“

”ٹھیک ہے۔ جب تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو میں  
تمہیں بتا دیتی ہوں۔“ اسماء نے کہا۔

”بھابی! کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات  
کر لیں۔ یہاں کھڑے رہ کر بات کرنا مناسب نہیں۔“

ہسپانوی یہاں دو سو سال سے زائد عرصے تک جبر ہے۔ 1704ء میں وائس ایڈمرل آف انگلینڈ سر جارج روک نے سہ روزہ جنگ کے بعد ہسپانیوں کو یہاں سے مار بھگایا اور اس پر برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ 1713ء میں ہسپانیہ نے اٹریخت کے معاہدے کی رو سے جبل الطارق پر برطانیہ کا اور سسلی پر سپوائے کا اقتدار تسلیم کر لیا۔ 13 ستمبر 1779ء کو ہسپانوی فوجوں نے جبل الطارق پر حملہ کر دیا اور تین سال، سات ماہ اور بارہ دن اس کا محاصرہ کیے رکھا لیکن برطانوی گورنر جنرل آلسٹس ایلٹ کے کامیاب دفاع کے سبب ہسپانیہ کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔

1965ء میں ہسپانیہ نے دوبارہ جبل الطارق کی جزوی ناکہ بندی کر دی۔ 1967ء میں یہاں ریفرنڈم کروایا گیا جس میں آبادی کی غالب اکثریت نے برطانوی اقتدار کے حق میں ووٹ دیے۔ اسی سال نئے آئین کا نفاذ ہوا جس کی رو سے مقامی آبادی کو اندرونی معاملات میں خود مختاری دے دی گئی۔ 1968ء میں اقوام متحدہ نے برطانیہ کو ہدایت کی کہ وہ یہ نو آبادی اسپین کے حوالے کر دے۔ برطانیہ کے انکار پر اسپین نے اس کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ 1985ء تک ناکہ بندی جاری رکھی۔

مرسلہ: احمد توفیق۔ میر پور خاص

بتایا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھ سکا۔“

”بہت اچھے لیکن یہ مرد کی نچر ہے کہ وہ کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کرتا اگر میں کسی پر چھائیں تو بھی اپنا آئیڈیل کہوں تو سلیم کہتے تو کچھ نہیں۔ لیکن کہیں نہ کہیں حاسد ضرور ہو جاتے۔“

اسماء صحیح کہہ رہی تھی۔ مرد کی فطرت ایسی ہی ہوتی ہے۔ خاص طور پر شوہر کی۔

”کیا تم محمود صاحب سے ملنا چاہو گے؟“ اسماء نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ میں بھی ان کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”حالانکہ انہوں نے قسم دی تھی کہ ان کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہو لیکن اب بات میری وفا اور عزت کی آگئی ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ان سے مل لو۔ تاکہ سلیم کو یقین دلا سکوں کہ میں ایسی ویسی نہیں ہوں۔“

کچھ دیر بعد ہم پھر سر جانی کے اس مکان کے سامنے تھے۔ اسماء نے دستک دی۔ اندر سے کچھ کہا گیا جس کا جواب اس نے دیا تھا۔ پھر اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔

اسماء اندر چلی گئی، جب کہ میں اس دوران باہر کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی۔ اس نے پہلے اشارہ کیا تو میں بھی اس مکان میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔

میرے سامنے محمود شیرانی صاحب کھڑے تھے۔ وہ شخص جن کی شاعری میں پڑھتا چلا آیا تھا۔ جن کے تقریریں

”ارے میں ان ہی کے پاس جاتی ہوں۔ تم نے سرجانی میں جس گھر کو دیکھا ہے محمود صاحب اس گھر میں موجود ہیں۔ ان کی صحت اس قابل نہیں کہ وہ اپنا کوئی کام کر سکیں۔ اس لیے میں یہاں آکر ان کے لیے کھانے بنا دیتی ہوں۔ ان کے برتن وغیرہ دھو دیتی ہوں۔“

”خدا کی پناہ۔ یہ تو عجیب انکشاف کیا ہے آپ نے۔“

”ہاں اس لیے سلیم کو بھی نہیں معلوم کہ میں کس کے پاس جاتی ہوں۔“ اسماء نے کہا۔

”لیکن محمود صاحب سے آپ کا ایسا کیا تعلق ہے؟“

”ایک باپ اور بیٹی کا۔“

”کیا؟“ یہ ایک دوسرا انکشاف تھا۔ ”کیا محمود صاحب آپ کے والد ہیں؟“

”ہاں۔“

”حیرت کی بات ہے۔ سلیم نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھایا ہے۔“ اسماء نے بتایا۔ ”میں ان کی سب سے چچی شاکر دھی۔ کیا استاد باپ کا درجہ نہیں رکھتا۔“

”بالکل رکھتا ہے۔ خاص طور پر محمود شیرانی جیسا استاد

لیکن آپ کو یہ سب سلیم سے نہیں چھپانا چاہیے تھا۔“

”خورشید، سلیم بہت اچھے انسان ہیں۔“ اس نے کہا۔

وڈیوز پرستی تھیں۔ اخباروں میں بڑھی تھیں۔  
وہ حق گو تھے، ایسے لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ ان  
کو دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا اور اس وقت اندازہ ہوا  
کہ وہ کتنے وجہ اور خوب صورت انسان تھے۔  
عمر کا اندازہ پچاس اور بچپن کے لگ بھگ ہوگا۔ وہ  
بیساکھی پریتھے۔ ان کی ایک ٹانگ پولیس تشدد کے نتیجے میں  
ضائع ہو گئی تھی۔ یہ خبر بہت پہلے میں نے اخباروں میں پڑھی  
تھی۔

”خوش آمدید۔“ شیروانی صاحب نے مصافحہ کے  
لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ”اسماء بیٹی نے مجھے  
تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔“  
”سرا! میں بھی آپ کے بے شمار عقیدت مندوں میں  
سے ایک ہوں۔“ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔  
”اؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ اسماء نے کہا۔

ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ شاید بھٹک کے  
طور پر استعمال ہوتا ہوگا اور شیروانی صاحب جیسوں کا کمرہ ایسا  
ہی ہونا چاہیے۔  
ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بے شمار مسودے  
بھی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ جو شاید ان کی تقریروں کے  
ہوں گے۔

”معاف کرنا میاں یہ کمرہ اس سے بھی کہیں زیادہ  
الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ اسماء بیٹی نے آکر بڑی حد تک اس کو  
سید کر دیا ہے۔ یہ قابلِ فخر شاگردوں میں سے ایک ہے۔  
میری دعا ہے کہ خدا ایسی شاگرد ہر استاد کو دے۔“  
”جناب! ایسی شاگردی کو پروڈیوس کرنے کے لیے  
آپ جیسا قابلِ فخر استاد بھی چاہیے۔“ میں نے کہا۔  
”اسماء بھابی کمرے سے باہر چلی گئیں۔“

شیروانی صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں  
ان کی باتیں پوری توجہ اور عقیدت سے سنتا رہا۔ ان کی  
باتوں میں وہی ملک اور قوم کے لیے درد مندی تھی جو شیروانی  
صاحب جیسے آدمیوں کا حراج ہوتا ہے۔ جس طرح علامہ  
اقبال اس امت کے لیے تڑپا کرتے تھے۔ اس طرح  
شیروانی صاحب تڑپ رہے تھے۔

شیروانی صاحب تو اپنی جگہ تھے لیکن اسماء کا کردار بھی  
کم نہیں تھا۔ وہ جس طرح اپنے استاد اور آپ بڑے انسان  
کی خدمت کر رہی تھی وہ جذبہ قابلِ قدر تھا۔  
اس وقت میں نے مناسب سمجھا کہ سلیم کے بارے

میں بھی بات کر لی جائے۔ میں نے اسماء سے کہا۔ ”بھابی!  
اب میں خود اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ آپ ایک  
با وفا خاتون ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ شیروانی صاحب کی  
خدمت کر کے آپ نے خود کو بہت عظیم ثابت کر دیا ہے تو  
کیوں نہ سلیم کو بھی اس راز میں شامل کر لیا جائے۔“  
”کیا مطلب؟“ شیروانی صاحب چونک پڑے۔  
”آپ کس راز کی بات کر رہے ہیں۔“

”اسماء بھابی نے آپ کے بارے میں اپنے شوہر کو  
بھی نہیں بتایا ہے۔ یہ ان سے چھپ کر آپ کے پاس آیا  
کرتی ہیں۔“  
”ارے یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“ شیروانی  
صاحب جلدی سے بولے۔ ”اس طرح تو شوہر کچھ بھی سمجھ  
سکتا ہے۔“  
”میں تو براہِ علم ہو گئی ہے۔“

”میں نے یہ سوچا کہ آپ اگر کسی کے سامنے نہیں  
آ رہے تو سلیم کو بھی نہ بتایا جائے۔“ اسماء نے کہا۔  
”نہیں بیٹی ایسا مت کرو۔“ شیروانی صاحب نے کہا۔  
”اچھا ہوا جو آج یہ بات میرے سامنے آ گئی۔ تم اپنے شوہر کو  
سب کچھ بتا دو۔ میں تم پر کوئی حرف برداشت نہیں کروں  
گا۔“

”جناب میں ان کے شوہر کو خود آپ کے پاس لے کر  
آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تاکہ وہ ہر طرح سے مطمئن ہو  
جائے۔“  
”ہم کچھ دیر اور بیٹھ کر واپس آ گئے۔ میں اس کو لے کر  
سیدھا سلیم ہی کے گھر گیا تھا۔  
سلیم گھر پر ہی موجود تھا۔  
وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔  
”سلیم آج میں بھابی کا معاملہ کر کے آیا ہوں۔“  
میں نے کہا۔ ”تم اپنے شک کے لیے ان سے معذرت کرو۔  
ان کے کردار کا ایک زبردست پہلو ہمارے سامنے آیا  
ہے۔“  
”وہ کیا ہے۔“

”تم نے محمود شیروانی صاحب کا نام تو سنا ہوگا۔“ میں  
نے پوچھا۔  
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم بھی ان کا ذکر کرتے ہو۔  
خود میں نے ان کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔“  
”اور شاید تمہیں یہ بھی معلوم ہو کہ کسی زمانے میں وہ

جگر مراد آبادی لاہور تشریف لائے تو کچھ مقامی ادیب و شاعر نیاز حاصل کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ تک پہنچے۔ جگر صاحب نہایت اخلاص اور تپاک سے ہر ملاقاتی کا خیر مقدم کر رہے تھے کہ ایک دم سعادت حسن منٹو نے آگے بڑھ کر جگر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قبلہ! اگر آپ مراد آباد کے جگر ہیں تو یہ خاکسار لاہور کا گردہ ہے۔“

\*\*\*\*

سعادت حسن منٹو جب لمبے لمبے ڈگر بھرتے ہوئے تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے تو وہاں برآمدے میں بڑا گارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے رک گئے۔ پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ چیخ کر کہنے لگا۔ ”راشد صاحب! اذرا جلدی سے باہر تشریف لائے۔“

یہ شور سن کر ان۔م۔ راشد کے علاوہ کرشن چندر اور اچندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے پاس جمع ہو گئے۔

”راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔“ منٹو نے سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بغیر ڈاگاردوں کی سائیکل خدا کی قسم سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی فلم ہے۔“

”اس کی آواز بہت تھکی ہوئی اور افسردہ تھی۔“ ان دونوں نے مل کر گل کھلا دیا ہے۔

”کن دونوں نے۔“

”اسماء نے اور اس دانشور شیروانی نے۔“

”بھائی صاف صاف بتاؤ۔ کیا سلسلہ ہے۔“

”تم ہمارے گھر آؤ۔ یہاں آکر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ تم جو شبوت کی بات کرتے تھے نا تو ایک جیتا جاگتا شبوت تمہارے سامنے ہوگا۔“

اب تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ اس کی آواز بتا رہی تھی کہ معاملہ واقعی بہت سیریس ہے لیکن کیا معاملہ تھا یہ اس کے گھر جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

میں جلدی جلدی تیار ہوا۔ اپنی بائیک سنبھالی اور سلیم کے گھر پہنچ گیا۔

گھر پر سوگوار کی کیفیت تھی۔ اسماء ایک طرف بیٹھی ہوئی زور ہی مچاتی جب کہ سلیم غصے اور پریشانی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اسماء نے کہا۔ ”خورشید! اچھا ہوا تم آگئے۔ مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا تھا۔ اب مجھ پر بدکاری کا بھی لگ گیا ہے جب کہ خدا گواہ ہے کہ میں بے گناہ اور بے قصور ہوں۔“

اسماء کے استاد جگے ہیں۔“

”ہاں یہ معلوم ہے لیکن وہ تو پرانی بات ہوگئی۔“

”اسماء اپنے استاد کی خدمت کے لیے جایا کرتی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

میں نے سلیم کو سب کچھ بتا دیا۔ میری بات سن لینے کے بعد سلیم اسماء پر برس پڑا۔ ”بے وقوف عورت تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔“

”میں ڈرتی تھی کہ کہیں تم ان کا راز فاش نہ کر دو۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ میں تو خود ان کا عقیدت مند ہوں۔“ سلیم نے کہا۔

”اب یہ بتاؤ تمہارا شک دور ہوا یا نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یا۔ اب تو میں اپنی بیوی کا مرید بھی ہو گیا ہوں۔“

”شیروانی صاحب تم سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔“ اسماء نے بتایا۔

”میں تو سر کے بل جاؤں گا۔“ سلیم نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ”یا تمہارا بہت شکر یہ کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میں تو نفسیاتی مریض بننا جا رہا تھا۔“

میں اور اسماء ایک دن سلیم کو بھی شیروانی صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ سلیم ان کا معتقد ہو کر واپس آیا تھا۔

بظاہر تو یہ کہانی ختم ہوگئی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ ابھی اور بھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔ اس کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آنے والا تھا۔

اور وہ موڑ اس وقت سامنے آیا جب ان کے یہاں پہلی اولاد ہوئی۔

پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے لیکن میں اسے دیکھنے اسپتال نہیں جا سکا تھا اور نہ ہی گھر جا سکا۔ کئی دنوں کے بعد میں نے سلیم کو مبارک باد کا فون کیا۔

”کس بات کی مبارک باد۔“ سلیم نے کہا۔

”کمال کرتے ہو، بیٹی ہونے کی مبارک باد دے رہا ہوں۔“

”تم یہ مبارک باد اس شیروانی کو دو۔“ سلیم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“

”بکواس نہیں ہے یا۔ حقیقت ہے۔“ اس نے کہا۔

”اب میرے پاس اس سوال کا جواب ہی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو بھی یقین ہے۔“  
”اب میں کیا کہوں۔ ہاں بھابی سے غلطی ہو گئی ہو گی۔ انسان کو بھینکتے دیر نہیں لگتی لیکن اچھا ہے کہ درگزر کر جاؤ۔“

”خورشید! تم میری نچر جانتے ہو میں ہر معاملے میں درگزر کرنے والا انسان ہوں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جس نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اندر سے کمزور پڑ گیا ہوں۔ برباد ہو گیا ہوں میں۔“

”تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے۔“  
”اب یہی بہتر ہوگا کہ راستے الگ کر لیے جائیں۔“ اس نے کہا۔

”دیکھو یہ بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔“  
”اب ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”خورشید اب تم ذرا اس معاملے کو... دوسرے انگل سے دیکھو۔ اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ اس انداز سے انوالو ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے شوہر میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ وہ اس سے خوش نہیں تھی۔ اس لیے اس نے کسی اور کو اپنا سہارا بنالیا۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟“

”ہاں شاید ایسا ہی ہے۔“  
”شاید نہیں یقیناً۔“ اس نے کہا۔ ”ورنہ کسی اور کے پاس جانے کا جواز ہی نہیں بنتا۔ وہ اس دوسرے مرد کے پاس جا کر خوش رہتی ہے تو مہذب طریقہ یہی ہے کہ شوہر اس کے راستے سے ہٹ جائے۔“  
”لیکن اگر وہ عورت اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی ہو تو؟“

”یہی تو پراپلم ہے کہ وہ اپنی غلطی نہیں مان رہی۔“ سلیم نے کہا۔ ”تم نے خود کو لیا۔ وہ ہٹ دھرم ہو گئی ہے۔ اپنی ضد پراڑی ہو گئی ہے۔ کہتی ہے اس نے کچھ نہیں کیا۔“  
”میں کو خوش کروں گا کہ بھابی اپنی خطا مان لیں۔ پھر تو تم اپنا فیصلہ بدل لو گے نا۔“

”بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔“  
”سلیم یہ تو سوچو کہ تمہاری ایک بچی بھی ہے۔“  
”میری بچی یا.....!“

”خورشید تم ثبوت کی بات کرتے تھے نا جاؤ کمرے میں جا کر دیکھ لو۔ بچی سو رہی ہے تم خود سمجھ جاؤ گے کہ بدکاری کس کو کہتے ہیں۔“

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کمرے میں آ گیا۔ ان دونوں کی نوزائیدہ بچی بستر پر سو رہی تھی۔ میں خود اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

وہ تو بوجھم و شورانی جیسی تھی۔ ویسا ہی خوب صورت چہرہ اور ویسا ہی رنگ۔ جب کہ یہ دونوں میاں بیوی گہرے سانولے تھے اور بچی بہت خوب صورت۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ وہ بچی میرے سامنے تھی۔ ایک واضح ثبوت بچی کی صورت میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔

”دیکھ لیا تم نے۔“ سلیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔  
”ہاں دیکھ لیا۔“ میری آواز بھی ٹھہر چکی تھی۔  
سلیم میرے پاس آ گیا۔ ”جانتے ہو یہ سب کیا ہے۔ یہ تنہائی ہے۔ ایک عورت جب ایک تنہا شخص سے ملنے جاتی ہے تو شیطان ان کے درمیان آتی جاتا ہے۔ اب وہ شخص چاہے محمود شیرانی ہی کیوں نہ ہو یہ سب تو ہوتا تھا۔“

اس دوران اسامہ بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے سلیم کی باتیں سن لی تھیں۔ ”میں کس طرح یقین دلاؤں۔ کس طرح۔ اگر میں نے ذرا برابر بھی بے وفائی کی ہو تو میرے لیے جہنم کے دروازے کھول دیے جائیں۔“

”وہ تو حل ہی پکے ہیں۔“ سلیم کا لہجہ بہت سرد و سرد ہوا تھا۔ ”تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔“ وہ بولتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد اسامہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”خورشید! خدا کے لیے سلیم کو یقین دلاؤ کہ میں ایسی نہیں ہوں۔“

”میں کیسے یقین دلاؤں بھابی کیونکہ آج خود میں بہت کمزور پڑ گیا ہوں۔“

میں بھی اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ جہاں سلیم ایک کرسی پر ٹھہرا بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

”کیا سوچا ہے تم نے؟“ میں نے پوچھا۔  
”پہلے تم بتاؤ۔ کیا میں غلطی پر ہوں۔ لیکن اس عورت نے میرے ساتھ بے وفائی نہیں کی ہے؟ کیا اس سے بڑا کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے؟“

## انور شعور

انور شعور غزل کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی غزلیات کے تین مجموعے آچکے ہیں، جن کے نام بالترتیب اندوختہ، مشق سخن اور ی رقصم ہیں۔ یہ تقریباً 15 سال سے معروف روزنامہ میں مسلسل ”قطعہ“ لکھ رہے ہیں۔ انور شعور کے ہاں دوسو موضوعات واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں رومان اور حالات و واقعات ہیں۔ ان کی شاعری کا محور بالخصوص یہ دو موضوعات رہے۔ انکساری اور عاجزانہ طبیعت کے مالک انور شعور نے اس عہد کے تمام لوگوں سے روابط رکھے جن میں رئیس امر دہوی، فیض، جون ایلیا، احتفاظ الرحمن اور دیگر کئی لوگ شامل رہے۔ آپ سیاسی و سماجی اتار چڑھاؤ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے خیال میں حالات کی خرابی کے پیچھے ایک اجالا ہے جس کا اپنے وقت پر ظہور ہوگا اور پاکستانی عوام کے لیے اچھا وقت لے کر آئے گا۔

## عزم بہزاد

اچھا معرہ کہنے کی جستجو دل میں لیے ایک شاعر تمام زندگی بھی گزرا سکتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ آج کے دور میں شعرا مشق کو تخلیق کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عزم بہزاد نے ایک خصوصی نشست میں کیا۔ ان کا شعری مجموعہ 1997ء میں ”تعبیر سے پہلے“ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اشتہاری کمپنی میں بحیثیت ”کونسلٹنٹ رائٹر“ اس فانی دنیا سے کوچ کرنے تک وابستہ رہے۔ مختلف اشتہارات کے لیے بے شمار گیت اور لازوال مصرعے تخلیق کر چکے ہیں، عزم بہزاد کے خیال میں شاعری کے علاوہ تمام اصناف میں اظہار صرف کب معاش کی سبیل ہے، اس کو ہم تحقیق نہیں کہہ سکتے تخلیق ہمارے اندر کو در یافت کرتی ہے جب کہ کرشل ازم میں ہم ”ماسز“ کو در یافت کرتے ہیں۔ دل سے جنم لینے والی خواہش تحقیق کہلاتی ہے اور تقاضے کے تحت کچھ لکھا جائے تو وہ کرشل ازم کہلاتا ہے۔

اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی جائے از: خرم سہیل

”اب جس کی بھی ہو۔ یہ بہر حال بچی ہے۔“  
یہ جان لینے کے باوجود کہ اس بچی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس کی پرورش کے اخراجات برداشت کرتا رہوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”چاہے اسماء کہیں بھی رہے۔ کسی کے ساتھ بھی رہے۔“

اس نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ویسے بھی اسماء کی غلطی نے کوئی گنجائش کہاں رہنے دی تھی۔

میں نے اتمام حجت کے طور پر ایک بار پھر اسماء کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اگر اپنی غلطی مان لے تو ہو سکتا ہے کہ سلیم معاف ہی کر دے۔ کیونکہ وہ ایک بڑے دل کا انسان ہے۔

لیکن اس کی وہی رٹ تھی کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔

میں ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد جنرل گئی کہ تسلیم نے اسماء کو طلاق دے دی ہے اور اسماء اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلی گئی ہے۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ محمود کے پاس کیوں نہیں گئی۔ کیسی عجیب چوبیٹن تھی۔ حالانکہ ان دونوں میں عمر کا بہت فرق تھا۔ لیکن اس گندے فعل کو انجام دیتے ہوئے یہ فرق کہاں دیکھا گیا تھا اور اب تو وہ سلیم سے آزاد ہو چکی تھی اب اس کو کون روک سکتا تھا۔

وہ اب محمود شیر والی سے شادی بھی کر سکتی تھی لیکن وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ بہر حال یہ اس کا اپنا معاملہ تھا۔

اس کے بعد پھر میری اسماء سے ملاقات نہیں ہوئی اور آج تک نہیں ہو سکی۔ جب اس کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آچکا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ایک خبر پڑھنے کو ملی کہ سر جانی ٹاؤن کے ایک گھر سے مشہور دانشور اور شاعر محمود شیرانی کی لاش ملی ہے۔

خبر کے مطابق شیرانی صاحب وہاں روپوشی اور تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک رات ان پر دل کا دورہ پڑا۔ چونکہ وہ بالکل تنہا تھے۔ اس لیے کوئی ان کی مدد نہیں کر سکا اور اسی عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔

لاش اس وقت دریافت ہوئی جب آس پاس کے گھر لو کو سخت بدبو محسوس ہونے لگی۔ پولیس کو بلا کر دروازہ



اس وقت بچے کی ماں اپنے ماحول سے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ماں کو خوب صورت بچوں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر ماں کا کوئی آئیڈیل ہو اور وہ اس آئیڈیل کے بارے میں سوچتی رہتی ہو تو اس آئیڈیل کے نقوش اس کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے میں چلے جاتے ہیں۔ ”جب میری تخلیق ہوئی تو میری ماں کی آنکھوں میں کس مرد کا چہرہ تھا۔“

توڑا گیا تو محمود صاحب مردہ پڑے ہوئے تھے۔  
پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ بتا دیا کہ ان کو ہارٹ ایک ہوا تھا اور وہیں اسپتال میں ان کو محمود شیرانی کے طور پر پہچان لیا گیا۔

جب یہ خبر پہلی تو بے شمار لوگ اسپتال آ گئے اور انہوں نے تصدیق کر دی کہ وہ محمود صاحب ہی تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر کو پڑھ کر اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔ سلیم نے صرف اتنا کہا تھا اب میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔ جس کم جہاں پاک۔  
کچھ اور دن گزر گئے۔

سلیم نے ایک اور شادی کر لی جب کہ وہ اس دوران ہر مہینے باقاعدگی سے اس بچی کے لیے پیسے بھجوا رہا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھ سے یہی وعدہ کیا تھا۔

اور ویسے بھی ایسے معاملات میں پیدا ہونے والے بچے کا کیا تصور ہوتا ہے وہ معصوم تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ اصلی باپ کون ہوتا ہے اور ماں کس کو کہتے ہیں۔  
بہر حال ایک دن ایسا ہوا کہ شہر کی ایک تعلیمی سرگرمیاں کرنے والی تنظیم کا ایک دعوت نامہ مجھے موصول ہوا۔

وہ دعوت نامہ ایک سیمینار کا تھا۔

اس سیمینار کا موضوع تھا۔ ”بچے کی پیدائش کا حیاتیاتی پہلو“ بہت ہی خشک قسم کا موضوع تھا لیکن میری دلچسپی کی وجہ یہی تھی کہ اس سیمینار کے مقرر ڈاکٹر زین صاحب تھے۔ انہوں نے سماجی اور بائیولوجیکل فیلڈ میں بہت کام کیا تھا۔

میں ان کی دو کتابیں پڑھ چکا تھا۔ بہت گہری نگاہ رکھنے والے دانشور تھے۔  
میں نے وہ سیمینار اٹینڈ کیا۔

اور وہیں سے اس کہانی کا تیسرا موڑ سامنے آ گیا جس کے بعد میں آج تک رورہا ہوں۔ پچھتا رہا ہوں۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ کچھ اور ہو گیا ہے۔

تقریریں ہو رہی تھیں۔ کچھ کدول سے بنا۔ کسی کو نیم دلی سے۔ لیکن جب زین صاحب آئے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا کیونکہ میں ان ہی کو سننے کے لیے تو آیا تھا۔

زین صاحب نے اپنی تقریر کرتے ہوئے ایک اچھی بات کی۔ جس نے مجھے اڑا کر رکھ دیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”بچہ جس وقت رحم مادر میں پرورش پا رہا ہوتا ہے

”ہمارے یہاں چونکہ اس سبکیٹ سے آگاہی نہیں ہے۔ اس لیے بہت سے گھروں میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ بیوی نے شوہر کے ساتھ بے وفائی کی ہے (زین صاحب جیسے سلیم اور اسماء کا کیس بتا رہے تھے) حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ حمل کے دوران وہ عورت اپنے آئیڈیل سے متاثر ہوتی رہتی ہے بس۔“  
اس کے بعد بھی وہ بہت کچھ بتاتے رہے لیکن مجھے جو کچھ سننا تھا وہ سن چکا تھا۔ شاید قدرت مجھے اسی لیے اس سیمینار میں لائی تھی کہ میری آنکھوں کی پٹیاں اتر جائیں۔ وہ پٹیاں اتر چکیں۔ اس لیے پھر بے پناہ شرمندگی۔ اسماء کو طلاق دلوانے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ میں اس کی وکالت نہیں کر پایا تھا۔ میں نے بھی اسے گناہ گار سمجھ لیا تھا۔  
اب اس کا مذاکرتا لازمی تھا۔

اور مذاکرتا اس طرح ہو سکتا ہے کہ میں خود اسماء کو اپنا لوں۔ شادی کر لوں اس سے۔ وہ ایک باکبار اور گریٹ عورت تھی۔ اس سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی اور لے کر نہیں جاتی تھی۔ اسلام نے صاف بتایا ہے کہ دو نامحرم مرد و عورت ایک چھت کے نیچے اکیلے نہیں اس لیے کہ ان کے درمیان تیسرا شیطان آ جاتا ہے۔ یہاں شیطان تو نہیں آیا، بدنامی کا سامان ضرور آ گیا۔  
اس کے کردار کے دونوں پہلو سامنے آ گئے تھے۔

ایک تو اپنے استاد کی خدمت، پھر اپنے شوہر سے وفا۔ میں نے اس کے گھر اپنا رشتہ بھیج دیا۔ جو ذرا سی دشواری کے بعد قبول کر لیا گیا۔ اسماء اب میری بیوی ہے اور میں یہ کہانی اس لیے لکھ رہا ہوں کہ بہت سے لوگ جو اس سچائی سے واقف نہیں ہیں واقف ہو جائیں اور گھر ٹوٹنے سے بچ جائیں۔



## لپ باک

جناب ایڈیٹر

السلام علیکم

ایک بار پھر میں ایک سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سرگزشت میری ایک دیرینہ دوست کی ہے جسے میں نے کہانی کا رنگ دیا ہے۔ کچھ تبدیلی بھی کی ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔

راحت وفا راجپوت  
(لاہور)

مجھے سلام کیا مگر میں تو جیسے حزدہ سی ہو گئی تھی۔ اس شخص میں عجیب سی کشش تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے اس طرح دیکھنے سے اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے ایک بار پھر سلام کیا تو میں

میں اپنے آفس میں بیٹھی تھی کہ چڑا اسی نے کسی آدمی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے دو ہٹا سلیٹے سے سر پر اوڑھ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد ایک جوان آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ اس نے

ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

لی اور شان و شوکت سے شادی کرا دی۔

فرزانہ بھائی چڑچڑ سی تھیں، پہلے دن سے ہی انہوں نے ہم گھر والوں کو کوئی لفٹ نہیں کرائی اور شادی کے ایک ماہ بعد ہی اپنے گھر چلی گئیں۔ بقول ان کے یہاں پھوٹے سے گھر میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ بھائی نے بھی اس کی تائید کی اور یوں وہ اپنے والدین کے گھر ہی رہنے لگیں اور پھر بھائی بھی مفتے میں چار دن اور گھر گزارنے لگے۔ شادی کے بعد نخواستہ لے کر آئے تو آدمی امی کو دی ساتھ ہی یہ کہا کہ اب بیوی کو خرچہ بھی دینا ہے۔

امی پریشان بھی رہ گئیں۔ کمیٹیاں اور قرضے سب منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد کمیٹی دیتا رہے گا۔ اب بھی فکر مند تھے اور امی فکر مند ہی میں وہ بلڈ پریشر کے مریض بن گئے۔ تم درستم یہ کہ شادی کے تین ماہ بعد بھائی کا سالا جو کہ دینی میں ہوتا تھا اس نے ندیم بھائی کو دینی بلوانے کا کہہ دیا۔ بھائی دل و جان سے تیار ہو گئے۔ امی نے کہا۔ دو بیٹیوں کے ساتھ ہم بوڑھے ماں باپ کیا کریں مگر ہو ادبی جو بھائی کی مرضی تھی۔ بھائی دینی چلے گئے ہم حیران اور بے بس تھے۔ ابا دونوں میں بوڑھے لگنے لگے تھے۔ امی روٹی رتیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھی اور میرا ارادہ کسی اچھے کالج میں داخلہ لینے کا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی بندگی میں آگئے ہوں فکر سے ابا دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ قرضہ دینے والے اب واپسی کا تقاضا کر رہے تھے۔ دو ماہ تک تو بھائی نے دو چار بار سلی کا فون کیا اور اپنے سیٹ ہونے کے بعد کچھ پیسے بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔

تقدیر نے ایک اور کاری وار کیا۔ ایک رات ابا کو ہارٹ ایک ہوا اور وہ ہم تینوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم برتو جیسے دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ماں کا دیران چہرہ ہم بہنوں کو دہلائے دیتا تھا۔ امی کم کم ہو گئی تھیں۔ بھائی کا فون آیا تھا، وہ بھی رورہا تھا۔ باپ کا آخری بار منہ نہ دیکھنے پر غم زدہ تھا۔ صدمہ کچھ کم ہوا تو ارد گرد دیکھا کہ اب زندگی کیسے گزرے گی۔ امی سیدھی سادی عورت تھیں۔ ابابھی گھر اور باہر کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔ اب ہم تین عورتیں تھیں۔ رابعہ چوٹی جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ اسے اس سنگین حالات کا ادراک نہیں تھا۔ ہم ماں بنی ایک دوسرے کی غم گسار تھیں۔ ابا کی نخواستہ بند ہو گئی۔ ان کی پنشن اور بقیات جات کے ملنے میں ابھی کچھ عرصہ لگتا تھا۔ جمع پونجی کچھ نہیں

”جی بیٹھے۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بچے اس کے قریب کھڑے تھے۔ ”جی۔“ میں نے کہہ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ ”اپنے دونوں بچوں کو آپ کی اکیڈمی میں داخل کروانے آیا ہوں۔ ہم اس محلے میں نئے شفٹ ہوئے ہیں۔“ اس کی آواز بھی بہت حرا انگیز تھی۔

ضروری کاغذی کارروائی کے بعد بچوں کا داخلہ ہو گیا۔ اس نے فیس ادا کی اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ دل و دماغ میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ میری ذات کے سمندر میں بخور ڈال گیا تھا۔ پتا نہیں اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اب تک میں نے کبھی کسی مرد کے لیے اپنے اندر کوئی کشش محسوس نہیں کی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ پھر کیا ہوا یہ بتانے سے پہلے میں اپنے ماضی کا تعارف کرا دوں۔

میرا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے ہے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ بھائی بڑا تھا اور اس سے پانچ سال چھوٹی میں یعنی آمنہ اور مجھ سے چھ سال چھوٹی رابعہ تھی۔ اولاد میں اتنا وقفہ قدرتی طور پر ہی تھا۔ ابا ایک پرائمری اسکول میں پانی پچھتے تھے۔ محدود آمدنی میں امی جان بہت سلیقے سے گھر چلا رہی تھیں۔ ندیم بھائی نے میٹرک کرنے کے بعد ٹیکنیکل کالج سے الیکٹریشن کا ڈپلوما کورس کیا تھا اور انہیں ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری مل گئی تھی۔ ان کا اثر ان پر بہت مہربان تھا۔ اس کے گھر میں جب بھی بجلی سے متعلق کوئی کام لگتا تو وہ بھائی کو بلایا کرتا تھا۔ یہ روز روز کا جانا رنگ لے آیا۔ اس کی بیٹی نے ندیم بھائی کو پسند کر لیا۔ ندیم بھائی خوب صورت اور اونچے لمبے قد کے جوان تھے۔ وہ لڑکی عمر میں اس سے بڑی تھی اور صحت مند بھی تھی۔

پتا نہیں اس نے کیسا چکر چلایا کہ ندیم بھائی امی جان کے سامنے تن گئے کہ شادی کروں گا تو فرزانہ سے۔ امی ابونے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے تو ہم سب بھائی کا رشتہ لے کر فرزانہ کے گھر پہنچ گئے۔ اس کے والدین نے رسماً بھی وقت نہیں مانگا اور فوراً ہی ہاں کر کے دو ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی دے دی۔ امی نے جو پیسے جمع کر رکھے تھے وہ سب لگا دیے۔ بھائی کا کہنا تھا کہ دیگر کسی بہت اچھے ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ ان کی یہ ضد پوری کرنے کے لیے ابا نے کچھ دوستوں سے قرض لیا۔ امی نے محلے کی کمیٹی قبل از وقت

آئی۔ میں نے کہا۔ ”بھابی کو بتاؤ ہم آئے ہیں۔“  
وہ کہنے لگی۔ ”مالکن بہت ناراض ہوتی ہیں اگر سوتے  
میں اٹھایا تو۔“ تب میں نے سمجھا کہ ہر بار یہاں سے واپسی  
پر امی اتنی غڑ حال کیوں ہوتی ہیں۔ بہو کے سامنے ہاتھ  
پھیلائے کی ذلت، بھوک اور پیاس کی اذیت۔ اپنی بے بسی  
اور کسری کا احساس لے کر وہ یہاں سے لوٹی تھیں۔

دو پہر کا ایک بچ گیا ہم بیٹھے رہے۔ آخر بھابی اپنے  
کمرے سے باہر نکلیں اور بغیر کسی سلام دعا کے کچن میں چلی  
گئیں۔ تو جن کے احساس نے میری رگوں میں دوڑتے لہو کو  
گر دیا۔ میں نے بھابی کے پاس جا کر کہا۔ ”ہم دس بجے  
کے آئے ہوئے ہیں۔ امی آپ کے شوہر کی ماں ہیں اور ان  
کی ذرا براہ عزت نہیں آپ کے دل میں۔“  
بھابی ہنسنے لگیں اور کہنے لگیں۔ ”شکر نہیں کرتیں تم کو  
میرا شوہر اب بھی اپنی کمائی کھلا رہا ہے، احسان ماننے کی  
جگہ بدتمیزی کر رہی ہو۔ چلو کوئی پیسے نہیں ہیں، آجاتی ہیں  
فقیر نیاں میرے دروازے پر۔“

امی مجھے روکنے لگیں۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔  
میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے بھی بہت سنائیں  
بھابی کی والدہ بھی باہر آگئیں۔ وہ بھی بنی کو شہدہ دیے لگیں۔  
امی نے بھابی کے آگے ہاتھ جوڑے کہ آمنہ کی جگہ  
میں معافی مانگتی ہوں۔ بھابی نے امی کو غصے سے پیچھے دھکا  
دیا۔ امی نیچے گر پڑیں۔ غصے سے میری ٹانگیں کا پھٹنے لگیں۔  
میں نے امی کو اٹھایا اور بھابی سے کہا۔ ”تمہارے شوہر کا  
فون آئے تو اس سے کہنا اس کی ماں اور بہنیں آج سے مرگئی  
ہیں۔ اب یہ پانچ ہزار بھی وہ اپنے سسرال والوں کو ہی  
کھلائے۔“ یہ کہہ کر میں امی کو لے کر باہر آگئی۔

گھر سے نکلتے ہی ہم ماں بیٹیاں ایک دوسرے سے  
لپٹ کر رونے لگیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ گلی میں آتے جاتے  
لوگ ہمیں روتا دیکھ کر کہنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آنسو  
پونچھے اور اپنے دوپٹے سے امی کا چہرہ صاف کیا اور ان کا  
ہاتھ پکڑ کر گھر آگئی۔

”میں ندیم کو بتاؤں گی کہ اس کی بیوی نے میری سستی  
بے عزتی کی ہے۔ میں ہر بار چپ چاپ بے عزتی کروا کر  
آجاتی تھی کہ میرا بیٹا پردیس میں ہے وہ پریشان ہوگا۔“  
میں ماں کی سادہ دلی پر ہنس دی۔ رات کو ندیم بھابی  
کا فون آگیا اور ہماری کوئی بات سننے بغیر انہوں نے امی اور  
مجھے وہ سنائیں، بیوی کے آنسوؤں نے انہیں مشتعل کر دیا

تھی۔ بھابی نے ابھی تک ایک روپيا بھی نہیں بھیجا تھا۔ بھابی  
اور اس کے گھر والے لبا کے مرنے پر تھوڑی دیر کے لیے  
آئے تھے پھر دوبارہ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا۔

میں بہت پریشان تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون  
نہیں آئے تھے۔ میں نے ایک دن بھابی کو امی سے چھپ کر  
فون کیا اور گھر کے حالات بتائے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ  
جلد ہی کچھ کریں گے۔ چند دن بعد بھابی کا فون آیا کہ انہوں  
نے فرزانہ بھابی کو پیسے بھیجے ہیں وہاں جا کر پانچ ہزار روپے  
لے لیں۔ امی بہت خوش ہوئیں مگر مجھے اس بات کا شدید دکھ  
ہوا کہ ماں کو پیسے بھیجنے کی بجائے بیوی کو بھیجے ہیں اور اب  
ماں وہاں جا کر بہو سے پیسے مانگے گی مگر امی اسی بات پر  
خوش ہو گئی تھیں کہ چلو آمدنی کا کوئی سلسلہ تو ہوا۔ اگلے دن  
امی بھابی کے سینکے جا پہنچیں اور پیسے لے آئیں۔ ہم نے  
کچھ راشن اٹھایا فون اور بجلی، گیس کے بل ادا کیے۔

میرا رزلٹ آگیا تھا۔ میں نے بہت اچھے نمبر لیے  
تھے۔ کان کا خیال تو کب کا بھول چکی تھی۔ پرائیویٹ ایف  
اے کرنے کی تیاری شروع کر دی اس طرح تین ماہ اور گزر  
گئے۔ امی بھابی کی طرف ابیلی ہی جاتی تھیں۔ ایک بار میں  
نے کہا تو ٹال گئیں اور پھر ان کی واپسی بھی کافی دیر بعد ہوئی  
تھی۔ اگلے ماہ جب بھابی سے پیسے لینے جانا تھا تو امی کو بہت  
تیز بخار ہو گیا براہ پانچ تاریخ کو وہ جاتی تھیں۔ بخار کی وجہ  
سے دو دن نہ بستر سے اٹھ سکیں پھر راجہ کو ساتھ لے کر چلی  
گئیں۔ واپسی پر ان کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ پریشانی  
یہ ہوئی تھی کہ بھابی نے کہہ دیا کہ آپ مقررہ دن نہیں آئیں تو  
پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔ اب اگلے ماہ لیں گے۔

”مجھے شدید غصہ آیا۔ بھابی کا فون آیا تو میں نے  
شکایت کی تو وہ اتنا مجھے ڈانٹنے لگے اور بھابی کی طرف داری  
کرتے رہے۔ میں خون کے کھونٹ پی کر رہ گئی۔“

اگلے ماہ میں نے فیصلہ کیا کہ امی کے ساتھ خود جاؤں  
گی۔ امی مسلسل انکار کرتی رہیں مگر میں بھی ڈٹ گئی۔ ہم  
دونوں ماں بیٹیاں صبح دس بجے بھابی کے گھر پہنچے۔ راجہ کو ہم  
نے بھابی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔  
بہت باریل دینے کے بعد ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا اور  
ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اگلے ایک گھنٹے تک ہم وہیں  
بیٹھے رہے۔ ملازمہ نے پانی تک کا نہ پوچھا۔ امی کی طبیعت  
خراب ہونے لگی تھی۔ ملازمہ صفائی کر رہی تھی۔ بھابی اور ان  
کی والدہ سو رہی تھیں۔ میں نے پانی مانگا تو سادہ پانی لے کر

نیچے والا حصہ خالی کروا کر امی کے نام سے اکیڈمی بنائی۔ چند سالوں میں ہی اللہ کی مہربانی اور ہماری محنت سے حالات بدل گئے۔ آہستہ آہستہ میں نے چند لڑکیوں کو ٹیچر رکھ لیا۔ رابعہ بھی پڑھانی تھی۔ میں بھی بڑی کلاسز کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ ارد گرد میری اکیڈمی کا نام مشہور ہو گیا۔ پہلے بڈل تک تھی پھر میں نے میٹرک تک کر لی۔ اب امی چاہتی تھیں کہ میری شادی ہو جائے ہر ماں کی طرح انہیں میری فکر تھی مگر میں اپنی ماں اور بہن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی تھی، جب امی نے زیادہ اصرار کرنا شروع کیا تو میں نے کہا۔ ”میری شرط ہے کہ کوئی ایسا بندہ ڈھونڈیں جو میرے گھر میں رہے۔“

امی خاموش ہو گئیں مگر وہ میرے لیے رشتہ دیکھتی رہتی تھیں۔ اتنے سالوں میں ندیم بھائی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ انہوں نے گویا ہمیں بھلا دیا تھا۔ ہم نے بھی ان سے رابطے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایک بار ایک محلے دار نے بازار میں انہیں دیکھا تھا، ان سے ملا بھی تھا۔ پتا چلا کہ وہ بچے ہیں تین ماہ کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ بقول اس محلے دار کے کہ ندیم نے ایک بار بھی ماں اور بہنوں کا نہیں پوچھا تھا۔ شاید ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ بیٹے اور ماں اللہ کی آزمائش ہیں۔

ہم نے بھی صبر کر لیا تھا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ میری عمر پچیس سال ہو چکی تھی۔ میں بہت خوب صورت اساتذہ تھی مگر اب تک کسی کو دیکھ کر دل دھڑکا نہیں تھا پہلی بار جمال کو دیکھا تو دل میں چھپے خواب کا ایک بیدار ہو گئے۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ اعیال دار ہے۔ اسی لیے تو دل کو پاگل کہا گیا ہے۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا جو مجھے پاگل بنائے دے رہا تھا۔

جمال اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں کرائے پر شفٹ ہوا تھا۔ یہ مکان دو سال سے خالی تھا۔ مالک مکان نہیں اور چلے گئے تھے۔ اب جمال کو کرائے پر دیا تھا۔ جمال کا تعلق کسی گاؤں سے تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ کسی سرکاری اسکول میں اچھی پوسٹ پر ملازم تھا۔ جو بات اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی وہ اب سرچڑھ کر محسوس ہونے لگی تھی۔ بالکل فلموں جیسی چویش ہو گئی تھی۔

بچوں کا داخلہ ہو گیا تھا۔ اگلے دن وہ اکیڈمی آ گئے۔

تھا۔ میں نے بتانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ عادت کی وجہ سے ریسپونڈ نہیں اٹھایا تھا آپتیکر آن کر دیا تھا کہ امی بھی سن سکیں وہ ”میں سب باتیں سن رہی تھیں پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور سیٹ کے قریب جا کر کہا۔“ ”آج کے بعد تم میرے لیے مر گئے ہو، میرا اور میری بیٹیوں کا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں آج یہ کہہ دیتی ہوں کہ میرے جنازے پر بھی تمہیں نہ آنے دیا جائے۔“ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں خود ہکا بکا رہ گئی۔ امی کے چہرے پر اب سکون تھا۔ ایک ماں کا دل ہی جانتا ہے کہ اس پر کیا طوفان گزر گیا ہے مگر باہر سے امی پرسکون تھیں۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ زندگی کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ امید تھی کہ چند دن تک ابا کی پیشن شروع ہو جائے گی اور کچھ رقم بھی مل جائے گی۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری اور آئندہ کے لیے بلا تکب کرتی رہی۔ وقت نے مجھے بڑا کر دیا تھا۔ ابا کی پیشن لگ گئی جو کہ بہت معمولی سی رقم تھی۔ بہر حال نہ ہونے سے تو بہتر تھی جو پیسے ملے ان سے بھائی کی شادی پر لیا ہوا قرضہ واپس ہوا۔ کمٹیوں کا حساب کیا گیا۔

ہمارا گھر اپنا تھا۔ نیچے دو کمرے بارہوچی خانہ اور چھوٹا سامحن تھا اور ایک کمرہ اور بارہوچہ روم تھا جو کہ بھائی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ امی سے مشورہ کر کے میں نے اوپر ایک اور کمرہ، بارہوچی خانہ، بخوانے کا فیصلہ کیا۔ مناسب پیسوں میں یہ کام ہو گیا تو ہم اوپر شفٹ ہو گئے اور نیچے والا حصہ کرائے پر دے دیا۔

ہماری گلی سے ذرا ہٹ کر ایک پرائیویٹ اسکول کھلا تھا۔ میں نے وہاں جا کر لی۔ میرے میٹرک کے بہترین نمبر میرے کام آئے اور چھوٹی کلاسز کو پڑھانے کے لیے مجھے رکھ لیا گیا۔ شام کو محلے کے بچے مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو ٹینین بنا لیا۔ دن رات محنت، بھائی نے کئی بار فون کیا۔ سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر ہم لائن کاٹ دیتے۔ گھر میں بھائی کا ذکر بھی نہیں ہوتا تھا۔ زندگی آسان ہونے لگی۔ میں ایف اے کر کے بی اے کر رہی تھی۔ جب سنا کہ بھائی کو پتا ہوا ہے اور وہ ندیم بھائی کے پاس دینی چلی گئی ہیں۔ اس خبر کو ہم نے بڑی بے نیازی سے سنا مگر چپ کر ہم تینوں ہی روئے تھے اور پھر جب میں نے بی اے کر لیا تو ٹیوشن والے بچے اسے ہو گئے کہ میں نے



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





## ثوانہ

شاہ پور کوہستان نمک کے دامنی علاقہ میں ثوانہ آباد ہیں اور انہوں نے پنجاب کی تاریخ میں اس سے کہیں زیادہ نمایاں کردار ادا کیا جو محض ان کی تعداد دیکھتے ہوئے مشکل نظر آتا ہے۔ انہیں پنوار راجپوت اور سیال و گھسیا والے مورث اعلیٰ کی نسل سے ہی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب میں غالباً سیالوں کے ساتھ ہی آئے اور یقیناً پندرہویں صدی ختم ہونے سے پہلے۔ وہ سب سے پہلے دریائے سندھ پر جہانگیر کے مقام پر آباد ہوئے لیکن انجام کار شاہ پور تھل میں اپنے موجودہ مسکن کو چلے گئے جہاں مشا ثوانہ میں اپنا مرکزی قصبہ تعمیر کیا۔ اس سے بعد کی تاریخ ”دی چیفس آف پنجاب“ کے صفحات 519 تا 534 اور کرنل ڈیویز کی شاہ پور رپورٹ کے صفحہ 40 سے آگے بیان کی گئی ہے۔ باقی کا ضلع سکھوں کا مطیع ہو جانے کے لیے کافی عرصہ بعد تک ثوانوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اب وہ ایک نیم گلہ بان، نیم کاشیکار قبیلہ، ساہی پیدا کرنے والے مضبوط آدمیوں کی نسل ہیں۔ تاہم ان کے اوصاف افسوس ناک طور پر ان کی انتہائی جھگڑالو افتاد سے داغدار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندرون خانہ اور جس کسی کے ساتھ بھی واسطہ پڑا ان کی غیر ختم شورش جاری ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں

از: سر ڈیونل اینٹن

مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

انہیں جمال ہی چھوڑنے آیا تھا۔ ایک بار پھر اسے سامنے دیکھ کر میری دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ دو دن گزرے تھے کہ امی نے مجھے بتایا کہ ہمارے ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے ہیں۔ میاں بیوی اور دو بیٹے، بیوی آج نئے آئی تھی۔ گاؤں کی ہے۔ ادھر کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔ میں نے جمعہ والے دن ان کو اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔

میرا تو خوشی سے دل ہی کل گیا۔ جمال سے ملاقات کا راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ جمعہ والے دن میں نے بہت اجتماع سے شاندار کھانا بنایا۔ بہترین برتن نکالے۔ اپنے نئے اسٹیکش ریڈی میڈ سوٹ کا انتخاب کیا۔ میرے بال بہت لمبے اور سیاہ تھے۔ اسے میں نے کٹے چھوڑ دیئے تھے۔ میں ایسا کیوں کر رہی تھی مجھے خود پتا نہیں تھا۔ مقررہ ٹائم پر وہ لوگ آ گئے۔ جمال بلیک نیٹ اور سرخ ٹی شرٹ میں لبوس تھا۔ سیاہ بال اس کی پیشانی پر بھرے بھرے تھے۔ وہ بہت پیٹنڈم لگ رہا تھا۔ مجھے اس کی بیوی کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک کم صورت اور دیہاتی سی لڑکی تھی۔ اتنی گرمی میں بھی اس نے ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا۔ بیٹے بھی عام سی شلوار قمیصوں میں تھے۔ مجھے جمال کی بیوی عابدہ پر بہت رشک آیا۔ اس عام سی لڑکی کی قسمت کتنی اچھی تھی۔

انہیں کھانے کی دعوت دی تو جمال نے کہا۔ ”آپ نے تو بہت تکلف کر لیا ہے۔“

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ عابدہ بہت اناڑی پن سے کھا رہی تھی۔

بچوں کو کھانا میں نے ہی کھلایا۔ کھانے کی جمال نے بہت تعریف کی۔ میری تو جیسے محنت ہی وصول ہو گئی۔ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں عابدہ سے کہا۔ ”باجی! بہت گرمی ہے آپ موسم کے کپڑے پہنیں۔ ریشمی کپڑوں میں آپ کو گرمی لگ رہی ہوگی۔“

”ہاں لے لوں گی۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ عابدہ کو بازار سے کچھ اچھے کپڑے دلا دیں۔ اسے فیشن اور کلرز کا کچھ پتا نہیں ہے۔“ جمال نے مجھ سے کہا۔

”جی ضرور۔ جب آپ کہیں۔“ میں نے بھی مسکرا کر

جواب دیا۔ رات گئے تک ان کا ہمارے گھر رہنا میری زندگی کا خوب صورت لمحہ تھا۔ عابدہ نے امی کو کہہ دیا کہ آپ میری امی ہیں تو میری امی نہال ہو گئیں۔ امی کو جمال میں

یہ ساری باتیں نہیں مانتا تھا۔ وہ تو ضدی بچے کی طرح چل رہا تھا کہ جمال ہی چاہیے۔ جب بھی عابدہ اور جمال ہمارے گھر آتے یا ہم ان کے گھر جاتے، میں جان بوجھ کر عابدہ پر ہمدردی کے انداز میں تنقید کرتی تو جمال کے ماتھے پر ہل گھرے ہو جاتے۔ عابدہ گاؤں کی لڑکی تھی۔ اس کی چال ڈھال رہن سہن سب میں گنوار پن جھلکتا تھا۔ یہی ایک بات تھی جس کا میں نے فائدہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ جمال سب کے سامنے ہی عابدہ سے بے زاری اور انسٹل کا انداز اختیار کرنے لگا۔ دوسری طرف میں نت نئے لباس خوب صورت میجر اسٹائل اور اپنے ہر انداز سے جمال کو متاثر کرنے میں لگی ہوئی تھی جس طرح عورت کو خدا نے ایک خاص حس دی ہے کہ وہ مرد کی نگاہ کو سمجھ جاتی ہے اسی طرح مرد کے پاس بھی وہ نظر ہوتی ہے جس سے عورت کی نظر پہچان لیتا ہے کہ اس میں نفرت ہے یا محبت۔

عابدہ اور جمال کی شادی کی سالگرہ تھی۔ یہ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ فضا میں ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس رہا ہوا تھا۔ شام کو ہلکی سی خنکی محسوس ہونے لگی تھی اور موسم بے حد دلکش ہو گیا تھا۔ امی کے کہنے پر میں نے عابدہ کے لیے خوب صورت ساجورلی سیٹ اور جمال کے لیے پیٹ شرٹ خرید لی تھی۔ بچوں کے لیے بھی گفٹ تھے۔ شام کو ہم ان کے گھر گئے۔ میں ہمیشہ کی طرح اسٹاکش کپڑوں میں لمبوس تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جمال کی آنکھوں میں پسندیدگی اتر آئی جس نے میری دھڑکن تیز کر دی۔ عابدہ تیار ہو رہی تھی۔ میری رنگ کا سلے ستارے سے جاسوٹ اس نے پہن رکھا تھا۔

”آج آپ کو ساڑی باندھنی چاہیے تھی۔“ میں نے جمال کے سامنے ہی اسے کہا۔

”مجھے نہیں پہننی آتی۔“ وہ بولی۔

”آمنہ جی آپ اسے ساڑی باندھنا سکھا دیں اس جاہل کو تو کچھ پتا نہیں ہے۔“ جمال تخرانہ انداز میں بولا۔

”میں دو ساڑیاں لایا تھا۔ ایک بھی نہیں پہننی اس نے۔“

”کوئی بات نہیں میں سکھا دوں گی۔ میں آپ کے لیے پیٹ شرٹ لائی ہوں۔ آپ یہ پہنیں تب تک میں عابدہ کو تیار کرائی ہوں۔“

ایک ہلکے رنگ کا سوٹ اور اپنی لائی ہوئی جیولری عابدہ کو پہنا کر اس کا میک اپ کیا تو وہ ایک دم بدلی ہوئی

شاید اپنا بیٹا نظر آ گیا تھا۔ باتوں باتوں میں جب امی ندیم بھائی کے بارے میں بتاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں تو جمال نے کہا۔ ”آئی آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں اور عابدہ کو بہو اور بچوں کو اپنے بھوتے۔“

امی خوشی سے رو پڑیں۔ اگرچہ وہ میرے سامنے ندیم بھائی کا کبھی نام نہیں لیتی تھیں مگر میں جانتی تھی کہ بیٹے کی جدائی کا دکھ انہیں اندر سے کھا رہا ہے۔ اس دن کے بعد عابدہ بے تکلفی سے ہمارے گھر آنے جانے لگی۔ جمال کم ہی آتا تھا۔

میرے کمرے کی کھڑکی سے جمال کے گھر کا محن صاف نظر آتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے وہ لوگ محن میں سوتے تھے۔ ایک بچہ جمال کے ساتھ اور دوسرا عابدہ کے ساتھ سوتا تھا۔ میں رات گئے تک اسے دیکھتی رہتی تھی۔ کھاتے پیتے ہنستے مسکراتے دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

اسی تنگدستی نے مجھے بیمار کر دیا۔ بہت تیز بخار تھا۔ گرمی کی چھیٹوں کی وجہ سے اکیڈمی میں بچوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ راجہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ بھی کالج سے آ کر بچوں کو بڑھاتی تھی۔ دو دن سے مجھے بخار تھا۔ عابدہ کئی بار میری خبر لینے آ چکی تھی مگر وہ تم گنہ آ یا نہ حال پوچھا۔ تیسرے دن بخار کچھ ہلکا ہوا۔ امی میرے لیے پھنڈی بنا رہی تھیں۔ راجہ بچے اکیڈمی میں تھی کہ جمال آ گیا۔ امی نے کمرے میں آ کر مجھ سے کہا کہ میں دوپٹا وغیرہ درست کر لوں۔ جمال میری خبر لینے آیا ہے۔ میں دھڑکنے دل کے ساتھ سبھل کر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پھر کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ بڑے غور سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو جیسے دل میں طوفان سا آ گیا۔ میں نے جلدی سے نگاہ جھکا لیں۔ پھر اسے پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

بیماری کے دوران بھی میں رات کو کھڑکی سے ان کے محن میں ضرور دیکھتی تھی۔ اگرچہ دماغ مجھے سمجھاتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ مرد اور دو بچوں کا باپ ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ جمال کی بہن کی شادی عابدہ کے بھائی سے ہوئی ہے یعنی وہ نے سے کا معاملہ ہے۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ جمال ساری زندگی عابدہ کے ساتھ رہنے کا باندھا تھا۔ مگر دل

کے موقع تلاش ہونے لگے۔ پھر کبھی کبھار باہر بھی ملنے لگے۔ میری بے رنگ اور ساپ زندگی میں بہار آگئی۔ ادھر عابدہ سارا وقت امی کے ساتھ لگی رہتی۔ کبھی کھانا پکانا سیکھتی کبھی کپڑوں کی سلائی، بچے بھی امی کو داد دے کہتے تھے۔ میں نے صاف طور پر جمال سے کہہ دیا کہ مجھے اس کا عابدہ کو چھوٹا بھی پسند نہیں۔

اس نے کہا۔ ”جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ صرف میرے بچوں کی ماں ہے۔“

ہماری محبت کو سات ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے لیے کئی رشتے آئے مگر میں نے امی کو صاف منع کر دیا۔ جمال نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد مناسب طریقے سے امی سے میرا ہاتھ مانگے گا۔ مجھے اس کی بیوی کا تعلق بھی منظور تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ عابدہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ میں اسے گاؤں میں رکھوں گا اور ہم دونوں یہیں رہیں گے۔

جمال سے میری محبت عشق کا روپ دھار چکی تھی۔ وہ بھی میرے لیے جتنی ہو رہا تھا۔

ایک شام عابدہ اور جمال آئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ امی نے کچرلا بنایا تھا اور انہیں دعوت پر بلایا تھا۔ بچے رابعہ کے ساتھ شرارتوں میں لگے ہوئے تھے۔ عابدہ اور امی باتیں کر رہے تھے۔ جمال سے بھی بات ہو رہی تھی۔ سب کی نظر بجا کر وہ مجھے کوئی اشارہ کرتا یا ذہنی بات کہتا تو میرا دل دھڑک اٹھتا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک عابدہ اٹھی اور بھاگ کر واش روم کی طرف چلی گئی۔ امی بھی اس کے پیچھے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد امی عابدہ کو پکڑے واپس آئیں اور اسے صوفے پر لٹا دیا۔

”کیا ہوا امی۔“ میں نے پوچھا۔  
جمال بھی عابدہ کے پاس جا کر پوچھنے لگا۔ ”کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟“

”اس حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔“ امی نے محتاط الفاظ میں جمال سے کہا اور میرا داغ بھگ سے اڑھکیا۔ میں بچی نہیں تھی۔ سب سمجھ گئی۔ مارے طیش کے میری رنگوں میں خون اٹھنے لگا۔ وہ تو کہتا تھا جب سے تم ملی ہو میں نے عابدہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اب عابدہ کیسے امید سے ہو گئی۔ میں نے بڑی کاٹ دار نظروں سے جمال کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے نظر چرا گیا۔ میں

لگنے لگی۔ جمال بھی تیار ہو کر باہر آیا تو بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”شکریہ۔“ وہ میری طرف جھک کر آہٹگی سے بولا۔ ”یہ میرا بھی فائبرٹ کلر ہے۔ ہم دونوں کی پسند کشی ملتی ہے۔“

میں خاموش رہی۔ امی اور رابعہ، عابدہ کے ساتھ مل کر ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھیں۔

”آپ کو پسند آیا مجھے خوشی ہوئی۔“  
”کاش کبھی عابدہ میرے لیے شاپنگ کرتی مجھے تو حسرت ہی رہی۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ میں نے کہا۔  
”جی ضرور۔“

”آپ اتنے بڑے لکھے ہیں تو آپ کے والدین نے کوئی بڑی لکھی لڑکی کیوں نہ دی تھی۔“

”نہیں آمنہ جی، میری بہن جو مجھ سے بڑی ہیں عابدہ کے بھائی کے گھر ہے۔ وہ بے اولاد ہیں ان کا گھر نہا جڑے اس لیے مجھے بے بی بی دینا پڑی۔“

”ہنہ! میں نے ہنکارا بھرا۔“  
”مگر زندگی کا سماجی ہم مزاج نہ ہو تو سفر بہت مشکل

لگنے لگتا ہے۔ میں عابدہ کو کسی دوست کے گھر نہیں لے جاسکتا۔ وہ اپنی زندگی میں کتنے مگر میرے اندر کا انسان نا آسودہ ہے۔ میں زندگی گزار نہیں سکتی رہا ہوں۔“ پہلی بار جمال نے تفصیل سے بات کی اور اپنے دل کا درد بتایا۔ میں اسے تسلی دینے لگی۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

”آپ سے بات کر کے دل کو عجیب سا سکون ملا ہے، اگر آپ برانہ مائیں تو آپ کو فون کر لیا کروں۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے برا نہیں لگے گا۔“ یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

اس دن کے بعد سے تو اتر سے اس کے فون آنے لگے۔ کافی دیر دیر تک باتیں ہونے لگیں۔ پھر ایک دن جمال نے مجھ سے اظہار محبت کر دیا۔ اس نے کہا۔ بہت عرصے سے جس خوشی کی مجھے تلاش تھی وہ تم سے ملی ہے۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں بھی تو یہی چاہتی تھی، سو ہواؤں میں اڑنے لگی۔

دوپہر میں اکیڑی کے فون پر اس سے بات ہوتی بہانے بہانے سے ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے

طوفان اٹھتا ہے۔ اب میں اور کتنا ناراض رہتی۔ اس کی اس ادانے میرا دل پانی پانی کر دیا۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس نے کہا۔ ”آمنہ تم مجھے دھوکہ باز اور جھوٹا نہ سمجھو۔ میں نے تمہیں چاہا ہے اور اپناؤں گا بھی۔ اس بار میں گاؤں جاؤں گا تو اب اور اسی سے بات کروں گا۔ پہلے تمہاری امی راضی ہو جائیں۔ میں اور وہ دل کر پھر خواب بننے لگے۔ امی اب عابدہ کا اور بھی خیال رکھنے لگی تھیں۔ اکثر کھانا ہمارے گھر سے ہی جاتا۔ جمال امی سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے خود ہی منع کر دیا کہ عابدہ کی ڈیوری میں تین چار ماہ ہیں وہ فارغ ہو جائے تو پھر بات کرنا۔“

دن گزر رہے تھے ہماری وہی روٹین تھی۔ فون اور باہر ملنا۔ میری کچھ ڈے آ رہی تھی اور میری خواہش تھی کہ ہم دونوں باہر جائیں کیک بھی کاٹیں اور کھانا بھی کھائیں۔ جمال نے وعدہ کر لیا۔ اکیڈمی سے اس دن میں جلدی اٹھ گئی اور نہادھو کر بہترین سوٹ پہنا۔ امی سے ایک دوست کی طرف جانے اور شاپنگ کا کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ مقررہ جگہ پر میں شام چھ بجے پہنچ گئی تھی۔ جمال نے بھی چھ بجے آنا تھا۔ مگر وہ نہ آیا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ سات بجے، آٹھ بجے اور آخرونچ گئے رات ہو گئی تھی۔ لوگ جو مجھے کافی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔ شرمساری اور اذیت سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ گھر پہنچی تو امی گھر پر نہیں تھیں۔ رابعہ نے بتایا کہ عابدہ کو لے کر اسپتال گئی ہیں جمال کے ساتھ۔

”تو یہ بات ہے بیوی کی بیمار داری میں ایک اکیلی جوان لڑکی کو وعدے کا پابند بننا کر ایمان جگہ پر بٹھا کر بھول ہی گئے کہ میں کتنی پریشان ہوئی۔ کیسے لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کیا اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ دوسری بار اس نے میری توہین کی تھی۔ میں کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ صبح امی آئیں تو پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے۔ امی بہت خوش تھیں۔ وہ عابدہ کے لیے نئی بناری تھیں انہیں دو پہر کو کچھ اسپتال جانا تھا۔ عابدہ کا بڑا آپریشن ہوا تھا۔ مجھے کوئی خوشی نہ تھی۔ میرے دل پر اس پڑ چکی تھی۔ بے حسی کا احساس سارے وجود پر چھا چکا تھا۔ دو پہر کو رابعہ بھی امی کے ساتھ اسپتال چلی گئی۔ اکیڈمی کے ٹائم نہیں بچے آ گئی۔ شام کو امی واپس آئیں۔ بتانے لگیں کہ عورتوں کے وارڈ میں مرد نہیں رہ سکتا۔ اس لیے رات کو جمال مجھے لے جانے گا۔ تم دونوں ہمیں دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ جمال بھی خیال رکھے گا۔ جمال کو کھانا دے

غصے سے باہر آ گئی۔ پھر وہ لوگ اپنے گھر چلے گئے۔ میں ساری رات غصے سے کھولتی رہی کہ وہ کس قدر دھوکے باز ہے۔ مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ بھی روتی بھی ہنستی عجیب پاگلوں جیسی حالت ہو گئی تھی۔

دوسرے دن میں نیچے اکیڈمی میں بھی نہیں گئی کیونکہ میں جانتی تھی وہ ضرور آئے گا۔ رابعہ نیچے چلی گئی۔ اگلے دن آفس میں جا کر بیٹھی تھی کہ اس کا فون آ گیا۔ سی ایل آئی میں نمبر دیکھ کر میں نے ریسور ہی نہیں اٹھایا۔ بیل پر بیل ہوئی رہی۔ شام کو دونوں میاں بیوی گھر آئے، میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کمرے میں لیٹی رہی۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ساتویں دن وہ آفس میں آ گیا۔ عجیب اجڑی سی حالت ہو رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ کر جانے لگی تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہم کئی بار تنہائی میں ملے تھے مگر اس کی اس بات نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا تھا کہ وہ کبھی تنہائی کا فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ کبھی بھار ہاتھ تھامنے کے علاوہ اس نے میرے فربہ ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت میں اکیلی تھی کوئی ٹیچر یا پچہ کسی ٹائم بھی آ سکتا تھا۔

”چھوڑیں میرا بازو آپ بہت.....“ میری بات مکمل نہ ہوئی اور آنسوؤں نے روک لی۔

”مجھے معاف کر دو آمنہ میری جان۔ بس مجھ سے غلطی ہو گئی۔ شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں کمزور پڑ گیا۔ مجھے معاف کر دو۔ چلو اسی وقت میں تمہاری امی سے تمہارا ہاتھ مانگتا ہوں۔“

”نہیں مجھے اب آپ کا اعتبار نہیں آپ نے میری توہین کی ہے۔“ میں بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

اس نے جھٹکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔

”نہیں آپ جائیں میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

اچانک وہ میرا بازو چھوڑ کر میرے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ”صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔“

میں ششدر رہ گئی۔ وہ میرے دل کا مکیں تھا۔ میری پہلی محبت۔ میرا عشق تھا۔ میرا جنون تھا۔ میں اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ اسے اپنے قدموں میں بیٹھا دیکھ کر تڑپ گئی۔ ”پلیز ایسا نہ کریں۔“ میں دور ہو گئی۔ میرے دل میں فخر کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ ایک مرد اپنا وقار کسی عورت کے سامنے اسی وقت کم کرتا ہے جب اس کے دل میں محبت کا

بڑھ کر انہیں سہارا دینے لگا۔

”دینا۔“

”ہٹ جاؤ پیچھے۔“ امی چلائیں۔ وہ وہیں رک گیا۔  
”میں نے تمہیں بیٹا سمجھ کر اپنے گھر میں آنے کی اجازت دی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم میرے ہی گھر نقب لگاؤ گے۔“ امی رونے لگیں۔

”آنٹی پلیز! میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنیں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”آپ جانتی ہیں عابدہ سے میرا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ میں آؤں کورانی بیٹا کرکھوں گا۔ سارے حقوق ادا کروں گا۔ کوئی کمی نہ ہوگی۔ آؤں سے پوچھیں ہم نے ایک ساتھ رہنے کے خواب دیکھے ہیں۔“  
میں بے آواز رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جمال آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دے کر چلا گیا۔ امی سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔

”میں عابدہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اسے بیٹی بنایا تھا۔ اب اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کے لیے اس کا گھر اجاڑ دوں۔ آؤں تم تو بہت سمجھ دار ہو، کس راستے کا انتخاب کر لیا تم نے؟“ وہ پھر رونے لگیں۔ جب کافی دیر رونے کے بعد وہ چپ ہوئیں تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”امی جمال میری کانٹوں بھری راہ میں ایک خوش رنگ امید پھول ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو سن لیں جمال میری خوشی ہے۔ میں نے آپ سے بھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلی اور آخری بار مانگ رہی ہوں۔ جمال سے میری شادی کے لیے مان جائیں۔“

وہ چپ چاپ میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ جمال نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اسی لیے تو میرا ہاتھ مانگ لیا اس نے، اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا اور اب میں کیسے پیچھے ہٹ جانی جب کہ میری خواہش بھی یہی تھی۔ اگلے دن امی نے جمال کو بلوایا اور کافی دیر اس سے نہ جانے کیا باتیں کرتی رہیں۔ جب جمال باہر آیا تو بہت خوش تھا۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”میری جان! ایک مرحلہ تو طے کر لیا ہے، آنٹی مان گئی ہیں۔ اب ابا اماں کو منانے گاؤں جا رہا ہوں۔ دعا کرتا۔ کامیاب لوٹوں پھر ہم ایک ہو جائیں گے۔“ میں شرمائی۔  
جمال گاؤں چلا گیا۔ عابدہ کو کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ امی اس کی پہلی جیسی تیارواری کرتی رہیں۔ جمال کو گئے تیسرا دن تھا کہ عابدہ کا بھائی اسے لینے آ گیا۔ عابدہ بھی چلی گئی۔ دن پون گزرتے رہے۔ جمال ابھی تک نہ لوٹا تھا۔

رات آٹھ بجے امی پھر چلی گئیں۔ رابع نے دال چاول بنائے تھے۔ میں کھانا کھا کر لیٹ گئی۔ رابع نے بتایا کہ ”جمال بھائی آئے ہیں آپ کو بلا رہے ہیں۔ آپ جائیں اور انہیں کھانا بھی دے دیں۔“

”نہیں رابع! مجھے بخار ہو رہا ہے تم انہیں جلدی سے کھانا کھلا کر فارغ کرو اور دروازہ بند کر کے آ جاؤ۔“  
وہ چلی گئی۔ میں گم سم سوچتی رہی کہ جمال کی زندگی میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس لیے ابھی بھی وقت ہے پلٹ جانا ہی بہتر ہے۔ چار دن عابدہ اسپتال میں رہی۔ میں ایک بار بھی نہیں گئی۔ جمال سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ شاید وہ جان بوجھ کر میرا سامنا نہیں کر رہا تھا۔ عابدہ گھر آ گئی تھی۔ امی اور رابع کا زیادہ وقت اسی کے گھر گزر رہا تھا۔ جمال کی غیر موجودگی نے عابدہ سے مل آئی تھی۔ بچی بہت پیاری تھی۔ مجھے بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ کتنی دیر اسے گود میں لے کر بیٹھی رہی۔

یہ میری سالگرہ والے دن کے سات دن بعد کی بات ہے۔ رابع عابدہ کے پاس تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ امی کھانا بنا رہی تھیں۔ میں اکیڈمی کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اچانک جمال آ گیا۔ کتنے دن بعد اسے دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے مجھے دیکھا اور سلام کیا۔ میں جواب دے کر بغیر کمرے میں آ گئی۔ وہ امی کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امی نے مجھے آواز دی۔ میں باہر آئی تو دیکھا کہ امی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور جمال سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”آؤں، جمال نے جوابی بات کہی ہے۔ تمہاری شہ پر کہی ہے یا اس کا اپنا دماغ خراب ہے۔“ امی نے غصے سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں گھبرا گئی۔  
”میں نے آنٹی سے کہا ہے کہ میں آؤں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ جمال نے بڑے سکون سے جواب دیا۔  
میں حیران پریشان رہ گئی۔  
”بولو آؤں کیا تم بھی جمال سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“ امی کی آواز شعلہ باری تھی۔  
میں نے جمال کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں سب کچھ بھول گئی۔ ”جی امی۔“  
”آؤں!“ امی لڑکھڑا گئیں۔ جمال تیزی سے آگے

اجازت لے کر عابدہ کے پاس آگئی۔ لہنگا دیکھا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ میں واپس آنے لگی تو چائے کے لیے روک لیا۔ کہنے لگی اب تو تم نے دہن بن کر ہی ادھر آنا ہے۔ میں شرما کر چپ رہی۔

چائے پیئے ہوئے عابدہ نے کہا۔ ”آمنہ تم واقعی جمال سے بہت سچی محبت کرتی ہو۔ ورنہ کوئی بھی لڑکی اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔“

”میں بھی اس کا شمار اپنی طرف ہے کہ بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے جمال کو قبول کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ میں خاموش رہی۔ میں مسکرا کر بات سنتی رہی۔ پہلے تو جمال اس شرط پر راضی نہیں ہوتا تھا اسے اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔ اسی لیے مان گیا مگر میرا خیال تھا کہ تم نہیں مانو گی۔“ عابدہ نے مسکرا کر کہا۔ اب ذرا میں نے دھیان دیا اس کی بات پر۔ کون سی شرط۔ مجھے تو کسی بات کا علم نہیں ہے۔

”اچھا کیا جمال نے تمہاری رضامندی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ حیرانگی سے بولی۔

”کیسا فیصلہ باجی پلیز مکمل کر بتائیں۔“ میرا دل ایک دم گھبرانے لگا۔

”نہیں جب جمال نے تمہیں نہیں بتایا تو میں کیوں بتاؤں۔“ وہ حتیٰ لہجہ میں بولی۔

میں نے اصرار کیا قسم دی تو تب اس نے جو اکتشاف کیا اس سے میرے رونقٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ جمال کو شادی کی اجازت اس شرط پر دی گئی ہے کہ چونکہ جمال کے بچے ہی خاندان کے اصلی وارث ہیں ان کے ساتھ کوئی حصہ دار نہ ہو۔ ان کے ساتھ کوئی حق نیکی نہ ہو اس لیے جمال کی ضد پر گھر والوں کو ماننا پڑا۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ شادی سے پہلے ہی جمال ایک آپریشن کروائے گا جس سے اولاد نہ ہوگی اور اس طرح میں صرف جمال کی بیوی تو بن جاؤں گی لیکن اس کے بچوں کی ماں نہیں بن سکوں گی۔ تاکہ صرف عابدہ کے بچے ہی ہر چیز کے حقدار ہیں۔ پہلے تو جمال نہ مانا پھر شادی اسی صورت میں ہونے کی وجہ سے اس نے رضامندی دے دی۔

میرے سر پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ میری حالت سے بے خبر کہہ رہی تھی۔ ”یہ شرط کسی بھی لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے مگر تم بہت اعلیٰ ظرف ہو اور واقعی جمال سے پیار کرتی ہو۔“ میں نے کوئی بات نہ کی اور اٹھ کر چلی آئی۔

میرے تو دن رات انگوروں پر گزر رہے تھے۔ امی نے نظریں چرائے پھرتی تھی۔ رابعہ تمام باتوں سے لاعلم تھی۔ پندرہ دن کے بعد جمال آیا تو میری سانس میں سانس آئی۔ وہ بہت کمزور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ بہت بڑی جنگ لڑ رہا ہوں۔ عابدہ کا بھائی جمال کی بہن کو مجھے چھوڑ گیا تھا اور اپنی بہن عابدہ کو ساتھ لے گیا تھا۔ جمال نے بتایا کہ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس بار میں کسی قسم کی بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گا۔

میں پرسکون ہو گئی۔ کافی دن گزر گئے۔ جمال مطمئن تھا کہ امی اس بار میرا ساتھ دیں گی۔ امی خاموش تھیں۔ جمال آتا میرے ساتھ باتیں کرتا۔ کھانا کھاتا امی خاموش دیکھتی رہتیں۔ پھر جمال گاؤں چلا گیا اور جب لوٹا تو اس خوشخبری کے ساتھ کہ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ہیں۔ اس کی بہن اپنے گھر چلی گئی تھی۔ عابدہ کو بھی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جمال کے امی ابا آئے اور باقاعدہ میرا رشتہ طلب کیا اور تین ماہ بعد شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ امی مان گئیں مگر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آمنہ! میں صرف تمہاری خاطر راضی ہوئی ہوں تم نے بہت دکھ میرے ساتھ اٹھائے ہیں۔ بیٹا بن کر میرا ساتھ دیا ہے۔ اللہ کرے جمال تمہیں ساری خوشیاں دے۔ کوئی محرومی نہ رہے۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“ ہم دونوں ماں بیٹی کے لگ کر رونے لگیں۔

بھائی نے تو مڑ کر خبر نہ لی تھی۔ اب کون ہاتھ بٹاتا اس لیے امی میرے ہجیر کی تیاری کرنے لگیں۔ عابدہ گاؤں سے آچکی تھی۔ میں شرمندہ سی تھی مگر اس نے مجھے گلے لگا کر کہا۔ ”میں تو شروع سے جانتی ہوں کہ جمال کو میری بیوی بیوی نہیں، کوئی خوب صورت بڑھی لکھی بیوی چاہیے تھی۔ تم میری بہن ہو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ خوش رہیں گی اس لیے کہ ہم دونوں کی خوشی ایک ہی شخص ہے۔“

کتنی بڑا ظرف تھا اس کا، میں پرسکون ہو گئی۔ جمال نے سارے کپڑے جوئے میری پسند سے خریدے۔ ہم دونوں نے اکٹھے شادی کی شاپنگ کی۔ شادی میں پندرہ دن تھے۔ میرا سرخ رنگ کا لہنگا آچکا تھا۔ امی نے اب جمال اور میرا پردہ کرادیا تھا۔ عابدہ نے مجھے بلوایا تھا کہ ایک بار لہنگا اور اس کی قمیص چپک کر لوں کہ فٹنگ ٹھیک ہے۔ رابعہ نے بتایا کہ جمال گھر پر نہیں ہے۔ میں امی سے



جنگلاتی جھلسلاتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا پہلے نمبر

سیما رضا ردا نے اپنے مٹی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا

میں دکھائے کرداروں کے نت نئے رنگ

کراچی  
پاکیزہ  
ماہنامہ

شیریں صدر اور رفعت سراج کے خوب صورت سلسلے وار ناول..... مٹی اقساط لیے

سحرش فاطمہ کے سحر انگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول..... میویری دھوپ کی تم ہی چھاؤں

عالیہ حرا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول..... اشک، جگنو اور ستارے

نگہت اعظمی، سعدیہ رئیس اور فرح طاہر کی خصوصی کہانیاں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور جج کی باسعادت مناسبت سے اختر شجاعت کا پڑ شکوہ مضمون

وہ آنے بزم میں.....

ہماری سمنر رائٹر صبیحہ شاہ

کی صباحت بھری آمد

شائستہ زبین کا سنہرا رو پہلا روپ لیے ایک جامع سروے

اسکے علاوہ

دہن نمبر کے لیے شوخ و شنگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، ہالہ احمد، امہ ثمامہ، ضادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگہت غفار و دیگر ہنرمند لکھاریوں کی حسین تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور پُر تحقیق کار رز، سحر انگیز شاعری، خوشن و اکتھ پکوان، قابل عمل نسخے اور بہت بہت پُر لطف احوال..... صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی مندر

والا مرد نہیں ہوتا ہے۔ میں ساری زندگی تمہاری شکل نہ دیکھنے کی دعا کرتی ہوں۔“

اگلے ہی دن جمال، عابدہ کے ساتھ وہ مکان چھوڑ گیا۔ مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ میں نے امی سے کہہ دیا کہ جو رشتے میرے لیے آئے ہیں ان میں سے جو مناسب ہو منتخب کر لیں مگر شرط یہ ہے کہ میں اکیڈمی چلاتی رہوں گی۔ امی نے دور پرے کے ایک رشتے دار خاور سے رشتہ طے کر دیا۔ چھ ماہ بعد میری شادی ہو گئی۔ خاور میرے لیے بہترین شوہر ثابت ہوئے۔ وہ پڑھے لکھے، باوقار شخص تھے۔ ان کا اپنا کاروبار تھا۔ مجھے انہوں نے عزت محبت سب کچھ دیا مگر جب میرا بیٹا میری ہانپوں میں آیا تو لگا کائنات میرے قدموں میں آ گئی ہے۔ میری بے چینی کو تو آرا گیا۔ ایک بار پھر جدہ شکر ادا کیا کہ میں جمال کی شرط کا شکار نہیں ہوئی۔ آج میری شادی کو چوبیس سال ہو چکے ہیں۔ میرے چار بچے ہیں دو بیٹے دو بیٹیاں۔ میری کل کائنات میری ہستی کا غرور ہیں۔ میں اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے نہیں ہکتی۔

امی کی وفات ہو چکی ہے۔ رابعہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش ہے۔ چندہ سال پہلے ندیم بھائی آئے تھے۔ ماں سے معافی مانگنے مگر معاف کرنے والی جا چکی تھی۔ بہت روئے، مجھ سے معافیاں مانگتے رہے۔ میں نے کہا ماں روئی چلی گئی۔ آپ کی اولاد جب آپ سے ایسا سلوک کرے گی تب پتا چلے گا کہ گویا میں نے انہیں دھکا دیا تھا۔

خاور اور بچوں کے ساتھ میں ایک خوش حال زندگی گزار رہی ہوں۔ اکیڈمی کے ساتھ ساتھ ہم نے اسکول بھی شروع کر دیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ جمال کا بھی بھولے بھٹکے تصور آتا ہے تو بے اختیار شکر ادا کرتی ہوں۔ بعض اوقات محبت میں ہمیں لگتا ہے کہ ایک شخص ہی ساری زندگی ہے، اس کے بعد ہمیں کسی کی ضرورت نہیں رہتی۔ وقت ہمیں بتاتا ہے کہ جس کے لیے ہم نے ساری دنیا سے مکر لی ہے اس کے علاوہ بھی ہمیں بہت کچھ چاہیے۔ کوئی بھی شخص ساری دنیا نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی کی رہ ہی جاتی ہے لیکن اس دن سر راہ عابدہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بالکل شہری ماحول میں ڈھلی لگ رہی تھی۔ مجھے سمجھ کر ایک بڑے ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ وہیں اس نے بتایا کہ اپنے نونے گھر کو بچانے کے لیے اس نے جھوٹ بولا تھا کہ جمال نے گاؤں میں کس شرط پر ہامی بھری ہے۔

گھر آئی تو سامنے ہی امی میرے لیے لائے گئے پتھر کے برتن کا سیٹ رابعہ کو دکھا رہی تھیں۔

”امی جی!“ میں دوڑ کر ان کے گلے لگ گئی اور اونچی آواز میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ اور امی گھبرا گئیں۔ مجھے سنبھالنے لگیں۔ میں روتے روتے غڑھال ہو کر گر پڑی۔ امی مجھے کے ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ اس نے انجکشن لگایا اور میں سو گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر سوئی رہی۔ جب ابھی تو سامنے امی کو دیکھ کر پھر زخم تازہ ہو گیا۔ پھر رونے لگی۔

”کیا بات ہے بیٹی۔ مجھے بتاؤ۔“

”امی! میں جمال سے شادی نہیں کروں گی۔ خدا کے لیے انہیں منع کر دیں۔“

امی تو پریشان ہو گئیں۔ ”کیا بات ہے آمنہ۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔ عابدہ نے کچھ کہا ہے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگیں۔

”نہیں امی کسی سے کچھ نہ کہیں۔ آپ منع کر دیں اور جمال سے کہہ دیں میرے سامنے نہ آئے۔“ میں نے ہاتھ جوڑ دیے امی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا۔ میری محبت اور اعتماد کے ساتھ اتنا بڑا کھیل کھیل جمال نے۔ ہر لڑکی پیدا کئی ممتا کے جذبے سے بڑھتی ہے اور میں تو بچوں کی دیوانی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا میرے اپنے بچے تو ہیں اور نہ بھی ہوئے تو کیا فرق پڑے گا۔ نئی عورت مل رہی ہے یہی بہت ہے۔ میری ممتا کو تو اس نے زندہ درگور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے اعتماد میں لیتا تو میں اس کی محبت میں اندھی ہو کر مان بھی جاتی۔ کیونکہ میں تو اس کے لیے پاگل تھی۔ اتنی بڑی قیمت محبت کو پانے کے لیے میں ادا کر دیتی اور میں ساری عمر خالی ہاتھ رہ جاتی۔ ایک ویران باغ جیسی زندگی ہو جاتی میری۔ میں سوچتی رہی روئی رہی۔

”پاجی دروازہ کھولیں۔“ باہر سے رابعہ کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔ اس نے میری طرف بڑھایا۔ جمال کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”آمنہ! ایک بار صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔ خدا کے لیے ایک بار سامنے آ کر میری بات سن لو۔“

میں نے خط کھٹکھٹے کھٹکے کر کے رابعہ کو دیا۔ ”اے کہہ دو تم ایک کمزور مرد ہو۔ دوسروں کے اشاروں پر چلنے

گدھ

محترم مدیر  
السلام علیکم

میں پہلے بھی جتا چکا ہوں کہ میرا تعلق صحافت سے ہے۔ اس پیشے کی وجہ سے لاتعداد واقعات میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ راتوں سے بھی میری ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ لوگ اسے خونی، سزا یافتہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں لیکن میں جب اس سے ملا اور اس پر گزرتے واقعات سننے تو حیران رہ گیا۔ آپ خود بھی اس کی خود بینی پڑھ کر حیران رہ جائیں گے۔

وسیم بن اشرف  
(ملتان)



آ کر اس نے راتوں کو کندھے سے پکڑ کر بھونچا، راتوں اس اچانک پڑنے والی افتاد سے گھبرا گئی۔ اس نے آؤدیکھا نہ تاؤ، اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے نکالنے والی کے گال پر بائیں ہاتھ کا ایسا تھپڑ مارا کہ وہ دو قدم دور جا کر سنبھل۔

”اے کیا گل کھلا کے آئی ہے۔“ ایک خراٹ  
عورت راتوں سے مخاطب تھی، راتوں ہر ذی نفس سے بے خبر ہیرک  
کی چھت کو گھور رہی تھی۔  
”اے گلابو میں تیرے سے پوچھ رہی ہوں۔“ قریب

ضرورت بھی محسوس نہ کی اور رانو پر پل پڑی، بد معاش، قاتلہ، آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں نے تو بڑی بڑی خراٹ قیدیوں کو سیدھا کر دیا۔ تیری اوقات ہی کیا ہے؟“

رانو کے اوسان خطا ہو گئے، وہ سمجھ ہی نہیں پاتی تھی کہ یہ آتے ہی اس پر کیا عذاب نازل ہو گیا، پانچ تھپہ بید، دو چار تھپہ کھانے کے بعد رانو کی آنکھیں چھلک پڑیں، جھشک اس کے لب پہلے ”بی بی صاحبہ یہاں بھی نا انصافی۔“

”نا انصافی، تو نے بانو کا سر پھاڑ دیا، تھپہ مارے اس کے گال لال کر دیئے اور بات انصاف کی کرتی ہے۔“ آفیسر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کیا کیا۔ میں تو خاموش بیٹھی تھی، اسی نے بد تیزی کی، جس سے بات بڑھ گئی، کیا میں اس کے ہاتھوں ذلیل ہوئی، مار کھاتی اس سے، اس کے کٹوے چاٹنے لگ جاتی۔“ رانو بولی۔

”بھاشن نہ بگھار، جو ہوا وہ بتا۔“ آفیسر نے اسے ڈانٹا۔

”بی بی وہی بتا رہی ہوں۔ آپ افسر ہیں انصاف آپ خود کرنا، پہلے اس نے مجھے چٹنی کہہ کر پکارا، میں نے جواب نہ دیا تو کندھے سے پکڑ کر جھجھوڑا، صفے میں میرا بھی ہاتھ چل گیا، اس نے بھی مارا اور میں نے بھی۔“

”ہوں؟“ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ہنگامہ بھرا اور حکم دیا رانو کو فی الحال دوسری بیرک میں بند کر دو، وارڈرز اسے لے لگیں۔ بانو کمرے میں ہی رہ گئی، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”تجھ سے دو روز بھی صبر نہ ہوا، آج ہی وہ جیل آئی اور تو اس سے بھڑکی، بانو اس طرح نہیں چلے گا، کسی نے اوپر شکایت کر دی تو میں اگلا انریاں چلتی پھردی گی، تیرا کیا ہے تو دوسروں پر دھونس جما کر اپنا اتو سیدھا کھائے رکھے گی، یہ رانو ایک بد معاش کا قاتل کر کے آئی ہے اور تو نے پہلے ہی روز اس سے پیٹا لے لیا، ہوش کے ناخن لے، یہ نہ ہو جو چھوٹ میں نے تجھے دے رکھی ہے وہ واپس لے لوں، اور باقی کی قید تو مشقت کر کے گزارے۔ جا چلی جا موقع مل، اونچ نیچ دیکھ کر قدم اٹھایا کر، میرا کو اسیر سے بھی بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔“

”بانو جیل کی غنڈی تھی، خواہ فی قیدی اس کے سائے سے بھی دور بھاگتی تھیں، افسروں کی آشر باسے اس نے وہاں اپنی دھاک بٹھائی ہوئی تھی، جیل کے باہر بھی بڑی شخصیات سے اس کے مراسم تھے۔ قیدی عورتوں سے پیسے ہوتا، زور زبردستی،

”اری، تھپہ وہ بھی بانو کو۔“ وہ گرجی اس کا نام شاید بانو تھا جس نے رانو کا آتے ہی اسٹریو شروع کر دیا تھا۔ ”اے تو جانتی نہیں مجھے۔“ یہ کہتے ہی بانو نے لات کھائی جو رانو کے پیٹ میں لگی۔ وہ تکلف سے دوہری ہوئی، سیدھی ہونے سے پہلے ہی بانو نے اس کی چوٹی پکڑ کر جوزر کا جھنکا دیا تو رانو کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ بری طرح بوکھلا گئی، یہ کیا آفت اس پر ٹوٹ پڑی ہے۔ رانو بھی دیہات کی بلی بڑی بھی موقع ملتے ہی بانو کو ایک اور تھپہ جو رسید کیا تو اسے چھٹی کا دودھ با دلا دیا، اب بیرک میں باقاعدہ دھندلکشی شروع ہو چکی تھی، کبھی رانو نیچے اور بانو اوپر، کبھی رانو کا پٹہ بھاری اور بانو زمین پوس، دوسری قیدی عورتیں بیرک کی دیوار سے جا لگی تھیں اور تماشا دیکھ رہی تھیں۔ پھر رانو کا جودا چلا تو اس نے بانو کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ بیرک کے پینکے سے بری طرح گھرائی اور اس کی پشیمانی سے خون لکیر کی صورت میں بہتا اس کے رخسار تر کر تا گردن کیل کر گیا۔

”تیرا خون نہ بی جاؤں تو بانو نام نہیں۔“ وہ دھماڑی اور رانو کی طرف لپکی، رانو نے جھکا دی تو اپنے ہی زور میں وہ دیوار سے جا گرائی، چوٹ پر چوٹ کھانے سے وہ نیم پاگل ہو گئی اور ڈر کر ماتی ہوئی بدست گائے کی طرح پھر رانو کی طرف بڑھی۔ شور شرابہ سن کر جیل کا عملہ بید کی چھڑیاں لہراتا آیا، دروازہ کھولا اور بیٹا قصور پوچھے بانو کو کم بار، رانو کو دھنک کر رکھ دیا۔ بید کی چھڑیاں پے در پے پڑنے سے رانو کے منہ سے سکھاریاں نکلنے لگیں، دو چار بانو کو بھی پڑیں، تھوڑی دیر کی پٹائی نے سب شامت کر دیا، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی بید لہرائی کھینچ گئی۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔“ اس کا رعب اور دبدبہ دیدنی تھا، جھوٹا عملہ الٹ کھڑا تھا۔ ”میں پوچھتی ہوں یہ کیا اودھم مچا رکھا تھا؟“ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چلائی پھر وارڈرز کو گھورا تو ایک لیڈی وارڈر نے کہا میڈم ہم بھی شور سن کر یہاں پہنچے تھے، دیکھا تو آج آنے والی نئی قیدی رانو اور بانو کو گھم کھا تھیں، بانو کی پشیمانی سے خون بہہ رہا تھا۔

”دونوں کو لاؤ فورامیر سے کمرے میں، وہاں ان کی خدمت کرتی ہوں۔“ وارڈرز نے سیلوٹ کیا، دونوں کو اپنے حصار میں لے کر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کی طرف چل پڑیں، لیڈی وارڈرز آگے، پیچھے رانو، پھر دو وارڈرز اور پیچھے بانو، آخر میں بھی دو لیڈی وارڈرز، چھ الٹا کڑوں کی گمرانی میں انہیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لایا گیا، رات کے 9 بجتے والے تھے، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے معاملے کی چھان بین کی

سہولیات کے عوض رشوت لے کر جیل حکام تک پہنچانا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا، بدلے میں اسے جیل میں ہر سہولت میسر تھی۔

رانو کو دوسری بیرک میں پہنچا دیا گیا، یہ جیل میں اس کا پہلا دن تھا، پہلے ہی روز اس کے ساتھ جو بیٹی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی ظلم و جبر سہیتے، زمانے کی شوگریں اور اپنوں کے لگے گھاؤ کھا کر یہاں پہنچی تھی۔ جیل میں پہلے ہی دن جو کھل کھلا گیا وہ سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ زندان میں تھی، بابہ زنجیر تھی، زمانے کی زنجیر تو ذکر زندگی کے زندان میں ایک جنگ لڑ کر بھی وہ بظاہر پارٹی تھی لیکن اپنے بیسی کئی لڑکیوں کو یہ خاموش پیغام دے آئی تھی کہ سسک سسک کر مرنے سے، جبر کے سامنے سر ٹکوں ہونے سے بہتر ہے ظلم کے سامنے سر اٹھا کر چلا جائے، موت تو آتی ہے پھر روزِ روز مر کے کیوں جیا جائے، اس نے بھی اپنے زور بازو سے ان بد معاشوں کو وہ سبق سکھا دیا تھا کہ آئندہ کوئی اس جیسی لاچار رانو پر ہاتھ ڈالنے ہوئے ہزار بار سوچے گا۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی پٹلیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اس نے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ ٹانگیں پیاریں، جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا، جلد ہی اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا، سچ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

دوسرے روز منہ اندر میرے سب کو اٹھانے کا عمل شروع ہوا، یہ سب اس کے لیے ناخیر نہ تھا۔ زندان کی زندگی کا ہر دن اس کو نیا سبق پڑھا رہا تھا، مگر کن کر قیدی عورتوں کو نکالا گیا، سارا دن ان سے مختلف کام کرائے جاتے رہے، شام کو بھیڑ بکریوں کی طرح گنتی کر کے پھر بھانے میں بند کر دیا گیا، اسے یہ جیل بھی بھانہ ہی لگی تھی۔ روزانہ مشقت، پیاروں جیسا کھانا اور پھروں سے بھری بیرک، خواہن، بچے، شور شراب، رونا دھونا، مصائب و آلام، دکڑے، ماتم، یہ سب دیکھتے تین دن گزرے تو ایک رات ایک قیدی عورت اس کے پاس چلی آئی، دیکھنے میں ادھیڑ عمر لگتی تھی، لب کھولے تو لگا گویا پھول جھرنے لگے ہوں، اتنا شگھا لہجہ تھا۔ وہ قریب آئی اور بولی۔ ”بیٹی نہ جانے کون سی خطا تھے اس جہنم زار میں لے آئی ہے۔ نصف شب کو تو میرے بستر کے پاس آنا۔“ چند منٹ کے بعد وہ دوبارہ اپنی جگہ پر چلی گئی، بیرک کے باہر وارڈرز الٹ تھیں، چکر پھر لگا کر سب پر ایسے نظر رکھی ہوئی تھیں جیسے ان میں سے کوئی نظر بجا کر بھاگ کھڑی نہ ہو، حالانکہ اس زندان سے نکلنا مشکل تو کیا ناممکن تھا۔ رات آدھی بیت گئی، کسی شرمیلی لہن کی طرح

چاند نے بدلیوں کی چادر اوڑھ لی۔ بیرک کے سامنے درختوں کے سائے محدود ہو گئے، بیرک کے اندر اور باہر ہلکی روشنی والے بلب لگے ہوئے تھے۔ مگر ان غلطی کی ڈیوٹی تبدیل ہو چکی تھی، چاق و چوبند بنی وارڈرز نے راونڈ شروع کر دیے تھے، رانو کو اس خاتون میں کچھ خاص نظر آتا تھا۔ یہ جانے کیوں اس کے لب و لہجے میں اسے اپنائیت محسوس ہوئی تھی، نصف شب کو اسی خاتون نے رانو کو دیکھا، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اس خاتون نے رانو کو خفیہ سا اشارہ کیا، رانو غیر محسوس انداز میں ہٹھکتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں کسی اور کے لینے کی گنجائش تو نہ تھی لیکن کچھ حرکت برکت سے انہوں نے جگہ بنائی لی، وارڈرز کی نظر ان پر نہ پڑی تھی، خاتون نے آہستہ سے پوچھا۔ ”بیٹی کون سی افتادِ دن پڑی جو تو اس بھری جوانی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رنگ لگانے چلی آئی ہے۔“

”میں آپ کو کیا کہوں؟ کس نام سے پکاروں؟“

”آپا کہہ لو۔“

”آپ! پہلے آپ بتاؤ آپ یہاں کیسے؟“

”بتاؤں گی اپنوں کے زخم بھی دکھاؤں گی، کچھ نہیں چھپاؤں گی؟ لیکن تم اتنی خوبصورت ہو، کس کے تم کا نشانہ بنی ہو، یہ جیل نہیں عتوبت خانہ ہے، دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے۔“

”میں اپنے باپ کے باپ کے نتیجے میں یہاں ہوں۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں، مجھے اپنا سمجھو تو تفصیل سے سب بتاؤ، شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“

”آپ تو خود یہاں بے بس ہیں، میری کیا مدد کریں گی۔“

”اس کی فکر نہ کرو، اللہ مسبب الاسباب ہے۔“

”تو ٹھیک ہے آپا، نہ جانے کیوں مجھے آپ میں اپنی ماں کا عکس دکھتا ہے، کل رات کو میری زندگی کے اوراق پڑھ لیتا جن پر جبر اور ظلم، کڑے کیلے، حالات، دکھ بھرے واقعات کی تازہ داستان رقم ہے۔ زمانے کے فرعونوں سے لڑتی لڑتی اس چار دیواری میں آئی ہوں جسے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا، جیل کے بارے میں کسی سے سنا تھا نہ کبھی سوچا تھا، نام پوچھ کتنی ہوں آپ کا؟“

”شر نام ہے میرا، لیکن ہمیشہ بے شر ہی رہی، خیر تم مجھے آ پاپی کہنا، مجھے اس بے شر نام سے نفرت ہو گئی ہے، کوئی مجھے شر کہے تو میرے اندر آگ کا لاؤ روشن ہو جاتا ہے، میں اندر ہی

اندھ بھسم ہونے لگتی ہوں۔“

”آپا زندگی تو میری بھی دیکھتے کو نکلوں جیسی ہے، محبت نفرت میں بدلی، نفرت نے انتقام کو جنم دیا، انتقام کی پار کو کھٹنے لگا تو ہوس کے آسیب نے ایسا بحرِ پردہ کر پھونکا کہ زندگی تیز بہتر کر کے رکھ دی، میں نے اس آسیب کا قصہ تمام کر دیا۔ لالچ نے خون کے رشتوں کو اندھا کوٹھا بہرہ کر دیا تو مجھ سے قتل ہو گیا۔“

”قتل..... آپا بھونچکی رہ گئی۔“

”ہاں آپا قتل۔“

”کسے قتل کیا؟“

”اسے جسے ظالم رسم و رواج اور مکروہ روایات کے علیرہ دار میرا سرتاج بنا چاہتے تھے ساٹھ سال کا بوزھاسر تاج، ہونہ۔ اس نے نفرت سے ہونٹ کیڑے۔“

”اس داستانِ اہلِ کافکہ نظر مجھے سناؤ۔“ آپا اس کی باتیں سن کر بے تاب ہو گئی تھی۔

”کل سناؤں گی اپنی زندگی کا لوح۔ اب سوتے ہیں۔“ رانویہ کہہ کر آپا کا جواب سنے بغیر مہستی ہوئی اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

اگلا روز بھی معمول کے مطابق تھا۔ اس نے جیل میں قیدی اور حوالاتی عورتوں کی بے عزتی کرنے کے لیے انتہائی شرمناک ہتھکنڈوں کا استعمال دیکھا، اسے لگا جیسا زنانہ اسنافِ احترامِ خواتین، عزت نفس، اخلاق اور شرافت کے اصولوں سے بے بہرہ ہے۔ اس نے خواتین کو کرسیاں، بیڈ شیٹ، کڑھائی والی شاٹیں، ڈوپٹے، کشن، ٹی کوزی کور، ٹی ٹرائی سیٹ، سینریوں والے فریم بھی بناتے دیکھا۔ کھلے ہاتھوں بیروں اور بھرپور جسم والی رانوکھی جیل کا مخصوص لباس پہنا دیا گیا تھا، اس لباس میں وہ یوں پھنس کر رہ گئی تھی کہ جسم کے بعض اعضاء پر ایجنینہ کرنے کی حد تک نمایاں ہو گئے تھے، شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی، بازو بھی چھوٹے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی لباس پہنا گیا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی، اسے یہ لباس زبردستی ہی پہنا دیا گیا تھا، لگ رہا تھا جیل میں تمام خواتین کے لیے ایک ہی سائز کا لباس ہوتا ہے۔

موقعِ پاتے ہی آپا اس کے قریب چلی آئی اور اسے دوسری عورتوں سے تھوڑا دور لے گئی۔

”رانویہ قتل تو نے اپنی آبرو اور جان بچانے کے لیے کیا ہے ناں۔“ آپا نے تصدیق چاہی۔

”ہاں آپا۔“

”تو پھر تو زیادہ دیر جیل میں نہیں رہے گی۔“

”وہ کیسے، رانو دیدے پھاڑے آپا کو کھٹنے لگی۔“

”تو قاعدہ قانون نہیں جانتی، اگر مناسب وکیل تیرا کیس لڑے تو اگلی پستی پر تیری ضمانت اور چند مزید پیشیوں کے بعد تو باعزت بری ہو جائے گی۔“

”آپا گھر میں چلے آگ نہ لڑھے پانی، وکیل کون کرے گا؟“ وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

”اچھا میں کچھ کرتی ہوں، تو فکر نہ کر، میں تیری جوانی کو یہاں کی دیمک نہیں لگنے دوں گی، خیر سے چار دن یہاں کاٹ لے، جب بھی تجھ سے ملاقات کے لیے کوئی آئے تو مجھے بتانا۔“ آپا نے اسے تسلی دی۔

”مجھ سے کون ملاقات کے لیے آئے گا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”کیوں، کیا اس جہان میں تیرا کوئی نہیں؟“ آپا کو حیرانی ہوئی۔

”ہے آپا لیکن صرف سرور۔“

”سرور کون؟“

”وہی جو مجھ پر جان چڑھتا ہے۔“

”اودہ میں بھی!“ آپا کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”چلو! جو بھی آئے اسے ایک خط دینا، جو میں کسی کے نام لکھوں گی، بس تیرا کام ہو جائے گا اور تو ان سلاخوں سے باہر ہو گی۔“ آپا نے اسے تسلی دی۔

”لیکن آپ سب یہ.....“

آپا نے اسے ٹوکا اور بات جاری رکھی ”تجھے پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ نیران ہونے کی، ابھی این جی اوز کا نام سنا ہے؟“

”نہیں آپا یہ کیا چیز ہے؟“

”چیز نہیں لیکن!“ آپا نے اسے ہلکی سی چپٹ لگائی۔ ”یہ ایسی تنظیم ہوتی ہیں جو سماج میں بھلائی کے کام کرتی ہیں اور کوئی معاوضہ نہیں لیتیں، ایسی ہی ایک تنظیم میں میرے جانے والے اہم عہدیدار ہیں، تیرا ملاقاتی جب میرا خط ان تک پہنچائے گا تو وہ تھاٹے سے ایف آئی آر کی نقل لے کر وکیل کا بندوبست بھی کریں گے، تیرا کیس بھی مفت لڑیں گے اور تو ایک دو ماہ میں ہی بری ہو جائے گی۔“

”آپا یہ آپ کیسے سہانے سننے دکھا رہی ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ اب تک اس جہنم میں کیوں جل رہی ہیں۔“ وہ مجھے کاٹھا کھی۔



فواد وہاں کا کرتا دھرتا تھا۔ بچایت کا سرچ وہ ہوتا، ہر کس ونا کس کی زندگی اس کی مرضی کے مطابق بسر ہوتی تھی، بستی کے بیشتر افراد تو اس کے بھتیحوں میں ہی اپنا خون پسینا نیک کر کے پیٹ کا جہنم سر در کرتے تھے، کچھ بستی کے باہر محنت مزدوری کر کے روزی روٹی کا بندوبست کر لیا کرتے۔ اس بستی سے ایک کلومیٹر دور بھی چند گھروں پر مشتمل ایک بستی اور تھی، کچے مکانوں کے کینوں کا جو بھٹ خشت پر مزدوری کر کے گزر رہا کرتے تھے۔ کچھ میلوں ٹیلوں پر کھیل تماشے دکھا کر جسم اور روح کا ناظرہ برقرار رکھے ہوئے تھے، چند ایک ایسے بھی تھے جو چودھری کے ظالمانہ فیصلوں کی جینٹ جڑھنے کے بعد بستی سے نکال دیے گئے اور یہاں آ بیٹھے تھے۔ یوں یہاں دس پندرہ گھروں کی ایک بستی آباد ہوئی تھی۔ یہاں بشکل ہی کوئی مکان دو کمروں کا تھا اور نہ ایک کچا کمرانجن اور محسن جانور باندھنے کے لیے لکڑی اور گھاس پھوس سے چھپر ڈال رکھے تھے۔ جس گھر میں بھی نظر ڈالیں اس کی کل محتاج دو تین چار پائیاں، ایک آدھ جستی ٹرک یا چینی تھی، دونوں بستیوں میں کوئی اسکول تھا نہ ہی اسپتال، چودھری نے تو اپنی بستی تک سونگ لگوا رکھی تھی تاکہ اس کی شاہی سواری آرام سے آجائے۔ دوسری بستی کی حالت اس قدر درگروں کی کہ مرکز کو دور کی بات انہیں پہنچنے کا پانی بھی قریباً دو کوس دور سے گھڑوں میں بھر کر لانا پڑتا تھا۔ زیر زمین پانی نہ پڑتا تھا، ان کی پیاس بجھانے کا واحد ذریعہ وہاں سے گزرنے والی نہر تھی۔ اکثر اوقات یہ نہر خشک رہتی، تب مکین چودھری کے پاؤں پڑتے۔ اس کی اجازت سے اس کے زمینوں پر نصب ٹیوب ویل سے کڑوا پانی بھرا لاتے اور پیاس بجھاتے۔ یہ اس نہر پر لیے پانی کا شاخسانہ تھا کہ وہاں کے متعدد مکین یہ قان کے موڈی مرض کا شکار تھے۔ چودھری اور نذیر بے نشیات فروش کے گھروں میں جلی تھی۔ پانی غربت کے مارے اس قابل ہی نہ تھے کہ بجلی کا کنکشن لینے اور بل بھرتے۔ ان کے گھروں میں دو وقت کی روٹی پک جائے یہی بہت تھا۔ چند ایک کے پاس بکری، بھینس اور گائے یا بار برداری کے لیے گدھے تھے۔

بستی کے آدمے سے زیادہ مکین چودھری فواد کے مقروض اور باقی کے سود خور نذیر کے ڈسے ہوئے تھے، وہی صبح، وہی شام، وہی کام۔ بس لوگ جی رہے تھے، اس بستی میں شروع کا تیرا گھر راتو کا تھا۔ دو کمرے، کچن، گھر میں نیم کا درخت، کمرے کے سامان اتنا کہ گزر رہا ہو سکے، بوڑھا افسی باپ، ماں، ایک بھائی جو شہر میں کسی موٹر مکینک کے پاس مزدوری کرتا اور رات گئے لوٹتا تھا، راتو اور اس کی ماں چودھری

”سن میری بچی! سانپ کا ڈسٹا شاید بچ جائے، لیکن انسان اتنا زہریلا ہے کہ اس کا ڈسپانی بھی نہیں مانگتا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں ہوں۔“

”کیا اپنی مرضی سے؟“ آپا کی بات سن کر اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

”ہاں! کبھی آزاد فضاؤں میں ملاقات ہوئی تو تفصیل بتاؤں گی۔“ آپا نے پیار سے اسے سمجھایا۔

”راٹو بھی ششدر تھی کہ قیدی عورتوں پر بے پناہ سختی کے باوجود اس نے کسی کو بھی آپا سے بدتمیزی کرتے یا سخت رویہ اختیار کر کے نہیں دیکھا تھا، وہ سوچنے لگی آپا کی حقیقت کیا ہے؟ شاید آپا کے نہ بتانے میں کوئی مصلحت تھی۔“

”اچھا سنو۔“ آپا نے اسے سوچوں کے سمندر سے نکالا، یہ سب بھی ممکن ہو گا جب تو مجھے اپنی ساری داستان سنائے گی، اور آج کی رات کا تو نے وعدہ بھی کر رکھا ہے۔

”ہاں آپا آج کی رات میں تجھے وہ سب بتاؤں گی جو مجھ پر بنتی۔ دل میں پیوست ظلم کا ایک ایک تیر نکال کر سارے گھٹاؤں سے نکالیں گے۔ تو جی کتنی ہے انسان بہت زہریلا ہے۔“

دن ڈھلنے لگا تو آواز پڑ گئی خواتین کو تھاروں میں پیرکوں میں جانے کا حکم ملا، ایک ایک کو کتنی کے بعد پیرکوں میں ٹھونس دیا گیا۔

☆.....☆

سردیوں کے دن تھے سورج ڈوبنے ہی رات کا راج ہو گیا، قیدی عورتیں، غلیظ بستروں پر سبیل سے اٹے کھل اوڑھ کر لیٹ گئی تھیں، جاگ رہی تھیں تو صرف راتو اور آپا، تھوڑی سردی بڑھی اور کچھ اندھیرا چڑھ گیا، راتو اور آپا کے کھل میں تھی، راتو اپنی زندگی کے اوراق پلٹنے لگی۔

”احمد پور شرفیہ سے کوئی 20 میل کی دوری پر چولستان سے کچھ پہلے بمشکل 20 سے 22 گھروں پر مشتمل بستی آباد تھی۔ دس باہر جہ پڑے، سارے گھر کچے تھے، چھوٹی چھوٹی دیواریں کینوں کی غربت کو بے پردہ کیے ہوئے تھیں، کوئی مکان ایک کمرے کا، کسی کے دو تو شاید ہی کسی کے تین ہوں گے، البتہ ہر گھر کا چھوٹا یا بڑا کچن ضرور تھا، کئی گھروں میں درختوں کی اٹھان اس قدر تھی کہ گویا دوسرے گھروں میں جھانک کر وہاں کی خیر خیر لے رہے ہوں۔ اسی بستی میں دو گھر پختہ تھے، ایک وہاں کے چودھری فواد کا اور دوسرا بدقاش، نشیات فروش، عورتوں کے شکاری اور بیوپاری نذیر کے۔ کئی مریخ اراضی کا مالک چودھری

کارروائی کے ذریعے نے سرور ساربان کو اپنا ملزم قرار دے دیا، سرور اپنی غربت کی دہائیاں دیتا رہا، چور نہ ہونے کی یقین دہائیاں کراتے کراتے رو پڑا، غریب کے پاس ایک ہی سوٹی تھی، اس جوتے کو کھوجی نے اتروا کر دیکھا، سرور کو طے کو کہا گیا، اس نے دو چار چکر لگائے، کئی لوگوں نے دیکھا کہ جوتے کے کلوے کے نشان ہو، ہو ویسے ہی تھے جیسے مذریعے کے ڈبرے سے سرور کے چھپر نما مکان تک آئے تھے، مذریعے کے کارندوں نے دھونس اور دھاندلی سے سرور سے سامان کی برآمدگی کا مطالبہ کیا، ”میرے خلاف الزام ہے، میں نے چوری نہیں کی، میرے گھر کی تلاشی لو۔“ سرور نے بے بسی سے کہا۔

”چور تو تو ہی ہے، مان یا نہ مان، کھرا تیرے دروازے تک آیا، نشان بھی تیرے جوتوں کے ہیں، ہماری مان، سامان دے دے ورنہ پھر پولیس کا سہماں بننے کے لیے تیار ہو جا۔“ نذیر آدمیوں پر اترا آیا۔

بات چودھری فواد تک پہنچ گئی، پختا بل لی گئی، دو چار پائیاں، دو کرسیاں چودھری کے گھر کے وسیع و عریض لان میں موجود تھیں، دو کرسیوں پر چودھری فواد اور نذیرا فرعون بنے بیٹھے تھے، چار پائیوں پر ان کے کارندوں کا قبضہ تھا، بستی کے چند بوڑھے زمین پر لگتی پاتی مارے بیٹھے تھے اور بائیں جانب سینہ چور سرور ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”حالات و واقعات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ چوری تم نے کی ہے۔“ چودھری سرور سے مخاطب ہوا۔

”مالی باپ! اگر میں چور ثابت ہو جاؤں تو میرا سر آپ کے جوتے، یہ منجھ پر الزام ہے۔“ سرور نے صفائی پیش کی۔ غریب شاید جانتا نہیں تھا کہ اندھوں کی بستی میں آئینہ کون خریدتا ہے۔

”کھرا تمہارے گھر تک گیا، واردات میں جو جوتا چور نے پہنا وہ تم نے پہن رکھا ہے اور پھر بھی کہتے ہو کہ چور نہیں ہو۔“ چودھری بولا۔

”سرکار! یہ میرے خلاف کوئی سازش ہے، میں تو صبح اپنا اونٹ لے کر نکلتا ہوں، بھر بھی بار برداری، کبھی سواری، اور کبھی کھیل تماشا دکھا کر چند روپے کماتا کرات گئے کھرا کر سو جاتا ہوں، مجھے کسی نے پھنسا لیا ہے۔“ سرور نے ہمیش کے آگے تین بجائی۔

”سنو بستی والو! سر، بچ چودھری فواد بولا“ میں نہیں جانتا بات پولیس تک جائے وہ اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیں

کے کھیتوں میں کام کرتیں، بوڑھا گھر بڑا چار پائی توڑتا رہتا، یوں اس گھرانے کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ چودھری کے ظلم اور نذیرے کی چیرہ دستیوں کے خلاف کسی کو آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی، دونوں اس قدر بااثر تھے کہ علاقے کی پولیس بھی ان کے ٹکڑوں پر چل رہی تھی، گاڑی خراب ہو گئی تو پیسے چودھری نے دے دیئے، کسی کے بچے کی شادی ہوتی تو وہ چودھری کے در پر آ جاتا، قریبی پولیس چوکی میں کسی میز، کرسی یا چٹھے کی ضرورت پڑتی تو چودھری کام آتا، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ چودھری کی مرضی و نشاء کے بغیر علاقے میں پرندہ بھی رہا کرے۔

بستی چونکہ صحرا کے قریب تھی اس لیے رات کا منظر بہت مسکون ہوتا تھا۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے پرندے جو سارا دن جھاڑیوں میں چھپے رہتے تھے باہر نکل آتے اور ان کے چھپوں سے بستی کی فضاء میں ایک رونامی گونج پیدا ہو جاتی، افق کی سرخی خاستری رنگ میں بدل جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگتا اور دن کے پرندے اور انسان شب باشی کے لیے کھولنوں اور گھروں میں چلے جاتے اور ان کی جگہ رات کے پرندے اپنا راگ الاپنے لگتے یا پھر نذیرے کے کارندے کمرہ دھندے کا آغاز کرتے، چاند نکل کر درختوں کی چوٹیوں سے سرکٹا ہوا کھلے آسمان پر آ جاتا اور جب اس کی روشنی چمن چمن کر نیچے آتی تو زمین پر روشنی اور سائے مل کر عجیب نقش و نگار بناتے تھے پھر طلوع سحر کی گھنٹیوں میں چڑیاں چھپتاں، فاختائیں امن کے سریلے گیت چھیڑتیں، کبھی بکھار کول کی کوک نغمہ سرا ہوتی، لہلہاتے کھیتوں کے آخر میں آسمان جھک کر زمین سے ملے گا تھا، یہاں باہمی محبتیں کچے گھروں کا خاصہ تھیں، گھنے درختوں کی مہربان چھاؤں سخت چتتی دو پہر کو یہاں کے کینوں کے لیے نعمت سے کم نہ تھی، اس بستی کی بدبستی تھی کہ چودھری فواد اور نذیرے جیسی چگا ڈھیں آزادانہ ہر طرف گھومتی پھرتی تھیں۔“

☆.....☆

سر دیوں کے دن تھے، ایک دو پہر کو بچے والے شور نے وہاں کے کینوں کو حیران و پریشان کر دیا کہ نذیرے کے ڈبرے پر چوری کی واردات ہو گئی، بستی کے کسی کین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ چوروں کو مور پڑ گئے ہیں، لیکن نذیرے اور اس کے کارندوں نے یہ باور کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ ڈبرے سے چور ایک شپ ریکارڈر، ایک استری اور چند دوسری اشیاء چرا کر لے گیا ہے، کھوجی کو بلایا گیا، کھرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سرور ساربان کے دروازے پر رک گئے، بجائے پولیس

نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا، دونوں بستیوں میں کئی مکان پانی سے بھر گئے، چھتیس ٹنک پڑیں، غریبوں کے لیے رحمت بھی زحمت ثابت ہو رہی تھی، ایک طرف سردی دوسری طرف بارش، ہر طرف گھٹاؤپ تاریکی کا راج تھا۔ بارش گھم گئی لیکن کچے راستوں پر آمدورفت انتہائی دشوار ہو کر رہ گئی تھی۔ سردی کے راستے میں تاریکیاں حائل تھیں نہ کسی سانپ پچھو کے خوف نے اس کا راستہ کھوٹا کیا، سرشام ہی خالدہ کے ذریعے رات کو پیغام ملتے ہی وہ بے چینی سے رات کا انتظار کر رہا تھا، بارش بھی دونوں کے ارادوں میں رکاوٹ نہ بن سکی تھی، محبت کا جوش اور پیار کی لگن ہر خطرے کو دل و دماغ سے محو کر دیتی ہے، راتوں نے اسے دونوں بستیوں کے درمیان نیلے کے پیچھے ملنے کا پیغام بھجوایا تھا، اندھیری رات میں وہ تیز تیز قدموں سے ٹیلے کی جانب جا رہا تھا۔ کئی بار اس کا پاؤں چھوٹے موٹے ٹکڑھوں میں بھی پڑا، لیکن وہ سب سے بے پروا لگن میں چلا جا رہا تھا، اس سردی میں اس نے لٹڑے کا ایک پٹنا پرانا سوٹر پہن رکھا تھا، دل میں جب محبت کا کالا روشن ہوتو باہر کی سردی وجود برائے نہیں کرتی، وہ دیوانہ وار ٹیلے کی جانب بھاگنے لگا، کسی پتھر کی ٹھوکری تو شراپ سے پانی میں گرا، کپڑے کچڑ میں لت پت ہو گئے، اس نے وہیں پر جمع پانی سے کچھ کچڑ صاف کیا اور پھر چل پڑا کہ کہیں راتوں مایوس ہو کر واپس نہ چلی جائے، ٹیلے کے قریب پہنچ کر اس نے دو تین بار آہستہ سے راتوں، راتوں کا کارا۔ راتوں ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئی، سردی کو دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ”میں تو سردی سے ملنے آئی تھی کسی بھوت سے نہیں۔“

اس کی بات سن کر سردی نے رخ پھیر لیا۔ ”تو ٹھیک ہے بھوت واپس چلا جاتا ہے۔“ اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ راتوں نے پیار سے پکارا۔

”اے سردی، تو بھوت بھی دکھتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔“  
دونوں یوکی جھپڑ جھاڑ کر تیلی ریٹ ہٹا کر خشک ریت پر بیٹھ گئے۔ راتوں نے سردی کا ہاتھ پکڑا اپنے سر پر رکھ لیا ”کھائیں میری اور بتاتو نے چوری کی یا نہیں۔“  
”تیری قسم مانو! یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے، مجھے بستی سے نکالنے کے لیے سازش کی گئی ہے۔“  
”مجھے پتا ہے لیکن میں ایک بار تجھ سے یقین دہانی چاہتی تھی۔“  
”کس نے کیا یہ سب؟“  
”میں جانتی ہوں، تو بھی غور کرے تو سب سمجھ جائے گا۔“

کے، یہ وہ چوریاں بھی تسلیم کر لے گا جو اس نے کی بھی نہیں ہوں گی، نذیر اس کو اپنا چور قرار دے رہا ہے اور یہ بعد ہے کہ اس نے چوری نہیں کی، نرم و رواج کے مطابق کھرا اس کے گھر تک نکلا ہے، لہذا چور سردی ہی ہے، سامان برآمد کر دے تو سزا میں کی کر دیں گے ورنہ سنا سے بستی سے نکال دیا جائے گا اور بطور جرمانہ اس کا گھر نذیر سے حوالے کر دیا جائے گا۔“

بستی کے کسی شخص کی مجال تھی جو اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا، سردی نے پھر اپنی صفائی چیش کرنا چاہی تو چوہری نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور حکم دیا کہ کل وہ اپنا اونٹ لے کر بستی سے چلا جائے۔

سردی دوسرے روز پنجابی فیصلے کا پھندا گلے میں ڈالے بستی چھوڑ گیا اور ایک میل کے فاصلے پر دوسری بستی میں چلا گیا۔ راتوں کو سارے واقعہ کا پتا چلا تو چلا اٹھی، سردی چور نہیں ہے، اسے پھنسا یا گیا ہے۔

”تو بڑی اس کی طرفداری کر رہی ہے۔“ اس کا باپ بولا۔

”باپو، بات طرفداری کی نہیں، وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے اونٹ کا پیٹ پالتا تھا، اس بستی میں پلا بڑھا، والدین کے مرنے کے بعد ورثے میں ملے اونٹ کو اس نے روزی روٹی کا ذریعہ بنایا، آج تک اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے بستی والوں کو کوئی شکایت ہوئی ہو، ایک دم سے وہ چور کیسے بن گیا؟“ راتوں نے اس کی صفائی دی۔

”چپ بیٹھی رہ۔“ باپ نے ڈانٹا۔ ”چوہری کے کانوں میں بھٹک بھی پڑ گئی تو ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔“

”باپو! بات کچھ کچھ میری سمجھ آ رہی ہے، تیرے کان اور آنکھیں بند ہیں میرے نہیں۔“ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”راتوں کی ماں اسے چپ کرانے کی یا میں پھر.....“ باپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”راتوں چل میری بیٹی کمرے میں جا، کیا ہوا، کس کے ساتھ ہوا، ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔“ ماں کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو گئی۔

ساتھ والے گھر میں اس کی بچپن کی سہیلی اور ہم راز خالدہ رہتی تھی، وہاں کویتا خالدہ سے ملنے چلی گئی۔

☆.....☆

رات کسی گناہگار کے دل کی طرح انتہائی تاریک تھی، آسمان گہرے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، طوفانی بارش

گے۔ ”سرور جذباتی ہو رہا تھا۔

رانو نے اسے پیار سے چپٹ لگائی، ”تیرے مغز میں میری بات نہیں بیٹھی، میں کہہ بھی رہی ہوں کہ کچھ وقت کے لیے خاموشی سادھ لے، اپنے کام سے کام رکھ، مناسب موقع ملے ہی میں خود ماں سے بات کر دوں گی۔“

”اور وہ تیرا باپو، وہ کی جلا دے کم تو نہیں۔“

”شرم کر میرے باپ کو جلا د کہہ رہا ہے، انھوں کے نشے نے اسے ناکارہ کر دیا ہے، اس کی فکر نہ کر، ہاں بھائی رکاوٹ نہ ڈالے تو ہماری شادی کو کوئی نہیں روک سکتا۔“

”تو پھر ملا تھ اور کروعدہ کہ مر میں گے تو ساتھ اور جنس گے تو ساتھ۔“ سرور نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”مر میں ہمارے دشمن۔“ رانو نے اس کا ہاتھ لیا، اور پھر جلدی سے چمڑا کر بولی ”خود بھی مرے گا مجھے بھی مروا دے گا، سو رہا ہوں میں دیر تھی ہے، چل اٹھ چلیں، اندر جہاں راز دار ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو مرشنے والی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔

شیراز نے نفرت اور غصہ سے رانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے لگتا ہے تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی، تو اس چور ساربان سے اب بھی ملتی ہے۔“

سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رانو ایک دم سے بولی۔ ”یہ تجھ سے کس نے کہا؟ کسی پیر فقیر نے تیرے کان میں کچھ پھونک دیا ہے۔“

”بکو اس کرتی ہے میں تجھے ٹوٹے ٹوٹے کر کے پھینک دوں گا۔“ وہ پھنکارتے ہوئے بولا، اسی اثناء میں ماں اور باپو آ گئے۔

”اماں اس کو سمجھا لو، یہ ہر وقت میرے پیچھے بڑا رہتا ہے، ایسا نہ ہو میں اپنی جان دے دوں۔“ رانو منہ بسورنے لگی۔

”بات کیا ہے؟“ باپو نے پوچھا۔

”یہ اب بھی اس ساربان سے ملتی ہے۔“

”یہ جھوٹا بولتا ہے باپو۔“

”باپو! یہ کوئی گل کھلائے گی، ہمیں سر اٹھانے کے قابل بھی نہ چھوڑے گی۔“

”اچھا تو جا کام پر دیر ہو جائے گی۔“ باپو نے اسے ڈانٹا۔

”ٹھیک ہے باپو میں جاتا ہوں جس دن کوئی چاند چڑھا دیا تو یاد کرے گا۔۔۔“ شیراز پاؤں پٹختا چلا گیا۔

”تمہارا مطلب نڈرا؟“

”صرف نڈرا نہیں بلکہ چودھری کا بیٹا تو ابھی اس سازش میں ملوث ہوگا۔“

”مگر کیوں اور کس لیے؟“ سرور کو حیرانی ہو رہی تھی۔

”بڑا بھولا ہے تو بھی، جب سیانوں نے کہہ دیا کہ عشق اور مشک جیسے نہیں چھپتے، تو تیری اور میری محبت کی تھوڑی بہت خبر تو کسی کو ہوگی ناں۔“

”کھل کر بتا، بات میرے لیے نہیں پڑ رہی۔“

”منٹی کے مادھون، جب میں اماں کے ساتھ اور دوسری عورتوں کے ہمراہ چودھری کے کھیتوں میں کپاس کی چٹائی کے لیے گئی تھی تو نواز بھانے سے میرے قریب آیا اور عشق جھاڑنے لگا، میں نے سخت لہجہ اپنایا تو پتا ہے اس نے کیا جواب دیا تھا؟“

”مجھے کیا پتا تو ہی بتا۔“

”اس نے کہا تھا ہم چودھریوں سے تو ساربان اچھے ہیں جو دودھ ملائی کھاتے ہیں۔“ بات آئی تیرے کھوپڑے میں یا نہیں۔

”ہوں تو یہ بات ہے، اس کا مطلب ہے باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہم میں دو ریاں پیدا کی گئیں۔“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیا ہم دور ہو گئے ہیں۔“ رانو مصنوعی غصے سے بولی۔

”نہیں بلکہ چاہت میں اور شدت آگئی ہے۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے میرا جوتا چرا کر کسی کو پہنا کر نڈرے کے ڈیرے سے میرے گھر تک لایا اور لے جایا گیا، پھر جوتا محسن میں رکھ کر چوری کا ڈراما چکر مجھے بتی بدر کر دیا گیا، دیکھ لوں گا میں ان بدقماشوں کو۔“ سرور کا چہرہ سردی میں بھی چپٹانے لگا تھا۔

”نہ بے وقوفی نہیں کرنی، اب تک چند ایک کو پتا ہے پھر پورا جگہ ہماری محبت کا پیری ہو جائے گا۔“ رانو نے اسے سمجھایا۔ ”اچھے وقت کا انتظار کر، رانو تیری ہے اور تیری ہی رہے گی چاہے جان نہ چلی جائے۔“

”جملی کہیں کی، جان جانے کی بات پھر نہ کرنا، تو جانتی ہے میں تیرے بغیر نہیں جی سکتا، رانو! زندگی گزرے گی تو تیرے سنگ، نہیں تو محبت کے دشمنوں پر زندگی تنگ کر دوں گا، بغاوت پر آکسیا گیا تو پھر دشمنی کی آگ میں سب جھلسیں

ایک ایک پیسے کا حساب اور تیرے انگوٹھے لگے کاغذ اور گواہ موجود ہیں۔“ سب کچھ سچ کر بھی تو میرے پیسے ادا نہیں کر پائے گا۔

”میں کچھ سوچتا ہوں۔“ اللہ رکھا کے اوسان خطا ہو رہے تھے، پیسے لیتے وقت اس کے دہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ وقت بھی آئے گا! پروف جاننا نہ تھا نذیرا جس کی گندی نظر ایک عرصہ سے رانو پر مچی وہ تو اسے پھانسا رہا تھا، پیسے بھی دیتا، وہی پیسے واپس لے کر اسے افیم بچتا، اس کے اڈے پر جرا ہوتا، اور اس سے پیسے لے کر اس کے اڈے پر بار جاتا۔ نذیرا بے بدھو بیٹا نکلیا اور وہ بڑا گیا۔

”سن میں تجھے ایک تجویز بتاتا ہوں۔“ نذیرا کہنے لگا، اللہ رکھا کے کان کھڑے ہو گئے نذیرا اسے دیر سے دیر سے کچھ بتانے لگا، وہ سر ہلاتا رہا، چائے پینے کے بعد نذیرے نے چند کاغذ منگوائے جن پر کچھ لکھا ہوا تھا، اللہ رکھا کو کیا پتا کہ ان پر کیا لکھا ہے، جہاں جہاں نذیرے نے کہا وہ انگوٹھے لگا گیا، بات طے ہو گئی۔ نذیرے نے بوڑھے کو برے طریقے سے پھانس لیا تھا، اسے واپسی کے وقت 5 ہزار روپے دیئے، اللہ رکھا کے چہرے پر اب اطمینان تھا، غیرت اور بے عبرتی کا فرق وہ مٹا چکا تھا، ڈیڑھ لاکھ میں وہ بیٹی بچ چکا تھا، نذیرے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆

محابدے کے مطابق اللہ رکھا نے ٹھیک ایک ماہ بعد رانو کو نذیرے کے نکاح میں دے دینا تھا۔ تین ہفتے آنا فانا گزر گئے، دسمبر کا آخری عشرہ تھا، رانو، شیراز، اس کی ماں اور باپور کی سوچی کھا چکے تو اللہ رکھا نے یہ بتا کر سب کو حیران کر دیا تھا کہ اس نے رانو کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اسی مہینے کے آخر میں رخصتی ہے۔

سب کو چھپے سانپ سمجھ گیا، رانو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، حوصلہ کر کے بولی۔ ”باپو! یہ تیرا فیصلہ ہوگا، میرا نہیں، کسی سے شادی نہیں کروں گی میں اس سے تو بہتر تھا تو مجھے دیوار میں چنوا دیتا۔“

”تو اپنا منہ بندھ رکھ، جو کر رہا ہوں تیرے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔“

شیراز سے رہا نہ گیا بولا۔ ”باپو تو نے اکیلے ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا، کون ہے وہ؟“

”نذیرا بھٹے والا۔“

سب کو زور کا جھکا لگا، ایسے لگا جیسے اللہ رکھا نے نام

”سر پر چڑھا رکھا ہے تو نے رانو کو۔“ ماں نے باپ بیٹی کو زہرا لودنظر سے گھورا اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ اگلے روز ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ نذیرے کا کارندہ رانو کے گھر آیا، اللہ رکھا کو بلایا اور نذیرے کا پیغام دیا کہ آج دوپہر کو اس سے ملے۔

”بچھ چاؤں گا۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا، کارندہ چلا گیا۔ دوپہر کو رانو کا باپو اللہ رکھا نذیرے کے ڈیرے پر پہنچ گیا، نذیرا اسے پیچھ گی میں لے گیا، ایک نوکر سے چائے لانے کو کہا اور اللہ رکھا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”اللہ رکھا تو جانتا ہے اب تک کتنے پیسے مجھ سے سو درہ لے چکا ہے، اور کئی ماہ سے سود بھی نہیں دیا۔“

”نذیرے بھائی میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں، آپ ہی بتا دو۔“ اللہ رکھا نے پوچھا۔

”تھوڑے تھوڑے کر کے ایک لاکھ لے چکا ہے تو۔ اور سود ملا کر ڈیڑھ لاکھ سے اوپر بنتے ہیں۔“ نذیرے کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

اللہ رکھا کا رنگ پھلا پڑ گیا، اتنی رقم وہ لے چکا تھا، جوئے اور افیم نے سارا پیسا نکل لیا تھا۔

”نذیرے بھائی! میں تیرے آگے ہاتھ باندھتا ہوں، میرے گھر والوں کو پتا نہ ملے، تیرا میری رقم لوٹا دوں گا۔“ وہ گڑگڑایا۔

”کیسے لوٹائے گا، تیرے گھر میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، ہاں اگر تو میری ایک بات مان لے تو سارے پیسے چھوڑ دوں گا۔“ نذیرا اہل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”سگ، کون سی بات؟“ اللہ رکھا کو تعجب ہو رہا تھا کہ نذیرے جیسا کمینہ اتنی بڑی رقم معاف کرنے کے عوض کون سی بات منوانا چاہتا ہے۔

”رانو کی شادی مجھ سے کر دے۔“ نذیرے نے جیسے ہم پھوڑ دیا ہو۔ اللہ رکھا کا داغ ہنک سے اڑ گیا۔

”یہ کیا کہہ دیا ہے تو نے نذیرے بھائی۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

”تو میری عمر کا ہے، رانو تو ابھی چوبیس کی بھی نہیں

ہوئی۔“

”میں سود نہیں کر رہا، شرعی بات کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں، نہیں، رانو، شیراز، اس کی ماں کوئی بھی میری

نہیں مانے گا۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔“

”دیکھ لے! سوچ لے، ورنہ ڈیڑھ لاکھ، میرے پاس

”یہ وقت تو نہیں ہے کسی سے ملنے کا خیر تو اسے اسٹور کے ساتھ والے کمرے میں لے جا۔“ نذیر ارباب سے بولا۔  
 ”جانبھی بیٹھ، میں اپنے مہمانوں کی تھوڑی خاطر داری کر کے آتا ہوں۔“ نذیر ارباب۔

کار میں دو خواتین اور ایک لڑکا بچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ شیراز نے چلتے کڑھتے ایک گھٹنا انتظار کیا تب نذیر سے کو آتے دیکھا۔ اس کی چال میں لڑکھارہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کینہ پی پلا کر آیا ہے۔  
 ”ہاں بول کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ جو میرا وقت برباد کرنے آ گیا۔“ نذیر سے نفرت سے ہونٹ سکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا بچی پڑھائی ہے تو نے میرے باپ کو، کیوں ہمارا گھر چلانے پر قتل کیا، کیا لگاڑا ہے ہم غریبوں نے تیرا۔“ شیراز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔  
 ”سیدھی بات کر جو میری کھوپڑی میں بھی آئے، بھارت میں نہ تھا۔“ نذیر ابھی ہتھے سے اکٹھا گیا۔

”تو میری بہن کے قابل ہے؟ ہم غریب ہیں، بے غیرت نہیں۔ ہماری غربت کو ہماری کمزوری نہ سمجھ، دوبارہ میری بہن کا نام بھی لیا تو بستی والے وہ ہوتا دیکھیں گے جو اس سے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہوگا۔“ شیراز کا غصہ عروں پر تھا۔  
 ”ذرا چھری تلے سانس تو لے بچہ۔“ نذیر سے کہے بھدے لبوں پر وہی مکروہ مسکراہٹ تھی جو اس کے بدنام چہرے کو اور بھیا کیا بنا دیتی تھی۔

”اچھو، اچھو۔“ اس نے کسی ملازم کو پکارا۔  
 ”جی مائی باپ۔“ ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ ”بات سن، نذیر سے اس کے کان میں کچھ کہا، وہ چلا گیا، دس منٹ بعد 20،15 کاغذ اٹھائے آ گیا، نذیر سے کو تھماے اور چلا گیا، نذیر سے نے وہ کاغذ شیراز کے سامنے میز پر پھینک، دیئے اور بولا ”دیکھ ان کو، پڑھ ان کو، پھر بات کرنا۔“  
 ”میں کیا پڑھوں؟ کیا ہے یہ سب؟“ شیراز نے کاغذات کو گھورتے ہوئے کہا۔

”تیرا باپ میرا ڈیڑھ لاکھ کا مقروض ہے، اس نے سودا کیا ہے میرے ساتھ، ڈیڑھ لاکھ کے عوض بیٹی کے رشتے کا، نہیں نفیقین، تو لے جا، کسی وکیل سے پڑھوائے میں نے کوئی زور زبردستی نہیں کی۔“ شیراز کا غصہ جھاک کی طرح بیٹھ گیا، اسے اپنا باپ لکھ لگا جو مردار کھا تا ہے۔  
 ”اگر تم لوگوں کو یہ سب نہیں منظور تو پھر فیصلہ پہنچاتے

نہیں بتایا بلکہ ان کو آگ کے الاؤ میں دھکا دے دیا ہو۔  
 ”باپو! حیران دماغ تو نہیں چل گیا، اس بدنام زمانہ سے بیٹی بیاہے گا، اس ساٹھ سال کے بھیا تک بوڑھے سے، اس منشیات فروش اور سودخور سے۔“ شیراز سے غصہ ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

ماں بھی اپنے حواس کو بیٹھی تھی۔ بالا خر حواس میں آتے ہوئے بولی۔ ”تو میرے سر کا سانس ہے تو رانومیرا خون ہے، نہ جانے تو کیا کرتا پھرتا ہے، اپنی چارپائی اٹھا اور جاکسی درخت کے نیچے بیٹھا کر دن رات اٹیم کھایا کر، دماغ تو حیرا ولسے ہی ٹھکانے پر نہیں ہے، اب جو تو نے راتوں کے بارے میں کوئی بات کی تو ہم تجھے اس گھر سے دھکے دے کر نکال دیں گے، شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے، دنیا سے کی تو ہم سب پر حقو تھوکرے کی۔“ ماں نے دل کا غبار نکالا۔

رانو کمرے میں بیٹھی تھی، آنسو رکنے کا نام نہ لے رہے تھے، شیراز نے ایک تھراؤ کو نظر پا پو پر ڈالی اور گھر سے نکل گیا، ماں روکنی رہ گئی، باپ کی اس بے غیرتی پر اسے کسی پل چین نہ آ رہا تھا، جوان خون تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ غربت سے تنگ باپ کے اس فیصلہ نے زہر لیے تھجی کی طرح اس کے دل پر گھاؤ لگایا ہے، اسے کچھ بھائی نہ دیا تو بے دھڑک، ہر خوف و ڈر کو بالائے طاق رکھ کر نذیر سے کے ڈیرے کی طرف چل دیا، دو دروازے ہونے والی موسلا دھار بارش کے باعث ابھی بھی کہیں کہیں کچھڑ تھا، اسے لگا باپو نے راتوں، ماں اور اس کے منہ پر بھی بے غیرتی کا کچھڑ مل دیا ہے۔

نذیر سے کے ڈیرے کے مرکزی دروازے پر کھڑے بندوق بردار نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ ”کہاں منہ اٹھائے جا رہا ہے؟“

”نذیر سے ملتا ہے۔“  
 ”احترام سے نام لے، چوہری نذیر بول۔“  
 ”چوہری ہوگا تمہارا، مجھے کھانے کو نہیں دیتا۔ جابول اسے جا کے اللہ رکھا کا بیٹا آیا ہے۔“  
 ”اگر نہ بولوں تو۔“

”تو مجھے دوسرا راستہ آتا ہے۔“ شیراز پھٹکارا۔  
 اس سے پہلے کہ بات بدستی ایک کار آ کر رکی، نذیرا بڑی شان سے اترا۔ ”کیا لٹوا ہے؟“ اس نے چوکیدار اور شیراز کو تاد کی حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

”آپ سے ملنے آیا ہے لیکن بدستیزی کر رہا تھا جناب!“ چوکیدار بولا۔



دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی، اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو خود کو بھی بچنا پڑا تو بچ ڈالے گا لیکن شیراز اور اس کے گھر والوں کی ان جرائم پیشہ کے آگے نظریں نہیں جھکنے دے گا، دونوں نے کچھ اہم فیصلے کیے اور شیراز گھر چلا آیا۔

☆.....☆

دسمبر کی 28 تاریخ تھی، دھوپ نے ہر چیز کو روشن کر رکھا تھا لیکن دل سیاہ تھے تو ان کے جو سرخ اور اس کے سامنے تھے، جنہوں نے من مرضی کا فیصلہ ٹھوس کر غریب کی عزت کو اپنے کٹھنوں کی زینت بنانا تھا، غلط لوگوں کو کوشیاں بھی کوٹھے ہی ہوتے ہیں، جہاں وہ خود بھی غلامت کا ناچ ناچتے ہیں اور دوسروں کا تماشا بھی دیکھتے ہیں۔

منظر چودھری کی کوئی کا لان تھا، دسمبر کی دوپہر کی دھوپ سکون دے رہی تھی، لان میں دو کرسیاں، ایک بیچ، تین چار پائیاں چمچی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر چودھری فواد بڑے مٹھنے سے پھل کر بیٹھا تھا، دوسری کرسی پر بستی کا نام نہاد معزز بوڑھا بیٹھا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ چودھری کے گھروں پر پل رہا ہے، بیچ پر نذر کے حواری اور ایک چار پائی پر شیراز اس کا باپ اور ان کے دو تین حامی بیٹھے تھے۔ بستی کے کچھ لوگ آگئی پائی مارے گھاس پر بیٹھے تھے۔

”ہاں تو نذر بتا کیا معاملہ ہے؟“ چودھری نے پچھتایا کا آغاز کیا۔ نذر نے اللہ رکھا کے وقتاً فوقتاً ڈیڑھ لاکھ قرض لینے، اور پھر قرض معافی کے عوض بیٹی کا نکاح اس سے کرنے کی تفصیل بتادی، ساتھ ہی کاغذوں کا ایک پلندہ بھی چودھری کے آگے رکھ دیا۔

”اللہ رکھا تم کیا کہتے ہو؟“

وہ کیا کہتا، خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھا رہا، شیراز باپ کے دفاع میں بولا ”چودھری صاحب! ہمارے باپ سے جو کروت سرزد ہوئے، اس کی سزا اولاد کو کیوں دی جائے، باپ نے سب قبول کر لیا، ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے ساتھ ایک التجا بھی کرتے ہیں۔“

”بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ چودھری نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہم نذر سے کے ڈیڑھ لاکھ لوٹا دیں گے، اپنی بہن فروخت نہیں کریں گے۔“

”کیسے لوٹاؤ گے؟“

”ہمیں ایک ماہ کا وقت دے دیں۔“

”نذر سے تم کیا کہتے ہو؟“

میں ہو گا؟“ شیراز کے سینے میں انگارے دھک رہے تھے، دماغ میں خوفناک خیالات کا بغیر تھا۔

سرور ساربان کو رانو نے ملاقات کر کے سب بتا دیا تھا۔

”ہم اس بدقتاش کے پیسے لوٹا دیں گے۔“ سرور نے بڑے عزم سے کہا۔ ”مجھے گاؤں بدر کرنا بھی اسی سازش کا حصہ تھا، خیر، میں اپنا اونٹ بچ دوں گا۔ باقی کی ادا کیلئے لیے وقت لے لیں گے۔“

”کیا میرے گھر والے تیری اس قربانی کو قبول کر لیں گے، میں مری جاؤں گی، کنوئیں میں چھلاٹنگ لگا دوں گی، رانو تیری نہیں ہوگی تو پھر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔“ اس کی آنکھیں نم اور لہجہ جذباتی تھا۔

”پتلی کہیں کی، رب سب کا ہے، کچھ نہیں ہو گا۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا، سرور جان تو دے دے گا لیکن یہ برداشت نہیں کرے گا کہ تیرے وجود کو کوئی اوباش چھوئے۔“ وہ جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

☆.....☆

رانو نے گھر آ کر ماں سے بات کی، ماں نے شیراز کو بتایا، تینوں خاموش بیٹھے تھے، اللہ رکھا نے انہیں جس دلدل میں دھکا دیا تھا وہ اس میں ڈوبنا نہیں چاہتے تھے، بے بسی کی آگ انہیں جھلسائے دے رہی تھی۔ شیراز نے سرور ساربان کی پیشکش پر غور کیا، وہ جانتا تھا کہ سرور اور رانو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی اسے خوب معلوم تھا کہ سرور میں اس نے کبھی کوئی برائی نہیں دیکھی تھی، چوری کے الزام میں سرور کو بستی بدر کرنا بھی اب اسے اسی سازش کا ایک حصہ لگ رہا تھا، نذر سے منشیات فروش نے انہیں ایک ایسے جال میں جکڑ دیا تھا بظاہر جس سے رہائی نامکن نظر آ رہی تھی، لیکن ساربان کا احسان انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتا تھا، ہالا خراس نے خود سرور سے ملنے کا وعدہ کیا، اگلے ہی روز وہ سرور سے ملا، سرور نے اسے احترام سے اپنے چیمبر نما گھر میں انکوئی چار پائی پر بیٹھایا، محبوبہ کا بھائی آیا تھا، احترام تو واجب ہو گیا تھا۔

”سرور ہوشیار رہنا۔“ شیراز نے کہا۔ ”ہمارا واسطہ جن سے پڑا ہے وہ بڑے عیار اور مکار ہیں۔ اپنا اور اپنے اونٹ کا خاص خیال رکھنا۔ وہ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ پہلے پچھتایت ہو جائے، پھر سوچیں گے کہ کیا کرتا ہے۔“

دونوں کے پیار کا دشمن دوست بن کر آیا تھا، سرور کے

اندوز ہو رہا تھا، ام النہایت بھی پاس پڑی تھی، اس کا سر چڑھا مگر گالطیف بھی قریب بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔  
 ”سائیں! بڑی زوردار تجویز ہے میرے ذہن میں، سانپ بھی مر جائے گا لاش بھی نہ ٹوٹے گی۔“  
 ”اگر تیرا مشورہ کام نہ ہو تو لاش بھی ٹوٹے نہ ٹوٹے تیرا ایک آدھ ہاتھ بیدار ضرور توڑ دوں گا۔“ نذیر اترنگ میں بولا۔  
 ”سائیں، سننے سے پہلے تو سزا نہ سنائیں۔“ وہ گڑگڑایا۔

”اچھا اب بک جو کتنا ہے۔“  
 ”نہ سائیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ پھر وہ نذیرے کے قریب ہوا اور بڑبڑانے لگا۔  
 ”شباباش اولطیف۔“ نذیرے نے زور کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر مارا۔ محبت کے اس پھٹے سے لطیف زمین پر گرتے گرتے بچا۔  
 ”واہ سائیں، تیریاں تو ہی جانے۔“ نذیرے نے اسے سوکا ایک نوٹ دیا اور حکم دیا پاؤں ذرا زور سے دبائے۔

☆.....☆

سرور اور شیراز میں پھر ایک طویل ملاقات ہوئی، دونوں اونٹ لے کر منڈی گئے، نوے ہزار ریٹ لگا، دونوں بیوپاری سے سوچ بچار کا وقت لے کر واپس آ گئے، شیراز اپنے مالک کے پاس بھی گیا، اسے تمام بات بتادی، مالک نے رقم کھاتے ہوئے اسے دس ہزار بطور قرض دینے کا وعدہ کیا، جو اس کی تنخواہ میں سے کٹا رہے گا۔ ایک لاکھ ہو چکے تھے، پچاس ہزار کے بندوبست کی کہیں آس امید نظر نہیں آ رہی تھی، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، سازشیوں کو سازش سے مات دی جاتی ہے، دونوں نے گھنٹوں کی ملاقات میں ایک بے عیب منصوبہ بنایا جس پر مشکل ترین وقت میں عمل کرنا تھا۔ کھوتا ہوا جوان بھوار اور غربت، تحریج کاری کو جنم دے رہی تھی، چودھری نوادیا نذیرا بد معاش، دونوں میں سے کسی ایک کو اس جوڑی کے ہاتھوں لٹنا تھا، لیکن یہ سب انہوں نے رانوں سے پوشیدہ رکھا تھا۔

☆.....☆

ادھر دارو کے دھندے کا بادشاہ نذیرا اللہ رکھا سے ایک خفیہ ملاقات کر رہا تھا، اس نے دس ہزار اللہ رکھا کے ہاتھ پر رکھے، آنے والے وقت میں اس کے نشہ پانی کا وعدہ کر کے محلول سے بھری چھوٹی سی شیشی اسے دی۔ اللہ رکھا سر ہلاتا رہا اور شیشی دھونی کی ڈھب میں مضبوطی سے اُڑس لی اور گھر کی راہ لی۔

”چودھری صاحب ایک ماہ بہت زیادہ ہے یہ میری رقم لوٹا دیں، میں ان کو معاف کر دوں گا لیکن ایک شرط پڑے۔“  
 ”ٹھیک ہے اپنی شرط بتاؤ۔“  
 ”انہیں ادا کیجیے کہ بعد یہ بستی بھی چھوڑنا پڑے گی ورنہ کسی بھی وقت کوئی لٹوا ہو جائے گا۔“  
 ”تم انہیں کتنے دن کی مہلت دینا چاہتے ہو؟“  
 ”صرف پانچ دن۔“

”یہ ظلم ہے، صرف پانچ دن۔“ شیراز کا ایک حامی بولا۔  
 ”مدی پانچ دن کا کہتا ہے اور ملزم ایک ماہ مانگتے ہیں تو فیصلہ ہم کر دیتے ہیں۔“ چودھری بولا۔  
 ”آپ سر سچ ہیں، آپ کا فیصلہ سب کو قبول ہوگا۔ عدم قبولیت پر وہ سزا کا حق دار ہوگا۔ ملی جلی آواز میں گونجیں۔“  
 ”ٹھیک ہے! اس دن کا وقت دیتا ہوں، اللہ رکھا کے گھر والے اس دوران رقم کا بندوبست کر لیں بصورت دیگر اسی سو دنے پر عملدرآمد ہوگا جو اللہ رکھا نذیرے سے کر چکا ہے۔“  
 چودھری نے کمینگی کا مظاہرہ کر دیا۔ طوہا کر یا یہ فیصلہ سب کو قبول کرنا پڑا، پتہ چایت ختم ہو گئی۔

☆.....☆

سرور نے رانہ کو تختی سے منع کر دیا تھا کہ اگلے دس پندرہ روز کہیں نہیں آئے جائے گی، رانہ اس کے ہاتھ کو بوسا دے کر وعدہ کیا تھا کہ جیسے وہ کہے گا اسی طرح کرے گی، اس نے چھپ کر کالج کی ایک بوتل نہیں سے ڈھونڈ کر اسے توڑا اور کمرے میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بیٹی سوچ پچاس تھی کہ اگر برا وقت نہ ملا تو اپنی جان تو لے ہی سکتی ہے، عزت گنوانے سے بہتر ہے سرور اور گھر والوں کو ایک بے جان جسم دے جائے جس پر گندگی کا ایک دھبہ بھی نہ ہو، اگلے نفن میں اجلا جسم ہی اس کے گھر والوں کی عزت کو قائم رکھ سکتا تھا۔

☆.....☆

آج پھر بادل جو برے تو رکنے کا نام نہ لیا، جگہ جگہ کئی فٹ پانی جمع ہو گیا، غریبوں کے چھوٹے اور مکان ٹپک پڑے، نذیرا ایک کمرے میں بیٹھا کھڑکی کھولے موسم سے لطف

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گہرے

## جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا کونوں کے لیے 800 روپے  
اسرائیل، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ایک سال کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ پسی طرف سے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

### جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر 11 سیکشن 11، فیض باؤنگ اتھارٹی مین کورنگ روڈ، کراچی  
فون: 021-35895313 ٹیکس: 021-35802551

ستمبر 2017ء

☆.....☆  
رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، ایک کمرے میں  
شیراز، راتو، ان کی ماں بے سدھ سو رہے تھے دوسرے  
اندھیرے کمرے میں اللہ رکھا جاگ رہا تھا، لالچ اور بے غیرتی  
کے نشے نے نیند کو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور بھگا رکھا تھا،  
وہ ننگے پاؤں چارپائی سے اترا، آواز پیدا کیے بغیر دوسرے  
کمرے کا دروازہ ہلکے سے کھولا، شیشی والا سارا گھول وہ رات کو  
سالن میں اغڑ مل چکا تھا۔ بہانے سے اس نے کھانا نہیں کھایا،  
جن تینوں نے کھایا تھا، وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے،  
چند منٹوں کے بعد بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، اللہ  
رکھا دھیرے سے بیرونی دروازے پر گیا، کواڑ کھولے، ڈھانٹا  
باندھے چوڑی کھڑے تھے۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ بولا، میں کمرے میں جا  
رہا ہوں، تیر بھی اپنا کام کر کے نکلنے کی کرنا، کوئی دیکھ نہ لے۔  
چاروں اندر آ گئے، ایک بٹے کئے آدمی نے آگے بڑھ  
کر راتو کو سندھے پر ڈالا۔ پھر وہ دے پاؤں گھر سے نکل گئے،  
لالچ کی پٹی اندر رکھا کی آنکھوں سے نہ اتر سکی تھی۔ اس نے ایک  
لاکھ سا تھڑار میں راتو کو نڈیرے کی ”دلہن“ بنا کر رخصت کر دیا  
تھا۔

☆.....☆  
رات کو بھوش آیا تو وہ یکبارگی تڑپ کر اٹھ بیٹھی، حواس  
ذرا ٹھکانے پر آئے تو ماحول کو بھینچی بھینچی نگاہوں سے دیکھ رہی  
تھی۔ یہ ایک سجا سجا کر تھا، اس نے بار بار آنکھوں کو ملا، وہ  
بدبائی۔ ”یہ کیا پستانہ مالک۔“ اور پھر دم بخود رہ گئی۔  
نڈیرا اس کے سامنے ہی کمرے کے کونے میں کھڑا  
اسے کتے چارہ تھا، وہ کروہ نہیں ہنسا۔

”چیخنے چلاتے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے اپنی  
مونچوں کو تاتا دیا تیرے باپو نے تجھے مجھ سے بیاہ دیا ہے،  
نوٹ کمرے کیے ہیں اس نے تو میری زر خرید ہے۔“  
راتو لرز کے رہ گئی، سبھی نظروں سے نڈیرے کی طرف  
دیکھ کر گھٹکاتے ہوئے کرب کے ساتھ ساتھ جوڑ کر  
بولی۔ ”میرے کو چھوڑ دے چا چا، تم میرے باپ کی عمر کے ہو،  
جانے دے مجھے، زندگی بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گی، رحم کر  
میرے پر۔“

”بائیکل تو نہیں ہوگئی، کب سے تیرے لیے تڑپ رہا  
ہوں، ہاتھ آئی پری کو جانے دوں۔“ وہ شیطانی ہنستا ہوا اس  
کی طرف بڑھا۔

”کون ہے اندر، دروازہ کھولو۔“ دروازہ اب پیٹھا جانے لگا۔ رانو نے چیختے ہوئے کہا دروازہ باہر سے بند ہے، میں یہاں قید ہوں، پھر دروازہ باہر سے کھلا، چار پولیس والے اندر کھس آئے، ان کے ہاتھوں میں مارچیں تھیں، اندر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کون ہو تم؟ یہ کون ہے؟ کس کو قتل کر دیا۔“ ایک پولیس والا بولا، ہاتھیں وہ رات کو کشت رہتے یا پھر نذیرے کی حفاظت پر مامور تھے۔ حالات بگڑتے دیکھ کر آدھمکے تھے، لیکن نقشہ بدل چکا تھا۔

”یہ میری عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا، چمرے کی نوک میرے گھبے پر رکھ کر مجھے برا دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی آبرو بچانے کے لیے اسی کے چمرے سے وار کر دیا۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆

رانو کی ساری، انگلیں، آرزوئیں اور تمنائیں خاک اور خون میں تھم کر رہ گئیں، اس کی مسرتوں پر اس کے بے رحم باپ کی کمینگی کا کٹن پڑ چکا تھا۔ پولیس نے 302 کا کیس بنا دیا، سرد، شیراز، اس کی ماں، آنکھوں میں آنسو اور چہروں پر بدخواہیاں لیے بیٹھے تھے، رانو طنزموں کے کنبہ سے میں بت بنی کھڑی تھی۔

سرکاری وکیل نے جرح شروع کی۔ ”تم نے نذیر احمد کو جان بوجھ کر قتل کیا۔“

”اس کا جواب میں دے چکی ہوں۔“ رانو نے اسے نفرت سے دیکھا۔ ”بار بار مجھ کو کیوں دکھ دیتے ہو۔“

”تم نے قانون کو کیوں اتھھ مایا۔“

”قانون تب کہاں تھا جب وہ مجھے اپنے ہاتھوں میں لے رہا تھا۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ تم نے ایک انسان کے خون سے ہاتھ رنکے ہیں، تم نے بہت بڑا جرم کیا، قانون اور انصاف کی توہین کی ہے۔“ سرکاری وکیل دلائل کم دے رہا تھا گرج زیادہ رہا تھا، شاید چودھری فواد نے اچھی خاصی ”سرمایہ کاری“ کی تھی، اس سے قبل کہ وکیل وہی کھسے پٹے دلائل دہراتا رانو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور بولی۔

”حضور! بڑے صاحب، مالی باپ، میں غریب، ان پڑھ، جاہل، قانون تو نہیں جانتی، لیکن جب مجھ پر ظلم ہو رہا تھا، جب ایک میسرے میرے جسم پر اپنے بچے گاؤنے والا تھا، اس وقت یہ پولیس والے کہاں تھے؟ جب مجھے اغوا کیا گیا تب یہ

”ساریاں کی دلہن بننا چاہتی تھی نا، سب جانتا ہوں، آج ہم دونوں سہاگ رات منائیں گے۔“

”دور ہٹ۔“ رانو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ”میں سرور کے لیے جان پہ کھیل جاؤں گی۔“

وہ پیچھے ہٹ رہی تھی لیکن نذیرا نشے میں دھت آگے بڑھ رہا تھا۔

”تو میری بیوی ہے، نکاح بھی ہو جائے گا۔“ وہ بھی بیکسی باتیں کرتا رانو کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔

”بس اور آگے نہ بڑھنا، خدا قسم۔“

”چپ رہ کی کمین۔“ بد معاش نذیرا اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ”دور دور تک تیری آہ سننے والا کوئی نہیں۔“

رانو نے اسے زور کا دھکا دیا اور دروازے کی طرف لپکی، دروازہ باہر سے بند تھا، وہ گھبرا کر زور زور سے دروازہ پینے لگی، کھولو دروازہ کھولو، خدا کے لیے، رحم کرو، دروازہ کھولو۔“ وہ

چپ رہی تھی، لیکن صداب محمدا، اس کی آواز کو ناستہ، وہ تو آبادی سے دور ایک بے شہر شہر پر ایک کمرے میں تھی، جہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا، وہ بھاگ جانے کی جدوجہد میں

پاگل ہوئی جارہی تھی کہ پیچھے سے نذیرے نے دبوچ لیا، دونوں میں دھکامشتی شروع ہو گئی، رانو نے بھی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر

لیا، نذیرے نے تیز پھل والا چاقو نکالا اور اس کی نوک رانو کے سینے میں جھکودی، رانو کے منہ سے سکاری نکل گئی۔

”سیدی طرح بات مانتی ہے یا اتاروں چاقو سینے میں۔“ وہ گر جا۔

”مر جاؤں گی لیکن اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔“ وہ حلق پھاڑ کر چیختی۔

”چپ رہ۔“ نذیرے نے چاقو پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا۔ ”ساتھ اس کے گال پر زور سے کھونٹا مارا۔“

رانو نے دانت بھیج کر ایک زوردار دھکا دیا، نذیرا چمرے سمیت دور جاگرا، رانو بھی شیرنی کی طرح اس پر چبھتی، اس کھینچا تانی میں چاقو رانو کے ہاتھ لگ گیا، اس نے ایک پل

ضائع کیے بغیر پورے زور سے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ایک دل دوز چبھ، خون کا اہلٹا فوراً، رانو نے اس پر ہی بس

نکی چاقو بھیج کر نکالا اور اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ دو تین وار کیے، نذیرے کا سینہ چاک ہو گیا، کسی ذبح ہوتے بکرے کی

طرح ڈکراتا، ہاتھ پاؤں مارتا، لوثیاں لگتا نذیرہ کی بازی ہار گیا، کمرے کا دروازہ زور زور سے پٹیا جانے لگا، رانو بھی خون

میں لٹ پٹ تھی۔

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

مجبوری چہرے سے خوشی کا اظہار نہیں بھی کر رہا تھا تو دل میں ضرور خوش تھا کہ ایک گناہگار سے تو کینوں کو نجات ملی۔

☆.....☆

آپا رانوی دکھ بھری کہانی سن کر دل میں بہت دکھ محسوس کر رہی تھی، نہ جانے روزانہ حوالی کتنی بیٹیاں، کاروباری، کالا، کالی، ونی اور دیگر کمزورہ ریسوں کی جینٹ چڑھا دی جاتی ہیں، وہ دل میں اٹل فیصلہ کر چکی تھی کہ رانوی کو ہر صورت با عزت بری کرائے گی، وہ سمجھ گئی تھی کہ کیس بہت کمزور ہے، اس نے اپنے دفاع میں قتل کیا تھا، انوکا بھی ملزم نے کیا، بھگتا بھی اس کا، مجرمانہ جملہ بھی اس نے کیا، دروازے کی چنجی بھی باہر سے اس نے لگوائی، ایک دو چھتر تھانے میں گتے تو اس کا باپ بھی سب بک دیتا کہ اس نے مذہب سے مل کر کیا گل کھلایا تھا، اگلے

کہاں تھے؟ میں چیچی، چلائی، دہائی دی، لیکن اس منشیات فروش، عورتوں کے بیوپاری کو رحم آیا نہ کسی نے میری چیچ و پکار پر کان دھرے جب اس سمیٹھے نے میرے سینے میں چافوکی نوک چھوئی تو میری سسکاریاں کسی نے نہیں سیں، کمر اندر سے نہیں باہر سے بند تھا، میرا وار چل گیا، میں نے اس نا سو رو کو ختم کر دیا تو پولیس بھی آ پہنچی۔ اگر کمر اندر سے بند ہوتا تو میں اس کو قتل نہ کرتی بلکہ بھاگ نکلتی۔ یہ پولیس والے بھر، اس سے ملے ہوئے تھے، صاحب! مانی باپ، انصاف آپ کریں۔ میں نے اپنی آبرو بچائی ہے، اپنے دفاع میں وار کیا تھا۔ حضور! شاید آپ کو میری بات بری لگے، اگر ان پولیس والوں کی بہن بیٹی یا آپ میں سے کسی کی آبرو کوئی غنڈے کے ہاتھوں یا مال ہو تو کیا آپ خاموش بیٹھے رہیں گے، قانون کی مدد کا انتظار کریں گے؟ بتائیں حضور؟“

عدالت میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا، اس سے پہلے کہ سرکاری وکیل کچھ بولتا وہ پھر دھکی لہجے میں بولی۔ ”اگر سزا دینی ہے تو میرے اس پاپی باپ کو دو اور دنیا کے ایسے تمام باپوں کو سولی چڑھا دو جو اپنی بیٹیوں کا سودا کرتے ہیں“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

”آرڈر آرڈر.....“ جج نے سب کو متوجہ کیا اور کہا کہ ”کیس کی باقاعدہ سماعت سے قبل ملزمہ کو وکیل کرنے کا قانونی حق ہے۔“

”لیکن حضور! اپنے گھر میں تو ایک روز کھانا پکتا ہے اور دو روز پیاز یا گڑ سے روٹی کھانا پڑتی ہے۔“ وہ جج سے مخاطب تھی۔

”اگر تم وکیل نہ کر سکی تو ریاست تمہیں وکیل فراہم کرے گی، جج نے اسے 14 دن کے جوڈیشل ریماڈ پر جیل بھیجنے کا حکم دیتے ہوئے عدالت پر رخصت کر دی۔“

لیڈی پولیس نے اسے ہتھکڑی پہنائی اور جیل پہنچانے کے لیے گاڑی کی طرف لے کر چل پڑی، اسی دوران جب ضروری قانونی کارروائی ہو رہی تھی تو ان اور بھائی شیراز کو اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”رانو فکر نہ کرنا، ہم وکیل کریں گے چاہے کچھ بھی ہو۔“

ایک کونے میں سرور کھڑا تھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، وہ کٹتی باندھے رانوی کو تنگے جا رہا تھا، وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وکیل کیسے کرنا ہے؟، ہستی میں یہ بات پھیلی تو سب غنڈے مذہب سے بے رحم ہو کر رہے تھے اور رانوی کی بھادری کے گن گارے تھے، ایک شیطان سے سب کو اماں بل گئی تھی، اگر کوئی بحالت

کراچی

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی..... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر تشویلیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں



روز آپانے ایک طویل خط لکھا اور انوکے حوالے کرتے ہوئے  
اسے سمجھا بھی دیا کہ شیراز اور سرور کو کیا کہنا ہے۔

☆.....☆

ایک دو روز بعد شیراز، اس کی ماں اور سرور تینوں اس سے ملاقات کو آئے، رانو نے حال احوال کے بعد وہ خط انہیں دیا اور انہیں سب سمجھا بھی دیا، یہ آپا کا جیل میں اثر و رسوخ ہی تھا کہ خط لکھنے سے پہچانے تک کوئی ملازمہ رکاوٹ نہیں بنی تھی، دوسرے روز ہی بہاولپور کی ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم کے وکیل نے جیل پہنچ کر دلالت نامے پر اس کے انگوٹھے لگوائے۔

کیس کی باقاعدہ سماعت کے پہلے ہی روز رانو کے وکیل کے سامنے سرکاری وکیل کی ایک نہ چلی، عدالت نے پچاس پچاس ہزار کے چٹکوں کے عوض اس کی ضمانت منظور کر لی، اس روز بھی خوش تھے، بس ایک معما تھا تو آپا کا کردار؟ اسی روز رو بہ کار جیل پہنچی اور شام کو اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

☆.....☆

دن ڈوب چکا تھا، ملتان جیل سے رہائی کے بعد وہ اڑھائی سے تین گھنٹے وکیل کی کار میں سفر کر کے ہستی پہنچے تھے۔ ایک پرچہ نذرے اور رانو کے باپ کے خلاف بھی درج ہو چکا تھا۔ پولیس نے بہت کوشش کی تھی کہ یہ ایف آئی آر درج نہ ہو لیکن رانو کے وکیل ارشد ایڈووکیٹ نے عدالت سے رجوع کیا، عدالت کے حکم پر نذرے کے خلاف افواہ جس بے جا فعل کی کوشش، عزت لوٹنے کا مقدمہ درج ہوا اور رانو کے باپ کے خلاف نذرے کا ساتھ دینے، ان سب کو کھانے میں بے ہوشی کی دوام لانے اور بیٹی بیچنے کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا تھا۔

چودھری نواز نے اس دوران کئی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم کی لیگل ٹیم سارے معاملے کو دیکھ رہی ہے تو اس نے دم دبا کر روپوش ہونے میں عافیت بھی۔ اس لیگل ٹیم نے رانو سے مشورہ کیا تھا کہ وہ لوگ چاہیں تو اس معاملے میں نام نہاد سرخ چودھری نواز کو بھی ٹھیک لیتے ہیں، لیکن رانو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے کمرموں کی سزا اب اسے دے گا، ایک نڈایک روز وہ ضرور رب کی پکڑ میں آئے گا، رانو کے باپ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا، اسے بھی اس کے سیاہ کرتوتوں کی سزا ملنی ہی

☆.....☆

بمشکل چار پیشیوں کے بعد عدالت نے رانو کو باعزت بری کر دیا۔ کبھی کے چہرے خوشی سے ختم ہوتے تھے۔ ماں نے رانو کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما، شیراز نے بھی بہن کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تو ایک بہادر بہن ہے، ہمیں تم پر ناز ہے۔ جان پر کھیل گئی لیکن عزت بہ حرف نہ آنے دیا، پھر ازراہ مذاق کہنے لگے پیارے سرور کا اونٹ دو بار بکتے بکتے بلا خرچ ہی گیا، رانو کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ سرور نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اب اسے اور رانو کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

☆.....☆

کوئی ایک ماہ بعد رانو نے ماں، بھائی اور سرور کو ساتھ لیا، ملتان جیل میں آپا سے ملاقات کرنے، شکر یہ ادا کرنے اور لڈو دینے گئی، جیل انتظامیہ کا کہنا تھا کہ یہاں تو آپا نام کی کوئی قیدی یا حوالا لاتی نہیں۔

”میرے ساتھ ہی تو چھ نمبر بیرک میں تھی۔“ رانو حیرت سے بولی۔

”لیکن اب نہیں ہے۔ کل رات ہی اسے موت لے گئی۔“ نیل ملازمہ کا جواب تھا۔

ان تینوں کو حیرت کا جھٹکا لگا، رانو کی آنکھوں سے آنسو چھٹک پڑے۔

پھر تینوں اداسی کے عالم میں اپنی کچی بستی کی جانب لوٹ گئے، رانو محسوس کر رہی تھی آپا کو وہ بھی نہیں بھول پائے گی، آپا نہ ہوتی تو نہ جانے وہ کہاں ہوتی۔

شمارہ اگست 2017ء کی منتخب سچ بیانیان

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: نقب..... انیلہ (کراچی)

☆ دوم: نجات..... زویا اعجاز (لاہور)

☆ سوم: بدگمان..... وردہ خان (کراچی)

پہلے دو حصے اور تیسرے اضعاف کے لیے آپ اپنی منتخب کیجئے  
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے